BAIS401CCT

فقہ، تصوف اور علم کلام

(Fiqh, Tasawwuf & Ilm al-Kalam)

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے۔)

(چوتھا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-انڈیا

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: Fiqh, Tasawwuf & Ilm al-Kalam

ISBN: 978-93-95203-76-0

First Edition : **June, 2023**

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2023
Copies	:	2500
Price	:	330/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Mohammad Haziq, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Karshak Art Printers, Hyderabad

Fiqh, Tasawwuf & Ilm al-Kalam

for

Bachelor of Arts (4th Semester)

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India

*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© *All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)*

Editor	ایڈیٹر
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja Assistant Professor (Islamic Studies) DDE, MANUU, Hyderabad	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز) نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Language Editors	لینگویج ایڈیٹرس
Dr. Mohammad Haziq *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز، ڈی ڈی ای، مانو
Dr. Mohd. Akmal Khan *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Urdu, DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد اکمل خان گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

Editorial Board	مجلس ادارت
Prof. Abdul Ali *Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh*	پروفیسر عبدالعلی سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. S. M. Azizuddin Husain *Former Head, Dept. of History & Culture JMI, New Delhi*	پروفیسر ایس۔ ایم۔ عزیزالدین حسین سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohammad Ishaque *Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi*	پروفیسر محمد اسحاق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohd. Fahim Akhter *Head, Dept. of Islamic Studies, MANUU*	پروفیسر محمد فہیم اختر صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Ghazanfar Ali Khan *Prof., of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU*	پروفیسر غضنفر علی خان پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja *Asst. Prof., Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Mohammad Haziq *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Syeda Amina *Guest Faculty /Asst. Prof. (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر سیدہ آمنہ گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

کورس کوآرڈینیٹر

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ، اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ، اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز) مانو	1
مولانا اشہد جمال ندوی، پی جی ٹی ٹیچر، سینیر سیکنڈری اسکول، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	2،5،6
پروفیسر فہیم اختر ندوی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	3
ڈاکٹر سید عبدالرشید، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، عالیہ یونیورسٹی، کلکتہ	4
ڈاکٹر محمد حاذق، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو	7،19
ڈاکٹر سیدہ آمنہ، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو	8،9
ڈاکٹر شاہد علی عباسی، سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد	10،11،12،13،14، 17،18،15،16
پروفیسر اختر الواسع، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	20،21
ڈاکٹر شکیل احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کشمیر کیمپس	22
ڈاکٹر وارث مظہری، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی	23
ڈاکٹر مشتاق تجاروی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	24

پروف ریڈرس:

اول : ڈاکٹر محمد حاذق

دوم : ڈاکٹر سیدہ آمنہ

فائنل : ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9

بلاک 1 : فقہ

اکائی 1	فقہ اسلامی کا تعارف اور بنیادی مآخذ	11
اکائی 2	فقہ اسلامی کے ثانوی مآخذ	30
اکائی 3	فقہی تاریخ کے ادوار (حصہ اول)	46
اکائی 4	فقہی تاریخ کے ادوار (حصہ دوم)	58

بلاک 2 : فقہی مسالک

اکائی 5	اہم فقہی مسالک (حصہ اول)	73
اکائی 6	اہم فقہی مسالک (حصہ دوم)	88
اکائی 7	ہندوستان میں فقہی خدمات (حصہ اول)	103
اکائی 8	ہندوستان میں فقہی خدمات (حصہ دوم)	117

بلاک 3 : تصوف

اکائی 9	تصوف کا تعارف آغاز وارتقا (حصہ اول)	132
اکائی 10	تصوف کا تعارف آغاز وارتقا (حصہ دوم)	146
اکائی 11	ابتدائی دور کے صوفیائے کرام اور ان کی تعلیمات (حصہ اول)	160
اکائی 12	ابتدائی دور کے صوفیائے کرام اور ان کی تعلیمات (حصہ دوم)	174

بلاک 4: تصوف

اکائی 13	تصوف کے مشہور سلسلے (قادریہ، چشتیہ)	186
اکائی 14	تصوف کے مشہور سلسلے (سہروردیہ، نقشبندیہ)	200
اکائی 15	تصوف کی مشہور کتابیں (حصہ اول)	213
اکائی 16	تصوف کی مشہور کتابیں (حصہ دوم)	228

بلاک 5: تصوف

اکائی 17	ہندوستان کے مشہور صوفیائے کرام (حصہ اول)	240
اکائی 18	ہندوستان کے مشہور صوفیائے کرام (حصہ دوم)	254
اکائی 19	ہندوستان کے مشہور صوفیائے کرام (حصہ سوم)	270

بلاک 6: کلام

اکائی 20	علم کلام (تعارف اور آغاز)	285
اکائی 21	علم کلام (ارتقا)	306
اکائی 22	مشہور متکلمین (حصہ اول)	321
اکائی 23	مشہور متکلمین (حصہ دوم)	335
اکائی 24	مشہور متکلمین (حصہ سوم)	350
	نمونہ امتحانی پرچہ	367

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہورہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بیUGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کرکے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کرکے خود اکتسابی موادSLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سر ٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centers) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centers) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جارہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جارہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہو گا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹر) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹر) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامیات، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامیات کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامیات کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کرسکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم بی اے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کررہے ہیں۔ سمسٹر چہارم کے اس پرچہ کا عنوان "فقہ، تصوف اور علم کلام" ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت بی اے سمسٹر چہارم کے لیے ہے اس پرچہ میں کل چوبیس اکائیاں ہیں جن کو چھ بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان اکائیوں کے تحت علوم اسلامیہ میں سے تین مضامین، یعنی فقہ اسلامی، تصوف اور علم کلام، پر فائدہ مند گفتگو کی گئی ہے۔ ان شعبوں کے تعارف اوران پر ہونے والے کاموں کے تاریخی تسلسل کے ساتھ ان مضامین میں ہندوستانی علما کرام کی خدمات پر بھی تحریری مواد مہیا کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ (الازہری)

کورس کوآرڈی نیٹر

فقہ، تصوف اور علم کلام

(Fiqh, Tasawwuf & Ilm al-Kalam)

اکائی 1: فقہ اسلامی کا تعارف اور بنیادی مآخذ

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 تعریف اور مفہوم

1.2.1 لغوی تعریف

1.2.2 اصطلاحی تعریف

1.2.3 فقہ اور شریعت و دین

1.3 فقہ کی ضرورت اور اہمیت

1.4 فقہ میں اجتہاد

1.5 فقہ کے بنیادی مآخذ

1.5.1 قرآن کریم

1.5.2 سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

1.5.3 اجماع

1.5.4 قیاس (Analogy)

1.6 کلیدی الفاظ

1.7 اکتسابی نتائج

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

اس اکائی میں سب سے پہلے یہ بتایا جائے گا کہ فقہ اسلامی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کیا ہے؟ پھر فقہ اسلامی کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس کے بعد فقہ اسلامی کے مآخذ پر گفتگو کرتے ہوئے فقہ کے بنیادی مآخذ کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس بات کو جان سکیں کہ فقہ اسلامی کیا چیز ہے اور اس کے دائرہ میں کس قسم کے علوم اور احکام آتے ہیں؟ اس کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کیا ہے؟ انسانی زندگی کے لیے فقہ اسلامی کتنی ضروری ہے اور اسلام میں اس کی کیا اہمیت بیان کی گئی ہے؟ نیز آپ اس سے بھی آگاہ ہوں کہ فقہ اسلامی کے بنیادی مآخذ کیا ہیں؟

1.2 تعریف اور مفہوم

1.2.1 لغوی تعریف

"فِقْه" عربی لفظ ہے، عرب کہتے ہیں: "فقهتُ كلامك" یعنی میں آپ کی بات سمجھ گیا۔

لغت میں فقہ کے معنی ہیں معلوم ہونا، اطلاع پانا، کسی چیز کو جاننا، اس کے بارے میں سمجھنا یا فہم حاصل کرنا۔ فقہ کے معنی کے بارے میں علماء کے مختلف قول ملتے ہیں۔ علماء کے ایک قول کے مطابق فقہ "مُطلق فہم" کو کہتے ہیں، یعنی ظاہر اور باریک دونوں چیزوں کو سمجھنا۔ اور یہی راجح معنی ہے۔ دوسرے قول کے مطابق محض باریک چیزوں کے سمجھنے کو فقہ کہتے ہیں۔ اور تیسرا قول ہے: مُخَاطِب کے کلام سے مقصد اور غرض کو سمجھنا۔ امام محمد ابو زہرۃ فقہ کی لغوی / لسانی تعریف میں لکھتے ہیں: "ایک گہری سمجھ جو الفاظ اور اعمال کے مقاصد کو پہچانتی ہے۔"

قرآن کریم میں کئی جگہوں پر "فقہ" کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: "**يا شعيب مانفقه كثيراً مما تقول**" (ہود: 91)، ترجمہ: (اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں)۔ اسی طرح دوسری جگہ ہے: "**ولكن لا تفقهون تسبيحهم**" (اسراء: 44)۔ ترجمہ: (لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے ہو)۔ ایک اور آیت میں اللہ فرماتا ہے "**فَمَالِ هَؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا**" (نساء: 78)۔ ترجمہ: (اس قوم کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں آتے)۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "...**لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا** ..." (اعراف: 179)، ترجمہ: (وہ دل [دماغ] رکھتے ہیں مگر وہ ان

سے [حق کو] سمجھ نہیں سکتے)۔ ان تمام جگہوں پر 'فقہ' کا لفظ "سمجھ" کے معنی میں آیا ہے۔ "سمجھ" کے علاوہ قرآن وحدیث میں فقہ کا لفظ "باریک چیزوں کو سمجھنا" کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسے کلام مجید میں آیا ہے: "**ليتفقهوا في الدين**" (توبہ:122)، ترجمہ: (تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں)۔ اور حدیث نبوی ﷺ ہے (**مَن يُرد الله به خيرًا، يُفقِّهه في الدين**)، ترجمہ: اللہ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین میں سمجھ (تَفَقُّہ) عطا فرما دیتا ہے۔ ان دونوں مقامات پر 'فقہ' کا استعمال باریک چیزوں کو سمجھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

1.2.2 اصطلاحی تعریف

ابتدائی دور میں فقہ کی تعریف زیادہ عام معنی کے ساتھ کی جاتی تھی اور "فقیہ" کا استعمال ان لوگوں کے لیے کیا جاتا تھا جو تمام علوم شرعیہ کا علم رکھتے ہوں، کیونکہ شروع میں فقہ ایک جامع لفظ تھا۔ کتاب وسنت سے سمجھی جانے والی ہر چیز کو فقہ کہتے تھے۔ وحی ونبوت کی معلومات سے جو نتائج بھی اخذ کیے جاتے ہوں، خواہ ان کا تعلق عملیات سے ہو، یا وجدانیات (اس میں اخلاق وتصوف شامل ہیں)، یا اعتقادیات سے، سب ہی پر "فقہ" کا اطلاق ہوتا تھا۔

اس ضمن میں امام ابوحنیفہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فقہ کی تعریف یوں کی ہے: **الفقه، معرفة النفس، مَالَها وما عليها**۔ ترجمہ: فقہ، نفس کے حقوق اور فرائض وواجبات جاننے کا نام ہے۔ عقائد کی اہمیت کے پیش نظر امام ابوحنیفہ اسے "فقہ اکبر" کہتے تھے۔ نیز یہ مفہوم، جو فقہ کے لیے تھا، رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق ہے: "اللہ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین میں سمجھ (تَفَقُّہ) عطا فرما دیتا ہے"۔

بعد کے دور میں جب مختلف علوم کا ظہور ہوا جس میں علم فقہ بھی شامل ہے تو فقہ کو شریعت کے عملی احکام کہا جانے لگا۔ نیز فقہ کا اطلاق محض فروعی احکام کے لیے مخصوص ہو گیا، اور اس کے ساتھ ساتھ حکم اور دلیل کے درمیان ارتباط کو جاننا بھی فقہ میں شامل کیا گیا۔ جیسا کہ امام شافعی کی طرف منسوب مشہور تعریف ہے: "**العِلْمُ بِالأَحْكام الشَّرْعِيَّة العَمَلِيَّة (الفَرْعيّة) المكتسب مِنْ أدِلَّتِها التَفْصيْلِيَّة**"، یعنی ("فقہ") شریعت کے عملی (فروعی) احکام جاننے کا نام ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ (مکتسب) ہوں۔

- **احکام شرعية**: حکم شرعی سے مراد اللہ تعالی کا خطاب جو مُکَلَّف (انسان) کے افعال سے متعلق ہو۔ حکم کی دو قسمیں ہیں:

(1) **حكم تَكلِيفي**: جیسے کہ کسی عمل کا فرض یا واجب یا مستحب یا مباح یا حرام یا مکروہ ہونا۔

(2) **حكم وَضْعي**: کسی عمل کا شرط یا سبب یا مانع ہونا۔

- شرط: جس کے عدم سے دوسری چیز کا عدم لازم ہو، لیکن جس کے وجود پر کسی دوسری کا وجود یا عدم لازم نہ ہو۔

مثال: وضوء نماز کے لیے شرط ہے۔ اگر وضوء نہیں تو نماز نہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اگر وضوء موجود ہو تو نماز بھی لازمی طور پر موجود ہو، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ نماز کا وقت ابھی نہ ہوا ہو۔

- سبب: جس کے موجود ہونے سے شرعی حکم کا وجود لازم آئے (سوائے اس کے کہ کوئی مانع آجائے)، اور جسکی عدم موجودگی سے کوئی حکم لازم نہ آئے۔

مثال: سورج کا ڈھلنا نماز ظہر کی فرضیت کا سبب ہے۔ لیکن اگر اس وقت مکلّف پر بے ہوشی طاری ہوگئی تو نماز کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔

- مانع: لغت میں رکاوٹ کو مانع کہتے ہیں۔ فقہ میں وہ جس کے وجود سے (حکم کا) عدم لازم آئے، اور اس کے عدم سے (حکم کا) وجود اور خود اس (مانع) کا عدم لازم نہ آئے۔

مانع کی دو قسمیں ہیں:

(i) مانعِ حکم: رشتہ داری وراثت کا سبب ہے اور قتلِ عمد کرنا وراثت (یعنی حکم) کے لئے مانع ہے۔ لہذا یہاں مانع حکم (وراثت) کو ختم کر رہا ہے نہ کہ سبب (رشتہ داری) کو۔

(ii) مانعِ سبب: کمال نصاب زکوٰۃ کا سبب ہے لیکن اگر زکوٰۃ کا مالک مدین ہو تو یہ زکوٰۃ دینے کا ایک مانع ہوگا۔

"شَرعِيَّة" کی اس قید کا مقصد غیر شرعی احکام کو خارج کرنا ہے، جیسے کہ احکام عقلیّہ (کل، جزء سے بڑا ہے)، احکام حِسّیّہ (آگ جلا دیتی ہے)، احکام وضعیّہ (مبتدا مرفوع ہوتا ہے)، وغیرہ۔

- عَمَلِيَّة: وہ احکام جو مُکَلَّف کے عمل یا فعل سے متعلق ہوتے ہیں، انہیں فروعی احکام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس تعریف سے اعتقادی یا اصولی احکام (اللہ ایک ہے، محمد ﷺ پیغمبر خدا ہیں، آخرت میں حساب برحق ہے، وغیرہ) اور اخلاقی احکام (حسد اور تکبر کا حرام ہونا، وغیرہ) خارج ہوتے ہیں۔ غور کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ "فقہ" کا اطلاق بعد کے دور میں عملیات کے چند مختصر شعبوں تک محدود ہو کر رہ گیا، علامہ ابن نجیم الحنفی (صاحب کتاب البحر الرائق) نے ان عملی شعبوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: عبادات، معاملات اور مزاجر۔ اگر ہم ان میں کتاب السیر کا بھی اضافہ کرلیں تو ایک طرح سے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کا احاطہ کر سکتے ہیں۔

- أدِلَّة تَفْصِيْلِيَّة: دلیل (یہ مفرد ہے ادلّۃ ودلائل کا) وہ ہے جس پر مناسب طریقے سے غور کیا جانے سے ایک دوسرے علم تک پہنچ سکتے ہیں۔ اگر علم کی جگہ ظن حاصل ہو تو یہ دلیل نہیں بلکہ "امارۃ" کہلائے گا۔ "دلیل تفصیلی" سے مراد وہ دلیل جزوی (جزئي) ہے جس کا تعلق کسی خاص مسئلے سے ہو اور وہ اس کے لیے ایک خاص حکم قائم کرتی ہو۔ احکام شریعت کے ماہرین شرعی دلائل کی روشنی میں ہی احکام معلوم کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے، روزے کی فرضیت کا علم "يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامَ" اس تفصیلی دلیل کے ذریعے حاصل ہوا، زکوٰۃ کی فرضیت کا علم "ءَاتُوا الزَّكٰوةَ" کے ذریعے حاصل ہوا، نماز کی فرضیت کا علم "أَقِيْمُوا الصَّلٰوة" کے ذریعے حاصل ہوا، وغیرہ۔

سنی اور شیعہ علماء کی متفقہ رائے کے مطابق شرعی دلائل کے سرچشمے صرف دو ہیں قرآن اور سنت نبوی۔ پھر کچھ معمولی اختلافات

کے ساتھ، علماء نے دو مزید ذرائع کا اضافہ کیا: اجماع اور قیاس، اور یہ چار ملا کر بنیادی مآخذ (عربی میں المصادر الأولية) کہلاتے ہیں۔ اسلامی فقہ کی ترقی کے ساتھ مزید مآخذ وجود میں آئے جنہیں ثانوی مآخذ کہا جاتا ہے لیکن ان کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان ذرائع میں سے کچھ یہ ہیں: مصالح مرسلہ، عرف، استصحاب وغیرہ۔ اس آخر الذکر زمرے (یعنی ثانوی مآخذ) کی وضاحت ہم اگلی اکائی میں کریں گے۔

ابن السمعانی کتاب القواطع میں لکھتے ہیں: الفقه، هو استنباط حكم المُشكِل من الواضح۔ یعنی بحث اور اجتہاد کے ذریعے واضح شریعت کے نصوص (legal texts) کے اساس پر مشکل (یعنی پیچیدہ) کے حکم کو استنباط کرنے کو "فقہ" کہتے ہیں۔

فقہ کی ایک اور عام اور مقبول تعریف علماء کی اصطلاح میں یہ ہے: فقہ اُن احکام و مسائل کا مجموعہ ہے جن کے تعلق سے وحی نازل ہوئی ہے، اور جن کو مجتہدوں نے استنباط کیا ہے، یا اہل فتاویٰ نے فتویٰ کے طور پر جاری کیا ہے، یا جن کو اہل تخریج (مخصوص علماء) نے نصوص سے نکالا ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فقہ ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے قرآن و حدیث کے معانی و اشارات کے علم اور احکامات کی مخصوص دلائل کے ذریعے معرفت حاصل ہو۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقہ کا موضوع دو حصوں پر مشتمل ہے:

1. شریعت کے عملی احکام کا علم
2. تفصیلی دلائل کا علم

1.2.3 فقہ اور شریعت و دین

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ عام بول چال میں فقہ کے لیے "شریعت" اور "دین" کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ کیا یہ الفاظ حقیقت میں مترادف ہیں؟ یا ان کی مراد میں فرق ہے؟ قرآن اور سنہ نبویہ کی روشنی میں ہمیں معلوم ہوتا کہ شریعت کے معنی ان امور کے ہیں جو شارع (اللہ تعالیٰ) نے مشروع (مقرر) کئے ہیں۔ اس طرح شریعت کے لفظ میں تمام احکام دین شامل ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ (پھر ہم نے آپ کو [دین کے کام کے] ایک شریعت [راستہ] پر مامور فرمادیا تو اسی [راہ] پر چلتے جایئے)، (جاثیہ:18)۔

دین کے لفظ میں بھی تمام احکام اسلامی شامل ہیں، نیز قرآن کی روح میں "دین" اعتقادات، اخلاق، عبادات، معاملات وغیرہ تمام احکام کا جامع ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: (تم لوگوں کے لیے [اللہ نے] وہی دین مقرر کیا ہے جس کی نوح کو ہدایت دی تھی اور جو ہم نے آپ [ﷺ] کی طرف اُتارا ہے، (شوریٰ:13)۔ اور اس طرح شریعت اور دین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اس سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ، اگر ہم "فقہ" کے ابتدائی یا جامع (عمومی) مفہوم کو لیں تو شریعت، دین اور فقہ تینوں بظاہر مترادف نظر آتے ہیں۔ اور اگر ہم "فقہ" کو اس کے مخصوص مفہوم (یعنی فروعی احکام کا علم) سے دیکھیں تو شریعت اور دین کا دائرہ فقہ سے وسیع ہو جاتا ہے۔ یعنی فقہ شریعت کا حصہ ہے، اور شریعت اس سے زیادہ عام ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ شریعت کے احکام کا عظیم حصہ عملی

احکام سے متعلق ہے، اس لیے فقہ کے لیے شریعت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فقہی کتابوں میں صرف وہی مسائل اور احکام نہیں بیان کیے گئے ہیں جو اصطلاحی طور پر "فقہ" کہلاتے ہیں، بلکہ عملی مسائل کے ساتھ شریعت کے اصولی و بنیادی احکام اور عقائد و اخلاق کے احکام بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

1.3 فقہ کی ضرورت اور اہمیت

فقہ اسلامی ایک جامع اور منظم نظام حیات ہے، جس نے انسان کی اصل پر توجہ مرکوز کی ہے۔ فقہ کا تعلق انسان کی زندگی کے ہر مرحلے سے ہے، اس کے دنیا میں آنے سے قبل سے اس کی پرورش اور اس کی زندگی کے بارے میں، اس کی موت اور اس کے موت کے بعد اس کی جائیداد (میراث) کی تقسیم وغیرہ، یہ تمام امور فقہ پر مبنی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ فرد معاشرے کی تشکیل کی بنیاد ہے۔ جہاں شریعت اسلامیہ نے دوسروں کے ساتھ ایک فرد کے تعلقات کو منظم کیا ہے، اسی طرح اس کے ساتھ دوسروں کے تعلقات کو بھی واضح کیا۔ اور ہر فرد کے حقوق اور فرائض کو مفصل انداز میں پیش کیا، اور اُسے اپنے فرائض کا پابند بنایا، اور اپنے حقوق کے اختیار پر اسے حق دیا، کیونکہ ہر وہ فرض جو ایک فرد پر واجب ہے وہ دوسروں کا حق بنتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "فقہ" انسانی زندگی کو منظم اور مرتب کرتی ہے، خالق و مخلوق کے مابین رشتہ استوار کرتی ہے، سیاسی اور معاشی نظام کی صورت گری کرتی ہے اور ایک انسان کو کامیاب اور خوش گوار زندگی کا اسلوب سکھاتی ہے۔

فقہ وہ عنصر ہے جو شریعت کی بقا اور زمانے کے ساتھ اس کے تسلسل کی ضمانت دیتا ہے، اور تمام ابھرتے ہوئے اور عصری معاملات سے نمٹنے میں مدد کرتا ہے۔ فقیہ کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اپنے دور (عصر) میں فرد اور معاشرے کی زندگی کی مکمل تنظیمی تصویر قرآن و سنت کی روشنی میں اخذ (استنباط) کرے۔ تاکہ فرد اور معاشرہ کی زندگی ایک ہم عصر زندگی ہو جو ایک طرف عصری حالات کے ٹھیک مطابق ہو اور دوسری طرف وہ اللہ تعالی کی تعلیمات کے بھی مطابق ہو۔

فقہ کے نہ ہونے سے کیا ہوگا؟ اسلام ماضی تک محدود رہے گا اور وہ زمانے کے ساتھ رابطہ قائم کرنے سے قاصر ہوگا۔ اس طرح اس کی بقا اور اس کا تسلسل ممکن نہ ہوگا۔ انسان کو اس دنیا میں ایک سماجی اور سیاسی نظام کی ضرورت ہوتی ہے جس کے تحت وہ زندگی گزارتا ہے۔ یہ نظام یا تو انسان کے بنائے ہوئے ناقص نظاموں پر قائم کیا جائے، انہیں "**الأنظمة الوضعية**" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یا یہ نظام اللہ تعالی کے سامنے انسان کی ماتحتی کی بنیاد پر بنایا گیا ہو (اُن شریعتوں کے ذریعے جن کے ساتھ انبیاء تشریف آئے تھے)، نظام بہر حال ضروری ہے۔

یہ بات ایک حقیقت ہے کہ انسان کا اپنے آپ کے ماتحت ہونا ایک ناقص اور کمزور کی تابعداری کرنا ہے، تو یہ انسان کے لیے کمال کا باعث نہیں بنتا۔ بلکہ اس کی زندگی میں خامیوں کو گہرا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا، انسان کے لیے ایک ایسے سماجی و سیاسی نظام کی ضرورت ظاہر ہوتی ہے جس کو اللہ تعالی کے سامنے انسان کی ماتحتی کی بنیاد پر بنایا گیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں، یہ نظام نامکمل (یعنی انسان) کی مکمل اکمل

(یعنی اللہ تعالیٰ) کی ماتحتی کے طور پر بنایا گیا ہو۔ یہی وہ جامع اور منظم نظام حیات ہے جس کو ہم فقہ اسلامی (Islamic Jurisprudence) کہتے ہیں۔

یاد رہے کہ فقہ کی مخصوص بنیاد قرآن اور سنت ہے، لیکن ان دونوں میں محض کچھ ہی احکام متعین طور پر بیان ہوئے ہیں۔ در اصل ان دونوں مصادر کا کام اصولی طور پر ہدایات فراہم کرنا ہے نا کہ جزوی تفصیلات۔ ہاں، ہر دور کے فقہاء کا کام ہے کہ وہ ان دونوں مصادر کی روشنی میں تمام امور حیات اور اپنے اپنے عصر کے مستجدات (نئے مسائل) پر، مقررہ اصول وضوابط کے تحت، احکام کا استنباط کریں، اور اسی کو اجتہاد کہتے ہیں۔ شریعت کے مطابق حلال و حرام کیا ہے اور جائز اور ناجائز کیا؟ کون سے اعمال فرض ہیں، کون سے واجب اور کون سے مندوب؟ کیا چیزیں مباح ہیں اور کیا مکروہ؟ یہ تمام باتیں فقہ اسلامی سے معلوم ہوتی ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ کہا کرتے تھے کہ حلال و حرام کا علم فقہاء سے حاصل کرو، اسی طرح شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن وحدیث کے بعد اسلام کا مدار فقہ پر ہے۔ حدیث نبوی: (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر چاہتا ہے، اسے دین میں سمجھ [تَفَقُّه] عطا فرما دیتا ہے)، علامہ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ اس حدیث سے تمام علوم سے "تفقہ" کا افضل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا بیانات سے ہم فقہ کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

1.4 فقہ میں اجتہاد

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے یہ پڑھا کہ فقہ اسلامی وہ فریم (ہیکل) ہے جس میں قرآن و سنت کے نصوص (متون) اور دیگر دلائل کی روشنی میں فقہاء کرام نے فروعی احکام کا استنباط کیا ہے۔ مثال کے طور پر نماز کی فرضیت کا علم درج ذیل تفصیلی دلیل کے ذریعے حاصل ہوا: "أَقِيمُوا الصَّلٰوة"۔ ظاہر سی بات ہے کہ استنباط کے اس کام کے لیے فقہاء کے سامنے کچھ اصول اور ضوابط رہے ہیں—ان اصولوں کا بنانا "اہل اصول فقہ" (اصولیین) کا کام ہے—اور ان اصول و ضوابط کے مطابق ہی فقہاء نے احکام کا استنباط کیا ہے۔ استنباط میں جِد وجہد کا یہ کام "اجتہاد" کہلاتا ہے، اور استنباط کی مہارت رکھنے والے فقہاء کو "مجتہدین" کہتے ہیں۔ لفظ "تَفَقُّه"، جو قرآن میں، سورہ توبہ، آیت 122 میں سے لیا گیا ہے، کا استعمال بھی صاحب علم استنباط کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ نئے سرے سے کسی مسئلہ پر حکم کا پیدا کرنا (قرآن یا سنت نبوی کی طرف رجوع کئے بغیر) ایسا ہی ہے جیسے کہ دین میں کوئی نئی چیز کا اضافہ کرنا، اور یہ دونوں امور خلاف شرع ہیں۔ لہٰذا دین میں کوئی نئی چیز کا اضافہ کرنا اجتہاد نہیں کہلاتا ہے بلکہ اسلام میں جس اجتہاد کا اعتبار ہے وہ قرآن یا سنت نبوی سے دلیل تلاش کرنے میں سعی ومشقت کرنا ہے، یا اجماع و قیاس یا کسی اور ماخذ کی رہنمائی میں کسی خاص مسئلہ میں حکم ثابت کرنا ایسی دلیل سے جس کی تلاش میں محنت کی گئی ہو اور غالب ظن میں اس حکم کا علم اسی دلیل شرعی سے حاصل ہوا ہو۔ بس یہی "اجتہاد" کہلاتا ہے۔ غور کیجیے کہ جہاں فقیہ کا کام شرعی دلیلوں میں سے، مقررہ اصول وضوابط کے تحت، احکام کا استنباط کرنا ہے وہیں اہل اصول فقہ کا کام ان تمام اصول وضوابط کا وضع کرنا ہے جن کو استنباط کے عمل میں فقہاء استعمال کر سکیں۔

جیسا کہ آپ نے اوپر دیکھا، احکام کا استنباط قرآن کریم یا سنت نبوی کے نصوص سے ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ شرعی

دلیل دو طرح کی ہوتی ہے:

1- نص (متن): جیسے کہ قرآن کریم اور سنت نبوی۔

2- غیر نص: جیسے اجماع اور قیاس؛ یہ درست ہے کے یہ نص نہیں ہیں، تاہم یہ خود نصوص سے ماخوذ ہیں، اور ان پر منحصر ہیں۔ لہٰذا یہ قسم بھی دلائل شرعیۃ میں مانی جاتی ہے۔

فقیہ کو استنباط کے طریقوں کا علم ہونا چاہیے۔ اور وہ طریقے دو قسم کے ہیں:

1۔ معنوی طریقے: ان میں غیر نصوص سے استنباط کرنا ہے۔ جیسے کہ قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ، وغیرہ جو کہ خود نصوص سے ماخوذ ہیں۔

2۔ زبانی (لفظی) طریقے: جس میں نصوص سے استنباط کرنا ہے۔ صاحب استنباط کو الفاظ کے ادا کیے گئے معانی (یعنی دلالۃ اللفظ) سے واقف ہونا چاہیے: دلالۃ العبارۃ، دلالۃ الاشارۃ، دلالۃ النص، دلالۃ الاقتضاء وغیرہ۔ اس کو چاہیے کے وہ عبارت کی ترکیب و تشکیل، اس کا مطلب اور اس کی ادائیگی کے طریقوں سے آگاہ ہو، اور یہ بھی سمجھتا ہو کہ لفظ سے کب حقیقت مراد ہے اور کب مجاز۔ کیونکہ اس واقفیت کا اثر نصوص کو سمجھنے اور ان سے شرعی احکام کو استنباط کرنے پر ہوتا ہے۔

دلالات کا علم احکام کے استنباط میں کیسے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے؟ درج ذیل مثالوں پر غور کریں۔

- **دَلَالَۃ العِبارۃ:** (جھوٹی بات [قَوْلَ الزُّورِ] سے پرہیز کرو) (حج:30)۔ دلالۃ العبارۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹی گواہی جرم ہے۔
- **دلالۃ الإشارۃ:** (اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور پہننا دستور [معروف] کے مطابق بچے کے باپ پر لازم ہے) (بقرہ: 233)۔ دلالۃ العبارۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ اور ماں کا نفقہ بچہ کے باپ پر لازم ہے۔ یہی نص میں دلالۃ الاشارۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ اپنے حقیقی باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔
- **دلالۃ النَّصّ:** (اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو، اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف بھی نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا بھی نہیں...) (اسراء: 23)۔ لفظ "أُفّ" سب سے کم ضرر ہے، اور کم سے کم ضرر کی ممانعت یقیناً ہر ضرر کی ممانعت ہے۔ تو دلالۃ النص سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر والدین کو "اُف" کہنا حرام ہے تو یقیناً زیادہ اہم ہوا کہ ہاتھ اٹھانا اور سبّ و شتم کرنا بھی حرام ہے۔ اس اسلوب کو "قیاس جَلی" بھی کہتے ہیں، کیونکہ ہمیں عِلّت (یہاں "ضرر") جاننے کی ضرورت ہوئی لیکن یہ علّت ظاہر ہے نہ کہ مخفی۔
- **دلالۃ الإقْتِضَاء:** (تم پر مردار [مرا ہوا جانور] حرام کر دیا گیا ہے) (مائدہ: 3)۔ یہاں مراد کھانے کی حرمت ہے نہ کہ خود اُس چیز (ذات / جوہر) کی حرمت۔ اس نص کی عبارت کو سمجھنے اور جملے کی درستگی کے لیے ہم کو ایک لفظ کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ لفظ "کھانا" ہے، ایسے لفظ کو "مُقتضیٰ" کہتے ہیں، اور اس اسلوب کو دلالۃ الاِقتضاء۔

یہ سچ ہے کہ قرآن اور سنت کی نصوص جو ہمیں عطا کی گئی ہیں وہ محدود ہیں اور مسائل (یا سوالات) لامحدود ہیں، تو ان مسائل کو حل کرنے کے لیے دلائل شرعیۃ کا سہارا لینا ضروری ہوا۔ انہی دلائل کو فقہ اسلامی کے مآخذ (مصادر فقہ) کہتے ہیں۔ ان مآخذ میں کچھ بنیادی مآخذ کہلاتے ہیں اور کچھ ثانوی مآخذ۔ ذیل میں ہم بنیادی مآخذ کا جائزہ لیں گے، اور ثانوی مآخذ کی وضاحت ہم اگلی اکائی میں کریں گے۔

1.5 فقہ کے بنیادی مآخذ

سنی اور شیعہ علماء کے متفقہ رائے کے مطابق شرعی دلائل کے سرچشمے صرف دو ہیں قرآن اور سنت نبوی۔ ان کو درجہ اول کے مصادر کہتے ہیں۔ پھر کچھ معمولی اختلافات کے ساتھ، علماء نے دو مزید ذرائع کا اضافہ کیا: اجماع اور قیاس (عقل)، اور ان چاروں کو ملا کر بنیادی مآخذ (عربی میں **المصادر الأولية**) کہا جاتا ہیں۔ اسلامی فقہ کی ترقی کے ساتھ مزید مآخذ وجود میں آئے جنہیں ثانوی مآخذ کہا جاتا ہے لیکن ان کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ ثانوی مصادر یہ ہیں: استحسان، صحابی کا فتوی، عرف، اہل مدینہ کا عمل، مصالح مرسلہ، سد ذرائع، استصحاب اور سابقہ شریعت۔ اس آخری قسم (یعنی ثانوی آخذ) کی وضاحت ہم اگلی اکائی میں کریں گے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے بنیادی (اولی / اصلی) مآخذ میں چار مواد آتے ہیں، قرآن کریم، حدیث نبوی، اجماع اور قیاس۔ ان چاروں مآخذ کے درمیان اہمیت اور درجہ کے اعتبار سے وہی ترتیب ہے جس ترتیب سے یہ ذکر کیے گئے ہیں۔

1.5.1 قرآن کریم

قرآن کریم یعنی اللہ کی کتاب سب سے پہلا مصدر شریعت اور بنیادی ماخذ ہے، یہی اصل الاصول ہے، دوسرے تمام مآخذ خواہ وہ بنیادی ہوں یا ثانوی قرآن کریم پر ہی مبنی ہیں۔

قرآن کریم کے تعارف اور اس کی تدوین کی تفصیل آپ اس سے پہلے کی کتاب عقیدہ، قرآن اور حدیث، اکائی نمبر 5 میں پڑھ چکے ہیں۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا مکمل اور آخری ہدایت نامہ بنا کر نازل کیا اور اسے رہتی دنیا تک کے لیے محفوظ بنا کر حکم دیا کہ اب تمام لوگ اپنی پوری زندگی میں اسی سے رہنمائی حاصل کریں۔ اسی لیے فقہاء اور مجتہدین کسی بھی مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی حیثیت بنیادی دستور کی ہے۔ قرآن کا کام اصولی طور پر ہدایات فراہم کرنا ہے نا کہ جزوی تفصیلات، اس لیے اس میں اصول وکلیات کے بیان پر اکتفاء کیا گیا ہے اور معاملات کی تفصیلات اور مسائل کی فروع وجزئیات سے بحث نہیں کی گئی ہے اور اگر کہیں کی گئی ہے تو بہت کم اور وہ بھی کسی اور کلی کے تحت ہے۔ اس اختصار کے باوجود قرآن جامع ہے اور یہ جامعیت جب ہی ممکن ہے کہ اس میں امور کلی بیان کیے گئے ہوں۔

قرآن کریم نے توضیح اور تفصیل کا اختیار سنت کو تفویض کیا، اور ہمیں سنت کی پیروی کا حکم دیا، (اور جو کچھ رسول [ﷺ] تمہیں عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس چیز سے تمہیں منع فرمائیں سو [اُس سے] رک جاؤ) (حشر: 7)۔

1.5.2 سنت رسول ﷺ

یہاں مناسب یہ ہو گا کہ ہم ابتدا میں سنت اور حدیث میں جو تعلق ہے اسے سمجھ لیں اور دونوں الفاظ کی تعریف پر غور کریں۔ کوئی گفتگو یا کوئی کلام، نئی بات، نئی چیز کو عربی زبان میں حدیث کہتے ہیں، جب کہ **سنت** لغوی اعتبار سے مختلف معانی میں استعمال ہوتی ہے، جن میں رواج، طریقہ، عادت، راہ، دستور، قانون وغیرہ شامل ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے اگر ہم نے حدیث اور سنت دونوں کو رسول اللہؐ کے اقوال، افعال اور تقریرات کے معنوں میں استعمال کیا تو اس صورت میں شریعت میں حدیث اور سنت مترادف ہوئے۔ لیکن اگر ہم یہ مان کر چلیں کہ سنت کا معنیٰ ہے چلنے کا راستہ، اور چلنے کا راستہ وہی ہوتا ہے جس پر بار بار چلا جائے تو اس اعتبار سے ہر سنت حدیث ہے لیکن ہر حدیث سنت نہیں ہے، کیونکہ نبی کریمؐ کے ایسے بھی عمل ہیں جو آپؐ کے معمول کا حصہ نہیں تھے، ایسے عمل حدیث میں شامل ہیں لیکن اُن کو سنت نہیں کہا جاتا۔

حدیث اور سنت میں جو تعلق ہے بعض علماء اسے کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

1. کبھی حدیث اور سنت الگ الگ ہوتی ہیں یعنی ایک چیز حدیث تو ہوتی ہے لیکن وہ سنت کا درجہ نہیں پاتی
2. کبھی دونوں جمع ہو جاتے ہیں کہ جو حدیث ہوتی ہے وہ سنت بھی ہوتی ہے
3. کبھی سنت الگ ہو جاتی ہے لیکن وہ حدیث نہیں ہوتی

بعض ائمہ حدیث رسولؐ کے ساتھ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال اور افعال کو بھی حدیث میں شامل کرتے ہیں جب کہ بعض دوسرے ائمہ حدیث اس میں فرق کرتے ہیں۔ شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ حدیث کا اطلاق رسول اللہؐ اور دیگر ائمہ (اہل بیت) کے فرامین یا ان کی روش، سیرت اور ان کے تائید کردہ اعمال پر ہوتا ہے۔

بہر حال، فقہ اسلامی کا دوسرا ماخذ رسول اللہؐ کی سنت ہے۔ اصحابِ اجتہاد احکام کے استنباط میں قرآن کریم کے ساتھ سنت کے ذخیرہ کو پیش نظر رکھتے ہیں اور حدیث کے درجہ استناد کے اعتبار سے حکمِ شرعی اور اس کا درجہ متعین کرتے ہیں۔ سنت پر عمل اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ قرآن پر۔ بلکہ حدیث کے بغیر قرآن پر عمل ممکن ہی نہیں، گویا سنت کتاب اللہ کے احکام کے لیے بمنزلہ تفسیر و شرح کے ہے۔ اس لیے قرآن میں رسولؐ کے تعلق کہا گیا کہ: (انہیں [لوگوں کو] کتاب [قرآن] و حکمت سکھاتے ہیں) (آل عمران: 164)۔ سنت کی اہمیت اِن اگلی آیتوں سے واضح ہوتی ہے: (جس نے رسول [ﷺ] کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ [ہی] کا حکم مانا) (نساء: 80)، ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول [ﷺ] کی اطاعت کرو...) (نساء: 59)۔

حدیث کی حجیت، ضرورت اور اس کے مختلف اقسام آپ تفصیل کے ساتھ کتاب عقیدہ، قرآن اور حدیث، اکائی 16 اور 17 میں پڑھ چکے ہیں، اس لیے ہم ان تمام چیزوں کو تفصیل سے یہاں دوبارہ بیان نہیں کریں گے۔

قرآن کریم کے ساتھ سنت نبوی کا تعلق تین قسم کا ہے:

1. سنت قرآن کے احکام کی تائید و تاکید کرتی ہے، جیسے عبادات کے جو احکام قرآن میں آئے ہیں سنت میں بھی ان کو مزید تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

2. سنت کے ذریعہ قرآن کی شرح ہوتی ہے۔ مثلاً، قرآن میں کوئی حکم مبہم ہے تو اس کی تشریح، یا کوئی مطلق ہے تو اس کے لیے شرط، کوئی عام ہے تو اس کی تخصیص سنت میں بیان کی گئی ہے۔

3. سنت کے ذریعے کچھ ایسے احکام دئے گئے ہیں جن کے بارے میں قرآن خاموش ہے، جیسے نکاح میں پھوپھی اور بھتیجی کو ایک ساتھ رکھنے کی حرمت اور شکاری درندے و شکاری پرندے کی حرمت کے احکام حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔

1.5.3 اجماع

- اجماع کی لغوی تعریف

اجماع عربی لفظ ہے، افعال کے وزن پر، اس کا ایک معنی "عزم" یا کسی چیز کا "پختہ ارادہ" کر لینا ہے، رسول اللہؐ فرماتے ہیں: "مَنْ لَمْ يُجْمِعِ الصِّيامَ قَبْلَ الفَجْرِ فَلا صِيَامَ لَهُ"، ترجمہ: (اُس شخص کا روزہ نہیں ہو گا جو فجر سے پہلے ہی روزہ رکھنے کا عزم [یعنی نیت] نہ کرے)۔ اجماع کا دوسرا معنی ہے: "اتفاق"، یعنی کسی بات پر متفق ہونا، عربی میں کہتے ہیں: أجمع القوم على كذا، أي: اتفقوا عليه، یعنی قوم اِس بات پر متفق ہو گئی۔

- اجماع کی اصطلاحی تعریف

اصطلاحی اعتبار سے اجماع کی تعریف یہ کی جاتی ہے: نبی کریمؐ کی وفات کے بعد، کسی خاص عہد میں تمام مجتہدین کا، کسی شرعی دلیل کی روشنی میں، کسی شرعی حکم پر متفق ہو جائیں۔

مدینہ میں مسلمانوں میں اور رسول اللہؐ کے بعد اور خاص طور پر صحابہ کرام کے درمیان اجماع پیدا ہوا۔ رسول کریمؐ کے دور میں دینی معاملات میں آپؐ کے علاوہ کوئی مرجع اور قانون نہیں تھا، اور عموماً صحابہ کے دور میں مدینہ منورہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں نہ کوئی فقیہ تھا نہ تو فقہ۔ ماہرینِ فقہ کی تعداد بھی محدود تھی لہٰذا، رائے پر جمع ہونے والوں کی رائے معلوم کرنا آسان تھا۔ لیکن آگے چل کر اسلامی ممالک میں جب توسیع کی لہر اٹھی اور تمام بڑے شہروں میں درس کے حلقے اپنے اپنے ماہرینِ شریعت کے ساتھ منتشر ہوئے، تو اجماع حاصل کرنا مشکل ہو گیا، خاص طور پر چونکہ ابتدا میں تصنیف و تالیف کا علم و رواج نہیں تھا۔

- اجماع کی شرطیں

(i) مطلوبہ مسئلے پر متفق ہونے والے افراد مجتہد ہوں

(ii) تمام مجتہد مسلمان ہوں

(iii) اجماع کے لیے کسی شرعی دلیل (قرآن / سنت) کا ہونا ضروری ہے

(iv) اجماع نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ہوا ہو

(v) کسی شرعی حکم پر اجماع ہو، نہ کہ طب، لغت وغیرہ سے متعلقہ کسی مسئلے پر ہو

(vi) اجماع کے بعد ضروری ہے کہ متفقہ فیصلہ عمل میں آجائے

(vii) اجماع سے مراد ایک مخصوص وقت کے تمام مجتہدین کا اتفاق ہے، کیونکہ ایک کی مخالفت بھی اجماع کے منعقد ہونے رکاوٹ ہے

شیعہ مذہب میں بھی اہل سنت کی طرح شرعی احکام کے استنباط کے منابع میں سے اجماع ایک بنیادی ماخذ ہے۔ اس کے حجت ہونے پر قرآن کی متعدد آیات اور نبی کریم ﷺ کی کئی احادیث دلیل ہیں۔ عہد رسالت کے بعد متعدد احکام پر صحابہ کرام کا اجماع ہوا، جیسے کہ:

- جمع قرآن
- مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ
- دادی کے لیے میراث میں چھٹے حصے کا تعین
- سور کے گوشت، چربی اور کھال کی تحریم
- جنازہ کی نماز میں چار تکبیرات

■ اجماع کی دو قسمیں ہیں:

(i) اجماع صریح: تمام مجتہدین وقت مل کر اس حکم پر اتفاق کا صراحتاً اظہار کریں۔

(ii) اجماع سکوتی: کچھ اہل علم کسی بات پر اتفاق کا اظہار کریں اور دوسرے اہل علم اس کا انکار نہ کریں۔

اجماع سکوتی کو کچھ علماء نے حجت مانا ہے اور کچھ نے حجت نہیں مانا۔ جنھوں نے حجت مانا، اس سکوت کے حجت کے لیے کچھ شرطیں رکھیں:

- سکوت کرنے والوں سے موافقت یا مخالفت کسی چیز کا صدور نہ ہو
- جب انہیں اجماع کی اطلاع ملے انہیں اس پر غور کرنے کے لیے مناسب وقت ملے
- مسئلہ زیرِ غور وہ ہو جس میں کتاب و سنت کی صراحت نہ ہو اس میں اجتہاد کی گنجائش ہو
- اسے سکوت سے تسلیم کرنے والے گروہ مجتہدین ہوں

1.5.4 قیاس (Analogy)

■ قیاس کی لغوی تعریف

قیاس عربی لفظ ہے جو کہ قاسَ يَقِيسُ قيساً وقِيَاساً سے ماخوذ ہے، اس کے معنی "تقدیر" اور "مساواۃ" ہے، یعنی ایک شئے کا

اندازہ دوسری شئے کے ذریعہ کرنے کے ہیں۔ عربی میں کہا جاتا ہے: قِسْتُ الأرضَ بالمِتْرِ، أَي: قَدَّرْتُها بِهِ۔ ترجمہ: میں نے زمین کو میٹر سے ناپا، یعنی میٹر کے ذریعہ اندازہ لگایا۔

- قیاس کی اصطلاحی تعریف

قیاس کی اصطلاحی تعریف میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض ماہرین نے مختلف علماء کی تعریفات کو جمع کرکے ان کے ضعف، جامعیت، شمولیت اور مانعیت سے متعلق جو بحثیں پیش کی ہیں، یہاں ان کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس خصوص میں ایک جامع اور مانع تعریف علامہ محمد ابوزہرہ کی بہی ہے۔ وہ اپنی کتاب "اصول الفقہ" میں لکھتے ہیں:

"إنّه (ایٔ القیاس) إلحاق أمر غیر منصوص علیٰ حُکمه بأمر آخر منصوص علیٰ حُکمه للإشتراك بینهما في عِلّة الحُکم"۔

یعنی حکم کی علّتِ میں مشارکت کے وجہ امر غیر منصوص (فرع) کا حکم شرعی امر منصوص (اصل) کے مطابق بیان کیا جائے، یہ قیاس کہلاتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں، اگر کسی مسئلہ کے بارے میں قرآن یا سنت میں حکم بیان ہوا ہے، تو اس حکم کی جو علّت (وجہ، سبب) ہے وہ جن جن نئے مسائل میں پائی جائے گی وہاں بھی وہی حکم جاری کیا جائے۔

- قیاس کی حُجّیت

علماء اسلام نے قیاس کے اثبات کے لیے کئی نصوص اور واقعات سے استدلال کیا ہے۔ ذیل میں دو اہم دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

-قرآن: حجیت قیاس کے سلسلہ میں علماء نے کئی قرآنی آیتیں پیش کی ہیں، یہاں ہم ایک اہم آیت پر روشنی ڈالیں گے: (عبرت حاصل کرواے عقل [بصارت] والو) (حشر: 2)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں "اعتبار" کا حکم دیا ہے۔
اعتبار کا لفظ "عبور" سے ہے، جس کا مطلب ہے ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف (اشتراک کی وجہ سے) منتقل ہونا، اور یہی قیاس میں بھی معتبر ہے۔ یعنی قیاس میں بھی "حکم" ایک مسئلہ (اصل) سے دوسرے مسئلہ (فرع) کی طرف منتقل ہوتا ہے، علّت مشترکہ کی بنیاد پر۔

-سنت نبوی: اثبات قیاس کے باب میں حدیث معاذ بن جبل ایک اہم درجہ رکھتی ہے، سنن ترمذی میں مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے معاذ بن جبل کو جب یمن بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو حضرت معاذ کو بلا کر پوچھا کہ: "بتاؤ معاذ کوئی قضاء در پیش ہو جائے تو کس طرح اس سے نمٹوگے؟" عرض کیا یا رسول اللہ! کتاب اللہ کی روشنی میں، آپؐ نے پوچھا کہ: "کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ ملے تو؟" جواب دیا سنتِ رسولؐ میں تلاش کروں گا، آپؐ نے پھر معلوم فرمایا کہ: "سنت میں اس کی صراحت نہ ملے تو کیا کروگے؟" دست بستہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ مقدور بھر اجتہاد کروں گا، حضرت معاذ کے اس موفق جواب پر فرطِ

مسرت میں آپؐ نے ان کے سینہ پر دستِ شفقت رکھا اور حمد و ثنا کے ساتھ ان کے طرزِ اجتہاد کی تصویب فرمائی۔

-اجماع: جمہور اہل السنہ اور اہل تشیع علماء، علاوہ اصحاب الظاہر (علامہ داؤد الظاہری اور متبعین) کا مذہب ہے کہ مسائل توحید اور عقائد میں قیاس کو دخل نہیں ہے لیکن احکام شرعیہ میں قیاس سے مفر بھی نہیں ہے۔ ایک علامہ کے بقول: عام شریعت کے نصوص اپنے عموم کے دائرہ میں صرف انہی نکتوں کو لیتے ہیں اور لے سکتے ہیں جو ان نصوص کے مفہوم میں داخل ہوتے ہیں؛ لیکن نئے پیش آمدہ مسائل اور معاملات کی وہ انواع واقسام جو ان نصوص کے مفہوم میں سرے سے شامل ہی نہ ہوں وہ ان نصوص کے عموم کے دامن میں قیاس جیسی اصولی دلیل کے ذریعہ آسکتے ہیں۔ بس اسی لیے کہا جاتا ہے کہ قیاس کا ضابطہ خود قرآن کی آیات اور احادیث میں کارفرما ہے۔ امام مزنی نے فرمایا کہ رسول اللہؐ کے زمانے سے آج تک فقہاء اپنے دین کے معاملے میں تمام احکام میں قیاس کا استعمال کرتے رہے ہیں اور ان کا اس پر اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہوگی اور باطل کی نظیر باطل۔

- قیاس کے ارکان چار ہیں:

1.اَصل: جس پر قیاس کیا جاتا ہے (مقیس علیہ)۔ یہ وہ چیز ہے جس کا حکم ثابت ہوتا ہے نص شرعی سے (قرآن وسنت) اور اس کے ساتھ نئے مسائل کو ملا دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شراب کی حرمت ثابت قرآن سے ہے اور اس کے ساتھ نبیذ یا منشیّات / مخدِّرات (drugs) کو ملا دیا جاتا ہے۔

2.فَرع: جو اصل کے ساتھ ملائی جاتی ہے۔ لغت میں اس کو کہتے ہیں جو اپنے غیر سے پیدا ہوا اور اس کی بنیاد بھی اسی پر ہو۔ اور اہل اصول فقہ کی اصطلاح میں اس محل کو کہتے ہیں جسے حکم میں دوسرے سے ملانا مطلوب ہوتا ہے۔ جیسا کہ دیگر منشیات ہیں، ان کو شراب کے ساتھ اس کے حکم میں ملانا مطلوب ہوتا ہے (مشترکہ علّت کی بنیاد پر)، اور وہ حکم تحریم کا ہے۔

3.عِلّت: وہ علّت (operative cause) جو اصل اور فرع کو جمع کرتی ہے، یہ اصل اور فرع کے درمیان مشترک معنی ہوتا ہے جو فرع کے لیے اصل کے حکم کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسا کہ نشہ آور ہونا (عربی میں سُکر، اور انگریزی میں intoxication) منشیات کو شراب کے حکم تحریم میں ملانے کی علّت ہے۔ یادرکھیں کہ علّت نہیں تو قیاس نہیں۔

- علت کی پانچ شرطیں ہیں:

(i) وصف ظاہر ہو، یعنی کہ حواسِ خمسہ ظاہرہ سے وہ وصف معلوم ہو سکے۔

(ii) منضبط ہو، یعنی کہ اشخاص، زمانہ، ماحول اور حالات کے وجہ سے نہ بدلے۔ یہی اختلاف ہے "علت" اور "حکمت" کے درمیان، حکمت منضبط نہیں ہوتی ہے۔

(iii) مناسب ہو، یعنی کہ وہ وصف جو علت مانی گئی ہو اس کے اور حکم کے درمیان ایک توافق ہو اور اس وصف کی بنیاد پر حکم نکالنے میں شریعت کی حکمت بھی سمجھ میں آئے۔

(iv) متعدّی (یعنی قابل انتقال) ہو اور حکم کے موضوع تک محدود و مقصور نہ ہو۔ ایک غیر متعدی وصف کی مثال: سفر کی علت صوم پر مقصور ہے، مسافر کو روزہ نہیں رکھنے کی رخصت ملتی ہے، لیکن اس سے نماز نہیں ادا کرنے کی رخصت نہیں ملتی۔

(v) معتبر ہو، یعنی کہ شریعت نے اس وصف کو علت مانا ہو، اور کوئی شرعی نص کے مخالف نہ ہو۔

- علت کی تین قسمیں ہیں:

(i) وہ جس کی وضاحت خود نصوص شرعیہ میں کردی گئی ہے، جیسے حدیث میں کہا گیا ہے کہ دَافۃ (بڑی تعداد میں لوگوں کی آمد) کی حالت میں قربانی کا گوشت گھروں میں محفوظ نہ کریں (یعنی کہ سارا تقسیم کردیا جائے)۔ اس ممانعت کی علّت "دافۃ" ہے، اور اس کا علّت ہونا خود حدیث کے الفاظ سے واضح ہے۔ شیعہ حضرات نے قیاس شرعی کو صرف اسی نوع پر منحصر کیا ہے۔

(ii) وہ جس کے علّت ہونے پر فقہاء کا اجماع منعقد ہوا ہے۔

(iii) وہ جس کی وضاحت نص شرعی متعین نہیں کرتی لیکن اس کو فقہائے کرام اپنے اجتہاد کے ذریعے معلوم کرتے ہیں۔ اسی قسم کی وجہ سے فقہاء کے درمیان احکام شرعیہ سے متعلق اختلافات پائے جاتے ہیں۔

4. اصل کا حکم: وہ حکم شرعی جو اصل (مقیس علیہ) کے لیے ثابت ہے نصوص سے۔ اور یہ "مطلوبہ حکم" ہے جس میں فرع کو اصل کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قصاص کا حکم ہے جس کو کسی بھاری چیز کے ساتھ قتل کرنے میں، لوہے کی تیز دھار چیز سے قتل کرنے کے ساتھ ملایا گیا ہے۔

-فرع کا حکم: یہ رکن نہیں مانا جاتا ہے، بلکہ قیاس کا نتیجہ ہے، قیاس کا پھل ہے (**ثمرۃ القیاس**)۔

- قیاس کی مثال:

سوال: عصر حاضر میں منشیات نوشی کا کیا شرعی حکم ہے؟

جواب: فقہاء نے خمر (شراب) کی حرمت کی علّت (وجہ و سبب) پر غور کیا تو وہ نشہ آور ہونا (intoxication) پایا گیا۔ خمر کے بارے میں قرآن اور سنت کے نصوص میں حکم مذکور ہے، لیکن عصری منشیات (drugs) کے بارے میں حکم مذکور نہیں ہے۔ غور اور خوض کیا تو دیگر منشیات میں بھی نشہ آور ہونے کی وہی علّت پائی تو فقہاء نے جو حکم خمر کا تھا اس کو دیگر منشیات کی طرف منتقل کیا اور ان میں بھی حرمت کا حکم دیا۔

اوپر کی مثال میں اصل "خمر" ہے؛ فرع "دیگر منشیات"؛ اصل کا حکم "حرمت"؛ علّت مشترکہ "نشہ" ہے، پھر اصل سے فرع کی طرف حکم کو منتقل کیا گیا، بس اسی عمل کو قیاس کہتے ہے۔

1.6 کلیدی الفاظ

مستنبط کرنا : نکالنا، نتیجہ نکالنا

استنباط : استخراج کرنا، معلوم باتوں سے نامعلوم بات دریافت کرنے کا عمل، چند باتوں کو ملا کر عقل کی مدد سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا

فروع : جزوی-فرع یعنی شاخ، جمع فروع

نصوص : نص کی جمع (Legal Text)، قرآن کی واضح آیت نیز واضح حدیث

فتوی : جمع فتاوی، شریعت کا حکم، شرعی رائے

اجتہاد : شریعت کی دلیلوں میں غور کرکے حکم معلوم کرنا

آخذ : (ماخذ کی جمع، عربی میں مصادر، انگریزی میں: sources) اخذ کرنے کی جگہ، دلیل شرعی

ثانوی : دوسرے درجے کا

حجت : دلیل، ضروری ہونا

صریح : واضح، اظہار کرنا

سکوتی : خاموشی

قیاس : لغت میں: ایک چیز کو دوسری چیز کے برابر کرنا۔ اصطلاح میں: عِلَّت کے اندر غیر منصوص مسئلہ (فرع) کا منصوص مسئلہ (اصل) کے مساوی ہو جانا ہے

اشتراک : مشترک ہونا، ایک جیسا ہونا

علت : وجہ، سبب

مُتَّفَقَہ : سب کا اتفاق، سب کے نزدیک تسلیم شدہ

متعذر : مشکل، دشوار، محال کے قریب

1.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- فقہ کا لغوی معنی فہم اور باریک چیزوں کی سمجھ ہے۔
- اصطلاح میں فقہ انسان کے اعمال سے تعلق رکھنے والے ان فروعی احکام کا نام ہے جو شریعت کے تفصیلی دلائل سے مستنبط کیے گئے

ہوں۔

- عقائد کے احکام دین کے واضح فرائض اور اخلاقی احکام فقہ نہیں کہلاتے ہیں۔ کیونکہ پہلی صورت میں وہ اصولی احکام ہیں فروعی نہیں۔ دوسری صورت میں وہ بدیہی احکام ہیں، مستنبط شدہ نہیں۔ اور تیسری صورت میں وہ قلبی احکام ہیں عملی نہیں۔
- فقہ اسلامی کے لیے شریعت کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔
- ہر انسان کو شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے قدم قدم پر فقہ اسلامی کی ضرورت پیش آتی ہے۔
- قرآن وحدیث میں زیادہ تر اصولی ہدایات دی گئی ہیں، جن کی روشنی میں روزمرہ زندگی کے مسائل کا حکم شرعی معلوم کیا جاتا ہے۔ اور اسی کا نام فقہ اسلامی ہے۔
- فقہی احکام کا استنباط کرنے کے لیے کچھ اصول وضوابط ہیں۔ اور ہر چھوٹا بڑا حکم شریعت کی دلیلوں کی روشنی میں ہی طے کیا جاتا ہے۔ یہ کام اجتہاد کہلاتا ہے۔ اور اجتہاد کرنے والے فقہاء مجتہدین کہلاتے ہیں۔
- جن دلائل کے پیش نظر اجتہاد اور استنباط احکام انجام دیا جاتا ہے وہ فقہ اسلامی کے آخذ کہلاتے ہیں۔
- فقہ اسلامی کے مآخذ دو قسم کے ہیں: (1) بنیادی آخذ، یہ چار ہیں: سب سے اہم ماخذ قرآن کریم ہے، پھر سنت نبوی پھر اجماع اور پھر قیاس۔ (2) ثانوی آخذ، یہ متعدد ہیں، اور ان کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف بھی ہے۔
- قیاس یعنی کہ "علت حکم میں مشارکت ہونے کی وجہ سے غیر منصوص مسئلہ (فرع کا حکم) منصوص مسئلہ (اصل کا حکم) کے مطابق بیان کیا جائے"۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. باریک چیزوں کو سمجھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے:

(a). اجتہاد (b). اجماع (c). استحسان (d). فقہ

2. فقہ کی تعریف میں "معرفة النفس، مَالَهَا وما عليها" کس نے فرمایا؟

(a). امام شافعی (b). امام جعفر صادق (c). امام ابو حنیفہ (d). امام مالک

3. "اللہ تعالیٰ کا خطاب جو مُکَلَّف (یعنی انسان) کے افعال سے متعلق ہو"، اسے کہتے ہیں:

(a). دلالۃ الاقتضاء (b). حکم شرعی (c). قیاس (d). نص

4. فقہ کا موضوع کتنے حصوں پر مشتمل ہے؟

(a). دو (b). تین (c). چار (d). سات

5. استنباط میں مشقت، جِد وجہد کا کام کہلاتا ہے:

(a). فقہ (b). قیاس (c). اجتھاد (d). اجماع

6. فقہ کے مصادر اوّلیہ کی تعداد ہے:

(a). بارہ (b). چار (c). تین (d). دو

7. (تم پر مردار حرام کر دیا گیا ہے)(مائدہ:3)،اس نص میں کونسی دلالۃ سے معنی واضح ہوتا ہے؟

(a). دلالۃ النص (b). دلالۃ العبارۃ (c). دلالۃ الاشارۃ (d). دلالۃ الا قتضاء

8. ”علت میں اشتراک کی وجہ سے اصل کے حکم کو فرع میں ثابت کرنا“،اسے کہتے ہیں:

(a). اتفاق (b). قیاس (c). استصحاب (d). دلالۃ اللفظ

9. قیاس کا لغوی معنی ہے:

(a). قلب کرنا (b). جمع کرنا (c). اندازہ کرنا (d). تمام صحیح

10. اجماع کی متفقہ قسمیں کتنی ہیں؟

(a). دو (b). تین (c). چار (d). چھ

1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. فقہ، شریعت اور دین میں کیا فرق ہے؟ بیان کیجیے۔
2. قیاس پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
3. فقہ اسلامی کی اہمیت اور ضرورت پر نوٹ تحریر کیجیے۔
4. ”دلالۃ اللفظ“ کی اہمیت اور اس کی اقسام بیان کیجیے۔

1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. فقہ کی تعریف اور مفہوم پر ایک مضمون لکھیے۔
2. فقہ کے بنیادی مآخذ پر روشنی ڈالیے۔
3. تفقہ اور اجتہاد سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ بیان کیجیے۔

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. فقہ اسلامی: تدوین و تعارف — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (https://besturdubooks.net/qamoos-ul-fiqh)
2. مقدمہ: تدوینِ فقہ — سید مناظر احسن گیلانی
3. فقہ اسلامی: تعارف اور تاریخ — پروفیسر اختر الواسع؛ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
4. فقہ اسلامی کے ذیلی مآخذ — محمد نعمان صاحب (https://kitabosunnat.com/kutub-library/fika-islami-k-zally-makhiz)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 2: فقہ اسلامی کے ثانوی مآخذ

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 فقہ اسلامی کے ثانوی مآخذ

2.3 آثارِ صحابہ

2.3.1 آثار صحابہ کی باعتبار مراتب تقسیم

2.4 استحسان

2.4.1 استحسان کی قسمیں

2.5 استصحاب

2.5.1 اقسام استصحاب

2.6 استصلاح یا مصالح مرسلہ

2.6.1 مصالح مرسلہ کے لیے شرطیں

2.7 عرف وعادات

2.7.1 عرف کی قسمیں

2.9 سدِ ذرائع

2.9.1 ذرائع کے مراتب ودرجات

2.10 ملکی قوانین

2.10.1 عہد نبوی ﷺ کے واقعات

2.10.2 عہد صحابہؓ کے واقعات

2.11 کلیدی الفاظ

2.12 اکتسابی نتائج

2.13 نمونہ امتحانی سوالات

2.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

ماخذ کے معنی حاصل کرنے اور پانے کی جگہ ہے۔ مآخذ سے وہ ذریعہ مراد ہیں جن سے قانون اخذ کیا جاتا ہے۔ کسی بھی حکم کا مرجع قرآن وحدیث ہے۔ یہ دونوں اصل میں اسلامی احکامات کا اصل سرچشمہ وبنیاد ہیں۔ غرض اسی کی روشنی میں اسلامی احکامات کے لیے جو علم وجود میں آیا اسے اصول فقہ کہا جاتا ہے۔ اس اکائی میں فقہ اسلامی کے ثانوی ماخذ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ ثانوی مآخذ کون کون سے ہیں اس کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس بات کو جان سکیں کہ فقہ کے ثانوی مآخذ کیا ہیں اور ان مآخذ سے فقہی احکام کیسے دریافت کیے جاتے ہیں۔ اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ فقہ اسلامی کے ثانوی مآخذ کے بارے میں جان سکیں گے۔

2.2 فقہ اسلامی کے ثانوی مآخذ

شریعت اسلامی کے عملی احکام کی تشریح وتوضیح کا نام فقہ اسلامی ہے۔ جس کا انطباق انسانی زندگی پر ہوتا ہے۔ مآخذ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (1) بنیادی مآخذ (2) ثانوی مآخذ

بنیادی مآخذ چار ہیں: قرآن مجید، حدیث، اجماع اور قیاس

اور ثانوی مآخذ کی تعداد، تعریف اور دائرہ میں اصولیین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ عمومی طور پر 9 مآخذ کو تسلیم کیا گیا ہے۔

2.3 آثارِ صحابہ

حضرات صحابہ کرامؓ امت کے افضل ترین افراد تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کی صحبت وتربیت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

وہ رسول اللہ ؐ کے براہِ راست مخاطب تھے، اس لیے وہ آپ ؐ کے مراد و منشا کو بہتر طور پر سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

قرآن مجید نے صحابہ کرامؓ کے ایمان کی پختگی، نیت کے خلوص، مغفرت کی بشارت اور قیامت کے روز بلند مقام پر فائز ہونے کی خوش خبری دی ہے اور ارشادات نبویؐ میں بھی صحابہ کو رشد و ہدایت کا پیکر، نجات یافتہ اور حق کے لیے معیار قرار دیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے صحابہ کرامؓ کے تقویٰ، علمی دسترس اور ان کے شخصی کردار کا بہت اچھا تعارف کرایا ہے۔ آپؓ نے ارشاد فرمایا: ''یہ محمد ؐ کے اصحاب ہیں، جن کی زندگیاں نہایت سادہ، قلوب پاکیزہ، علم وسیع اور تکلفات سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ یہ حضرات امت کے افضل ترین لوگوں میں ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے منتخب فرمایا۔ تم لوگ ان کے فضل کو پہچانو۔ ان کے نقش قدم کی پیروی کرو اور ان کے اخلاق اور ان کی سیرت کو جہاں تک بس چلے مضبوطی کے ساتھ پکڑو، یہی لوگ صراط مستقیم پر ہیں۔''

انہی نصوص کی وجہ سے محدثین نے صحابہ کرامؓ کے لیے یہ مستقل اصول وضع کیا کہ تمام صحابہ عادل و ثقہ (الصحابة كلهم عدول) ہیں۔ اسناد کی تحقیق میں ان کی شخصیت زیر بحث نہیں لائی جا سکتی اور فقہا نے یہ اصول اخذ کیا کہ جس کے عمل سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے وہ پوری قوم کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ اس لیے فقہ اسلامی کے مآخذ میں ان کے اقوال و اجتہادات کو بھی نمایاں مقام حاصل ہو گا اور بوقت ضرورت اس سے مدد لی جائے گی۔

2.3.1 آثار صحابہ کی باعتبار مراتب تقسیم

فقہا نے صحابہ کرامؓ کے اقوال و فتاویٰ کی حسب مراتب کئی قسمیں کی ہیں اور ہر ایک کا علیحدہ حکم بیان کیا ہے۔

1. ایسے آثار و معمولات جن میں بظاہر ذاتی رائے کے شامل ہونے کی گنجائش ہی نہ ہو۔ مثلاً: مغیبات یا اجر و ثواب کی باتیں یا تعبدی معاملات میں شرعی حکم کا بیان؛ کیوں کہ اس میں قیاس کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے؛ غالب گمان یہ ہے کہ اسے صحابی نے رسول اللہ ؐ سے سن کر ہی بیان کیا ہو گا۔ اس لیے یہ آثار از قبیل سنت شمار ہوں گے اور ان کی حیثیت مرفوع حدیث کی ہو گی۔

2. ایسے آثار جن کے بارے میں دوسرے صحابہ کا اختلاف منقول نہ ہو۔ وہ بھی بالاتفاق قابل حجیت ہیں، اس لیے کہ کسی بات پر صحابہ کا اتفاق کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حکم شریعت ہے۔ جیسے: وراثت میں دادی کا حصہ وغیرہ۔

3. ایسے آثار جو ذاتی اجتہاد پر مبنی ہوں۔ دوسرے ہم عصر صحابہ کے لیے حجت نہیں ہو سکتے۔ اس پر بھی تمام علماء کا اتفاق ہے، اسی وجہ سے صحابہؓ نے ایک ہی مسئلہ میں مختلف رایوں کا اظہار کیا ہے۔ اور صحت کی شرط کے ساتھ سب سے استفادہ کیا گیا ہے؛ مگر ایسے آثار دوسرے مجتہدین کے لیے حجت ہوں گے یا نہیں؟ اس سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

(الف) امام شافعیؒ، مالکی، متاخرین، احناف اور اکثر متکلمین کی رائے یہ ہے کہ ایسے آثار کسی کے لیے قابل حجت نہیں ہیں؛ کیوں کہ صحابہ کرامؓ اپنی تمام خصوصیات کے باوجود اجتہادی خطا کے امکان سے مبرا نہیں ہیں۔

(ب) امام شافعیؒ اور ائمہ احناف کی ایک پرانی رائے اور امام مالکؒ و احمدؒ کی ایک روایت کے مطابق اگر قرآن و سنت اور اجماع میں کچھ نہ پایا جائے تو صحابہ کے آثار میں سے کسی کی رائے قبول کرنا ضروری ہوگا۔ دلیل کے طور پر یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ ”میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں تم جس کی بھی اتباع کروگے تمھیں اسی کے ذریعہ ہدایت حاصل ہوگی۔ “

مختصر یہ کہ شریعت اسلامی کی تشکیل و تدوین میں آثار صحابہ کو سنی فقہاء نے غیر معمولی اہمیت دی ہے اور تشریع کے تمام مراحل میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے اصولیین نے اسے فقہ اسلامی کے ثانوی مآخذ میں شامل کیا ہے؛ کیوں کہ قانون سازی کے کسی بھی مرحلہ میں اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

2.4 استحسان

استحسان کے لغوی معنی کسی شے کو اچھا و مستحسن سمجھنا۔ چنانچہ استحسن فلان اس وقت کہا جائے گا جب کہ وہ کسی کی رائے، بات اور صورت کو اچھا سمجھے اگرچہ وہ دوسروں کے نزدیک بری ہی کیوں نہ ہو۔ اصطلاحی تعریف میں فقہاء میں قدرے اختلاف ہے، ہر مسلک میں الگ الگ تعریف کی گئی ہے۔ ذیل میں حنفی اور مالکی مکتب فکر کی تعریفات درج کی جاتی ہیں:

ابوالحسن کرخی حنفی نے یہ تعریف کی ہے:

استحسان پیش آمدہ مسئلہ کے نظائر میں ایک حکم محدود ہے جو اس میں بھی دیا جاسکتا ہے لیکن زیادہ قوی وجہ کی بنا پر وہ حکم چھوڑ کر اس کے خلاف حکم دینے کو کہتے ہیں۔(أنّ یحکم فی المسألة بمثل ما حکم به فی نظائرها الی خلافه لوجه اقویٰ یقتضی العدول عن الاول)

ابن رشد مالکی کی یہ تعریف ہے:

استحسان قیاس کے حکم میں کسی قسم کا غلو و مبالغہ پائے جانے کی وجہ سے دوسرے حکم کی طرف منتقل ہونا ایسی جگہ کہ قیاس سے استثناء کی وجہ موجود ہو۔(الاستحسان هو طرح القیاس الذي یؤدي إلی غلو فی الحکم و مبالغة فیه إلی حکم آخر في موضع یقتضی أن یستثنیٰ من ذلک القیاس)

ضرورت و افادیت

انسانی ضرورت اور مصلحتوں کا دامن وسیع ہے۔ ان کو قانونی بندشوں میں جکڑنا حد درجہ مشکل ہے۔ ضرورتیں پہلے وجود میں آتی ہیں پھر ان کو منظم شکل دینے میں قاعدہ و قانون بنائے جاتے ہیں۔ زمان و مکان کے لحاظ سے ان میں تبدیلی موقع و محل کے اعتبار سے ان میں جدت طرازی کبھی قیاس کی وسیع حدوں کو بھی تنگ بنادیتی ہے یا نقصان دہ ثابت کردیتی ہے۔ ایسی صورت میں فقہاء قیاسی حکم کو چھوڑ کر دوسرا حکم اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ پہلے والے سے زیادہ آسان اور مفید ہوتا ہے۔ فقہاء ایسا کرنے میں اس لیے مجبور ہیں کہ حکمت الٰہی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا ہو اور اس کے ذریعہ احکام معلوم کرکے فلاح و بہبود میں اضافہ اور مضرت کا دفعیہ ہوسکے۔ استحسان اسی ضرورت

کے تحت کا پیدا کردہ اصول یا ماخذ ہے۔ اس کی تائید میں فقہاء کی تصریحات موجود ہیں اور یہ صورت اختیار کرنا عین حکمت الٰہی کے موافق ہے۔ ارشاد ہے: یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر۔ (البقرۃ: 158) ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمھارے لیے سہولت اور آسانی چاہتا ہے، مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

قرآن و سنت میں استحسان کے ماخذ شرعی ہونے کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے۔ البتہ وہ آیات جن میں ''بہتر'' کے انتخابات یا تنگی کے بجائے سہولت کو اختیار کرنے کا ذکر ہے، ان کو فقہاء نے استحسان کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ ذیل کی دونوں آیات میں ''احسن'' کے انتخاب کا حکم دیا گیا ہے:

''فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون أحسنه''۔ (الزمر: 18) ترجمہ: میرے ان بندوں کو خوش خبری دیجیے کہ وہ جو بات سنتے ہیں ان میں ''احسن'' کی اتباع کرتے ہیں۔

''وأمر قومک یأخذوا بأحسنها'' ۔(الاعراف: 145) ترجمہ: اور اپنی قوم کو حکم دیجیے کہ ان کے ''بہتر'' مفہوم کی پیروی کریں۔)

اسی طرح حدیث میں بھی کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا سوائے حضرت عبد اللہ ابن مسعود کے ایک موقوف قول کے: جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔(فما رأى المؤمنون حسناً فهو عند الله حسن)

2.4.1 استحسان کی قسمیں

استحسان کی دو قسمیں ہیں۔

1. استحسان قیاسی: استحسان قیاسی یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں دو وصف پائے جائیں، جو دو مختلف قیاسوں کا تقاضا کریں۔ ایک قیاس ظاہر متبادر اور دوسرا قیاس خفی جو اس مسئلہ کے کسی دوسری اصل سے الحاق کا مقتضی ہو۔(امام ابوزہرہ) استحسان قیاسی دراصل متعدد قیاسات کے درمیان ایک قیاس کو ترجیح دینے کا نام ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب کہ ایک ہی مسئلے میں قیاس کی متعدد صورتیں موجود ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے برخلاف ہوں۔

2. استحسان ضرورت: یہ ہے کہ اس میں کسی قیاس ظاہر کے خلاف اس لیے حکم لگایا جاتا ہے کہ کسی انسانی حاجت یا دقت کو رفع کرنے کی شدید ضرورت ہوتی ہے یا مصلحت عامہ اس کی مقتضی ہوتی ہے اور یہ بات اس وقت پیش آتی ہے جب قیاس پر عمل کرنے میں کوئی تنگی یا مشکل پیش آجائے۔ ایسی صورت میں قیاس کا دامن چھوڑ کر وہ شکل اختیار کی جاتی ہے جس میں زیادہ سہولت و افادیت ہو؛ تاکہ وقت کی مشکل اور تنگی دور کی جاسکے۔ اس لیے ایسے مسائل جن کو ایک دوسرے پر قیاس کیا جاتا ہے گو وہ سب ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں اور چند مشترک اصول ہی پر ان کی بنیاد ہوتی ہے؛ مگر کبھی کبھار موقع و محل کے اختلاف یا عارضی اسباب کی بنا پر ظلم و عدل اور دقت و سہولت کے اعتبار سے ان کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی ایک حکم ظلم ہوتا ہے مگر دوسرے وقت میں وہی عدل ہو جاتا ہے۔ کبھی ایک حکم میں سہولت

ہوتی ہے مگر کسی عارضی سبب سے وہ چیز انتہائی مشقت و تنگی بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں شریعت اگر ایک ہی طرح کا معاملہ کرے تو اس کی ہمہ گیریت باقی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ایسی ہی صورتوں میں جب کہ قیاس پر عمل کرنے میں مفید نتائج برآمد ہونے کا امکان نہ ہو۔ فقہاء استحسان کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اس کو استحسانِ ضرورت سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض فقہائے احناف نے استحسان کی مزید قسمیں بیان کی ہیں۔ جیسے: استحسان بالسنہ، استحسان بالاجماع وغیرہ۔

ان تفصیلات سے استحسان کی حقیقت اور مآخذ شریعت میں اس کے مقام و مرتبہ کی تعیین بخوبی ہو جاتی ہے نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ قیاس کے استعمال سے بعض مسائل میں جو شدت اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے استحسان کے ذریعہ اس میں ایک معتدل اور مناسب راہ نکل آتی ہے۔

مثال: جیسا کہ کنوئیں کو پاک کرنے کا معاملہ ہے۔ کیوں کہ اصل یہ ہے کہ اگر پانی میں نجاست مل جائے تو وہ نجس ہو جاتا ہے جب تک کہ وہ بہہ نہ جائے لیکن ضرورت کی بنا پر اسے معاف کر دیا گیا۔

2.5 استصحاب

یہ بھی ایک اہم ثانوی ماخذ سمجھا جاتا ہے اور ائمہ فقہ نے بنیادی مآخذ سے رہ نمائی نہ ملنے کی صورت میں اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔

استصحاب کے لغوی معنی صحبت طلب کرنا، دوست بنانا اور باقی رکھنا ہیں۔ اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے وجود اور عدم وجود کو ہر حالت میں باقی رکھنا، یہاں تک کہ تبدیلی ثابت نہ ہو جائے۔ فقہاء نے اپنے مخصوص اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے۔ ”حال میں کسی چیز کے ثبوت کا حکم محض اس بنیاد پر لگانا کہ وہ چیز ماضی میں موجود تھی“ (هو الحكم بثبوت أمر في الزمان الثاني بناءً على أنه كان ثابتاً في الزمان الأول)

استصحاب کی سب سے واضح تعریف علامہ شوکانی نے کی ہے۔ کہ جس بات پر زمانہ ماضی سے عمل درآمد ہوتا چلا آرہا ہے، وہ زمانۂ حال و مستقبل میں بھی اپنی اصل پر باقی رہے گی۔ بشرطیکہ تغیر پذیر کرنے والا کوئی حکم موجود نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بات زمانہ ماضی سے ہوتی آرہی ہے اور اس کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے تو وہ اپنی جگہ پر باقی رہے گی۔

فقہاء نے اس کی بہت سی تعریفیں کی ہیں اور الفاظ میں فرق بھی پایا جاتا ہے۔ تمام تعریفوں کو جمع کرنے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ استصحاب ایک ایسا فقہی اصول ہے، جس کے ذریعہ ایسے امور کے سلسلے میں جو پہلے سے کبھی شرعی حکم کے تحت آتے ہوں، اس وقت تک اسی حال میں باقی رہنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے جب تک اس میں تبدیلی کا کوئی واضح ثبوت نہ مل جائے، اسی طرح جس امر کے حکم کی نفی یا اثبات میں کچھ ثابت نہ ہو تو اسے بھی اصول استصحاب کے تحت پہلی حالت میں برقرار رکھا جاتا ہے؛ کیوں کہ اس دوسری حالت کے باعث اس کا وجود قائم رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی دلیل مل جائے تو حکم بھی بدل جائے گا۔

حجیت استصحاب

اس کی حجیت پر زیادہ تر فقہی مسالک متفق ہیں۔ ان کے درمیان اختلاف صرف اس سلسلے میں پایا جاتا ہے کہ کس حد تک اس اصول کو مؤثر مانا جائے۔ حنابلہ اسے سب سے زیادہ مؤثر مانتے ہیں، احناف بہت کم ہی اس سے استفادہ کرتے ہیں اور شوافع و مالکیہ نے درمیانی راہ اختیار کی ہے۔

2.5.1 اقسامِ استصحاب

اس کی متعدد قسمیں اور صورتیں بیان کی جاتی ہیں۔ بعض میں تمام فقہاء اتفاق رکھتے اور بعض میں مختلف فیہ ہیں۔ علامہ محمد ابوزہرہ نے اپنی کتاب میں چار قسمیں بیان کی ہیں جو تمام فقہاء کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

1. **استصحاب البرائة الأصلية** (بری الذمہ ہونے کی اصلیت کو باقی رکھنا): انسان کا کسی حکم سے اس وقت تک دست بردار رہنا جب تک اس کو حکم کا مکلف بنانے کے لیے کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔ اگر کوئی دلیل ایسی سامنے آجاتی ہے جو اس کو کسی حکم کا مکلف بنادے تو پھر وہ حکم اس پر عائد ہوگا۔

2. **استصحاب ما دل الشرع أو العقل على وجوده:** یعنی شریعت یا عقل انسانی کسی چیز کے وجود یا عدم کا تقاضا کرے۔

3. **استصحاب الحكم:** اس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے کسی چیز کی حلت و حرمت کا حکم دیا تو یہ حکم مستقبل میں برقرار رہے گا جب تک اس چیز کی حلت یا حرمت پر کوئی واضح دلیل نہ مل جائے۔

4. **استصحاب الوصف:** یعنی جو کیفیت شرعاً ثابت ہے، اسے باقی رکھنا کہ کیفیت تبدیل نہ ہو جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کا وجود یا عدم وجود زمانہ ماضی میں ثابت ہو وہ حکم زمانہ حال میں باقی رہے گا تاوقتیکہ اس کے خلاف دوسرا حکم ثابت ہو جائے۔

اس کے علاوہ دو قسمیں اور ہیں جو استاد محمصانی نے ذکر کی ہیں:

5. **استصحاب المغلوب أو استصحاب الحال بالماضی:** یعنی برقراری معکوس یا حال کی حالت ماضی میں قائم رکھنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کا وجود یا عدم وجود زمانہ حال میں ثابت ہو، اسے زمانہ ماضی میں برقرار رکھا جائے گا۔

6. **استصحاب حكم الإجماع:** اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف کے موقع پر اجماع کا حکم برقرار رہے گا، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک حالت میں کوئی حکم متفقہ طور پر ثابت ہو، اس کے بعد اس متفقہ حکم کی صفت بدل جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی کو پانی نہ ملے تو وہ تیمم کرکے نماز پڑھ لیتا ہے اور اس کی نماز متفقہ طور پر صحیح ہو جاتی ہے؛ لیکن اگر وہ نماز پڑھتے ہوئے پانی دیکھ لے تو اس میں شریعت کا حکم کیا ہوگا؟ کیا حکم اجماع کے استصحاب کی وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی نماز درست ہوگئی؛ کیوں کہ پانی کے مشاہدے سے پہلے اجماع یہی تھا اور یہ حکم اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک کوئی دلیل یہ نہ ثابت کردے کہ پانی کے مشاہدے نے نماز باطل کردی ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ اس کی نماز باطل ہوگئی؛ کیوں کہ محل اجماع کی صفت بدل گئی۔ اس سلسلے میں دو رائیں ہیں:

(۱) ابو حامد، ابو الطیب اور قاضی ابو العلی وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ قسم دلیل شرعی نہیں۔

(۲) ابو عبد اللہ، رازی، مزنی اور صیرفی وغیرہ اسے حجت شرعی مانتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ حکم اجماع کا استصحاب اس وقت تک رہے گا جب تک کوئی اور ثبوت اس حکم اجماع کو باطل نہ کر دے۔

2.6 استصلاح یا مصالح مرسلہ

''مصلحت''منفعت حاصل کرنے اور مضرت کو دفع کرنے سے عبارت ہے۔ شریعت اسلامی جس کا مقصود انسانی گروہوں کو اصر اور اغلال (الاعراف:157) سے آزاد کرنا اور عدل واحسان قائم کرنا (النحل:90) ہے اور جس کے پیغامبر کو تمام کائنات کے لیے پیکر رحمت بنا کر مبعوث فرمایا گیا ہے (الانبیاء:107) ممکن نہیں کہ وہ مصلحت انسانی سے خالی اور حکمت ودانش سے عاری ہو۔

اسی لیے اسلامی قانون کے ماہرین نے مصلحت کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ شریعت کے مقاصد پانچ ہیں: (1) حفظ دین (2) حفظ نفس (3) حفظ عقل (4) حفظ نسل اور (5) حفظ مال۔ بلاشبہ ان پانچوں مقاصد کی تکمیل ''مصلحت'' ہے اور ان میں سے جو بات کسی مقصد کے لیے مضر ثابت ہو وہ ''مفسد'' ہے۔

معتبر ہونے کی دلیلیں

دین میں مصالح مرسلہ کو حجت اور اصل ماننے پر جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(1) احکام شریعت اصل میں مبنی بر مصلحت ہیں اور ممنوعات کی بنیاد مقاصد پر ہے۔ اس لیے مصلحتیں بجائے خود قابل قبول اور مفاسد قابل رد ہیں۔

(2) عہد صحابہ میں ایسے فیصلے کیے گئے ہیں، جن کے بارے میں نہ نصوص میں حکم ہے اور نہ ممانعت۔ بلکہ وہ ایسی مصلحتوں پر مبنی ہیں جو مقاصد شریعت سے ہم آہنگ ہیں۔ مثلاً: عہد عثمانی میں جمع قرآن کا مسئلہ اور عہد فاروقی میں شراب نوشی کی سزا کی تعیین وغیرہ۔

(3) ایسی نظیریں عہد تابعین میں بھی ملتی ہیں۔ اس عہد کو اللہ کے رسول ﷺ نے ''قرن خیر'' قرار دیا ہے۔ اس کی سب سے واضح مثالیں حدیث کی تدوین وترتیب، اس کی صحت وضعف کی تحقیق، فن جرح وتعدیل کی ایجاد، بیت المال سے مسافر خانوں کی تعمیر اور منیٰ میں پختہ مکانوں کی تعمیر پر پابندی لگانا وغیرہ ہیں۔

2.6.1 مصالح مرسلہ کے لیے شرطیں

اہم بات یہ ہے کہ مصالح مرسلہ پر عمل کرنے کی کیا شرطیں ہیں علامہ شاطبی مالکی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے تین شرطوں کا ذکر فرماتے ہیں:

(1) یہ کہ اس مصلحت اور مقاصد شریعت کے درمیان ہم آہنگی پائی جاتی ہو، نہ اصول شرع میں سے کسی اصل کے منافی ہو، نہ شریعت کے ادلۂ قطعیہ میں سے کسی دلیل کے مغائر۔

(2) مصلحت ان امور سے متعلق ہو جن میں عقل و مصلحت کو ملحوظ رکھا جاتا ہو۔ تعبدی امور میں سے نہ ہو۔

(3) اس مصلحت کو قبول کرنے کا مقصود دین میں کسی حرج کا دفع کرنا یا شریعت کی کسی بات کا تحفظ کرنا ہو۔

2.7 عرف وعادات

شریعت اسلامی کے ثانوی مآخذ میں ایک اہم ماخذ عرف و عادات ہے۔ فقہ اسلامی کی وسعت و ہمہ گیری اور دوامی حیثیت کو زندہ و تابندہ رکھنے میں اس نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

عرف کے لغوی معنٰی نمایاں چیز، بلندی، جود و سخا اور پسندیدہ قول و عمل کے آتے ہیں اور عادت طور طریقہ، ایک ہی کام کو بار بار کرنے کو کہتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہ الفاظ اب شریعت اسلامی کی ایک اخلاقی و قانونی اصطلاح بن چکے ہیں۔

فقہاء نے عرف وعادات کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں:

”عرف وعادات وہ ہے جو ذہنوں میں راسخ ہو جائے اور جسے فطرت سلیمہ قبول کرے۔“

مشہور فقیہ عبد الوہاب خلّاف نے بڑی نپی تلی تعریف لکھی ہے:”عرف وہ ہے جو لوگوں میں عام ہو جائے اور لوگ اس پر عمل کرنے لگیں۔ قول و فعل اور ترک سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔“

عرف و عادات کو عموماً مترادف سمجھا جاتا ہے؛ لیکن بعض فقہاء نے دونوں میں لطیف فرق بیان کیا ہے۔ لفظ ’عادت‘ کا تعلق انفرادی طریقہ کار یا ایسے عمل سے ہوتا ہے جو بار بار کرنے کی وجہ سے کسی شخص کی فطرت ثانیہ بن گیا ہو۔ جب کہ عرف کا اطلاق اجتماعی عادت اور پوری قوم یا طبقے کے درمیان پائے جانے والے عمل اور رواج سے ہوتا ہے۔

عام طور سے عرف وعادات کے ماخذ شرعی ہونے میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے:

”خذ العفو و أمر بألعرف و أعرض عن الجاهلين“۔ (الاعراف:199) ترجمہ: درگذر سے کام لو، معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

اسی طرح اس کے ثبوت میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود کا یہ اثر پیش کیا جاتا ہے۔ جس بات کو عام مسلمان اچھا سمجھ لیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی وہ اچھا ہوتا ہے (ما راه المؤمنون حسناً فهو عند الله حسن)(مسند احمد بن حنبل)۔

مذکورہ آیت اور روایت کے علاوہ بے شمار ایسے دلائل موجود ہیں، جن سے صراحۃً یا دلالۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے عرف و عادات کو بھی ایک قانونی ماخذ قرار دیا ہے۔

قانونی احکام کے ضمن میں قرآن نے ”معروف“ کا لفظ بکثرت استعمال کیا ہے۔ فقہاء ایسی تمام آیات کو عرف وعادت کے استعمال

کی دلیل مانتے ہیں۔ چنانچہ طلاق، نکاح، وصیت، اجرت اور رضاعت وغیرہ کے سلسلہ میں اس طرح کی متعدد آیات موجود ہیں۔

2.7.1 عرف کی قسمیں

عرف کی تقسیم دو نوعیتوں سے کی گئی ہے۔ ایک تو استعمال اور وضع کے اعتبار سے، دوسرے اہل استعمال کی عمومیت اور خصوصیت کے لحاظ سے۔ پہلی نوعیت کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں۔ اول: عرف لفظی۔ دوم: عرف عملی۔ دوسری نوعیت کے اعتبار سے اس کی تین قسمیں ہیں۔ اول: عرف عام۔ دوم: عرف خاص۔ سوم: عرف شریعت۔ ذیل میں ان کی تعریفات پیش کی جاتی ہیں:

عرف قولی (لفظی)

عرف قولی یہ ہے کہ کسی لفظ کو عام لوگ ایک متعین معنٰی میں استعمال کرتے ہوں اور لغت میں وہ اس معنٰی میں مستعمل نہ ہو۔

(إنّ العرف القولي أن تكون عادة أهل العرف يستعملون اللفظ فى معنى معين و لم يكن ذلک لغة العرف)

عرف عملی

عرف عملی یہ ہے کہ لوگ اپنی طبعی افعال یا تمدنی معاملات میں کسی خاص طرز یا کسی خاص طریقہ کے عادی ہو جائیں۔

(أما العرف العملي فهو اعتبار الناس على شيء من الأفعال العادية أو المعاملات المدنية)

عرف عام

وہ عرف جس پر ممالک اسلامیہ کے عام لوگوں کا تعامل ہو خواہ وہ تعامل قدیم ہو یا جدید۔

(هو ما تعامله عامة اهل البلاد سوائاً كان قديماً أو حديثاً)

عرف خاص

عرف خاص سے مراد ایسے رواج و معمولات ہیں جو کسی خاص علاقے، پیشہ یا طبقے میں رائج اور مشہور ہوں۔ مثلاً: عراق میں دابہ کا لفظ خاص طور پر گھوڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ حالاں کہ اس کے لغوی معنی پیر سے چلنے والے جانور کے ہیں۔

عرف شریعت

عرف شریعت دراصل عرف عام اور خاص ہی کی ایک صورت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شریعت اسلامی کبھی لغت کے بعض الفاظ کو ایک مخصوص معنٰی میں استعمال کرتی ہے۔ مثلاً: صلوۃ، زکوۃ، صوم، حج وغیرہ۔ ظاہر ہے شریعت ان الفاظ کو جن معنی میں استعمال کرتی ہے وہ اپنے خاص لغوی معنی سے بہت مختلف ہیں۔

2.8 ماقبل شریعت

دینی اصطلاح میں شریعت سے مراد وہ طریقہ زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے مقرر کر دے اور اس پر چلنے کا حکم دے۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہ نمائی کے لیے اپنے رسولوں کے ذریعے طریقۂ زندگی عطا کیا اور اس پر گامزن رہنے کی تاکید کی۔ (المائدۃ:48)

ما قبل شریعت سے مراد وہ شریعتیں یا طریقہ ہائے زندگی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے توسط سے مختلف قوموں کو عطا کیں۔ مثلاً: شریعت ابراہیم، شریعت موسیٰ اور شریعت عیسیٰ وغیرہ۔

محمد ﷺ کو اس دنیا میں ایک نئی شریعت دے کر مبعوث کیا گیا، اس کے ساتھ ہی ما قبل شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ فقہاء و اصولیین یہ سوال کرتے ہیں کہ شریعت محمدی کے ہوتے ہوئے کیا گزشتہ شریعتیں قابل عمل ہیں؟ یا پھر ان سے بالکلیہ صرف نظر کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں فقہاء کے جوابات مختلف ہیں۔

ایک طبقے کا کہنا ہے کہ قرآن و سنت کے حوالے سے بعض شرطوں کے ساتھ ان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا طبقہ یہ خیال کرتا ہے کہ شریعت محمدی نے گزشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے، اس لیے ان پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل جن باتوں کو ان سے شریعت محمدی میں شامل کیا گیا ہے وہ ہمارے لیے اس وجہ سے واجب التعمیل نہیں ہیں کہ وہ اُن شریعتوں کا جزو ہیں۔ بلکہ ہمارے اوپر ان کا وجوب قرآن و سنت کی تصریحات کی وجہ سے ہے۔

گزشتہ شریعتوں سے اخذ و استفادہ یا انہیں قابل عمل بنانے والے حضرات بعض آیات، نبوی تصریحات اور آپ کے معمولات سے اس پر استدلال کرتے ہیں۔

2.9 سدِ ذرائع

ایسے اسباب و طریقوں پر بندش لگانا جو مفاسد کا موجب ہوں۔ شریعت اسلامی کے ثانوی مآخذ میں ’سدِّ باب‘ بھی ایک اہم ماخذ ہے، جس سے فساد کو برپا ہونے سے پہلے روکنے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر کام لیا جاتا ہے۔

شریعت اسلامی کے احکام بنیادی طور پر دو طرح کے ہیں:

1. مقاصد: وہ اقوال و اعمال ہیں جو بعینہ مقصود و مطلوب ہیں۔ مثلاً: مفروضہ عبادات اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ۔
2. وسائل: اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ جیسے: نماز کے لیے طہارت و اذان وغیرہ۔

شریعت اسلامی نے مقاصد کے حصول یا اجتناب کے ساتھ ان اسباب و وسائل کا بھی بھرپور خیال رکھا ہے، جو مصلحت مفسدہ کا سبب بنتے ہیں اور ایسے تمام امور جو فطرت انسانی کے خلاف ہوں یا جن سے انسانی معاشرے میں ظلم و فساد برپا ہو سکتا ہو ان کی ممانعت کے ساتھ ساتھ ان کے داخل ہونے کی راہوں کو بھی مسدود کر دیا ہے۔

2.9.1 ذرائع کے مراتب ودرجات

فقہاء نے وسائل وذرائع کا تجزیہ کر کے حسب مراتب ان کی تقسیم کی ہے اور اس کی چار قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

1. ایسے ذرائع جو یقینی طور پر موجب فساد ہوں۔ جیسے: اندھیرے میں کسی کے دروازے کے سامنے گڑھا کھودنا وغیرہ۔ یہ عوام کے لیے خطرناک ہے اس لیے ایسے ذرائع کو مسدود کرنے پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔

2. وہ ذرائع جو عموماً نوع انسانی کے لیے مفید سمجھے جاتے ہیں؛ مگر کبھی کبھار ان میں ضرر کا پہلو بھی سامنے آجاتا ہے۔ جیسے: انگور کی کھیتی وغیرہ۔ اس میں ضرر یہ ہے کہ وہ شراب بنانے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس میں افادیت کا پہلو غالب ہے، اس وجہ سے تمام فقہاء اس کی اجازت دیتے ہیں۔

3. وہ ذرائع جن میں ضرر کا پہلو غالب ہو۔ جیسے: شراب کا کاروبار کرنے والوں سے انگور فروخت کرنا وغیرہ۔ ایسے ذرائع متفقہ طور پر ممنوع ہیں۔

4. ایسے ذرائع جو فساد کا سبب بنتے ہوں؛ مگر زیادہ نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ وامام شافعیؒ ایسے ذرائع کو معتبر سمجھتے ہیں اور امام مالکؒ وامام احمد بن حنبلؒ نے فساد کے پہلو کو ترجیح دیتے ہوئے ممنوع قرار دیا ہے۔

الغرض: جس طرح سدّ ذرائع بھی فقہ اسلامی کا ایک اہم طریقہ ہے شریعت اسلامی نے مقاصد کے حصول کی تاکید وترغیب اسی طرح ان کے اسباب ووسائل پر بھی پوری توجہ دی ہے اور جو اوامر ضرر ونقصان کا باعث ہیں۔ ان کی ممانعت کے ساتھ اس کی جتنی راہیں ہو سکتی ہیں، سب پر روک لگا دی ہے کہ کسی طرح بھی شریعت اسلامی کے اہم عناصر عدل ورحمت، مصالح اور فطرت انسانی پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔

2.10 ملکی قوانین

ملکی قوانین سے مراد وہ مروجہ قوانین ہیں جو قانون سازی کے وقت متعلقہ ممالک میں نافذ ہوں اور وہ باشندگان ملک کی گھٹی میں رچے بسے ہوں۔

حجیت

ملکی قوانین سے اخذ واستفادہ کے لیے نصوص شرعیہ میں کوئی صراحت نہیں پائی جاتی؛ تاہم "امت مسلمہ" کے "امت خیر" ہونے کے ناطے "معروف" کے فروغ اور منکرات کی ممانعت کا جو عمومی حکم ملا ہے، فقہا نے اس میں ملکی قوانین کو بھی شامل کیا ہے اور تاریخی طور پر یہ امر مسلّم ہے کہ خود رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے اپنے زمانے میں عرب وعجم کے بہت سے قوانین کو ضروری اصلاح کے بعد شریعت اسلامی کا جزو بنایا ہے۔ پھر آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی اپنے معنی ومفہوم میں بڑی وسعت رکھتا ہے کہ: اچھی اور عمدہ بات مؤمن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں پائے وہ اسے لینے کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

(الكلمة الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو أحقّ بها)

اسی لیے دیگر چیزوں کے علاوہ اگر ملکی قوانین میں قوم کی بہتری کا کوئی پہلو ہے تو اسے بھی اپنی متاع گم شدہ سمجھ کر اپنانے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیے۔ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ دونوں کے مبارک عہدوں میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ ان نفوس نے اسلامی قانون سازی کے مختلف مراحل میں مروجہ قوانین کو شریعت اسلامی کا جزو بنایا ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

2.10.1 عہد نبوی ﷺ کے واقعات

- عرب کا قدیم اصول تھا کہ مدعی سے دعوی کے ثبوت کے لیے گواہ طلب کیے جاتے تھے اگر گواہ نہ ہوتے اور مدعی علیہ انکار کرتا تو مدعی علیہ کو قسم دی جاتی تھی۔ فقہ اسلامی کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ گواہ مدعی کے ذمہ ہے اور قسم انکار کرنے والے کے ذمہ میں (البينة على من إدّعى و اليمين على من أنكر)۔
- عرب میں نکاح کے متعدد طریقے رائج تھے، ان میں بعض طریقوں میں خونی اور رحمی رشتوں کا بھی پاس و لحاظ نہ کیا گیا تھا۔ اسلام نے ان کے ان تمام طریقوں کو کالعدم قرار دے دیا اور جو بہتر اور مناسب طریقے تھے، انہیں شریعت اسلامی کا جزو بنالیا۔
- جائداد کی ملکیت منتقل کرنے کی مختلف صورتیں رائج تھیں۔ مثلاً: بیع، ہبہ، رہن اور اجارہ وغیرہ معمولی ترمیم کے ساتھ انہیں قائم رکھا گیا۔
- بیع کی مختلف شکلیں رائج تھیں۔ بیع صرف، بیع سلم، بیع مرابحہ، بیع تولیہ وغیرہ ان میں جو شکلیں فساد اور نزاع کا سبب بنتی تھیں انہیں باطل قرار دے کر صحیح صورتوں کو رواج دیا گیا وغیرہ۔

2.10.2 عہد صحابہؓ کے واقعات

1. صحابہ تجارت کے لیے شام، مصر، حبشہ، عراق اور یمن وغیرہ جایا کرتے تھے۔ شام و مصر میں رومی قانون اور عراق میں ایرانی قانون سے سابقہ پڑتا تھا۔ یمن میں بھی یہودیوں، رومیوں اور ایرانیوں کے اثرات تھے۔ اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ مغربی چین سے اندلس کے کچھ حصے تک پہنچ گیا تھا اس وسیع علاقے میں کئی مستقل تمدن پہلے سے موجود تھے۔ اسلامی حکومت میں ان ممالک کی زبان، کلچر، منصب وغیرہ ہر چیز کی حفاظت کی گئی اور معاملات کے تصفیہ اور رسم کی ادائیگی میں حتی الامکان ملک و مذہب کے قوانین کا لحاظ رکھا گیا۔
2. عراق، شام اور مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے بڑی حد تک رومی، یونانی اور ایرانی قانون لگان اور مال گزاری کو باقی رکھا تھا۔ البتہ زمین داروں کے کاشت کاروں کے ساتھ مظالم اور سخت گیریوں پر اسلام نے قدغن لگائی اور اس میں توازن پیدا کیا۔
3. اس زمانہ میں چنگی اور درآمد وغیرہ کے لیے یہ قانون تھا کہ بیرونی ممالک کے تاجروں کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے جیسا وہ مسلمان تاجروں کے ساتھ اپنے ملک کے قانون کے مطابق کرتے تھے۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تشریع اسلامی کے ابتدائی مرحلے میں محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے ملکی قوانین سے بھی حتی الامکان مدد لی ہے اور اس کی قابل قبول چیزوں کو اپنی "متاع گم شدہ" سمجھ کر قبول کر لیا ہے؛ تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہ ہو گا کہ "شریعت اسلامی" کی بنیاد ہی غیر ملکی قوانین پر ہے۔ جیسا کہ بعض مستشرقین نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ فقہ اسلامی کا بیشتر حصہ رومن قوانین سے ماخوذ ہے۔ بجز چند قوانین کے فقہ اسلامی کا "رومن لا" (Roman Law) سے کوئی تعلق نہیں۔

2.11 کلیدی الفاظ

تشریع	:	قانون سازی، شریعت، شرع
جدت طرازی	:	نیا انداز یا نئی روش، نئے طریقے ایجاد کرنا
مضرت	:	خسارہ، نقصان، ضرر
متبادر	:	ذہن میں جلدی آنے والا، قابل فہم، جلدی کرنا
حلت و حرمت	:	سبب حرمت، وجہ حرمت
معکوس	:	قابل منسوخ، بر عکس، جسے الٹا یا بدلا جا سکے
مغائر	:	مخالف، نامطابق، بر خلاف

2.12 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شریعت اسلامی کی تشکیل و تدوین میں آثار صحابہ کو فقہاء نے غیر معمولی اہمیت دی ہے اور تشریع کے تمام مراحل میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے اصولیین نے اسے فقہ اسلامی کا ثانوی مآخذ میں شامل کیا ہے؛ کیوں کہ قانون سازی کے کسی بھی مرحلہ میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
- عرف و عادات کو عموماً مترادف سمجھا جاتا ہے؛ لیکن بعض فقہاء نے دونوں میں لطیف فرق بیان کیا ہے۔ لفظ 'عادت' کا تعلق انفرادی طریقہ کار یا ایسے عمل سے ہوتا ہے جو بار بار کرنے کی وجہ سے کسی شخص کی فطرت ثانیہ بن گیا ہو۔
- شریعت اسلامی نے مقاصد کے حصول یا اجتناب کے ساتھ ان اسباب و وسائل کا بھی بھر پور خیال رکھا ہے، جو مصلحت مفسدہ کا سبب بنتے ہیں اور ایسے تمام امور جو فطرت انسانی کے خلاف ہوں یا جن سے انسانی معاشرے میں ظلم و فساد برپا ہو سکتا ہو ان کی ممانعت کے ساتھ ساتھ ان کے داخل ہونے کی راہوں کو بھی مسدود کر دیا ہے۔

2.13 نمونہ امتحانی سوالات

2.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. فقہ کے بنیادی مآخذ کتنے ہیں۔

(a).چار (b).آٹھ (c).بارہ (d).دو

2. وہ عمل جو ذہنوں میں راسخ ہو جائے اور جسے فطرت سلیمہ قبول کرے:

(a).مصالح مرسلہ (b).استصحاب (c).عرف (d).ان میں سے کوئی نہیں

3. استحسان کی کتنی قسمیں ہیں۔

(a).دو (b).چار (c).ایک (d). تین

4. مصالح مرسلہ کی کتنی قسمیں ہیں۔

(a). تین (b).پانچ (c).ایک (d).ان میں سے کوئی نہیں

5. شریعت کے مقاصد کتنے بیان کیے جاتے ہیں۔

(a).پانچ (b).آٹھ (c).دس (d).دو

2.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. استحسان کی قسموں کو بیان کیجیے۔
2. استحسان کی ضرورت وافادیت پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔
3. اقسام استصحاب پر گفتگو کیجیے۔
4. مصالح مرسلہ پر نوٹ تحریر کیجیے۔
5. سد ذرائع پر اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔

2.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. آثار صحابہ پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
2. استصحاب پر ایک مفصل مضمون تحریر کیجیے۔
3. عرف وعادات اور اس کی قسموں پر جامع مضمون قلم بند کیجیے۔

2.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. کشف الاسرار علی اصول الفقہ	:	علامہ فخر الاسلام بزدوی
2. المدخل الفقہی العام	:	مصطفی احمد الزرقاء
3. اصول الفقہ	:	محمد ابوزہرہ مصری
4. اصول الفقہ	:	محمد الخضری بک
5. اصول التشریع الاسلامی	:	حسب اللہ علی
6. اصول الشاشی	:	ابو علی شاشی

اکائی 3: فقہی تاریخ کے ادوار (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 عہد نبوی
3.3 عہد صحابہ
3.4 عہد مجتہدین
3.5 مابعد عہد مجتہدین سے سقوط بغداد تک
3.6 کلیدی الفاظ
3.7 اکتسابی نتائج
3.8 نمونہ امتحانی سوالات
3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

رسول کریم ﷺ کے عہد میں فقہ کا کیا مفہوم تھا؟ صحابہ کے زمانے میں نئے مسائل کے حل کے لیے فقہی احکام کا استنباط کس طرح ہوا اور فقہی میدان میں کیا کیا رجانات ظاہر ہوئے؟ صحابہ کے بعد مجتہدین کے زمانے میں کن حالات کے تحت فقہی مسالک تشکیل پاتے گئے اور فقہ کے موضوع پر نئی کتابوں کی تصنیف اور نئے علوم کی تشکیل کیسے ہوئی۔ ان تمام امور پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس اکائی میں فقہ کے ارتقائی مراحل میں سے ہم ایک تاریخی حصے کا احاطہ کریں گے جو زمانہ نبوت سے شروع ہوتا ہے اور سقوط بغداد (1258ء) تک محیط

ہے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ فقہ اسلامی کا آغاز کیسے ہوا؟ نبی کریم ﷺ کے مبارک دور میں اور صحابہ کے زمانے میں فقہ کی صورت حال کیا تھی؟ دور مجتہدین میں فقہ کی ترتیب کیا تھی؟ پھر مابعد مجتہدین سے سقوط بغداد تک میں فقہ اسلامی کے اندر کس نوع کا ارتقا انجام پایا؟ یوں آپ فقہ اسلامی کی عہد بہ عہد تاریخ اور ہر دور میں اس کی خصوصیات سے آگاہ ہو سکیں گے۔

3.2 عہد نبوی

فقہ اسلامی کی تاریخ پہلے حصے کو بنیادی طور پر چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔ عہد نبوی　　2۔ عہد صحابہ

3۔ عہد مجتہدین　　4۔ مابعد مجتہدین سے سقوط بغداد تک کا دور

فقہ اسلامی کی ابتدا آغاز وحی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ رسول کریم ﷺ پر قرآن کریم کی آیات نازل ہوتی تھیں اور آپ ﷺ وہ آیات صحابہ کو سناتے اور ان کی تشریح اپنے قول و عمل سے فرماتے۔ صحابہ ان احکام کو سنتے اور فوراً ان پر عمل پیرا ہو جاتے۔ کبھی صحابہ اپنے فہم کے مطابق کوئی عمل کرتے تو رسول اللہ ﷺ کو اس سے آگاہ کرتے اور آپ ﷺ اس کی توثیق فرماتے یا غلطی ہوتی تو اصلاح فرمادیتے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پہلے پورا قرآن کریم نازل ہو گیا تھا اور آپ ﷺ نے اس کی تعلیم صحابہ کو دے دی تھی۔ آپ ﷺ کی وفات سے پہلے اعلان بھی ہو گیا تھا کہ اب دین مکمل ہو گیا ہے (مائدہ:3)۔

اس اولین دور میں فقہ اسلامی کا مرجع اور سرچشمہ دو چیزیں تھیں، اللہ کی کتاب اور رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس۔ بلکہ قرآن کی آیات کو سننے اور سمجھنے کے لیے بھی رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدسہ کی طرف ہی رجوع کیا جاتا تھا۔ ہر پیش آمدہ مسئلہ میں شرعی رہنمائی، آپ ﷺ سے ملتی تھی۔ اس دور میں "فقہ اسلامی" کا لفظ اپنے اصطلاحی مفہوم میں رائج نہ تھا۔ البتہ دین کے فہم اور تفقّہ کے معنی میں یہ لفظ قرآن اور حدیث میں استعمال ہو رہا تھا۔ اسی طرح یہ لفظ "علم" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ جو صحابہ علم و فقہ میں ممتاز ہوتے وہ قراء کہلاتے تھے۔ ایسے صحابہ قرآن کے حافظ بھی ہوتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کا یہ دور دو مرحلوں پر مشتمل ہے:

1. پہلا مرحلہ مکہ مکرمہ میں گذرے تیرہ برس کا ہے، جس میں عقائد کی اصلاح اور اس کی پختگی پر زور دیا گیا

2. دوسرا اہم مرحلہ مدینہ منورہ کی دس سالہ زندگی کا ہے۔ اس میں تفصیل سے شریعت کے احکام نازل ہوئے اور آپ ﷺ نے ان کی تشریح و تفصیل فرمائی اور دین اسلام کا پورا نظام تیار ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات میں ہی کچھ صحابہ شرعی احکام اور فقہی مسائل میں ممتاز ہو گئے تھے اور آپ ﷺ ان کو قانونی نوعیت کے کام سپرد فرماتے تھے اور ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی فرماتے تھے۔ جیسے آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا اور ان سے پوچھا کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آئے تو کیسے فیصلہ کروگے، انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر اس میں نہ ملے ؟ جواب دیا کہ تب رسول اللہ ﷺ کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر اس میں بھی نہ ملے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ تب اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ یہ جواب سن کر آپ ﷺ بہت خوش ہوئے اور ان کی تائید فرمائی۔ اسی طرح بنو قریظہ کے معاملے میں آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ کو فیصلہ کے لیے مقرر فرمایا۔ عمرو بن عاص سے ایک مقدمے کے بارے میں فرمایا کہ: فیصلہ کرو، اگر صحیح کروگے تو دس نیکیاں ملیں گی اور کوشش کے بعد غلطی ہو جائے تب بھی ایک نیکی ضرور حاصل ہوگی۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اپنی قانونی صلاحیتوں کی وجہ سے صحابہ میں امتیازی شناخت رکھتے تھے۔

عہد نبوی ﷺ دراصل فقہ اسلامی کا بنیادی دور ہے۔ کیونکہ فقہ اسلامی کا سارا سرمایہ اسی دور پر مبنی ہے۔ آئندہ پیش آنے والے تمام ادوار اسی دور کی توسیع اور اسی بنیاد پر عمارت سازی کی کوششیں ہیں۔

عہد نبوی میں شرعی احکام اور فقہی مسائل کے تعلق سے تین قسم کی خصوصیات پائی جاتی تھیں:

1. یہ کہ احکام بتدریج دیے جاتے تھے، جیسے شراب کی حرمت بیک وقت نہیں آئی بلکہ آہستہ آہستہ ذہن سازی کرتے ہوئے مرحلہ وار ممانعت آئی۔
2. یہ کہ احکام میں شدت اور سختی نہیں رکھی گئی بلکہ آسانی اور سہولت عطا کی گئی، چنانچہ قرآن اور حدیث میں بار بار کہا گیا کہ دین آسان ہے اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ آسانی چاہتا ہے۔
3. یہ کہ احکام بہت تھوڑے اور انسانی وسعت کے مطابق دیے گئے تاکہ وہ گراں بار نہ ہو جائیں۔ بلکہ لوگ اپنی زندگی کی مصروفیات میں مشغول رہتے ہوئے بآسانی دین پر عمل کر سکیں۔

3.3 عہد صحابہ

صحابہ کا دور وفاتِ نبوی ﷺ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور ہجری صدی کے اختتام تک جاری رہتا ہے۔ اس دور میں صاحب شریعت ﷺ کی معصوم ذات موجود نہیں رہی تھی اور آسمان سے نزولِ وحی کا رشتہ منقطع ہو گیا تھا۔ اس دور کے افراد دین اور اس کے احکام کے مزاج آشنا اور صاحب شریعت ﷺ کے تربیت یافتہ تھے۔

اس دور کے دو حصے ہیں:

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

1. <u>خلافت راشدہ کا دور:</u> پہلے حصے میں بڑے بڑے صحابہ موجود تھے۔ خود خلفائے راشدین دنیاوی امور کے ساتھ دینی مسائل میں بھی امتیازی مقام رکھتے تھے۔ پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا طریقہ یہ تھا کہ جن مسائل میں قران کی آیت موجود ہوتی وہاں قرآن سے فیصلہ کرتے، اگر قرآن میں حکم نہیں ملتا اور سنت رسول ﷺ مل جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اور سنت بھی نہیں ملتی تو صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کرتے اور ان کے اتفاق سے فیصلہ فرماتے۔ اسی طریقہ پر حضرت عمر فاروق اور بقیہ خلفائے راشدین بھی چلتے رہے۔ صحابہ کا طریقہ یہ بھی تھا کہ جب نئے مسائل کے اندر قرآن کا حکم یا سنت رسول ﷺ نہیں ملتی تو وہ شریعت کی روح اور مقصود کو سامنے رکھ کر اجتہاد ورائے سے فیصلہ کرتے اور شریعت کے مشابہ مسائل پر قیاس کرتے۔

اس دور میں کچھ صحابہ فقہی مسائل میں زیادہ مشہور ہوئے جو نئے مسائل میں اجتہاد سے فیصلے کرتے تھے، ان میں، حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ زیادہ نمایاں تھے۔ دوسری جانب بعض صحابہ قرآن اور سنت کے ظاہری الفاظ کی پابندی کرتے تھے اور رائے کے استعمال سے گریز کرتے تھے، ان میں زیادہ نمایاں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ ہے۔ اس دور میں بعض مسائل کے اندر صحابہ کے درمیان رائے کا اختلاف بھی ہوا۔ یہ اختلاف کبھی اس لیے ہوا کہ قرآن کے ایک لفظ میں دو معنی کا حتمال تھا، جیسے قرآن کریم کی آیت میں طلاق کی عدت "ثلاثة قُروء" بتایا گیا ہے۔ عربی لفظ "قُرء" دو متضاد معنی میں استعمال ہوتا ہے: (1) حیض کے لیے اور (2) طہر کے لیے، یعنی حیض کے بعد پاکی کے دن۔ یہاں دونوں معنی کا احتمال ہے، چنانچہ بعض فقہاء نے طلاق کی عدت تین حیض قرار دی، جب کہ کچھ دوسرے فقہاء نے اس لفظ کی بنیاد پر طلاق کی عدت تین طہر بتائی۔

کبھی سنت کی سند کو دیکھتے ہوئے اس کے ردو قبول اور اس کے مفہوم کی تعیین میں اختلاف ہوا، جیسے وہ مشہور واقعہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ وہ بنو قریظہ کے محلہ میں پہنچ کر ہی عصر کی نماز پڑھیں۔ صحابہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں ہی نماز عصر کا وقت ختم ہونے لگا تو چند صحابہ نے کہا کہ حکم نبوی کا مقصود یہ ہے کہ ہم جلدی وہاں پہنچیں۔ اب نماز کا وقت نکلا جاتا ہے تو ٹھہر کر عصر پڑھ لیں، پھر سفر جاری رکھیں۔ کچھ دوسرے صحابہ نے کہا کہ نہیں ہم فرمان نبوی ﷺ کے مطابق عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچ کر ہی پڑھیں گے۔ ان کا اختلاف رائے برقرار رہا۔ چند صحابہ نے راستہ میں نماز پڑھی، اور بقیہ نے بنو قریظہ پہنچنے کے بعد، عصر کی نماز قضاء کر کے پڑھی۔ بعد میں جب دونوں گروہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ماجرا سنایا تو آپ ﷺ نے دونوں سے کہا کہ تم نے صحیح کیا ہے۔ اور کبھی غیر منصوص مسائل میں اپنی رائے سے حکم متعین کرنے میں اختلاف ہوا۔ یہ اجتہادی نوعیت کا اختلاف تھا جس کی بے شمار مثالیں ہم مختلف فقہی مسالک میں دیکھتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ سارے اختلافات صرف جزوی مسائل سے متعلق تھے۔

2. <u>خلافت راشدہ کے بعد سے پہلی صدی ہجری کے ختم تک:</u> دور صحابہ کا دوسرا حصہ جو خلافت راشدہ کے بعد شروع ہوتا ہے وہ اصاغرِ صحابہ اور اکابر تابعین کا زمانہ ہے۔ اس میں بڑے صحابہ یا تو بہت کم رہ گئے تھے یا اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں پھیل کر دین وعلم کی خدمت میں مصروف تھے۔ ان شہروں میں تابعین نے اپنے اساتذہ صحابہ سے علم وفقہ سیکھا اور اپنے اساتذہ ہی کے

نہج پر نئے مسائل میں اجتہادات کیے۔ آپ نے پیچھے پڑھا ہے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں بڑے (عربی میں اکابر) صحابہ کے درمیان دو رجحانات ظاہر ہوئے تھے۔ ایک رجحان والے رائے اور غور و خوض سے کام لیتے تھے، اور دوسرے رجحان والے رائے کا استعمال نہ کرکے نصوص کے ظاہری الفاظ کی پابندی کرتے تھے۔ جیسا کہ بنو قریظہ پہنچ کر نماز پڑھنے والی مثال میں آپ نے دیکھا کہ راستہ میں عصر کی نماز پڑھنے والوں نے حکم نبوی ﷺ پر غور و خوض کیا اور اس کے مفہوم و مقصود پر عمل کیا' جب کہ بعد میں عصر کی نماز قضا پڑھنے والوں نے حکم نبوی یعنی نصوص کے ظاہری الفاظ کی پابندی کی۔ صحابہ کے آخری دور کے اس زمانے میں یہ دونوں رجحان کافی نمایاں ہوگئے۔ اس دور میں ایک بات یہ بھی پیش آئی کہ اسلامی سلطنت کے دائرے میں وسعت کی وجہ سے بہت تیزی کے ساتھ بے شمار نئے مسائل پیش آئے۔ نئی نئی قومیں اور نئے نئے علاقے اسلام کے زیر سایہ آئے۔ وہاں کی تہذیب و تمدن علاحدہ تھی۔ ان کے رہن سہن اور بہت سی چیزوں میں فرق تھا، تو مسلمانوں کے سامنے بہت سارے نئے سوالات بھی امنڈ کر آئے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کے جزوی وواضح جوابات قرآن یا حدیث کے اندر اگرچہ موجود نہ تھے، مگر قرآن اور حدیث نے اصولی ہدایات ضرور دے رکھی تھیں اور ان کی روشنی میں ہر قسم کے نئے مسائل حل کئے جاسکتے تھے' چنانچہ ان کے حل کے لیے تابعین کی جماعت نے انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں سے غور و خوض اور اجتہاد کیا۔ انہوں نے قرآن و سنت کی اصولی ہدایات سے استفادہ کیا اور شریعت کے اصول اور مقاصد کو سامنے رکھ کر اجتہادات کیے اور تمام نئے مسائل کے سلسلہ میں شرعی جوابات فراہم کیے۔

اس تفصیل کو پڑھ کر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ صحابہ کے دور میں فقہ اسلامی کے اندر کافی وسعت اور پختگی آئی، نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے انہوں نے عملی طریقے اور مناہج طے کئے اور بڑے پیمانے پر اس کام کو انجام دیا۔ اس دور میں فقہ اسلامی کی خصوصیات کچھ اس طرح تھیں:

1. اس دور میں فقہی مسائل کے استنباط اور اجتہاد کے لیے ابتدائی دو مآخذ یعنی قرآن اور سنت کے ساتھ دوسرے کئی مآخذ کا اضافہ ہوا۔ صحابہ کے باہمی مشورے اور اتفاق سے جو مسائل طے ہوئے، وہ طریقہ "اجماع" کہلایا اور ایک ماخذ (مصدر) بنا۔ پھر انہوں نے اگر نئے مسائل کو قرآن و سنت کے کسی مسئلے کے مشابہ دیکھا تو یکساں حکم نئے مسئلہ میں بھی جاری کیا، یہ طریقہ "قیاس" کہلایا اور چوتھا ماخذ بنا۔ اسی طرح نئے مسائل کے حل کے لیے شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھ کر استدلال اور اجتہاد کیا گیا جس میں رائے کا استعمال ہوا، جو استدلال کے فرق کے لحاظ سے "استحسان"، "استصلاح" اور دوسرے ناموں سے مشہور ہوا۔ اور استدلال کے یہ طریقے ثانوی مآخذ بنے۔ ان ثانوی مآخذ کا تعارف آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں۔

2. دور صحابہ میں اجتہادی مسائل کے اندر رایوں کا اختلاف ہوا۔ یہ اختلاف صرف فروعی قسم کے مسائل سے متعلق تھا۔ اختلافی مسائل میں صحابہ کے درمیان تمام رائیں قابل احترام سمجھی گئیں، کیونکہ ہر رائے کے پیچھے شرعی دلیل موجود تھی، اور وسعت وآسانی کے لیے اختلاف کی گنجائش باقی رکھی گئی تھی۔

3. استدلال کے دونوں رجحان اس دور میں نمایاں ہوئے۔ رائے کا استعمال کرنے والے فقہاء "اہل الرائے" کہلائے اور دوسرے علماء "اہل الحدیث" کے نام سے معروف ہوئے۔ لیکن سبھی علماء وفقہاء کے سامنے قرآن اور حدیث ہی بنیادی ماخذ رہے اور ان کے بغیر کسی حکم کا استنباط نہیں کیا گیا۔ صرف ان کے غالب رجحان کی وجہ سے وہ حدیث یا رائے کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

4. اس دور میں فقہ اور حدیث کے فن باہم ممتاز ہوئے۔ فقہ و فتاویٰ میں مشغول رہنے والے اصحاب "فقہاء" کہلاتے تھے۔ دوسری جانب محدثین تھے جو حدیث کی روایت اور اس کی استنادی حیثیت کی تعیین میں مصروف رہے۔

5. اس دور میں فقہ اسلامی کا تعلق عملی اور واقعاتی مسائل کے ساتھ رہا، یعنی جو مسائل پیش آئے ان کا جواب دیا گیا۔ مفروضہ مسائل کے احکام نہیں نکالے گئے۔

3.4 عہد مجتہدین

یہ عہد دوسری صدی ہجری کے آغاز سے شروع ہوتا ہے اور تقریباً چوتھی صدی ہجری تک جاری رہتا ہے۔ اس دور کا ابتدائی حصہ صغار تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ ہے۔ پھر ان کے تربیت یافتہ شاگردوں کا زمانہ آتا ہے۔ یہ پورا دور در اصل مجتہدین کا عہد ہے، کیونکہ اس دور میں اسلامی مملکت کا رقبہ کافی وسیع ہو گیا تھا، نئی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں، نئی تہذیب و تمدن کا سامنا تھا، اس لیے نئے مسائل بڑی کثرت کے ساتھ پیش آئے، جن کے حل کے لیے مجتہدین کو کمربستہ ہونا پڑا۔ اسلامی حکومت کو بھی اپنے روزمرہ مسائل میں اسلامی قانون اور شرعی احکام کی ضرورت پیش آرہی تھی، اس لیے فقہی قانون سازی اور فقہی استنباط و اجتہاد کا کام بڑے زور وشور کے ساتھ اور بڑے پیمانے پر اس دور میں انجام پایا۔

اس دور کے فقہاء و مجتہدین اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں تھے، ہر ایک کا اپنا حلقہ تھا اور وہاں ان کے شاگرد تھے۔ استنباط اور اجتہاد کے لیے انہوں نے اپنے مناہج اور اصول طے کیے جو انہوں نے اپنے اپنے اساتذہ اور شیوخ سے سیکھے تھے۔ مناہج کے فرق کی وجہ سے فقہی احکام میں بھی فرق واختلاف ہوا۔ یہ مجتہدین چونکہ اپنے نہج اور طریقہ کار کے خود بانی تھے، اس لیے ان کا اجتہاد "مطلق" کہلایا اور وہ مجتہد مطلق قرار پائے۔ انہوں نے بے شمار مسائل میں اجتہادات کئے۔ پھر ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے اساتذہ کے نہج کے مطابق مزید مسائل واحکام مستنبط کیے۔ اور اس طرح مختلف شہروں میں مختلف مناہج کے مطابق فقہ اسلامی کی عظیم الشان عمارتیں، مستحکم بنیادوں پر تیار ہوئیں۔ اور یہی فقہی اجتہادات اپنے مجتہدین کی جانب منسوب ہو کر فقہی مسالک کے نام سے مشہور ہوتے گئے۔

ان فقہی مسالک میں درج ذیل اصحاب مسالک زیادہ معروف تھے۔ کوفہ میں امام ابو حنیفہ (80-150ھ) جن کی نسبت سے حنفی مسلک ہے۔ مدینہ منورہ میں امام مالک (93-179ھ) جن سے مالکی مسلک منسوب ہے۔ بغداد اور مصر میں امام شافعی (150-204ھ) جن کی طرف شافعی مسلک کی نسبت ہے۔ بغداد میں امام احمد بن حنبل (164-247ھ) جن سے حنبلی مسلک متعلق ہے۔ اسی طرح شام میں امام اوزاعی (88-157ھ)، عراق میں امام سفیان ثوری (97-161ھ)، بغداد میں امام ابو جعفر طبری (224-310ھ)، مصر میں امام لیث بن سعد، کوفہ میں امام عبدالرحمٰن ابن ابی لیلی (74-148ھ)، اور امام شریک (95-177ھ) کے ناموں کی طرف منسوب ہو کر ان کے مسالک معروف ہوئے۔ امام زید بن علیؒ کی نسبت سے فقہ زیدی اور امام جعفر صادقؒ کی نسبت سے فقہ جعفریہ نے شہرت پائی۔ اور ظاہریہ مسلک امام داؤد بن علی (202-270ھ) کی طرف منسوب ہوا۔ لیکن ان تمام فقہی مسالک کو ایسے علماء میسر نہیں ہوسکے جو ان کی فقہی آراء اور منہج وغیرہ کو محفوظ رکھ سکتے، اس لیے آہستہ آہستہ کئی فقہی مسالک ختم ہوگئے اور سارے فقہی مسالک باقی نہ رہ سکے۔ البتہ جو مسالک باقی رہے ان میں اہل سنت میں اوپر مذکور ابتدائی چار مسالک اور اہل تشیع میں فقہ زیدیہ اور فقہ جعفریہ مشہور ہیں۔

اس دور کی فقہی خصوصیات درج ذیل ہیں:

1. اجتہاد کے مختلف مناہج کی وجہ سے اور دوسرے علمی اسباب کے تحت متعدد فقہی مسالک تیار ہوئے لیکن جن مسالک کو قبولیت حاصل ہوئی اور ان میں بڑے بڑے اہل علم پیدا ہوتے رہے وہ مسالک باقی رہے، بقیہ مسالک کچھ دنوں رہ کر ختم ہوگئے۔

2. اس دور سے پہلے تک شخصی "تقلید" یعنی ایک مخصوص عالم سے یا ایک مخصوص مسلک کے عالم سے مسئلہ پوچھنے کا رجحان عام نہیں تھا۔ لوگ جس عالم سے چاہتے مسئلہ پوچھ کر عمل کر لیتے تھے۔ یہاں تقلید شخصی عام ہوگئی۔ ہر مسلک کے ساتھ اس مسلک کے مقلدین وابستہ ہوگئے۔ علماء اس مسلک کے مناہج کے دائرے میں استنباط کرتے اور عوام اپنے مسلک کے علماء سے مسائل دریافت کرتے۔

3. مجتہدین کا یہ دور علم و فضل کا زمانہ تھا۔ مسلکوں کا اختلاف صرف علمی دلائل پر مبنی تھا۔ اس میں تعصب اور شدت نہیں پائی جاتی تھی۔ اسی لیے مختلف فقہی رجحانات رکھنے کے باوجود مجتہدین اور دوسرے علماء ایک دوسرے سے استفادہ کرتے، دوسرے کی فقہی آراء کا احترام کرتے، اپنی اجتہادی رائے میں غلطی اور دوسرے کی رائے کی صحت کا امکان تسلیم کرتے اور بلا تکلف دوسرے مسلک کی رائے پر عمل کر لیتے تھے۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ امام شافعی نے بغداد میں امام ابو حنیفہ کی مسجد میں نماز پڑھی تو اپنے مسلک کے برخلاف فجر کی نماز میں دعائے قنوت نہیں پڑھی اور فرمایا کہ ہم کبھی اہل عراق کے مسلک پر عمل کر لیتے ہیں۔ اس طرح ایک مسئلہ میں حنفی مسلک کے امام ابو یوسف نے کہا کہ ہم اہل مدینہ کے مالکی مسلک پر عمل کر لیتے ہیں۔ فقہی مسائل میں ایسی رواداری اور احترام اس زمانے میں عام تھی۔

4. اس دور میں فقہی اجتہاد جب عام ہوا تو اس کے نتیجہ میں نئے نئے فقہی علوم کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ اجتہاد کے اصولوں اور مناہج کی وضاحت کے لیے "اصول فقہ" کے نام سے ایک مستقل فن تیار ہوا۔ فقہی احکام کے درجات اور مراتب کو ظاہر کرنے کے لیے اصطلاحات بنائی گئیں جیسے فرض، واجب، سنت، حرام اور مکروہ وغیرہ۔ یکساں نوعیت کے جزوی احکام کو ایک قاعدہ میں سموتے ہوئے "فقہی قواعد" بنائے گئے۔

5. اس دور میں فقہی مسائل کی تدوین انجام دی گئی۔ چنانچہ مختلف فقہی مسالک کے علماء نے فقہی تصنیفات تیار کیں۔ مثلاً امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی نے فقہ حنفی کے مسائل پر مشتمل کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جیسے: مبسوط، جامع صغیر، جامع کبیر، سیر صغیر، سیر کبیر، زیادات وغیرہ۔ امام شافعی نے کتاب "الام" تصنیف کی۔ امام مالک نے حدیث وفقہ کا مجموعہ "موطا" تالیف فرمائی۔ امام زید بن بن علی کی طرف "کتاب المجموع" منسوب ہے۔

6. اس دور میں امکانی مسائل فرض کرکے ان کے احکام طے کیے گئے تاکہ آئندہ اگر یہ مسائل پیش آئیں تو ان کا حکم پہلے سے معلوم رہے۔ یہ انداز "فقہ تقدیری" کہلایا۔ بعض فقہی مسالک میں فقہ تقدیری پر خاص توجہ دی گئی، جب کہ بعض فقہا و مجتہدین نے اس رجحان کو پسند نہیں کیا۔

3.5 مابعد عہد مجتہدین سے سقوط بغداد تک

چوتھی صدی ہجری کے بعد سے یہ مرحلہ اس وقت مکمل ہوتا ہے جب (651ھ / 1258ء) میں مسلمانوں کی عظیم ترین عباسی سلطنت کے پایہ تخت بغداد کو تاتاریوں کے حملے میں تباہ وبرباد کر دیا گیا۔ اس مرحلہ میں بنیادی طور پر مختلف فقہی مسالک کی مختلف انداز سے عظیم خدمات انجام دی گئیں، یہ کام کئی نوعیت کے تھے، ان میں ایک کام یہ تھا کہ مجتہدین نے پچھلے دور میں جو لاکھوں مسائل اور احکام مستنبط کیے تھے، اب انھیں بہترین ترتیب کے ساتھ اور متنوع اسالیب میں مرتب کیا گیا اور مختلف انداز سے کتابیں ترتیب دی گئیں۔ اس طرح فقہی تصنیفات کا عظیم ذخیرہ تیار کیا گیا۔ دوسرا کام فقہاء نے سابق ائمہ مجتہدین کی آراسے ان کی علتوں اور وجوہات کی تلاش اور ان کی تعیین کا انتہائی اہم کام انجام دیا۔ اسی طرح ایک کام یہ ہوا کہ جہاں ایک مسئلہ میں سابق فقہاء کی کئی رائیں تھیں اور یہ معلوم نہیں تھا کہ کس رائے کا کیا درجہ ہے، ان میں راجح رائے کو متعین کیا گیا۔

اس زمانے میں نئے مسائل میں اجتہاد سابق دور کی طرح باقی نہ رہا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو اب پہلے کی طرح نئے مسائل کی کثرت نہیں رہ گئی تھی اور دوسری طرف سابق دور میں جو مفروضہ مسائل کے احکام طے کیے گئے تھے ان سے بھی بعض نئے مسائل میں جواب مل جاتا تھا۔ اس لیے اجتہاد کی ہمہ ہمی اس دور میں نظر نہیں آتی ہے لیکن اس کے باوجود جہاں ضرورت پیش آئی ان میں مسلک کے دائرہ میں اجتہاد کیا گیا جو "اجتہاد فی المذہب" کہلایا۔ اس دور میں مختلف فقہی مسالک کے ماننے والوں کے درمیان مناظرے اور مباحثے بھی

پیش آئے۔

3.6 کلیدی الفاظ

صحابۃ	یہ "صحابی" کا جمع ہے، یعنی وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریاب ہوا ہو اور مسلمان کی حیثیت میں وفات پائی ہو۔ فقہ میں ان کے طبقات: اکابر صحابہ اور اصاغر صحابہ
تشکیل	بنانا
رجحانات	خیالات، سوچنے کا انداز
توثیق	تائید
مرجع	جس کی طرف رجوع کیا جائے
تفقہ	سمجھ حاصل کرنا
تدریج	آہستہ آہستہ
منقطع	ختم ہونا
ردو قبول	نہ ماننا اور ماننا
غیر منصوص	جس مسئلے کے بارے میں کوئی نص / شرعی حکم نہ ہو
نہج	طریقہ، اصول
مناہج	(منہج کی جمع) یعنی طریقے، اصول
مفروضہ	فرض کر لئے گئے، غیر حقیقی
صغار	(صغیر کی جمع) یعنی چھوٹے
تابعین	وہ لوگ جنھوں نے صحابہ کو دیکھا۔ ان کے تین طبقات درج ذیل ہیں: 1۔ اکابر تابعین، عموماً اکابر صحابہ سے روایت کرنے والے 2۔ متوسطین تابعین، صحابہ اور تابعین دونوں سے روایت کرنے والے 3۔ اصاغر تابعین، اصاغر صحابہ سے روایت کرنے والے
تبع تابعین	وہ لوگ جنھوں نے تابعین کو دیکھا
تقلید شخصی	ایک مکتبِ فکر کے منہج استنباط کا پابند رہنا
فقہ تقدیری	مفروضہ مسائل کے احکام

3.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- فقہ اسلامی کی ابتدا آغاز وحی کے ساتھ ہی ہوجاتی ہے۔
- رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کا زمانہ فقہ اسلامی کا بنیادی دور ہے۔ اس میں فقہ اسلامی کا پہلا ماخذ یعنی قرآن کریم کا نزول مکمل ہوا۔
- رسول اللہ ﷺ قرآن کے شارح تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے قرآن کی تشریح فرمائی جو سنت کے نام سے فقہ کا دوسرا ماخذ قرار پایا۔
- عہد نبوی میں فقہ اسلامی کے یہی دونوں (قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ) مآخذ تھے۔
- حیات نبوی ﷺ کے تیرہ سال کے مکی دور میں زیادہ تر عقائد کے احکام دیے گئے اور مدینہ کی دس سالہ زندگی میں شریعت کے تمام احکام نازل ہوئے۔
- عہد نبوی ﷺ میں فقہ کا لفظ فہم دین اور علم کے معنی میں رائج تھا، علم و فقہ میں ممتاز صحابہ قراء کہلاتے تھے۔
- عہد رسالت ہی میں کچھ صحابہ فقہی مسائل میں ممتاز ہوگئے تھے اور نبی ﷺ نے انھیں فقہی اور قانونی ذمہ داری سونپی تھی۔
- رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا حصہ خلافت راشدہ کا دور ہے۔
- عہد خلافت راشدہ میں نئے مسائل کے حل کے لیے پہلے قرآن میں حکم تلاش کیا جاتا، وہاں حکم نہ ملتا تو سنت رسول ﷺ دیکھی جاتی اور وہاں بھی حکم نہیں ملتا تو صحابہ کو جمع کرکے مشورہ کیا جاتا اور ان کے اتفاق سے فیصلہ ہوتا۔ یہ طریقہ اجماع کہلایا جو فقہ کا تیسرا ماخذ بنا۔
- صحابہ نے نئے مسائل میں شریعت کے مشابہ مسائل کا حکم جاری کیا جو قیاس کے نام سے فقہ کا چوتھا ماخذ قرار پایا۔
- عہد صحابہ میں دو قسم کے رجحانات ظاہر ہوئے، ایک رجحان نئے مسائل میں شریعت کی روح اور مقاصد کو سامنے رکھ کر عقل و رائے کا استعمال کرتے ہوئے اجتہاد کرتا تھا۔ دوسرے رجحان میں نصوص کے ظاہری الفاظ کی پابندی کی جاتی تھی۔
- نئے مسائل میں اجتہاد کرتے وقت مختلف علمی اسباب کے تحت صحابہ کی رایوں میں اختلاف بھی ہوتا تھا جس کا تعلق عموماً فروعی مسائل سے ہوتا۔
- خلافت راشدہ کے بعد سے پہلی صدی ہجری کے اختتام تک عہد صحابہ کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں صحابہ کے ساتھ زیادہ تر کبار تابعین تھے جو اپنے اساتذہ (صحابہ) کے مناہج کے مطابق اجتہاد کے عمل میں مصروف تھے۔
- عہد صحابہ کے دوسرے حصہ میں فقہ کے دونوں رجحانات زیادہ نمایاں ہوگئے تھے۔ پہلے رجحان والے اہل الرائے کہلائے اور دوسرے رجحان والے اہل الحدیث کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اسی طرح فقہ اور حدیث باہم ممتاز ہوگئے تھے۔ فقہ و فتاوی کے عمل میں مصروف علماء "فقہاء" کہے جانے لگے، اور روایت حدیث میں مصروف علماء "محدثین" کہلائے۔

- دوسری صدی کے آغاز سے چوتھی صدی تک مجتہدین کا زمانہ ہے۔ یہ دور فقہی اجتہاد کے عروج کا زمانہ ہے جس میں مستحکم بنیادوں پر فقہی احکام و قوانین کا استنباط کیا گیا اور باضابطہ فقہی مسالک کی تشکیل و تدوین ہوئی۔
- تیسرے دور میں اصول فقہ کا فن وجود میں آیا اور فقہی اصطلاحات متعین کی گئیں اور فقہی احکام و مسائل پر کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اس دور میں ہی مسائل فرض کر کے ان کے احکام مستنبط کئے گئے جو فقہ تقدیری کہلایا۔ شخصی اور مسلکی تقلید کا رواج بھی اس دور میں عام ہونے لگا۔ اس دور میں متعدد مجتہدین کے فقہی مسالک وجود میں آئے لیکن مختلف اسباب کے تحت چند مسالک ہی باقی رہے۔
- مجتہدین کے بعد کا طویل دور کئی مرحلوں پر مشتمل ہے، پہلے مرحلہ میں سقوط بغداد تک فقہی مسائل کی تدوین اور تصنیف کا زبردست کام انجام پایا۔ نیز مجتہدین کے اقوال و آراء میں ترجیحات اور ان کی وجوہات متعین کی گئیں۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. فقہ اسلامی کی ابتدا.............کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

(a). میلاد نبی ﷺ (b). نزول وحی (c). ہجرت مدینہ (d). خلافت راشدہ

2. رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کا فقہی دور کتنے مرحلوں پر مشتمل ہے؟

(a). دو (b). تین (c). پانچ (d). ایک

3. فقہ اسلامی کا بنیادی دور ہے:

(a). عہد صحابہ (b). عہد اکابر تابعین (c). عہد نبوی ﷺ (d). عہد خلافت راشدہ

4. دور صحابہ کا دوسرا حصہ کس کے بعد شروع ہوتا ہے؟

(a). شہادت امام حسینؓ (b). شہادت حضرت عثمانؓ (c). شہادت امام علیؓ (d). وفات نبی ﷺ

5. مفروضہ مسائل کے احکام کا نکالنا کس دور کی خصوصیت ہے؟

(a). دور اول (b). دور صحابہ (c). دور مجتہدین (d). دور کبار الصحابہ

6. فقہی مسائل کی تدوین کس دور کی خصوصیت ہے؟

(a). دور اول (b). دور صحابہ (c). دور مجتہدین (d). دور خلافت راشدہ

7. "شخصی تقلید" کس عہد کی خصوصیت میں سے ہے؟

(a). عہد نبوی ﷺ (b). عہد صحابہ (c). عہد مجتہدین (d). عہد خلافت راشدہ

8. امام اوزاعی کا مسلک کہاں مشہور تھا؟

(a). بلاد شام (b). بغداد (c). کوفہ (d). مدینہ منورہ

9. کتاب "الزیادات" کس کی تصنیف ہے؟

(a). محمد بن حسن شیبانی (b). امام شافعی (c). امام ابو حنیفہ (d). امام طبری

10. "کتاب المجموع" کس کی طرف منسوب ہے؟

(a). امام سفیان ثوری (b). امام شافعی (c). امام جعفر صادقؒ (d). امام زید بن علیؒ

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. عہد نبوی ﷺ میں فقہ کے مآخذ کیا تھے؟ بیان کیجیے۔
2. دور خلافت راشدہ میں فقہ کی کیا صورت حال تھی؟ بیان کیجیے۔
3. مجتہدین کے عہد کی فقہی خصوصیات کا تذکرہ کیجیے۔
4. مابعد عہد مجتہدین سے سقوط بغداد تک میں فقہ کا کیا حال تھا؟ بیان کیجیے۔
5. دور مجتہدین کے معروف فقہی مسالک پر روشنی ڈالیے۔

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. "عہد نبوی دراصل فقہ اسلامی کا بنیادی دور ہے"۔ اس عبارت کی وضاحت کیجیے۔
2. عہد صحابہ کی فقہی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
3. عہد مجتہدین میں فقہ کی ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. فقہ اسلامی تعارف اور تاریخ : پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
2. فلسفہ شریعت اسلامی : صبحی محمصانی
3. فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر : مولانا تقی امینی
4. تاریخ فقہ اسلامی : اردو ترجمہ ۔ مولانا عبد السلام ندوی
5. فقہ اسلامی، اصول، خدمات اور تقاضے : مرتبہ، مولانا محمد رضوان القاسمی۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 4: فقہی تاریخ کے ادوار (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 فقہی تاریخ کا دوسرا حصہ مابعد سقوط بغداد 656ھ /1258ء سے عصر حاضر تک

4.3 پہلا دور: سقوط بغداد کے بعد کا دور 656ھ سے 1286ھ تک

4.3.1 خصوصیات

4.3.2 مختصرات کی تدریس

4.3.3 شروح وحواشی کی تصنیف

4.4 اہم فقہی تصانیف

4.4.1 فتاوی عالم گیری

4.4.2 حاشیہ ابن عابدین

4.5 دوسرا دور مجلہ احکام عدلیہ کا دور 1287ھ سے 1358ھ تک

4.5.1 خصوصیات

4.5.2 مجلہ احکام عدلیہ کی تدوین

4.5.3 مجلہ کے احکام کی منسوخی

4.5.4 فقہی قانون سازی میں وسعت

4.5.5 قانون سازی میں تمام فقہی مسالک سے استفادہ

4.5.6 تصنیفات:

4.5.7 مجلۃ الاحکام العدلیۃ

4.6 تیسرا دور: عہد جدید 1358ھ تا زمانہ حال

4.6.1 خصوصیات
4.6.2 اجتماعی اجتہاد کا ظہور اور فقہی اکیڈمیوں کا قیام
4.6.3 علم فقہ کی تدریس کے طریقہ میں تبدیلی
4.6.4 دوسرے مذاہب سے استفادہ اور فقہ مقارن کا موضوع
4.6.5 جدید قوانین کے ساتھ تقابلی مطالعہ کا رجحان
4.6.6 فقہی تالیفات کا نیا رنگ
4.6.7 فقہ کی جدید نصابی کتابیں
4.6.8 فقہی موسوعات
4.6.9 فقہی قانون سازی کی کتابیں
4.7 کلیدی الفاظ
4.8 اکتسابی نتائج
4.9 نمونہ امتحانی سوالات
4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
4.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

اسلامی تاریخ میں فقہ کا مختلف انداز سے تعارف کرایا گیا ہے، کہیں پر اس کو 'تاریخ التشریع الاسلامی' یعنی 'اسلامی قانون سازی کی تاریخ' کا نام دیا گیا ہے، کہیں پر اس کو 'فقہ اسلامی کے ارتقاء کے مراحل' کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ اکائی میں پہلے دور کے ارتقائی مراحل کو بیان کیا گیا تھا۔ اس اکائی میں فقہ اسلامی کے ارتقاء کے دوسرے دور پر روشنی ڈالی جائے گی۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ فقہ اسلامی کے ارتقا کے مراحل سے واقفیت حاصل کرسکیں اور فقہ اسلامی کو درپیش حالات ومسائل کا تجزیہ کرسکیں۔ طلبہ اس بات سے بھی آگاہ ہوسکیں کہ فقہ کے ماہرین نے اس کی خصوصیات تدریس وتصنیف اور تالیف کے میدان میں کیا خدمات انجام دی ہیں۔

4.2 فقہی تاریخ کا دوسرا حصہ مابعد سقوط بغداد 656ھ / 1258ء سے عصر حاضر تک

فقہ اسلامی کی تاریخ بیان کرنے والوں نے علم فقہ کے ارتقائی مراحل کو دو بڑے حصوں میں بانٹا ہے۔ پہلا حصہ زمانہ نبوت سے شروع ہوکر سقوط بغداد تک کو محیط ہے۔ دوسرا حصہ سقوط بغداد سے موجودہ دور تک کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلا حصہ تقریبا ساڑھے چھ سو سال پر محیط ہے، جس کو بنیادی طور پر چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ عہد نبوی 2۔ عہد صحابہ 3۔ عہد مجتہدین 4۔ مابعد مجتہدین سے سقوط بغداد تک کا دور

ان ادوار کے بارے میں ہم گذشتہ اکائی میں پڑھ چکے ہیں۔

دوسرا حصہ یعنی سقوط بغداد سے زمانہ حال تک کا زمانہ تقریبا آٹھ صدیوں کا طویل عرصہ ہے، جس کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا دور سقوط بغداد یعنی 656ھ / 1258ء سے تیرہویں صدی ہجری کے اواخر یعنی 1286ھ تک کا ہے۔

دوسرا دور تیرہویں صدی ہجری کے اخیر یعنی 1286ھ سے دوسری عالمی جنگ کے بعد یعنی 1358ھ تک کا ہے۔

تیسرا دور دوسری عالمی جنگ کے بعد سے زمانہ حال تک جاری ہے۔

4.3 پہلا دور: سقوط بغداد کے بعد کا دور 656ھ سے 1286ھ تک

یہ مرحلہ سقوط بغداد سے شروع ہوکر تیرہویں صدی ہجری کے اواخر یعنی 1286ھ تک پہونچتا ہے۔ سقوط بغداد کا واقعہ 656ھ / 1258ء میں پیش آیا۔ یہ واقعہ اسلامی تاریخ کے سب سے دلخراش حادثات میں سے ایک ہے۔ تاتاریوں نے عالم اسلام کے بڑے حصہ پر اپنا قبضہ قائم کرلیا تھا۔ ہلاکو خان نے دار الخلافہ بغداد پر حملہ کرکے اس کو تاراج کردیا۔ بغداد علم وفن کا بھی اہم مرکز تھا، جہاں علمی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ اس حملہ کی وجہ سے کتب خانے برباد ہوگئے، مدارس مٹ گئے۔ سیاسی زوال کا بہت بڑا اثر علمی ترقی پر پڑا۔ اس دور میں دوسرے علوم کے ساتھ فقہ کی تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ہر شعبہ میں زوال آیا۔

آپ جانتے ہیں کہ ابتدائی ادوار میں علم فقہ کی ترقی کا اہم سبب یہ تھا کہ علماء وفقہاء نصوص شریعت میں غور وتدبر کرتے تھے، جب کہ اس دور میں کمال یہ سمجھا جانے لگا کہ ہر مسلک والے اپنے مسلک کی کتابوں کو سمجھ لیں، اور جزئی مسائل کو یاد کرلیں۔ نصوص میں غور

کر کے احکام کے اسباب اور علتوں تک پہونچنے کا کام ختم ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں اجتہادی طرز کی کاوشیں بند ہو گئیں۔ اب مسائل کے حل میں اپنے فقہی مسلک کی کتابوں کو ہی سامنے رکھا جانے لگا۔ ابتدائی ادوار اور اس دور میں ایک نمایاں فرق یہ سامنے آیا کہ پہلے فقہ کے طالب علم قرآن و سنت، اصول اور مقاصد شریعت، احکامات کے دلائل کا علم حاصل کرتے تھے۔ جب کہ اس دور میں طالب علموں نے صرف ایک مسلک کی کتابیں پڑھنے تک اپنے آپ کو محدود کر لیا۔

4.3.1 خصوصیات

اس دور میں علم فقہ کی تعلیم و تدریس کا طریقہ بھی بدل گیا، اور اس کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے منہج میں بھی تبدیلی آئی۔ اس دور کی فقہی خصوصیات کو درج نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

4.3.2 مختصرات کی تدریس

اس کا مطلب یہ ہے کہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ایک مخصوص طرز عام ہوا، جس کو مختصرات کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ تدریس میں متقدمین کی کتابوں کو پڑھانے کے بجائے ایسی مختصر کتابوں کو پڑھایا جانے لگا، جو متاخر علماء نے تیار کی تھیں۔ اس مختصر کتابوں کو 'متون' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جن میں کم سے کم الفاظ استعمال کئے جاتے تھے، جس کی وجہ سے یہ نا قابل فہم ہو جاتی تھیں، پھر ان کے حل اور تشریح پر سارا زور صرف کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار کی وجہ سے اصل فن اور مضمون کو سمجھنے کے بجائے عبارت حل کرنا ہی اصل کمال سمجھا جانے لگا۔ اور فن کی ترقی رک گئی۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ متون کی تیاری کا طریقہ جب شروع ہوا تھا، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک فن کے اہم مسائل کو آسان الفاظ میں بیان کر دیا جائے، تاکہ مبتدی طلباء کے لئے پڑھنا اور سمجھنا آسان ہو۔ لیکن جس دور کی ہم بات کر رہے ہیں، اس دور میں فقہی متون مشکل الفاظ کے مجموعہ کا نام ہو گیا۔ جس میں تحقیقی شان نہیں پائی جاتی تھی۔

4.3.3 شروح و حواشی کی تصنیف

اس دور میں تصنیف و تالیف کے میدان میں ایک نمایاں فرق یہ دیکھنے میں آیا کہ مصنفین اب اعلیٰ تحقیقی کتابیں تیار کرنے کے بجائے گذشتہ کتابوں پر کام کرنے لگے۔ فقہی کتابوں کو مختصر الفاظ میں لکھا جانے لگا۔ پھر ان کو حل کرنے کے لئے نئے سرے سے کتابیں لکھی جانے لگیں۔ جن کو شروح اور حواشی کا نام دیا گیا۔ شروح اور حواشی کے اقوال کو واضح کرنے کے لئے ان پر تعلیقات لکھی جاتیں، جو خود حواشی کا دوسرا نام تھا۔ ان تشریحات اور حواشی میں لفظی بحثیں زیادہ ہوتی تھیں، فن کے بنیادی مقاصد پر توجہ کم دی جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی بات اصل موضوع سے بہت دور نکل جاتی تھی۔ اس کے باوجود اس دور میں 'حواشی' کے نام سے بعض ایسی کتابیں منظر عام پر آئیں، جنھوں نے بعد والوں کے لئے فقہی مرجع کی حیثیت اختیار کر لی، جن میں 'حاشیہ ابن عابدین' امتیازی حیثیت کی حامل کتاب ہے۔

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ 'فتاویٰ' کے نام سے کتابیں تصنیف کی جانے لگیں۔ عام طور سے یہ کتابیں وہ علماء تصنیف

کرتے، جو سرکاری طور پر افتاء کے منصب پر فائز ہوتے، یا ان کو عوام میں مرجعیت ہوتی۔ ان سے جو سوالات پوچھے جاتے، وہ ان کے جوابات ایک کتاب میں جمع کر دیتے۔ امام ابن تیمیہ (وفات: 728ھ/1328ء)، تقی الدین سبکی (وفات: 756ھ/1355ء)، عالم بن علاء حنفی (وفات: 786ا/1381ء) وغیرہ علماء نے اس نام سے کتابیں لکھیں۔ فتاوی کی ان کتابوں کا فائدہ یہ تھا کہ ان سے فقہی مسائل کی عملی شکلیں سامنے آتی تھیں، یہ کتابیں نئے پیش آمدہ مسائل میں شرعی رہنمائی حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھیں۔ اس دور میں تیار ہونے والی فقہ و فتاوی کی بہت سی کتابیں آج بھی علماء کا مرجع بنی ہوئی ہیں، جن سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان میں فتاوی ابن تیمیہ، فتاوی السبکیہ، فتاوی تاتار خانیہ، فتاوی بزازیہ، فتاوی خانیہ اور فتاوی عالمگیری اہم ہیں۔ ان میں فتاوی تاتار خانیہ اور فتاوی ہندیہ ہندوستان میں تیار کی گئی تھیں۔

4.4 اہم فقہی تصانیف

جیسا کہ ہم نے بتایا کہ اس دور میں حواشی اور فتاوی کے نام سے کئی اہم کتابیں تیار ہوئی تھیں، جن میں اس زمانہ کے نئے مسائل کے بارے میں شرعی احکام بتائے گئے تھے، ان میں سے دو کتابوں کا تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے، ان کی اہمیت آج تک سارے عالم میں مسلم ہے۔

4.4.1 فتاوی عالم گیری

اس کتاب کو مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر (مدت حکومت: 1658-1707ء) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، کیوں کہ ان کے حکم پر اور ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یہ کتاب تیار ہوئی۔ عرب دنیا میں اس کتاب کو ہندوستان کی طرف نسبت کرتے ہوئے 'فتاوی ہندیہ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مغلیہ دور میں ہندوستان میں ایک مضبوط عدالتی نظام موجود تھا، اور دار الحکومت سے لے کر صوبائی اور ضلعی سطح تک قاضیوں کا تقرر ہوتا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے عدالت کے قاضیوں کے لئے ایک کتاب تیار کرنے کا منصوبہ بنایا، جس کو سامنے رکھنے سے قاضی حضرات کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ بادشاہ نے ایک کمیٹی بنائی، جس کا ذمہ دار اس وقت کے جید عالم ملا نظام الدین برہانپوری کو مقرر کیا۔ ان کے ساتھ اس کمیٹی میں تقریباً چالیس بڑے فقہاء شامل تھے، جن میں شیخ وجیہ الدین، شیخ جلال الدین، قاضی محمد حسن اور ملا حمید جون پوری بھی تھے۔ ان میں سے کئی علماء افتاء اور قضاء کی ذمہ داریاں بھی انجام دیتے تھے۔ کمیٹی کے لئے ایک بڑا کتب خانہ تیار کیا گیا۔ جہاں موضوع سے متعلق کتابیں مہیا کی گئیں۔ ان حضرات نے آٹھ سال میں فتاوی عالمگیری کے نام سے یہ کتاب تیار کی۔ پھر اورنگ زیب نے فرمان شاہی جاری کر کے اس کو پورے ملک کی عدالتوں میں مسلمانوں کے لئے نافذ کیا۔

ہندوستان میں چوں کہ حنفی مسلک زیادہ رائج ہے، اس لئے اس کتاب میں حنفی فقہ کے مطابق مسائل جمع کئے گئے ہیں۔ جن مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں سے صرف مفتی بہ قول کو لیا گیا ہے۔ کتاب میں فقہ کے تمام ابواب پر مسائل مرتب کئے گئے ہیں، جس کی ابتداء کتاب الطہارۃ سے ہوتی ہے، اور آخری موضوع کتاب الفرائض ہے۔ اس میں جو مسائل بیان کئے گئے ہیں، ان کا مصدر بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ فتاوی عالمگیری نہایت اہم اور معتبر کتاب ہے، آج تک اس کتاب سے علماء، فقہاء اور ارباب افتاء استفادہ کرتے ہیں۔

4.4.2 حاشیہ ابن عابدین

جیسا کہ ہم نے بتایا ہے کہ اس دور میں جو فقہی تصنیفات تیار ہوئیں، ان میں حواشی کے نام سے لکھی جانے والی کتابیں کثرت سے لکھی گئیں۔ ان میں سب سے اہم حاشیہ ملک شام کے حنفی مفتی اور فقیہ علامہ ابن عابدین کی تصنیف ہے، جن کا پورا نام محمد امین ابن عابدین ہے۔ علامہ ابن عابدین اپنے وقت میں بلاد شام کے سب سے بڑے فقیہ تھے، پوری اسلامی دنیا میں ان کی علمی شان مسلم تھی۔ دمشق میں 1198ھ/1784ء میں پیدا ہوئے، اور اسی شہر میں 1252ھ/1836ء میں وفات پائی۔ ان کی تیار کردہ کتاب کا نام "رد المحتار علی الدر المختار" ہے، جو "حاشیہ ابن عابدین" کے نام سے مشہور ہے۔ انہوں نے یہ حاشیہ جس کتاب پر لکھا ہے، اس کا نام رد المحتار ہے، جس کے مصنف کا نام امام حصکفی تھا۔ حاشیہ ابن عابدین سے علماء وفقہاء بکثرت استفادہ کرتے ہیں۔ فتوی نویسی میں یہ کتاب مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ نئے مسائل کے فقہی احکامات معلوم کرنے کے لئے یہ بہت اہم کتاب ہے۔

4.5 دوسرا دور مجلہ احکام عدلیہ کا دور 1287ھ سے 1358ھ تک

فقہی تاریخ کا یہ دور 1287ھ سے 1358ھ تک کو محیط ہے، جس کی مدت تقریباً ستر سال ہے۔ اس دور کی شروعات اس وقت سے ہوتی ہے، جب عثمانی خلافت نے مجلہ احکام عدلیہ کے نام سے شرعی قوانین کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا، اور اس کو اپنے قلمرو میں نافذ کیا۔ اور اس کا اختتام دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوتا ہے، جب کہ مجلہ احکام عدلیہ کو اسلامی ممالک میں منسوخ کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ نئی قانون سازی کی گئی۔

4.5.1 خصوصیات

گذشتہ دور کے مقابلہ اس دور میں اسلامی فقہ نے ترقی کی جانب قدم بڑھائے۔ یہ دور دنیا اور عالم اسلام کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی بالادستی دم توڑ رہی تھی، اور یوروپی اقوام ان کی جگہ لے رہی تھیں۔ دنیا میں انقلابات آرہے تھے۔ یہ انقلابات صرف سیاسی نہیں تھے، بلکہ علم و تحقیق اور فلسفہ وسائنس کے شعبوں میں بھی تھے، جن کا اثر دنیا میں قانون سازی کے ہر ادارہ کو محسوس ہو رہا تھا۔ فقہائے اسلام نے بھی ان اثرات کو سنجیدگی سے لیا، اور تبدیلی کے لئے تیاری شروع کی۔ اس دور کی خصوصیات کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

4.5.2 مجلہ احکام عدلیہ کی تدوین

اس دور کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں مجلہ احکام عدلیہ کی ترتیب وتدوین ہوئی۔ مجلہ سے پہلے بھی فقہ اسلامی کے کتب خانہ میں بے شمار کتابیں موجود تھیں، گذشتہ دور میں فتاوی کے نام سے متعدد کتابیں تیار ہوئی تھیں، لیکن ان میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ مسائل بکھرے ہوئے تھے، کہیں ایک مسئلہ کو مختصرا بیان کیا گیا تھا، تو دوسرے مسئلہ کو طویل انداز میں بیان کیا گیا تھا۔ اسی طرح کسی کتاب کی زبان بہت مشکل تھی، تو کسی کی زبان بہت آسان۔ کوئی ایسی کتاب نہیں تھی، جس میں قانونی انداز میں ایک ہی اسلوب میں مسائل

بیان کئے گئے ہوں۔ عثمانی حکومت نے جب اپنے قلمرو میں نئے انداز کی عدالتیں بنائیں، تو ضرورت محسوس کی کہ فقہی مسائل کو قانونی انداز میں ایک کتاب میں مرتب کیا جائے، جس میں معمول بہ اقوال بیان کئے جائیں، ضعیف اور متروک اقوال کو شامل نہ کیا جائے۔ اس کے لئے عثمانی حکومت کے وزیر انصاف کی سرکردگی میں علماء اور فقہاء کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس نے فقہی حنفی کے مطابق خرید وفروخت، کرایہ داری، رہن، شرکت، وکالت، مقدمہ اور دعوی، قسم اور قضاء وغیرہ کے مسائل کو ایک کتاب میں جمع کیا، اور اس کا نام "مجلة الاحکام العدلية" رکھا۔ سنہ 1293ھ میں خلیفہ کا فرمان جاری ہوا جس کے مطابق اس مجلہ کو عثمانی قلمرو کی تمام عدالتوں میں نافذ کردیا گیا۔

اس مجلہ کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں علمی یا تحقیقی یا درسی اسلوب کے بجائے قانونی اسلوب کو اختیار کیا گیا تھا۔ فقہاء کے اختلافات ذکر کرنے کے بجائے راجح قول کو شامل کیا گیا تھا۔ فقہی احکامات دفعہ وار ذکر کیے گیے تھے، ان دفعات کی تعداد 1851 تک پہونچتی ہے۔ مجلہ میں جو قوانین ذکر کیے گیے تھے، زیادہ تر ان کا تعلق تجارتی اور عدالتی قوانین سے تھا، جو دیوانی معاملات (سول لاء) کا ایک حصہ ہیں۔ عائلی قانون (پرسنل لاء) کو اس میں شامل کرنے بجائے الگ سے مدون کیا گیا، اور بعد میں نافذ کیا گیا۔ اسی طرح مجلہ میں فوجداری قوانین (کریمنل لاء) شامل نہیں تھے۔

4.5.3 مجلہ کے احکام کی منسوخی

اس دور کی شروعات مجلہ احکام عدلیہ کی تدوین اور نفاذ سے شروع ہوئی تھی، اور اس نے فقہی ارتقاء کو نئی جہت دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہوتے مجلہ احکام عدلیہ کو اسلامی ممالک کے مختلف حصوں میں منسوخ بھی کردیا گیا۔ جس کی دو اہم وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد دنیا کا سیاسی نقشہ بدل چکا تھا، خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد اسلامی دنیا کے نقشے میں متعدد ممالک وجود میں آئے۔ انہوں نے مقامی طور پر قانون سازی کا عمل شروع کیا، تو دیکھا کہ مجلہ احکام عدلیہ کے مسائل صرف حنفی فقہ کے مطابق ترتیب دئے گئے ہیں، اور جو اس علاقہ میں معمول بہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے، تجارت، زمین وجائیداد، مالی معاملات اور زندگی کے ہر شعبہ میں حالات کے بدلنے کی وجہ سے مسائل کی نئی نئی شکلیں سامنے آنے لگیں، نئے زمانہ میں عدالتی انتظامات میں کاروائی کا نیا سسٹم متعارف ہورہا تھا، جس کی وجہ سے ہر جگہ نئے سرے سے قانون سازی کی گئی۔

4.5.4 فقہی قانون سازی میں وسعت

اس دور کی ایک اہم خصوصیت فقہی قانون سازی کے میدان میں وسیع پیمانہ پر ہونے والی تصنیفی سرگرمیاں ہیں۔ اس دور کے اخیر میں بہت سے اسلامی ملکوں میں فقہی احکامات کو قانونی انداز میں مرتب کرنے اور نافذ کرنے کا کام ہوا، جو فقہی تاریخ میں ایک نئی تبدیلی اور ایک بڑی پیش رفت تھی۔ قانون سازی کا یہ عمل فقہ کے تینوں اہم میدانوں یعنی دیوانی، فوجداری اور انتظامی میں ہوا۔

4.5.5 قانون سازی میں تمام فقہی مسالک سے استفادہ

اس نئی قانون سازی کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ مسائل کے حل کے لئے کسی ایک ہی فقہی مسلک تک محدود رہنے کے بجائے تمام مسالک سے استفادہ کیا گیا، اور بہت سے معاملات میں نئے حالات کی رعایت کرتے ہوئے ضعیف اور متروک اقوال کو بھی اختیار کیا گیا۔ اور تقریباً فقہ کے ہر باب میں کسی نہ کسی حد تک تبدیلی کی گئی۔

4.5.6 تصنیفات:

اس دور متعدد فقہی تصانیف ظہور میں آئیں، جن میں سب سے اہم مجلۃ الاحکام العدلیۃ ہے، جس کا مفصل تعارف ذیل میں دیا جارہا ہے۔

4.5.7 مجلۃ الاحکام العدلیۃ

اس اہم فقہی تصنیف کے وجود میں آنے کا سبب یہ تھا کہ زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ عثمانی سلطنت میں تجارتی معاملات میں پھیلاؤ آتا جارہا تھا، مملکت عثمانیہ میں دوسرے ممالک کے باشندے بھی تجارت کرتے تھے، اور خود عثمانی تاجروں کے کاروبار دوسرے ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ حالات بدلنے سے نئے مسائل سامنے آرہے تھے، ان جدید تجارتی مسائل اور شکایتوں کی یکسوئی کے لئے نئے انداز کی عدالتیں قائم کی گئیں، جن میں قاضیوں کا تقرر ہوا۔ ان قاضیوں یعنی (Judges) کے لئے فقہی کتابوں کے تمام احکامات سے واقفیت ممکن نہیں تھی۔ کیوں کہ اسلامی فقہ کا تصنیفی ذخیرہ بہت وسیع تھا۔ اس لئے فقہی معاملات میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہوئی، جس میں مسائل کو قانونی زبان میں بیان کیا گیا ہو، اور اختلافات درج نہ کئے جائیں۔ اسلوب اور ترتیب قانونی ہو، اور زبان پیچیدہ نہ ہو۔

اس کام کی انجام دہی کے لئے سنہ 1286ھ میں عثمانی سلطان کے فرمان کے مطابق ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے سربراہ سلطنت عثمانیہ کے وزیر انصاف تھے۔ اس کمیٹی میں ترک اور عرب علماء اور فقہاء شریک تھے۔ آٹھ سال کے عرصہ میں یہ کام مکمل ہوا۔ تدوین کے بعد اس کتاب پر عثمانی سلطنت کے شیخ الاسلام اور دوسرے ماہر علماء نے نظر ثانی کی۔ اور 1293ھ میں اس کو سلطانی فرمان کے ذریعہ عثمانی قلمرو میں نافذ کیا گیا۔

اس مجلہ میں سب سے پہلے بنیادی فقہی قواعد بیان کئے گئے ہیں۔ ان فقہی قواعد کی تعداد 99 ہے۔ قواعد کی مفصل تشریح بھی کی گئی ہے۔ اس کے بعد 16 حصے ہیں، ہر حصہ کو "کتاب" کا نام دیا گیا ہے، ہر کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے، پہلی کتاب "کتاب البیوع" (خرید وفروخت) کے عنوان سے ہے، اور آخری کتاب "کتاب القضاء" کے عنوان سے ہے۔ ہر باب میں فصلیں ہیں۔ اس میں فقہی مسائل کو آسانی کے لئے دفعہ وار مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کل 1851 دفعات ہیں۔ مجلہ کی اصل زبان ترکی تھی، بعد میں اس کا عربی ترجمہ کیا گیا۔ اگرچہ کہ متعدد ممالک میں مجلہ کو سرکاری طور پر منسوخ کردیا گیا، لیکن اس کی علمی اہمیت آج بھی مسلم ہے، اور مسائل کے حل کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

4.6 تیسرا دور: عہد جدید 1358ھ تا زمانہ حال

یہ دور 1358ھ یعنی تقریباً دوسری جنگ عظیم (1939-1945ء) کے بعد سے شروع ہوتا ہے، اور زمانہ حال تک جاری ہے۔ اس دور میں دنیا بدل چکی تھی۔ صرف عالم اسلام اور مسلمان ہی نہیں، بلکہ تمام انسانیت کے لئے یہ ایک نیا دور تھا۔ قدیم دنیا اور اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی نظام رخصت ہو چکے تھے، اور ان کی جگہ نئے نظام ہائے حیات تشکیل پا رہے تھے، یا پا چکے تھے۔ وسائل حمل و نقل میں تیزی آنے کی وجہ سے دنیا سکڑ کر ایک گاؤں بنے جا رہی تھی۔ اس میں فقہ اسلامی کے سامنے نئی پریشانی آئیں، اور فقہ اسلامی نے ان کا حل پیش کرنے کی طرف پیش رفت کی۔

4.6.1 خصوصیات

اس دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں تیزی سے ترقی ہو رہی تھی، جس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر پڑ رہا تھا۔ تجارت و معیشت، معاشرہ و معاشرت کے نت نئے مسائل جنم لے رہے تھے۔ اور ان کا حل اجتہادی شان والے علماء کو میدان میں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ فقہ اسلامی نے اس دور میں نئی کروٹ لی، اور گذشتہ دونوں مرحلوں کے مقابلہ زیادہ تیزی سے تبدیلیوں کے ساتھ چلنے کی تیاری کی۔ اس دور کی خصوصیات کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

4.6.2 اجتماعی اجتہاد کا ظہور اور فقہی اکیڈمیوں کا قیام

نئے زمانہ میں نئے حالات نے اس بات کا شدید تقاضا پیدا کیا کہ اجتہاد کی طرف زیادہ توجہ دی جائے، اور اگر ایک شخص میں اجتہادی صفات پیدا نہیں ہو سکتیں، تو اجتہادی اوصاف رکھنے والے متعدد افراد کو جمع کر کے 'اجتماعی اجتہاد' کی راہ ہموار کی جائے۔ مسائل کے حل کے لئے فقہی نصوص تک محدود رہنے کے بجائے مقاصد شریعت اور نصوص کتاب و سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس تقاضہ کے پیش نظر فقہی اکیڈمیوں کا قیام عمل میں آیا۔ سب سے پہلے تو متعدد فقہی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، 1961ء میں دمشق میں 'اسلامی فقہ کا ہفتہ' کے نام سے کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ جامعہ ازہر (قاہرہ) میں اسی سال 'مؤتمر مجمع البحوث الاسلامیۃ' کے نام سے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی۔ ریاض میں 1976ء مطابق 1396ھ میں امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی نے اسلامی فقہ کے عنوان سے بین الاقوامی کانفرنس کا انتظام کیا۔

اجتماعی اجتہاد کے لئے سب سے پہلی فقہی اکیڈمی 'مجمع البحوث الاسلامیۃ' کے نام سے جامعہ ازہر، قاہرہ میں 1961ء میں قائم ہوئی۔ پھر سعودی عرب کے عالمی ادارہ 'رابطہ عالم اسلامی' نے مکہ مکرمہ میں بین الاقوامی فقہی اکیڈمی 'مجمع الفقہ الاسلامی' کے نام سے قائم کی۔ رابطہ کی اس اکیڈمی میں ہندوستان سے بھی اہم فقہی شخصیات شامل رہتی ہیں۔ عرب ممالک کی اجتماعی تنظیم منظمة المؤتمر الاسلامی (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) نے ایک فقہ اکیڈمی قائم کی۔ اس اکیڈمی میں عرب اور مسلم ممالک میں سے ہر ملک کا ایک ممبر مجلس عاملہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے اہم ممالک کو بھی نمائندگی دی جاتی ہے۔

ان فقہی اکیڈمیوں کا مستقل عملہ اور دفاتر ہوتے ہیں، اور عام طور پر اس کے اجلاس سالانہ منعقد ہوتے ہیں۔ جس میں جدید مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ طبی، تجارتی، سائنسی اور دوسرے عصری موضوعات سے تعلق رکھنے والے مسائل کی تفہیم میں یہ کمیٹیاں ان علوم کے ماہرین کو دعوت دیتی ہیں، عصری علوم کے ماہرین اکیڈمی کے ممبران کے سامنے گہرائی کے ساتھ مسائل کی تشریح کرتے ہیں، اور مسئلہ کی فنی باریکیاں سمجھاتے ہیں۔ پھر اکیڈمی کے ممبران متفقہ طور پر یا اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ لیتے ہیں۔

عالم اسلام کی طرح تمام دنیا کے مسلمانوں نے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت محسوس کی، یورپ میں "المجلس الاوروبي للإفتاء والبحوث" کے نام سے ایک ادارہ 1997ء میں قائم ہوا۔ ہندوستان میں بھی کئی ادارے قائم ہوئے۔ 1963ء میں مولانا ابو الحسن علی ندوی نے ندوۃ العلماء، لکھنو میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ جمعیت علماء ہند نے 1970ء میں ادارہ مباحث فقہیہ قائم کیا۔

ہندوستان میں اجتماعی اجتہاد کا سب سے فعال اور اہم ادارہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ہے، جس کی بنیاد سنہ 1989ء میں مشہور فقیہ اور قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے دہلی میں رکھی۔ یہ فقہ اکیڈمی ہر سال ایک سیمینار منعقد کرتی ہے، جس میں سائنس، طب، ٹیکنالوجی، معاشیات نیز معاشرتی و سماجی مشکلات سے جڑے نئے مسائل پر ملک کے اطراف واکناف سے ارباب افتاء کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ان کے مقالات کی روشنی میں فیصلے لئے جاتے ہیں۔ فقہی موضوعات پر تحقیق و تصنیف اکیڈمی کا امتیاز ہے۔

4.6.3 علم فقہ کی تدریس کے طریقہ میں تبدیلی

اس دور میں علم فقہ کے طریقہ میں بڑی تبدیلیاں آئیں، عالم اسلام میں اسلامی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، جس میں اسلامی فقہ کے شعبے قائم کئے گئے۔ فقہ کی تعلیم مدارس سے نکل کر عصری یونیورسٹیوں تک بھی پہونچی، جہاں فقہ کی عصری انداز میں تعلیم دی جانے لگی۔ یونیورسٹیز کے نظام کے تحت ہر مرحلہ کے لئے الگ الگ نصاب مرتب کیا گیا۔ نئے تقاضوں کے پیش نظر جدید نصابی کتابیں تیار کی گئیں، جو فن کی تفہیم میں قدیم نصابی کتابوں سے زیادہ معاون ثابت ہوئیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر اسلامی فقہ کے نئے موضوعات پر تحقیقی مقالات تیار کئے گئے۔ مقالات کی تیاری کے لئے خاص منہج اور معیار مقرر کیا گیا۔ جس سے تحقیق کا معیار بلند ہوا۔

4.6.4 دوسرے مذاہب سے استفادہ اور فقہ مقارن کا موضوع

اس دور میں گذشتہ ادوار کے مقابلہ دوسرے مسالک سے استفادہ کا رجحان بڑھتا گیا۔ اور "فقہ مقارن" (تقابلی فقہ) کا نیا موضوع سامنے آیا۔ اس موضوع کے تحت حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، زیدی، اباضی وغیرہ مسالک کے ساتھ صحابہ اور تابعین اور دوسرے ائمہ مجتہدین کی آراء سے استفادہ کرتے ہوئے مسائل کا حل نکالنے کی طرف قدم بڑھائے گئے۔ مسائل اور دلائل پر کھل کر بحث ومباحثہ ہونے کی وجہ سے فکری توسع پیدا ہوا۔ دیگر مسالک سے اس استفادہ کی وجہ سے مسلکی عصبیت میں کمی آئی، ایک مسلک کے طلباء اور علماء دوسرے مسلک کی خصوصیات سے واقف ہوئے۔ اور اسلامی فقہ کے عظیم ذخیرہ کی پوشیدہ خصوصیات سامنے آئیں۔

4.6.5 جدید قوانین کے ساتھ تقابلی مطالعہ کا رجحان

فقہی مسالک کے درمیان تقابلی مطالعہ سے آگے قدم بڑھاتے ہوئے علماء اور فقہاء نے جدید ملکی قوانین کا مطالعہ کیا۔ اور خاص طور سے معاملات کے باب میں ملکی قوانین کا فقہی قوانین کے ساتھ تقابل کرکے اس موضوع کو اسلامی فقہ کے نصاب تعلیم میں شامل کیا۔ پھر اس پر نئے انداز میں کتابیں مرتب کیں۔ اسلامی فقہ اور جدید ملکی قوانین میں اس رابطہ سے متعدد فوائد سامنے آئے۔ علمائے اسلام نے جدید اسلوب میں اسلامی فقہ کے اصول و قواعد اور مسائل کی تشریح کی، اور ان کو عصری تعلیم یافتہ قانون دانوں کے سامنے انہی کی زبان میں پیش کرنے سے مسائل کی تفہیم بہتر انداز میں ممکن ہوئی۔

4.6.6 فقہی تالیفات کا نیا رنگ

اس دور ہونے والی تبدیلیوں کا اثر تدریس کے ساتھ تصنیف پر بھی ہوا۔ اور نئے انداز کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ فقہ کی نصابی کتابیں تیار ہوئیں، فقہی موسوعات کے منصوبے بناکر تکمیل تک پہونچائے گئے۔ عدالتوں کی آسانی کے لئے فقہی قانون سازی کی کتابیں کثرت سے تصنیف کی جانے لگیں۔

4.6.7 فقہ کی جدید نصابی کتابیں

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، فقہ کے نئے نصاب کے لئے جدید انداز میں کتابیں لکھی گئیں، ان کتابوں کو پیچیدہ انداز کے بجائے آسان انداز میں مرتب کیا گیا۔ عمر اور تعلیمی مرحلہ کے لحاظ سے زبان اور اسلوب اختیار کیا گیا۔ مشقیں، مثالیں اور سوالات شامل کئے گئے، مسائل کی تفہیم میں نقشوں سے مدد لی گئی، جس کی وجہ سے فقہ کی تعلیم آسان ہوگئی۔

4.6.8 فقہی موسوعات

موسوعہ عربی زبان میں انسائکلوپیڈیا کو کہتے ہیں، جسے اردو میں دائرۃ المعارف کہا جاتا ہے۔ جدید دور میں ایک نیا تصنیفی رجحان یہ شروع ہوا کہ ہر علم و فن بلکہ ہر موضوع کے مربوط تمام مسائل کو یکجا کردیا جائے۔ تاکہ اس موضوع کے بارے میں تمام معلومات تک ایک وقت میں پہونچنا آسان ہو۔ چنانچہ عالم اسلام میں فقہی موسوعات کی تیاری کا نیا رجحان پیدا ہوا اور سب سے پہلے فقہی انسائیکلوپیڈیا کا منصوبہ عالم عرب میں 1954ء میں سامنے آیا۔ یہ منصوبہ سوریہ یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ (شریعہ کالج) نے تیار کیا تھا۔

فقہی انسائیکلوپیڈیا کا دوسرا منصوبہ کویت کی وزارت اوقاف نے "الموسوعة الفقهية الكويتية" کے نام سے پیش کیا، اور متعدد ملکوں سے تعلق رکھنے والے مختلف مسالک کے جید علماء نے اس کی تیاری شروع کی۔ 1966 میں یہ کام شروع ہوا۔ اس کی پہلی جلد 1404ھ / 1983ء میں، اور آخری جلد 1427ھ / 2006ء میں طبع ہوئی۔ یہ عظیم پروجیکٹ چالیس سال میں اختتام کو پہونچا۔ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ اسلامی کتب خانہ کا سب سے عظیم فقہی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ 45 جلدوں اور ساڑے اٹھارہ ہزار صفحات پر مشتمل اس انسائیکلوپیڈیا میں تین ہزار سے زیادہ فقہی اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے، اور ان تمام عناوین کو حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کیا ہے۔ ہر

اصطلاح کے تحت بنیادی طور پر چاروں سنی مسالک حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کے مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی بعض صحابہ اور تابعین کے فتاوی بھی نقل کئے گئے ہیں۔ مسائل کے ضمن میں قرآن مجید اور حدیث شریف سے دلائل ذکر کئے ہیں۔ ہر قول اور دلیل کو مصادر کی وضاحت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اردو زبان میں اس کتاب کا ترجمہ طبع ہو چکا ہے۔ ترجمہ کا کام اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا نے انجام دیا ہے۔

4.6.9 فقہی قانون سازی کی کتابیں

مجلہ احکام عدلیہ کی منسوخی کے ساتھ ہی اس کی جگہ پر کرنے کے لئے عالم اسلام میں کئی کتابیں تیار ہوئیں، جن کا مقصد فقہی مسائل کی قانون سازی اور عدلیہ کے لئے ان سے استفادہ کو آسان بنانا تھا۔ اس پہلو سے عالم عرب میں انفرادی اور سرکاری سطح پر متعدد کوششیں ہوئیں۔ ہندوستان میں بھی مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس جانب قدم بڑھایا، تاکہ ملک کی عدالتوں میں جج صاحبان کو اسلامی فقہ کی کتابیں پڑھنے اور ان سے استفادہ کرنے میں جو دشواری ہوتی ہے، وہ پیش نہ آئے۔ علماء کی ایک کمیٹی بنائی گئی، جس نے 'مجموعہ قوانین اسلامی' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ اس کی زبان اور اسلوب میں جدید قانونی انداز کا پورا لحاظ رکھا گیا۔ اور مسلم قانون دانوں سے نظر ثانی بھی کروائی گئی۔ اس مجموعہ میں 529 دفعات ہیں، جو عائلی قوانین مثلا نکاح، طلاق، خلع، میراث وغیرہ سے متعلق ہیں۔ چوں کہ ہندوستان میں فقہ حنفی کے ماننے والے زیادہ ہیں، اس لئے بنیادی طور پر اس کو حنفی فقہ کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔

4.7 کلیدی الفاظ

آبیاری	:	سیرابی، پانی دینا
سقوط	:	زوال
محیط	:	شامل، گھیرنے والا
متقدمین	:	پہلے زمانہ کے علماء
متاخرین	:	بعد کے زمانہ کے علماء
مختصرات	:	کسی کتاب کو مختصر کر کے کم الفاظ میں بیان کرنا
پیش آمدہ	:	پیش آنے والے
علت	:	فقہ کی اصطلاح میں علت اس سبب کو کہتے ہیں، جس پر کسی شرعی حکم کی بنیاد رکھی گئی ہو۔ مثال کے طور پر شراب کو اس لئے حرام کیا گیا ہے کہ اس میں نشہ ہوتا ہے، تو شراب کے حرام ہونے کی علت 'نشہ' ہے

قلمرو	:	حکومت کا علاقہ، مملکت، سلطنت
معمول بہ	:	جس پر عمل کیا جاتا ہو
متروک	:	ترک کیا ہوا، جس کو چھوڑ دیا گیا ہو
ارباب افتاء	:	فتوی دینے والے، مفتی حضرات
فقہ مقارن	:	علم فقہ کی ایک شاخ، جس میں دو یا زیادہ مسلکوں کے درمیان تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے
موسوعہ	:	دائرۃ المعارف، انسائیکلوپیڈیا
مُجَمَّع	:	میم پر پیش، جیم پر زبر، پھر میم پر تشدید اور زبر: اکیڈمی، علمی ادارہ

4.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اسلامی فقہ کے ارتقاء کی تاریخ کے دو بڑے حصے ہیں۔ پہلا حصہ دور نبوی سے سقوط بغداد تک کا ہے، دوسرا حصہ سقوط بغداد سے عصر حاضر تک کا ہے۔
- فقہی تاریخ کے دوسرے حصے کو تین ادوار میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا سقوط بغداد یعنی 656ھ /1258ء سے تیرہویں صدی کے اواخر تک۔ دوسرا 1286ھ سے عالم جنگ دوم کے بعد تک۔ تیسرا دور عالمی جنگ دوم سے موجود زمانہ تک۔
- پہلے دور میں فقہی علوم کی ترقی رک گئی، اور اجتہادی طرز کی کوششیں ختم ہو گئیں۔ اس دور میں فقہی تدریس اور تصنیف دونوں میدانوں میں تخلیقی کوششیں نظر نہیں آتیں۔ متون کے نام سے مختصر کتابوں کی تدریس شروع ہوئی، جن میں فن کے بجائے عبارت فہمی پر توجہ مرکوز کی جاتی تھی۔ ان متون کو حل کرنے کے لئے شرحیں لکھی جاتیں، اور شرحوں پر حواشی چڑھائے جاتے۔ قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کے بجائے ایک مسلک کی کتابوں پر توجہ دی جاتی تھی۔ اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں فتاوی نامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مجموعی طور پر اس دور میں فقہی علوم پر زوال آیا، لیکن بعض اہم تصنیفی کام بھی ہوئے۔ فتاوی عالمگیری اور حاشیہ ابن عابدین بہت اہمیت کی حامل کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔
- دوسرا دور مجلہ احکام عدلیہ کا دور ہے، جو 1287ھ سے 1358ھ تک ہے۔ اس دور میں ایک اہم کام یہ ہوا کہ عثمانی سلطنت میں نئے حالات کے تقاضے سے مجلہ احکام عدلیہ کا ظہور ہوا۔ اور اس کو پوری سلطنت میں نافذ کیا گیا۔ اس دور میں فقہی قانون سازی کا نیا طریقہ شروع ہوا۔ گذشتہ ادوار کے برخلاف اس دور میں قانون سازی کرتے وقت تمام فقہی مسالک سے استفادہ کا رجحان پیدا ہوا۔ اس دور کی اہم تصنیف مجلہ احکام عدلیہ ہے۔ اس میں فقہی مسائل کو آسان زبان اور اسلوب میں دفعہ وار مرتب کیا گیا ہے۔

- تیسرا دور جدید دور ہے۔ جو 1358ھ سے شروع ہوا، اور ابھی تک جاری ہے۔ عہد جدید میں زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں آئیں، جس کے اثرات فقہ اسلامی پر پڑے۔ اسلامی فقہ کو اس دور میں نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ فقہ اسلامی نے ان کو سنجیدگی سے لیا، اور نئے مسائل کے حل کی کوششیں کیں۔ اس دور میں اجتماعی اجتہاد کا رجحان پیدا ہوا، اور فقہی اکیڈمیوں کا قیام عمل میں آیا۔ رابطہ عالم اسلامی کی 'مجمع الفقہ الاسلامی'، آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس کی فقہ اکیڈمی، یوروپ کی 'المجلس الاوروبی للافتاء والبحوث'، ہندوستان کی اسلامک فقہ اکیڈمی اور دوسرے اداروں نے اجتماعی اجتہاد کو عملی طور پر شروع کیا، اور شریعت کی روشنی میں نئے مسائل حل کئے۔ اس دور میں علم فقہ کی تعلیم کے نئے طریقے سامنے آئے۔ فقہ مقارن کا موضوع پیدا ہوا، دوسرے مسالک سے استفادہ کے رجحان میں ترقی ہوئی۔ فقہی موسوعات کے نام سے انسائیکلوپیڈیا مرتب ہوئے۔ اور فقہی قانون سازی میں تیزی آئی۔

4.9 نمونہ امتحانی سوالات

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سقوط بغداد کے بعد فقہ اسلامی کی تاریخ کا پہلا دور کب سے کب تک ہے۔

(a). 656ھ سے تیرہویں صدی ہجری کے اواخر تک (b). 1286ھ سے 1358ھ تک
(c). آٹھویں صدی سے پہلی عالمی جنگ تک (d). پہلی عالمی جنگ سے دوسری عالمی جنگ تک

2. فتاوی عالمگیری کو تیار کرنے والی کمیٹی کے سربراہ کا نام کیا تھا۔

(a). شاہ ولی اللہ دہلوی (b). اورنگ زیب عالمگیر (c). ملا نظام الدین برہانپوری (d). عالم بن علاء حنفی

3. حاشیہ ابن عابدین کا نام کیا ہے۔

(a) رد المختار (b). کنز الدقائق (c). بدائع الصنائع (d). ہدایہ

4. مجلۃ الاحکام العدلیہ کا نفاذ کس سن میں ہوا۔

(a). 1293ھ (b). 1250ھ (c). 1300ھ (d). 1305ھ

5. مجلۃ الاحکام العدلیہ میں کس قسم کے قوانین شامل تھے۔

(a). تجارتی قوانین (b). عدالتی قوانین (c) گذشتہ دونوں (d). ان میں سے کوئی نہیں

6. اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کی بنیاد کس نے رکھی۔

(a). ابوالحسن علی ندوی (b). مولانا عبدالحئ (c). مجاہد الاسلام قاسمی (d). اشرف علی تھانوی

7. یوروپ کے اجتماعی اجتہاد کے ادارہ کا نام.........................ہے۔

8. رابطہ عالم اسلامی کے اجتماعی اجتہاد کے ادارہ کا نام...............ہے، اور وہ سنہ.............میں قائم ہوا۔

9. فتاوی کے نام سے لکھی جانے والی دو کتابوں کا نام یہ ہے:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔

10. فقہ مقارن یعنی تقابلی فقہ کس دور کی اہم خصوصیت ہے؟

(a). مجتہدین کے دور کی (b). مجلہ احکام عدلیہ والے دور کی (c). جدید دور کی (d). ان میں سے کسی کی نہیں

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سقوط بغداد کے بعد اسلامی فقہ کے ارتقاء کا اجمالی خاکہ بیان کیجیے۔
2. فتاوی عالمگیری کا تعارف پیش کیجیے۔
3. الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیہ پر مفصل روشنی ڈالیے۔
4. اجتماعی اجتہاد کی سمت میں ہونے والی کوششوں کا تذکرہ کیجیے۔
5. جدید دور میں فقہی تصنیف میں ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کیجیے۔

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سقوط بغداد کے بعد والے دور میں اسلامی فقہ کی خصوصیات کا تجزیہ کیجیے۔
2. مجلہ احکام عدلیہ کے نفاذ اور منسوخی کا جائزہ لیجیے۔
3. جدید دور میں اسلامی فقہ کی خصوصیات پر مضمون لکھیے۔

4.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. فقہ اسلامی: تدوین وتعارف : خالد سیف اللہ رحمانی
2. فقہ اسلامی: تعارف اور تاریخ : پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
3. تاریخ فقہ اسلامی : محمد خضری۔ اردو ترجمہ: عبد السلام ندوی
4. المدخل الفقہی العام : مصطفی احمد زرقاء

اکائی 5: اہم فقہی مسالک (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 فقہ مالکی
5.2.1 الکتاب
5.2.2 السنۃ
5.2.3 آثار صحابہ
5.2.4 اجماع
5.2.5 عمل اہل مدینہ
5.2.6 قیاس
5.2.7 مصالح مرسلہ
5.2.8 استصحاب
5.2.9 سد ذرائع
5.2.10 عرف وعادات
5.2.11 فقہ مالکی کا حلقہ اثر
5.3 فقہ حنفی
5.3.1 قانون اسلامی کی تدوین
5.3.2 فقہ حنفی کے بنیادی خدوخال
5.3.3 فقہ حنفی کی خصوصیات
5.3.4 فقہ شافعی

5.3.5 اصول شافعی

5.3.6 مصادر شریعت

5.3.7 شریعت اسلامی کے ثانوی مآخذ

5.3.8 فقہ شافعی کی امتیازی خصوصیات

5.3.9 فقہ شافعی کا نشو و نما

5.4 کلیدی الفاظ

5.5 اکتسابی نتائج

5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

فقہ اسلامی کے ارتقا کی بنیاد پر فکری اختلافات وجود میں آئے۔ جس کے نتیجے میں کئی فقہی مسالک منظر عام پر آئے اور ان میں کچھ مکتب فکر نے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔ اس اکائی میں ہم مسالک کا تعارف کراتے ہوئے ان کی خصوصیات، ان کے خدو خال، نشو و نما اور ان کے اصول بیان کیے گیے ہیں۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اہم فقہی مسلک فقہ مالکی، فقہ حنفی اور فقہ شافعی کا تعارف پیش کریں۔ تا کہ آپ ان مسالک کے فقہ کے خصوصیات اور اختلافات سے واقفیت حاصل کریں۔

5.2 فقہ مالکی

امام مالکؒ کی بیک وقت دو حیثیتیں تھیں۔ محدث اور فقیہ۔ ان کی شخصیت میں دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی کتاب

موطأاس کی بہترین ترجمان ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ امام مالک کے زمانے تک فقہ با قاعدہ ایک فن کی حیثیت سے متعارف نہیں تھا اور اس کے اصول وضوابط مرتب نہیں ہوئے تھے۔ امام مالک نے ایک طرح سے فقہ و فتاویٰ کی بنیاد ڈالی، وہ ایک جلیل القدر تابعی تھے۔ صحابہ کرام سے فقہاء سبعہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ مدینہ منورہ کے سب سے بڑے اور معتبر عالم مانے جاتے تھے۔ دور دراز علاقوں سے اپنے مسائل کے حل کے لیے لوگ آپ کے پاس کشاں کشاں آتے تھے اور اپنی تشنگی دور کرتے تھے۔ امام مالکؒ نے بذات خود کسی فقہی مسلک کی بنیاد نہیں رکھی، انھوں نے آزادانہ طور پر حالات کے مطابق فتوے دیئے اور ان اجتہادات کو اپنی کتابوں میں قلم بند کیے۔ بعد میں ان کے لائق شاگردوں نے جو پورے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے، انہی کی مدد سے اصول و قواعد مرتب کیے اور ان کے اجتہادات و فتاوی کو عام کرنے کی کوشش کی۔ امام مالک کے تفقہ و اجتہاد کا پایہ اتنا بلند تھا کہ لوگ از خود ان کے اتباع کی جانب مائل ہونے لگے، پھر عہد تدوین میں جب مسلکی حصار بندی شروع ہوئی تو 'مالکیہ' بھی ایک معتبر مسلک قرار پایا اور بڑی تعداد نے اس کا اتباع کیا۔ امام مالکؒ نے فتاوی میں استنباط مسائل کے لیے جو اصول اختیار کیے، ان میں کتاب و سنت کو سب پر فائق رکھا۔ اجماع و قیاس کی شرائط و تفصیلات میں دیگر ائمہ سے کچھ اختلاف کیا ہے۔ ضمنی مآخذ تعامل مدینہ، استصحاب، مصالح مرسلہ اور عرف و عادات کی رعایت مسلک مالکی کے امتیازات میں سے ہے۔

5.2.1 الکتاب

فقہ اسلامی کا اولین اور بنیادی ماخذ قرآن مجید ہے۔ امام مالکؒ ہر جگہ اس سے بھرپور استدلال کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ ایسی قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہیں، جن میں کسی قسم کی اصطلاحی باریک بینی نہیں ہوتی۔ ان کا ایمان تھا کہ معانی قرآن سمجھنے کے لیے صحیح راستہ سنت رسول اللہؐ ہے۔ وہ کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے کسی اور چیز سے استدلال اور استعانت حاصل نہیں کرتے تھے؛ بلکہ تفسیر قرآن مجید ہی ان کی توجہ کا مرکز ہوتی۔ یہ وہ طریقہ تھا جس نے آگے چل کر فقہی میدان اور اصولی میدان میں اپنا قدم جمایا۔

علمائے مذہب مالکی کا کہنا ہے کہ امام مالک نص قرآن اور ظاہر نص کو لیتے تھے۔ یعنی مفہوم مخالف یا موافق کو لیتے تھے، جس پر اس کی بنیاد ہے؛ مگر قاضی عیاض کا کہنا ہے کہ امام موصوف ترتیب ادلہ میں قرآن مجید کو اپنے نصوص پر مقدم سمجھتے تھے پھر ظواہر اور پھر مفہومات کو۔

5.2.2 السنۃ

فقہ اسلامی کا دوسرا بنیادی ماخذ سنت رسول اللہؐ ہیں۔ امام مالکؒ سنت سے استدلال کرنے میں بہت متشدد مانے گئے ہیں اور دوسری خاص بات یہ کہ وہ لفظ سنت بول کر طرز عمل اور طریقہ مراد لیتے ہیں، خواہ وہ اہل علم کا طرز عمل اور طریقہ ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ انھوں نے اس عموم میں آثار صحابہ اور اقوال تابعین کو بھی شامل کر لیا ہے۔

5.2.3 آثار صحابہ

آثار صحابہ کو قابلِ حجت ہونے کے سلسلہ میں وہ خلیفہ عادل عمر بن عبد العزیز کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں کہ ”رسول

اللہؐ کے بعد ان کے خلفاء ہمارے لیے سنت ہیں، ان سے اخذ و استفادہ کرنا، کتاب اللہ کی تصدیق اور اطاعت رسول کی تکمیل ہے۔ جس شخص نے سنت خلفاء کا اتباع کیا، ہدایت یاب ہوا اور جس نے ان کی مخالفت کی اور مومنین کے راستے کے علاوہ غیروں کی راہ پر چلا، وہ اللہ سے پھر گیا اور واصل جہنم ہوا اور یہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

اسی وجہ سے امام مالکؒ نے ائمہ اربعہ میں سب سے زیادہ صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ کو قبول کیا ہے۔ موطأ اور دیگر تصانیف میں جابجا اس کے حوالے ملتے ہیں۔ اپنے شاگردوں کو بھی انہوں نے اس جانب خصوصی توجہ کی تاکید کی۔ مالکی اصولوں میں بھی اس بات کی صراحت ہے کہ اقوال صحابہ سنت نبوی ہی کا ایک حصہ ہیں۔ اس لیے وہ فقہ اسلامی کی اساس اور حجت بننے کے مستحق ہیں۔

بعض ائمہ کرام نے اقوال تابعین کو بھی حجت ماننے کی وکالت کی ہے؛ کیوں کہ ان کے علم و فتویٰ کے بارے میں گمان ہوتا ہے کہ وہ بھی رسالت مآبؐ کی تعلیمات ہی سے مستفیض ہوگا۔ مگر امام مالکؒ عمومی انداز میں اسے حجت نہیں مانتے۔

5.2.4 اجماع

اجماع کو تمام ہی قابل ذکر علماء نے شریعت اسلامی کا ایک مآخذ تسلیم کیا ہے۔ خود امام مالکؒ کی تحریروں میں جابجا اس کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ اصولیین نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ وہ فقہائے مدینہ کے اجماع کو صرف حجت مانتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں خبر احاد کو رد کر دیتے تھے اور اس کے لیے بھی اجماع، اتباع لازم قرار دیتے تھے، امام مالکؒ اجماع کی تشکیل و تدوین میں عوام کا کوئی حصہ نہیں مانتے؛ کیوں کہ عوام کا اجتہاد غیر مستند اور غلطی سے خالی نہیں ہو سکتا، اجماع کے مفہوم میں اس تحدید کی بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت تک اجماع کی کوئی واضح شکل سامنے نہیں آئی تھی۔

5.2.5 عمل اہل مدینہ

ائمہ اربعہ میں صرف فقہ مالکی میں فقہائے اہل مدینہ کے راویوں کو بھی مآخذ کی حیثیت دی گئی ہے۔ ان کے نزدیک اتنی اہمیت ہے کہ بسا اوقات خبر آحاد پر بھی اسے مقدم رکھتے ہیں۔ امام مالکؒ نے خاص طور سے اس کے استناد پر بہت زور دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام اسی سرزمین سے اٹھا اور تشریع اسلامی کی بنیاد یہیں سے پڑی۔ اہل مدینہ اوامر و نواہی کے اولین مخاطب تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست ان کی تربیت فرمائی تھی۔ صحابہ میں جو فقہ و فتاوی میں ممتاز ہوئے، اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس شہر کے بارے میں خود رسول مقبول ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ "مدینہ برائی کی نفی کرتا ہے۔" یہاں کے باشندوں نے آپ ﷺ کو اور آپ کے تربیت یافتہ اصحاب کی عبادات، اخلاق اور معمولات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پڑھا ہے۔ اس لیے ان کے اقوال و آراء کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ وہ سنت مطہرہ سے ماخوذ و مستفیض ہوں گے اور بلاشبہ ان کو یہ مرتبہ حاصل ہونا چاہیے کہ ان سے استدلال کیا جائے۔

امام مالکؒ کے اس اصول سے دوسرے ائمہ مجتہدین نے اختلاف کیا ہے۔ خاص طور سے امام شافعی، امام مالک کے شاگرد تھے اور انہی سے اہل مدینہ کے فتاوی سنتے تھے، ان کے دلائل سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے استاد امام مالکؒ کے اس

اصول کی مخالفت کی ہے۔ اور اہل مدینہ کے اس اختصاص کو عوام پر محمول کیا ہے۔

5.2.6 قیاس

قیاس تمام ائمہ کے نزدیک ایک مستقل ماخذ شریعت ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف محض شرائط و کوائف میں ہوا ہے۔ احناف نے اس سے زیادہ اعتناء کیا ہے تو وہ قیاسی مشہور ہو گئے۔ اس زمانہ میں امام مالکؒ نے اپنے بعض اقوال میں اس کی مخالفت کی تو وہ قیاسی کے بجائے اتباعی مشہور ہو گئے۔ حالاں کہ قیاس سے دونوں نے کام لیا ہے؛ کیوں کہ قیاس ایک فطری ضرورت ہے۔ محض نصوص وتصریحات سے ہر زمانے کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔

امام مالکؒ کا قیاس اصلاً مصالح پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ قرآنی نظائر اور احادیث سے ثابت شدہ احکام پر قیاس کرتے ہیں؛ بلکہ موٴطا کا طرزِ تالیف ہی یہ ہے کہ وہ باب کے آغاز میں صحیح احادیث نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد مرفوع کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ مشابہ کو مشابہ سے ملاتے ہیں اور امثال کو امثال کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ اہل مدینہ کے تعامل پر بھی قیاس کرتے ہیں کیوں کہ انہیں وہ قابل حجت تسلیم کرتے ہیں۔ قیاس کی اصطلاحی تعریف اور اس کے قواعد و شرائط امام مالکؒ کے بہت بعد متعین ہوئے جس کی ان کے متبعین نے بہت سی شکلیں اختیار کیں۔

5.2.7 مصالح مرسلہ

امام مالکؒ نے مصالح مرسلہ سے بہت کام لیا ہے؛ بلکہ یہ اصول اصلاً انہیں کی طرف منسوب ہے اور اس کے حق میں انہوں نے کئی دلائل بھی پیش کیے ہیں۔

1. شارع نے جنس مصالح کا جنس احکام میں اعتبار کیا ہے۔ شارع کے اس اعتبار سے وسعت کا پتہ چلتا ہے۔
2. نئے احوال و مسائل کے استنباط میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثالیں موجود ہیں۔ وہ مطلقاً مصالح کا اعتبار کرتے تھے، نہ زیادہ بحث و تمحیض میں وہ پڑتے تھے اور نہ ہی کسی وکالت کی انہیں تلاش ہوتی تھی۔

5.2.8 استصحاب

قرافی کے بقول فقہ مالکی میں استصحاب بھی حجت ہے۔ جب تک کہ اس کے خلاف کوئی حجت قائم نہ ہو؛ لیکن اس کا طریقہ امام ابو حنیفہؒ کے طریقے سے قدرے مختلف ہے۔ یہ بات ابن قیم نے بھی اعلام الموقعین میں لکھی ہے۔

5.2.9 سد ذرائع

اکثر فقہاء نے ضمنی آخذ میں اسے بھی شمار کیا ہے۔ امام مالکؒ نے اپنے فقہی استنباط میں اس پر بہت اصرار کیا ہے۔

5.2.10 عرف وعادات

تمام فقہی مسالک میں اس اصل کو معتبر مانا گیا ہے، مسلک مالکی کے اختصاصات میں سے یہ بھی ایک ہے؛ کیوں کہ مصالح مالکی فقہ

استدلال کا ایک اہم ستون ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عرف کی رعایت کرنا جس میں کوئی فساد نہیں ہے، مصلحت کی قسموں سے ایک قسم ہے۔ اس کا ترک کرنا فقیہ کے لیے کسی طرح درست نہیں، اس لیے اس کا اعتبار ایک فطری امر ہے۔

5.2.11 فقہ مالکی کا حلقہ اثر

امام مالکؒ کا مسلک حجاز سے نکل کر اگرچہ عراق کے بعض شہروں بغداد، بصرہ اور خراسان کے شہروں قزوین، ابہر اور نیشاپور میں بھی پھیلا؛ لیکن مالکی مسلک کو زیادہ تر فروغ بلاد مغرب وافریقہ، تونس، الجزائر، مراکش، اندلس اور مصر میں ہوا۔ ابن خلدون کے بقول اس کا سبب یہ ہے کہ مغرب وافریقہ کے علماء کا منتہائے سفر حجاز رہا۔ مدینہ اس زمانے میں علوم اسلامی کا مرکز تھا اور عراق ان کے راستے میں نہیں پڑتا تھا۔ چناں چہ انہوں نے صرف علمائے مدینہ پر اخذ و اکتساب میں انحصار کیا اور امام مالک کی تقلید کی۔ مصر میں مالکی فقہ خود امام مالکؒ کی زندگی میں فروغ پا چکی تھی اور حجاز کے بعد مصر کو پہلا ملک سمجھنا چاہیے۔ جہاں امام مالک کا فیض پہنچا۔ مصر کے ممالیک کے زمانے میں شافعی قاضی کو پہلا درجہ اور مالکی قاضی کو دوسرا درجہ حاصل ہوتا تھا۔ بلاد تونس میں مذہب مالک ہمیشہ غالب رہا اور آج کل بھی وہاں اس کا غلبہ ہے۔ اندلس میں پہلے پہل اگرچہ امام اوزاعیؒ کا مسلک غالب تھا؛ لیکن 200ھ کے بعد سے یہاں فقہ مالکی کو غلبہ حاصل ہوا اور یہ ملک بڑے بڑے علماء وفقہاء اور مصنفوں کی قرار گاہ رہا۔ مغرب اقصیٰ میں بنو تاشفین (448-541ھ) کے عہد میں مالکیہ کو بہت فروغ ملا اور ان کی قوت میں اضافہ ہوا، ان علاقوں کے علاوہ سوڈان، بحرین اور کویت میں بھی یہ مذہب پھیلا خاص طور سے بالائی مصر میں اسے وہ حیثیت حاصل رہی، جو زیریں مصر میں شافعی مسلک کو حاصل تھی۔ آج کل مختلف ممالک اسلامیہ میں مالکیہ کی کل تعداد تقریباً پانچ کروڑ ہو گی۔

5.3 فقہ حنفی

عراق امام ابو حنیفہؒ کا مسکن و مولد اور حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کی فکر کا گہوارہ تھا، ان کے بعد ابراہیم نخعیؒ اس خطے میں فقہ کے سب سے بڑے امام ہوئے۔ انہوں نے مسائل فقہ کا ایک مختصر مجموعہ بھی تیار کیا۔ امام ابو حنیفہؒ کے استاد حضرت حمادؒ اگرچہ بلند پایہ مجتہد تھے؛ مگر فقہ کی ترویج واشاعت میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ ان کے انتقال کے بعد جب امام ابو حنیفہؒ مسند نشین ہوئے تو علمی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ امام ابو حنیفہؒ کے زمانے تک فقہ کے کچھ مسائل ہی مدون ہوئے تھے، وہ بھی زیادہ تر زبانی روایت پر ہی مبنی تھے، دوسرے جو کچھ بھی تھا اس کی کوئی فنی حیثیت نہ تھی، نہ استنباط واستدلال اور تصریح کے قواعد مرتب تھے۔ حدیثوں میں امتیاز مراتب نہ تھا اور شبہ النظیر علی النظیر کا کوئی قاعدہ بھی نہیں بنا تھا۔ مختصر یہ کہ فقہ جزئیات مسائل کا نام تھا۔ اس کو قانون کے رتبہ تک پہنچانے کے لیے بہت سے زینے باقی تھے۔ دوسری طرف فتوحات اسلامی کی کثرت کی وجہ سے اسلامی تمدن کا دائرہ ہر روز وسیع تر ہوتا جارہا تھا۔ واقعات اس کثرت سے پیش آتے کہ نصوص منقولہ سے استنباط واجتہاد کے بغیر ان کا حل نکالنا مشکل ہو گیا تھا، نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلم نے اس قدر وسعت حاصل کی تھی کہ زبانی روایت اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے وقت میں قدرتی طور پر ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنایا جائے نیز ہر روز پیش آنے والے مسائل کا

پیشگی حل تلاش کیا جائے۔

امام ابو حنیفہ نے فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین پر کئی جہات سے کام شروع کیا، جزئیات مسائل کو ایک لڑی میں پرویا، نصوص شرعیہ سے استفادے کی شکلیں متعین کیں، استنباط و استخراج کے اصول مقرر کیے اور مستقبل میں آنے والے مسائل کا پیشگی حل تلاش کرنے کے لیے "فقہ تقدیری" کے نام سے الگ الگ فن کی بنیاد ڈالی جو ان کا اختصاص بھی تھا۔

5.3.1 قانون اسلامی کی تدوین

امام ابو حنیفہؒ کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے انہیں لازوال عظمت عطا کی، یہ تھا کہ انہوں نے اس عظیم خلا کو پُر کر دیا جو خلافت راشدہ کے بعد شوریٰ کا سد باب ہو جانے سے اسلامی قانونی نظام میں واقع ہو گیا تھا۔ ایک صدی کے قریب اس حال پر گزر جانے سے جو نقصان رونما ہو رہا تھا اسے ہر صاحب فکر آدمی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف مسلم ریاست کے حدود سندھ سے اسپین تک پھیل چکے تھے۔ بیسیوں قومیں اپنے الگ الگ تمدن، رسم و رواج اور حالات کے ساتھ اس میں شامل ہو چکی تھیں۔ اندرون ملک مالیات کے مسائل، تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کے مسائل، شادی بیاہ کے مسائل، دستوری، دیوانی اور فوج داری قوانین وضوابط کے مسائل روز بروز سامنے آ رہے تھے۔ بیرون ملک دنیا بھر کی قوموں سے اس عظیم سلطنت کے تعلقات تھے اور ان میں جنگ، صلح، سفارتی روابط، تجارتی لین دین، بحری و بری مسافرت، کسٹم وغیرہ کے مسائل پیدا ہو رہے تھے اور مسلمان چوں کہ اپنا ایک مستقل نظریہ، اصول حیات اور قانون رکھتے تھے، اس لیے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے ہی نظام قانون کے تحت ان بے شمار نت نئے مسائل کو حل کریں۔ غرض ایک طرف وقت کا یہ زبردست چیلنج تھا جس سے اسلام کو سابقہ تھا اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ ملوکیت کے دور میں کوئی ایسا مسلم آئینی ادارہ باقی نہ رہا تھا جس میں مسلمانوں کے معتمد علیہ اہل علم اور فقیہ اور مدبر بیٹھ کر ان مسائل پر سوچتے اور شریعت کے اصولوں کے مطابق ان کا ایک مستند حل پیش کرتے جو سلطنت کی عدالتوں اور اس کے سرکاری محکموں کے لیے قانون قرار پاتا اور پوری مملکت میں یکسانی کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے امام ابو حنیفہؒ نے ایک سرکاری مجلس قانون وضع کی۔ جس کے ممبران امام ابو حنیفہؒ کے اپنے شاگرد تھے۔ ان میں سے قریب قریب ہر شخص امام کے علاوہ وقت کے دوسرے بڑے بڑے اساتذہ سے بھی قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے مددگار علوم، مثلاً لغت، نحو، ادب اور تاریخ و سیر کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ مختلف شاگرد مختلف علوم کے اختصاص کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس مجلس میں ۸۳ ہزار قانونی مسائل طے کیے گیے تھے۔ اس میں صرف وہی مسائل زیر بحث نہیں آتے تھے جو اس وقت تک عملاً لوگوں کو یا ریاست کو پیش آ چکے تھے؛ بلکہ معاملات کی امکانی صورتیں فرض کر کے ان پر بحث کی جاتی تھی اور ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا؛ تا کہ آئندہ کوئی نئی صورت پیش آ جائے جو اب تک پیش نہ آئی ہو تو قانون میں پہلے سے ہی اس کا حل موجود ہو۔

5.3.2 فقہ حنفی کے بنیادی خدوخال

فقہ حنفی مقبول ترین فقہ ہے۔ مؤرخین نے اس کی مقبولیت کا بڑی گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ مقبولیت کا سب سے اہم سبب اس کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

امام ابو حنیفہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن و سنت سے مسائل کے لیے استخراج و استنباط کے مناسب اصول وضع کیے۔ جن کی وجہ سے فقہ اسلامی ایک مستقل فن بن گیا۔ امام ابو حنیفہ نے ایسے وقت میں وضع اصول کی بنیاد ڈالی جب کہ بیشتر فنون ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھے۔ یہاں تک کہ نقل و کتابت کا رواج بھی بہت ہی کم تھا۔

یہ سچ ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں بھی قرآن و سنت سے استنباط مسائل کا رواج تھا اور فقہاء صحابہ و تابعین کچھ اصولوں کی بنیاد پر ہی یہ کام کیا کرتے تھے؛ مگر یہ اصول نہ منضبط تھے اور نہ ہی متعارف۔ چوں کہ امام ابو حنیفہ کے پیش نظر فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا تھا۔ اس لیے استنباط و استخراج مسائل کے ایسے فطری و بنیادی اصول وضع کرنے پڑے، جو انسانی معاشرے کی ضرورتوں کے مطابق ہوں اور ان سے استفادہ کرنا ہر ایک کے لیے آسان ہو۔ چناں چہ اصول اربعہ (قرآن، حدیث، اجماع، قیاس) کی توضیح، حدیث کے مراتب اور ان کے احکام، جرح و تعدیل کے اصول، اجماع کے حدود و ضوابط، قیاس کے اقسام و شرائط، احکام کی انواع، عموم کی خصوص و تحدید، رفع تعارض کے قواعد، فہم مراد کے طرق، یہ مسائل ہیں جو فقہ و اصول فقہ کے بنیادی ارکان ہیں اور ان تمام مسائل کے متعلق امام صاحب نے ضروری اصول و قواعد منضبط کیے، جو آج بھی فقہ حنفی کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جو آج نہ صرف فقہ حنفی بلکہ پوری فقہ اسلامی کی بنیاد ہیں جو بلا شبہ امام ابو حنیفہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

احادیث نبویہ سے اخذ و استفادہ کے متعلق امام ابو حنیفہؒ نے جو اصول وضع کیے، وہ فقہ اسلامی کی جان ہیں۔ امام صاحب نے تشریعی اور غیر تشریعی احادیث کی حیثیت متعین کر دی اور ان سے استفادہ کی راہیں مقرر کیں۔ اس کے علاوہ نقل و روایت میں ثقافت کے معیار اور احادیث کے قرآن اور عقل انسانی کے مطابق ہونے پر جو رائیں پیش کی ہیں، وہ بہت مہارت اور کمال علم کی دلیل ہیں۔

بحث احادیث کے علاوہ انہوں نے فقہ اسلامی کے لیے دوسرے اصول وضع کیے۔

(تواتر سے جو بات ثابت نہ ہو وہ قرآن نہیں ہے۔ قرآن مجید میں خبر احاد کے ذریعہ کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا، مطلق کا مقید پر اطلاق نص پر زیادتی ہے۔ قرآن مجید کی عمومیت خبر احاد سے خاص نہیں ہوتی۔ عام بھی خاص کی طرح قطعی ہے۔ خاص اگر متاخر ہو تو وہ خاص کو بھی عام کر دیتا ہے۔ کسی چیز کی ممانعت اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے۔)

فقہ حنفی کا دوسرا حصہ جو صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے حصے کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے اور وہ خاص حصہ ہے۔ اس میں امام ابو حنیفہ بلاشبہ تمام مجتہدین میں ممتاز ہیں؛ بلکہ علامہ شبلی نعمانی کے بقول اگر اسلام میں کوئی شخص واضع قانون گزرا ہے تو وہ صرف امام ابو حنیفہ ہیں۔

مسلمانوں میں توضیح قانون کا کام ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہے، جو مذہبی پیشوا تھے اور مذہبی قوانین میں نہایت غلو رکھتے تھے؛ لیکن امام ابو حنیفہ اس صف میں اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض کے اندازہ شناس تھے اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اس دوسرے حصے کی جس طرح تدوین کی اور جس ضبط و ربط سے اس کی جزئیات کا استقصاء کیا وہ اس زمانے کا نہایت وسیع قانون تھا اگرچہ اس کی تعبیر ایک عام لفظ فقہ سے کی جاتی ہے؛ لیکن در حقیقت اس میں بہت

سے قوانین تھے جو آج کی تعلیم یافتہ دنیا میں (ان ہی ابواب کے مسائل جو ترتیب دیئے گئے ہیں) وہ جدا جدا قانون کے نام سے موسوم ہیں۔ مثلاً قانون معاہدہ، قانون بیع، قانون لگان ومال گزاری، تعزیرات ضابطہ فوج داری وغیرہ وغیرہ۔

5.3.3 فقہ حنفی کی خصوصیات

1. فقہ حنفی کی سب سے اہم خصوصیت مسائل کا اسرار و مصالح پر مبنی ہونا ہے۔ احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ تمام احکام مقید ہیں، ان میں کوئی مصلحت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جب کہ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے؛ لیکن در حقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں، پھر اپنے موقف کی حمایت میں فریقین نے دلائل بھی فراہم کرنے کی کوشش کی۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر بحث واختلاف کے لائق نہ تھا۔ اس سے کون اختلاف کر سکتا ہے بیشتر احکام ومسائل کی مصلحت خود قرآن نے بیان کر دی ہے۔ مثلاً نماز کی مصلحت برائیوں سے روکنا ہے۔ "إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ" روزہ سے تقوی وطہارت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ شراب کے بارے میں فرمایا:

"وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا" اس طرح ہر مسئلہ اور حکم کے بارے میں وضاحتاً یا اشارتاً کوئی مصلحت ضرور بیان کی گئی ہے۔ امام ابو حنیفہ کا ابتداء سے ہی یہی مذہب رہا ہے اور اپنے تمام اصول میں انہوں نے اس بات کو ضرور پیش نظر رکھا ہے۔

2. حنفی فقہ دوسری فقہوں کی بہ نسبت زیادہ سہل العمل ہے۔ یہ بات قرآن وسنت کے مزاج کے عین موافق ہے۔ قرآن میں بڑی وضاحت کے ساتھ متعدد بار کہا گیا ہے کہ اللہ تم لوگوں کے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں آسان شریعت لے کر آیا ہوں۔" آپ ہی کا مشہور قول ہے "الدین یسر"۔

امام ابو حنیفہ نے اپنی فقہ میں قرآن وسنت کی ان واضح ہدایات کے پیش نظر نرمی وسہولت کا بھرپور خیال رکھا ہے، ان کے مسائل ایسے نرم اور آسان ہیں جو شریعت اسلامی کے شایان شان ہیں۔

3. امام ابو حنیفہؒ کے عہد تک "معاملات" کے احکام بالکل ابتدائی حالت میں تھے، جو متمدن اور تہذیب یافتہ ملک کے لیے بالکل ناکافی تھے۔ اس وقت تک نہ معاہدات کے استحکام کے قاعدے منضبط تھے، نہ دستاویزات وغیرہ کی تحریر کا اصول قائم ہوا تھا، نہ فصل قضایا اور ادائے شہادت کا کوئی قاعدہ طریقہ تھا۔ امام ابو حنیفہؒ پہلے شخص ہیں جو ان چیزوں کو قانون کی صورت میں لائے اور اس میں اس درجہ مہارت دکھائی کہ بعد کے ائمہ ومجتہدین میں سے بھی کوئی ایسا جامع اور متوازن قانون نہ بنا سکا۔ فقہ اسلامی کا جن لوگوں نے تقابلی مطالعہ کیا ہے، سب نے فقہ حنفی کی اس خصوصیت کا فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے 'سیرۃ النعمان' میں متعدد مثالوں سے اس فرق کو بڑی اچھی طرح واضح کیا ہے۔

4. فقہ اسلامی کی ایک اور نمایاں خصوصیت ذمیوں کے حقوق سے متعلق ہے۔ فقہ حنفی نے اہل الذمہ کو جس فیاضی اور آزادی کے

حقوق دیے ہیں، اس کی نظیر نہ تو کسی فقہی مسلک میں پائی جاتی ہے اور نہ ہی حقوق انسانی اور مساوات کی علم بردار حکومتوں میں سے کسی نے وہ حقوق دیے ہیں۔

5. فقہ حنفی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو احکام نصوص سے ماخوذ ہیں اور جن میں ائمہ کا اختلاف ہے، ان میں امام ابو حنیفہ جو پہلو اختیار کرتے ہیں وہ بالعموم قوی اور مدلل ہوتا ہے۔

5.3.4 فقہ شافعی

فقہ شافعی منقولات و معقولات کا حسین امتزاج سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بانی و پیشوا تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، ادب، بلاغت اور نحو و صرف ہر فن کے ماہر تھے۔ اگرچہ فقہ و حدیث سے خاص دل چسپی تھی؛ لیکن انہوں نے زندگی بھر اپنے آپ کو مذکورہ تمام علوم سے وابسطہ رکھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ان کے حلقۂ درس میں تمام فنون کی بیک وقت تعلیم ہوتی تھی اور ان کے حلقے سے ہر فن کے ماہر نکلتے تھے۔

فقہ اسلامی آپ کا میدان اختصاص تھا۔ انہوں نے جب آنکھ کھولی، فقہ حنفی اچھی طرح متعارف ہو چکی تھی اور مدینہ منورہ اور اس کے مضافات میں امام مالکؒ مرجع خلائق بنے ہوئے تھے۔ دوسرے مختلف علاقوں میں مختلف ائمہ کا چرچا تھا۔ بہت سے باطل فرقوں نے بھی سر اٹھالیا تھا، ان کے فقہ و فتاوی کی راہیں بھی الگ تھیں۔ امام شافعی نے سب کو قریب سے دیکھا، جانچا اور پرکھا، ان کی نگاہوں میں ہر مسلک اصول و کلیات کے لحاظ سے افراط و تفریط کا شکار نظر آیا۔ حنفیہ استحسانی اصول پر مصر تھے۔ مالکیہ تعامل مدینہ کو حجت مانتے تھے۔ چناں چہ ان کے دل میں فقہ اسلامی کو اعتدال پر لانے کا جذبہ پیدا ہوا اور ایک مسلک کی داغ بیل رکھی پھر اس کے لیے باقاعدہ اصول و قوانین وضع کیے گیے ان کی روشنی میں تمام مسائل زندگی کو پرکھا اور اسے قرآن و سنت سے قریب تر پا کر مدلل انداز میں عملی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اسلامی علوم و فنون میں مہارت کے علاوہ صالحانہ طبیعت، مجتہدانہ ذوق اور ذمہ دارانہ مزاج عطا کیا اس لیے آپ کا مسلک اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔

5.3.5 اصول شافعی

امام شافعیؒ کا فقہ اسلامی پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے فن اصول فقہ کو رواج دیا۔ نصوص سے استفادہ، غیر منصوص مسائل کی تخریج اور قیاس و استنباط کی شکلیں متعین کیں۔ امام شافعی کے عہد تک فقہ مالکی اور فقہ حنفی کے اہم بنیادی اصول متعارف ہوتے تھے؛ مگر ان کے پاس استنباط مسائل کی تفصیلات موجود نہ تھیں۔ امام شافعی نے اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، اسی وجہ سے انہیں بانیانِ اصول فقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

5.3.6 مصادر شریعت

امام شافعیؒ کے نزدیک مصادر شریعت میں قرآن و سنت پہلے نمبر پر ہیں اور دونوں کا درجہ برابر ہے۔ اس وجہ سے کہ بہت سے معاملات میں دونوں کی نوعیت ایک سی ہے۔ اس کے لیے وہ صرف صحت اور اتصال کی شرط لگاتے ہیں جب کہ امام ابو حنیفہؒ صرف مشہور

احادیث کو اس مرتبہ پر رکھتے ہیں اور امام مالکؒ صرف ان احادیث کو جو تعامل اہل مدینہ کے خلاف نہ ہوں۔ خبر واحد کے مقابلے میں ان کے نزدیک اجماع قابل ترجیح ہے اور احادیث میں مختلف معانی کا احتمال ہونے کی صورت میں ظاہری معانی کو ترجیح دی جائے گی اور اگر دو حدیثوں میں ٹکراؤ ہو تو سند کے اعتبار سے جو زیادہ مضبوط ہو اس پر عمل کیا جائے گا۔ صحابہ کرام کے اقوال کو بھی وہ بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اگر کسی صحابی کی رائے قرآن و سنت کے مطابق ہو اور دوسرے صحابی نے اس سے اختلاف نہ کیا ہو تو امام صاحب کے نزدیک یہ رائے قیاس کے مقابلہ میں ترجیح پائے گی؛ کیوں کہ ان کے بقول صحابہ کرامؓ علم و تقوی، فہم و فراست اور امانت و دیانت میں بہر حال بعد کے لوگوں سے افضل ہیں۔ اس لیے ان کے فتاوی میں صحت و صداقت کا زیادہ امکان ہے۔

تابعین کے اقوال کے سلسلے میں امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ وہ ترجیح میں معاون تو ہو سکتے ہیں؛ مگر قابل حجت نہیں۔ جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے کہ قیاس ان کے نزدیک آخری طریقہ استنباط ہے اور اس کے لیے بھی شرط لازمی ہے کہ وہ کتاب و سنت کی اساس پر مبنی ہو؛ کیوں کہ یہی مصادر شریعت اسلامی کی بنیاد ہیں اور کوئی چیز ان کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔

5.3.7 شریعت اسلامی کے ثانوی مآخذ

شریعت اسلامی کے ضمنی مآخذ میں حنفی مسلک کے استحسان کے وہ سخت مخالف ہیں، اسے وہ 'ذہنی عیاشی' قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے امام محمدؒ اور دوسرے علماء سے کئی بار مناظرے کیے اور کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر وہ اجتہاد جو کتاب و سنت، اثر و اجماع یا قیاس پر مبنی نہ ہو استحسان کہلاتا ہے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں مجتہد کسی دلیل یا دلالۃ النص کی رو سے فیصلہ نہیں کرتا؛ بلکہ جسے مستحسن خیال کرتا ہے اس کے مطابق فتوی دیتا ہے۔ یہ اجتہاد باطل کی ایک قسم ہے، جس کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی طرح مالکی مسلک کے 'اصول مصالح' مرسلہ کے بھی شدید مخالف ہیں، وہ مصالح کو صرف اسی وقت معتبر مانتے ہیں جب کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی بیان کردہ مصالح کے مشابہ ہوں اور ثابت شدہ احکام سے ان کا لازماً کوئی تعلق ہو۔ بصورت دیگر ایسے کسی اصول کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

5.3.8 فقہ شافعی کی امتیازی خصوصیات

1. فقہ شافعی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ منقولات و معقولات کا حسین امتزاج ہے۔ امام شافعیؒ نے خوش قسمتی سے جو دور پایا تھا وہ علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے ارتقاء کا زریں دور کہلاتا تھا، حدیثیں جمع ہو چکی تھیں، مختلف فقہی مکاتب فکر ظہور میں آ گئے تھے۔ علم کلام کا علمی دنیا میں چرچہ ہونے لگا تھا، جس کی وجہ سے تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں علم و عقل دونوں کو یکساں معاون سمجھا جا رہا تھا۔

امام شافعیؒ کو جہاں علوم اسلامیہ کا گہرا ادراک تھا، وہیں وہ کلامی مباحث اور اجتہادی کوششوں سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے ان علوم و معارف کی مدد سے ایک نئے فقہی اسکول کی بنیاد رکھی۔ جس کی اصل بنیاد تو نصوص شرعیہ پر قائم ہے اور جو زمانہ کی ضروریات اور

تقاضوں کو پوری کرنے کی بھی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

2. فقہ شافعی کا ہر جذبہ اصول پر مبنی ہے۔ امام شافعی اور ان کے شاگردوں نے جزئیات کی تخریج کے مقابلے میں اصول کی جانب زیادہ توجہ دی ہے۔ چناں چہ دوسرے مکاتب فکر کے مقابلے میں فقہ شافعی کے اصول زیادہ جامع اور مستنبط ہیں۔

3. فقہ شافعی کو نصوص شرعیہ سے قریب اور سب سے زیادہ سہل العمل سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا انحصار ظواہر پر ہے اور اس میں روح شریعت کی زیادہ رعایت رکھی گئی ہے۔

5.3.9 فقہ شافعی کا نشوونما

اس مذہب کو قبول عام بنانے کے لیے اس کی داخلی خصوصیات کے علاوہ امام صاحب کے تلامذہ اور متبعین کی مخلصانہ کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ بہت سے حکمراں بھی شافعی مسلک کے پیرو رہے، اس لیے حکومت کی سطح سے بھی اسے خاصا فروغ ملا۔ اس مسلک کی توسیع واشاعت میں ان کے جن شاگردوں یا متبعین نے نمایاں کردار ادا کیا ان کے نام یہ ہیں:

1. ابو بکر حمید، بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ مکہ مکرمہ میں امام صاحب کی شاگردی اختیار کی ان کے ساتھ مصر تک آئے اور یہیں انتقال کیا۔

2. ابو بکر محمد بن ادریس، امام شافعی کے قابل فخر شاگردوں میں سے ہیں۔

3. ابوالولید موسی بن ابی الجارود، انہوں نے امام شافعی کی کئی کتابیں روایت کی ہیں۔

4. ابو علی حسن مصباح زعفرانی، بغداد میں امام شافعی کے ہاں زانوئے تلمذ طے کیا۔

5. ابو علی حسن بن علی کرابیسی، یہ بہت بڑے، عالم، متقی اور مصنف تھے۔

6. ابو ثور کلبی۔

7. ابوعبدالرحمن احمد بن محمد بن یحی اشعری عصری۔

8. حرملہ بن یحی بن حرملہ، یہ بلند پایہ شخصیت کے حامل تھے۔

9. ابویعقوب یوسف بن یحی بویطی، بہت بڑے عالم، فقیہ، زاہد اور متقی شخص تھے۔

10. محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم، بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔

امام شافعیؒ کے مسلک کو سب سے زیادہ مصر میں فروغ ملا۔ بنی ایوب کے زمانے میں فقہ شافعی حکومت مصر کا سرکاری مسلک تھا۔ یہاں عہدۂ قضا شافعیوں کے لیے مخصوص تھا اور مدت دراز تک شیخ الازہر کا منصب بھی انہیں کے لیے مخصوص رہا، اس مسلک کو فروغ دینے کے لیے یہاں باقاعدہ کئی مدارس کا قیام عمل میں آیا، عراق اگرچہ حنفیوں کا قلعہ تھا؛ لیکن ماوراء النہر، خراسان، شام، اردن، لبنان، فلسطین اور حجاز میں بھی اس نے رسوخ حاصل کرلیا۔ ترکیہ وایران کے سنی علماء ہندوستان کے ساحلی علاقے اور پاکستان وبنگلہ دیش کے ایک حصے میں

بھی اس مذہب کی پذیرائی ہوئی اور آج یہ عالم اسلام کا دوسرا یا تیسرا بڑا مذہب ہے اور اس کے مقلدین کی تعداد پروفیسر ماسینیوں کے بقول دس کروڑ سے زیادہ ہے۔ فقہ شافعی کو بھی اپنے ارتقائی ادوار میں مد مقابل مسالک، فقہ حنفی، فقہ مالکی اور فقہ جعفری سے مصروف پیکار بھی ہونا پڑا اور یہ ازم و پیکار کئی مرتبہ خوں ریزی تک پہنچ گئی۔

5.4 کلیدی الفاظ

خبر احاد	:	وہ حدیث جسے ہر دور کے ایک راوی نے بیان کیا ہو۔
جرح و تعدیل	:	ایسے فن کو کہا جاتا ہے جس میں رواۃ حدیث پر بحیثیت قبول ورد، مخصوص الفاظ کے ذریعے کلام کیا جائے اور ان الفاظ کے مراتب پر بحث کی جائے۔
تدوین	:	جمع و ترتیب، تالیف، جمع کرنا
استحسان	:	لغوی معنی اچھا سمجھنا، شرعی نقطہ نظر سے کسی قوی تر دلیل کی بنیاد پر قیاسی حکم کو ترک کر دینا استحسان ہے۔
اجماع	:	لغوی معنی اتفاق، کسی زمانے کے تمام مجتہدین کسی مسئلہ کے بارے میں ایک حکم پر متفق ہو جائیں۔
اجتہاد	:	کوشش کرنا، اصطلاح میں شریعت کے تفصیلی دلائل کی روشنی میں کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کے لیے آخری درجہ کی کوشش کرنا۔
استنباط	:	اصطلاح فقہ میں اصول و قواعد کی روشنی میں قرآن و حدیث سے مسائل کا حکم نکالنا۔
استصحاب	:	ساتھی بنانا یا صحبت کو برقرار رکھنا، اصطلاح میں سابق حکم یا حالت کو باقی رکھا جائے جب تک کہ اس کو بدلنے والی کوئی دلیل نہ پائی جائے۔
مصالح مرسلہ	:	اصطلاح میں ایسی مصلحتیں کہ شریعت نے نہ ان کے معتبر ہونے کی صراحت کی ہے اور نہ نفی کی کہ ان کا اعتبار کیا جائے۔
سد ذرائع	:	سبب کو بند کرنا، اصطلاح میں ایسے اسباب جو بذات خود حرام نہ ہوں لیکن کسی فساد یا حرام تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہوں۔

5.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- فقہ اسلامی کا اولین اور بنیادی ماخذ قرآن مجید ہے۔ امام مالکؒ ہر جگہ اس سے بھرپور استدلال کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ عام طور سے

یہ ہوتا ہے کہ ایسی قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہیں، جن میں کسی قسم کی اصطلاحی باریک بینی نہیں ہوتی۔

- امام مالکؒ کا مسلک حجاز سے نکل کر اگرچہ عراق کے بعض شہروں بغداد، بصرہ اور خراسان کے شہروں قزوین، ابہر اور نیشاپور میں بھی پھیلا؛ لیکن مالکی مسلک کو زیادہ تر فروغ بلاد مغرب وافریقہ، تونس، الجزائر، مراکش، اندلس اور مصر میں ہوا۔
- امام ابو حنیفہؒ نے فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین پر کئی جہات سے کام شروع کیا، جزئیات مسائل کو ایک لڑی میں پرویا، نصوص شرعیہ سے استفادے کی شکلیں متعین کیں، استنباط واستخراج کے اصول مقرر کیے اور مستقبل میں آنے والے مسائل کا پیشگی حل تلاش کرنے کے لیے "فقہ تقدیری" کے نام سے الگ فن کی بنیاد ڈالی جو ان کا اختصاص بھی تھا۔
- احادیث نبویہ سے اخذ واستفادہ کے متعلق امام ابو حنیفہؒ نے جو اصول وضع کیے وہ فقہ اسلامی کی جان ہیں۔ امام صاحب نے تشریعی اور غیر تشریعی احادیث کی حیثیت متعین کر دی اور ان سے استفادہ کی راہیں مقرر کیں، اس کے علاوہ نقل وروایت میں ثقافت کے معیار اور احادیث کے قرآن اور عقل انسانی کے مطابق ہونے پر جو رائیں پیش کی ہیں وہ بہت مہارت اور کمال علم کی دلیل ہیں
- تابعین کے اقوال کے سلسلے میں امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ وہ ترجیح میں معاون تو ہو سکتے ہیں مگر قابل حجت نہیں۔ جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے کہ قیاس ان کے نزدیک آخری طریقۂ استنباط ہے اور اس کے لیے بھی شرط لازمی ہے کہ وہ کتاب وسنت کی اساس پر مبنی ہو۔
- امام شافعیؒ کا فقہ اسلامی پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے فن اصول فقہ کو رواج دیا۔ نصوص سے استفادہ، غیر منصوص مسائل کی تخریج اور قیاس واستنباط کی شکلیں متعین کیں۔

5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ابو حنیفہؒ کا مسکن و مولد کہاں تھا؟

(a). عراق　(b). مکہ　(c). مدینہ　(d). ان میں سے کوئی نہیں

2. اصول فقہ کے فن کو کس نے رائج کیا؟

(a). ابو حنیفہؒ　(b). امام مالکؒ　(c). امام شافعیؒ　(d). امام احمد بن حنبلؒ

3. ابو بکر محمد بن ادریس کس کے شاگرد ہیں؟

(a). ابو حنیفہؒ　(b). امام مالکؒ　(c). امام شافعی　(d). امام احمد بن حنبلؒ

4. بنی ایوب کے زمانے میں مصر کا سرکاری مسلک کون سا تھا؟

(a). فقہ مالکیؒ　(b). فقہ حنفیؒ　(c). فقہ شافعیؒ　(d). ان میں سے کوئی نہیں

5. مصالح مرسلہ کا اصول کن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے؟

(a). امام احمدؒ (b). امام اوزاعیؒ (c). امام مالکؒ (d). امام بخاریؒ

5.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. فقہ مالکی کے حلقہ اثر پر گفتگو کیجیے۔
2. فقہ حنفی کے خدوخال پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔
3. فقہ حنفی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
4. فقہ شافعی کی نشوونما پر نوٹ تحریر کیجیے۔
5. فقہ شافعی کی امتیازی خصوصیات تحریر کیجیے۔

5.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. فقہ مالکی پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
2. فقہ حنفی پر ایک مفصل مضمون تحریر کیجیے۔
3. فقہ شافعی پر جامع مضمون قلم بند کیجیے۔

5.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. حیاۃ الامام مالک : محمد ابوزہرہ مصری
2. سیرۃ النعمان : علامہ شبلی نعمانی
3. الشافعی، حیاتہ وعصرہ– آراؤہ وفقہہ : محمد ابوزہرہ مصری
4. حیاۃ حیاتہ وعصرہ، آراؤہ وفقہہ : محمد ابوزہرہ مصری
5. مناقب الشافعی : ابوبکر، احمد بن حسین بیہقی

اکائی 6: اہم فقہی مسالک (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 فقہ حنبلی

6.2.1 امام احمد بن حنبل کی فقہی کاوشیں

6.2.2 فقہ حنبلی کے ناقلین

6.2.3 فقہ حنبلی کے مصادر وماخذ

6.2.4 فقہ حنبلی کی خصوصیات

6.2.5 فقہ حنبلی کا حلقہ اثر

6.3 فقہ جعفری

6.3.1 قرآن مجید

6.3.2 حدیث

6.3.3 اجماع

6.3.4 عقل

6.3.5 ضمنی ماخذ

6.3.6 فقہ جعفری کی امتیازی خصوصیات

6.4 فقہ اہل حدیث

6.4.1 فقہ اہل حدیث کی خصوصیات

6.5 کلیدی الفاظ

6.6 اکتسابی نتائج

6.7 نمونہ امتحانی سوالات
6.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

فقہی مسلک میں مختلف علما اور اماموں نے علمی و فکری صلاحیتوں سے اپنے دور میں ضرورت کے تحت قرآن و حدیث کی روشنی میں مسائل استنباط کیے۔ ان ائمہ کے زیر اثر فقہی مسالک وجود میں آئے۔ پچھلی اکائی میں آپ نے فقہ مالکی، حنفی اور شافعی کے بارے میں پڑھا۔ اس اکائی میں آپ فقہی مکاتب حنبلی، جعفری اور اہل حدیث کے بارے میں جانیں گے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ فقہ حنبلی، فقہ جعفری اور فقہ اہل حدیث کی خصوصیات، ان کے حلقہ اثر کے بارے میں جان کاری حاصل کرسکیں۔

6.2 فقہ حنبلی

امام احمد بن حنبلؒ علم حدیث کے میدان میں مستقل مجتہد کے درجے پر فائز تھے، جنھوں نے بقول ابن تیمیہ الحرانی احادیث واخبار کے اس انبار میں سے جو آپ کو اپنے بہت سے شیوخ سے ملا تھا، اپنا مسلک خود قائم کر لیا۔ اس لیے آپؒ کو امام محمد بن جریر طبریؒ کی طرح محض محدث کسی بھی صورت میں نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح نہ آپؒ صرف فقیہ تھے کہ جس کا صرف شرعی اصول و قواعد فقہ سے تعلق ہوتا ہے؛ جیساکہ ابن عقیل نے تحریر کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے اختیار کردہ بعض مواقف ایسے ہیں کہ جنھیں آپ علیہ الرحمہ نے اسی خوبی سے احادیث پر مبنی کیا ہے کہ اس کی مثال شاذ ہی کہیں ملے گی اور آپ کے بعض فتاویٰ اس بات کے شاہد ہیں کہ آپ کی فقیہانہ باریک بینی عدیم النظیر تھی۔

بلاشبہ امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کو زیادہ تر شہرت خدمت حدیث کی وجہ سے حاصل ہے؛ کیوں کہ ان کی زیادہ تر علمی کاوشوں کا محور اخبار و آثار ہی ہیں۔ تاہم یہ مسلم حقیقت ہے کہ احادیث سے زیادہ شغف اور دل چسپی کے باوجود وہ فقہ اسلامی میں بھی درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے، اسی وجہ سے فقہ اسلامی کے چار ستونوں میں متفقہ طور سے ان کا بھی شمار ہوتا ہے اور ان کے مقلدین کی تعداد ہر زمانے میں

لاکھوں میں موجود رہی ہے۔

6.2.1 امام احمد بن حنبل کی فقہی کاوشیں

1. امام احمدؒ نے فقہ اسلامی پر کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ ان کا مجتہدین عصر مثلاً: امام شافعیؒ اور حافظ ہیثم وغیرہ سے شاگردانہ تعلق رہا۔ ان کی مخصوص تربیت اور عنایات کی وجہ سے خود ان کے اندر اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ آزادانہ و مجتہدانہ طور پر فتوی دینے لگے۔ تاہم ان کے تمام فتاوی ورائیں، احادیث رسول یا آثار ہی سے ماخوذ ہوتیں۔ اسی طرح انہوں نے ہزاروں مسائل کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کیا، جنہیں عوام میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور بعد میں ان کے شاگردوں نے نقل وروایت کے ذریعہ انہیں ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا۔

6.2.2 فقہ حنبلی کے ناقلین

امام احمدؒ سے روایت و فتاوی کی سماعت بے شمار لوگوں نے کی۔ ان میں بعض لوگ روایات و آثار میں نقل و سماعت کے لیے اختصاص رکھتے تھے جو روایات و فتاویٰ دونوں کی ایک ساتھ روایات کرتے تھے۔ اس طرح فقہ احمد کے ناقلین بے شمار پائے جاتے ہیں۔ چند وہ حضرات جنہوں نے فقہی مسائل واجتہادات کی نقل واشاعت میں زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

1. صالح بن احمد بن حنبلؒ (متوفی:244ھ)۔ یہ امام احمد بن حنبلؒ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔ تعلیم وتربیت والد محترم نے کی اور اپنا علمی وفکری جاں نشین بنانے کے لیے مخلصانہ کوشش کی۔ امام احمد کے علاوہ دیگر معاصر علماء سے بھی استفادہ کیا۔

2. ابو بکر احمد بن محمد ہانی الاثرم۔ یہ امام احمد بن حنبل کے ان شاگردوں میں تھے جو پختگی کی عمر تک پہنچنے کے بعد امام صاحب کے دامنِ فضل وکمال سے وابسطہ ہوئے تھے۔

3. عبد الملک بن عبد الحمید بن مہران المیمونی۔ امام احمد بن حنبل کے خصوصی شاگرد تھے؛ لیکن اس کے باوجود دیگر معاصر علماء سے بھی استفادہ کیا۔ انہیں حدیث کے مقابلہ میں فقہ سے زیادہ دل چسپی تھی۔

4. احمد بن محمد بن حجاج ابو بکر ابن راہویہ المروذی (متوفی:275ھ)، امام احمد بن حنبلؒ کے مخصوص و مقرب شاگردوں میں تھے، حدیث وفقہ دونوں موضوع پر درک حاصل تھا۔ فقہ و فتاویٰ سے زیادہ دل چسپی تھی۔ انہوں نے امام احمد سے 'کتاب الورع' روایت کی ہے۔ بعض ناقدین حدیث نے ان پر جرح کیا ہے؛ لیکن عبد الوہاب ورّاق نے اس طعن کو معاصرانہ چشمک کا نتیجہ بتایا ہے۔

5. حرب بن اسماعیل حنظلی کرمانی (متوفی:280ھ)، ابتداءاً ان کا میلان تصوف کی جانب تھا پھر امام احمد بن حنبلؒ کی صحبت وتربیت کی وجہ سے حدیث وفقہ کا خاص ذوق پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے بلا کی ذہانت اور قوت حافظہ عنایت کی تھی۔

6. ابراہیم بن اسحق حربی (متوفی:285ھ)، ابن ابی لیلیٰ کے بقول یہ علم کے امام، زہد کے سردار فقہ کے رمز آشنا، احکامِ فقہی کے ماہر اور حدیث کے حافظ تھے۔ بیس سال امام احمد کے حلقۂ درس میں شریک رہے اور حدیث وفقہ کے ساتھ امام صاحب کی شخصی خصوصیات

زہد، تقوی، امانت، صبر اور توکل کے بھی مثیل تھے، فقہ حنبلی کا بڑا حصہ آپ کے واسطہ سے بعد کے لوگوں تک منتقل ہوا۔

7. احمد بن محمد بن ہارون ابو بکر الخلال (متوفی: 311ھ)، فقہ حنبلی کی خدمت ان کا خاص مشغلہ تھا، اس کی جمع و ترتیب کے لیے دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور بے پناہ مصیبتوں کا سامنا کر کے اس سلسلہ کا ہر ممکن مواد حاصل کیا اور ایک ترتیب کے ساتھ اپنی کتاب "الجامع الکبیر" میں اکٹھا کیا، جو بلاشبہ فقہ حنبلی کا سب سے اہم اور بڑا مجموعہ ہے۔

8. عمر بن الحسنین الحزنی وغیرہ۔ فقہ حنبلی کے کبار ائمہ میں اِن کا شمار ہوتا ہے، 'خلال' کے لائق شاگردوں میں تھے۔ انہی کی وساطت سے مروّذی، صالح اور عبد اللہ سے مرویات حاصل کیں۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں صرف "المختصر" کو شرف بقا حاصل ہوا۔

6.2.3 فقہ حنبلی کے مصادر و مآخذ

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی شریعت اسلامی کے مآخذ وہی ہیں جو دوسرے فقہاء کے ہیں؛ مگر ان کے مراتب اور استفادہ کی نوعیت میں قدرے فرق ہے۔ اس ضمن میں وہ سب سے بلند رتبہ قرآن کو دیتے ہیں، جسے لفظی طور پر سمجھا جائے اور اس کی تشریح میں تاویل یعنی مجازیا تمثیلی تفاسیر کا استعمال نہ کیا گیا ہو پھر قرآن کے بعد سنت کا درجہ ہے۔ اس سے مراد وہ تمام احادیث ہیں، جن کے متعلق یہ یقین ہو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ آپ کے اپنے بیان کے مطابق آپ کا مقصد یہ تھا کہ اپنی مسند میں وہ احادیث جمع کریں جو آپ کے زمانے میں عام طور پر مسلم (مشہور) تھیں۔

6.2.4 فقہ حنبلی کی خصوصیات

1. فقہ حنبلی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دار و مدار نصوص و منقولات پر ہے۔ عبادات کے سلسلے میں خاص طور سے وہ قیاس آرائی کے قائل نہیں ہیں۔ معاملات اور دوسرے شرعی امور میں قیاس سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر انتہائی ناگریز حالات میں اسی وجہ سے فقیہ و مجتہد کے بجائے امام احمدؒ کو زیادہ شہرت محدث کی حیثیت سے ملی۔ انہوں نے جو تحریری سرمایہ چھوڑا وہ بھی پورا کا پورا احادیث ہی سے تعلق رکھتا ہے۔
2. دینی معاملات میں بدعات سے اجتناب فقہ حنبلی کی دوسری امتیازی خصوصیت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کبھی ایسے معاملات میں فتوی نہیں دیا جو ابھی وقوع پذیر نہ ہوئے ہوں۔
3. فقہ حنبلی میں "سدّ ذرائع" کی اصل پر بہت زور دیا گیا۔ فقہاء حنابلہ کے نزدیک وسائل کا حکم بھی وہی ہے، جو غایات کا ہے۔ یعنی جو امور حرام ہیں، ان کے مسائل و مقدمات بھی حرام ہوں گے۔ فقہ حنبلی کی اس اصل میں تمام دوسرے مسالک کے مقابلے میں زیادہ سہولت ہے؛ بلکہ پروفیسر ابو زہرہ کے بقول "اس فقیہانہ انداز فکر نے اس زندۂ جاوید مذہب میں ایک قسم کی تر و تازہ زندگی اور وسعت قائم کر دی ہے"۔

6.2.5 فقہ حنبلی کا حلقہ اثر

چاروں فقہی مسالک میں فقہ حنبلی کو سب سے کم مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کا حلقہ اثر بہت محدود رہا۔ بغداد سے اس کا آغاز ہوا، جب کہ فقہ حنبلی وہاں سے پہلے ہی جڑ پکڑ چکی تھی۔ بغداد سے ماوراء النہر پہنچا۔ وہاں البتہ خوب پھلا پھولا، پھر فاطمی عہد حکومت میں مصر میں قدم رکھا، فاطمی سلطنت کے خاتمہ کے بعد ایوبی تخت پر متمکن ہوئے، جو شافعی المسلک تھے۔ انہوں نے دوسرے مذاہب کی شدت سے مخالفت کی اور شافعیہ کے علاوہ کسی کو پنپنے نہیں دیا۔ حکمراں کے جبر سے تنگ آ کر مصر سے حنبلی فقہاء نے مختلف شہروں وصوبوں میں پناہ لی اور وہاں اپنے مسلک کی اشاعت کی۔ اٹھارویں صدی میں شیخ عبد الوہابؒ کی تحریک اصلاح کے ساتھ سرزمین نجد وحجاز میں یہ مسلک داخل ہوا اور حکومت کی سرپرستی میں پہلی بار باقاعدہ فروغ ملا۔ چناں چہ وہاں عوام وخواص کے ہر طبقہ میں اسے مقبولیت حاصل ہے اور اس کے فروغ و اشاعت کی ہر سطح پر کوشش کی جارہی ہے۔ فقہ حنبلی کی عدم قبولیت کا مختلف طریقوں سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ علامہ ابن خلدون کا کہنا ہے کہ ”خبر وروایت سے شدتِ اعتناء اور اجتہادی عمل سے دوری کی وجہ سے اسے زیادہ قبولیت حاصل نہ ہوئی“ لیکن پروفیسر ابوزہرہ نے اس الزام کی سختی سے تردید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قوت اجتہاد اور حالات وزمانہ کی رعایت فقہ حنبلی میں کسی مسلک سے کم نہیں ہے۔ اس کی عدم قبولیت کا پروفیسر موصوف نے دوسری طرح سے تجزیہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اس کے اسباب درج ذیل ہیں:

1. تمام فقہی مسالک میں سب سے آخر میں اس کے اصول وخواص متعارف ہوئے۔ جب کہ ماسبق مسالک اسلامی شہروں میں اچھی طرح نفوذ کر چکے تھے۔ اس لیے اسے پھلنے پھولنے کی زمین ہی بہت کم میسر ہوئی۔
2. امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے اصحاب ہمیشہ جاہ ومنصب سے دور رہے۔ اس کے برعکس اہل عراق کے درمیان مذہب حنفی اور اندلس ومغرب اقصیٰ میں مذہب مالکی کی نشر واشاعت کا راز یہ تھا کہ ان کے علماء اور قضاۃ بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے۔ امام ابو حنیفہؒ اگر اصرار کے باوجود زندگی بھر جاہ ومنصب سے دور رہے۔ لیکن ان کے شاگرد بار بار منصب قضا پر فائز ہوئے۔ امام زفرؒ نے امام ابو حنیفہؒ کی زندگی ہی میں بصرہ کا منصب قضا قبول کر لیا۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے ہارون الرشید کے دور میں منصب قضا کو پابندی کے ساتھ نبھایا اور کوئی سرکاری منصب عرصۂ دراز تک قبول نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے یہ مسلک ہمیشہ سرکاری سرپرستی سے محروم رہا۔
3. اس کا ایک سبب امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے متبعین کے وہ مخصوص حالات بھی ہیں جن کی وجہ سے انہیں انتہائی مشکل مرحلوں سے گزرنا پڑا جس کے ردعمل میں ان کے اندر شدید قسم کا تعصب پیدا ہو گیا، جس نے اس کی عمومی قبولیت میں خاصی رکاوٹ پیدا کی۔

6.3 فقہ جعفری

اہل سنت والجماعت کے فقہی مسالک کی طرح شیعہ فقہ میں بھی کئی مسلک پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مقبول اور

غالب مسلک اثنا عشری شیعہ کا ہے۔ انہی کو امامیہ بھی کہتے ہیں۔ اس فرقے کا نام امامیہ اس وجہ سے پڑا کہ یہ مسئلہ امامت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، اماموں کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے اور امام مہدی منتظر کا قائل ہے۔

عقائد کے اختلاف کی وجہ سے ان کی فقہ اور اصول فقہ میں بھی بکثرت اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ اس لیے درج ذیل صفحات میں اس کا تفصیل کے ساتھ تعارف کرایا جارہا ہے۔

فقہ جعفری کے بانی امام جعفر الصادق کے والد محمد باقرؒ ہیں۔ امامیہ روایات کے مطابق انہوں نے فقہ کے بنیادی اصول مرتب کیے اور انہیں کی روشنی میں مسائل کا استنباط واستخراج کیا۔ ان کے بعد امام صادق نے اسے پروان چڑھایا اور مختلف مسائل پر اپنے فتاوی کے ذریعہ اس فقہ کو مالا مال کیا؛ کیوں کہ فقہ و فتاویٰ سے آپ کو خصوصی دل چسپی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ صحیح معنوں میں والد بزرگوار کے جاں نشین تھے، ان کی فقہی مہارت اور اجتہادی کوششوں سے خصوصی استفادہ کیا تھا۔ ان کی تمام تر ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں، ان کی فقہی مہارت کو ہر مکتبۂ فکر کے علماء نے تسلیم کیا ہے اور اپنے دور کے نامور ائمہ میں شمار کیا ہے۔ شیعہ امامیہ ان کو مطلق مجتہد تصور کرتے ہیں، ان کے نزدیک ان کا علم بھی "وہبی" تھا اور ان کے زمانے میں کوئی بھی شخص ان کے پایے کا عالم نہیں تھا۔ ان کا ہر قول بہر صورت واجب الاتباع ہے، اور ان کی رایوں کے خلاف رائے کرنا ممنوع ہے۔ مگر علمائے اہل سنت کے یہاں کسی امام کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

فقہ جعفری میں شریعت اسلامی کے بنیادی مآخذ

فقہ جعفری میں شریعت اسلامی کے بنیادی مآخذ وہی ہیں جس کے علمائے جمہور قائل ہیں؛ مگر ان سے استدلال کی نوعیت اور ان کی صحت وثقاہت کے جانچنے کا طریقہ فقہاء اہل سنت سے بہت مختلف ہے۔

6.3.1 قرآن مجید

تمام اسلامی مکاتب فکر کی طرح فقہ جعفری میں بھی قرآن مجید کو شریعت اسلامی کے بنیادی مرجع کی حیثیت حاصل ہے، نیز اس عقیدہ میں بھی وہ جمہور کے ساتھ ہیں کہ یہ کتاب عظیم کسی بھی طرح کی تحریف وتبدل یا حذف واضافہ سے بالکل محفوظ ہے۔ مشہور شیعہ عالم شیخ صدوق قمی فرماتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ پر نازل فرمایا، وہ وہی قرآن مجید ہے جو دفتین کے اندر موجود ہے اور عام لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں کسی بھی طرح کی کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر وتفہیم کے سلسلے میں ان کا عقیدہ ہے کہ تفسیر صرف احادیث صحیحہ اور اقوال معصومین کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔ احادیث وہی قابل قبول ہوں گی جو قرآنی مدلولات کے موافق ہوں، صحابہ وتابعین کے اقوال میں صرف ایسے اقوال سے استدلال کیا جائے گا جو ائمہ معصومین کے اقوال کے مطابق ہوں۔ قرآن اپنے آپ میں واضح اور مبین ہے، اس لیے اس کے معانی میں رائے زنی درست نہیں ہے۔

ائمہ معصومین کو قرآن مجید کا مکمل علم عطا کیا جاتا ہے۔ وہ اس کے ظاہر وباطن، محکم ومتشابہ، ناسخ ومنسوخ اور تمام رازہائے سربستہ

سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے تفسیر قرآن کے تعلق سے ان کی آراء واجتہادات بھی حجت ہوں گے۔

6.3.2 حدیث

اس قول و عمل کا نام ہے جو رسول اللہ ﷺ یا ائمہ اہل بیت میں سے کسی امام تک منتہی ہو۔ قرآن مجید کے بعد حدیث شریعت اسلامی کا دوسرا بنیادی مأخذ ہے۔

تشریع اسلامی میں صرف وہی احادیث معاون ہو سکتی ہیں جو نبی اکرم ﷺ سے اتنی بڑی جماعت سے متواتر منقول ہوں کہ ان کا جھوٹ پر اتفاق کرنا محال ہو۔ ایسی روایات علم یقینی کا فائدہ دیتی ہیں۔ حدیث متواتر کے سلسلہ میں علماء جمہور کے بالمقابل شیعہ علماء کے یہاں یہ فرق ہے کہ وہ اتصال سند کو لازمی شرط نہیں مانتے؛ کیوں کہ یہ بات ایسی نا قابل فراموش حادثات کے مثل ہیں جن کی خبریں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی ہیں، لوگ ان پر یقین کرتے ہیں اور اتصال سند کی تحقیق نہیں کی جاتی۔ خبر احاد کی قبولیت کے لیے دو شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے۔ اول یہ کہ وہ اجتہاد کے مطابق ہو۔ دوسرے وہ ثقہ رواۃ سے متصلاً مروی ہو۔ ثقاہت کا معیار بھی ان کے نزدیک علماء اہل سنت سے مختلف ہے۔

وہ کتب حدیث جن پر علمائے شیعہ اعتماد کرتے ہیں:

1. الکافی، ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی (329ھ)، تین حصوں پر مشتمل ہے۔ 1۔اصول 2۔فروع 3۔روضہ
2. من لا یحضرہ الفقیہ، شیخ ابو جعفر صادق (381ھ)، یہ چار حصوں میں منقسم ہے۔
3. تہذیب الاحکام، شیخ ابو جعفر الطوسی (460ھ)، اس میں 13599/احادیث درج ہیں۔
4. الاستبصار، ابو جعفر الطوسی، تین حصے ہیں اور روایات کی تعداد 6531/ہے۔
5. الوافی، ملا حفص کاشانی (م 1091ھ)، یہ کتاب تین حصوں میں ہے۔ کتب اربعہ کی احادیث کا منتخب مجموعہ ہے۔
6. وسائل الشیعۃ، محمد بن حسن ابن حر (م 1104ھ)، یہ فقہی ترتیب پر لکھی گئی ہے۔
7. بحار الانوار، ملا محمد باقر مجلسی (م 1110ھ)، چھبیس جلدیں ہیں اور یہ احادیث و آثارِ ائمہ کا مجموعہ ہے۔ اب ایران سے سو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔
8. العوالم، عبد اللہ بن نور اللہ بحرانی۔ اس کتاب کو سو جلدوں میں منقسم کیا گیا ہے۔
9. جامع الاحکام، سید عبد اللہ الشبری (م 1242ھ)، اس کی پچیس جلدیں ہیں۔
10. مستدرک المسائل، میرزا حسین نوری (م 1320ھ)۔

6.3.3 اجماع

مجتہدین عصر کا کسی شرعی معاملہ میں متفق ہو جانے کا نام اجماع ہے۔ تمام فقہاء اسلام کے نزدیک اجماع شریعت اسلامی کا تیسرا ماخذ

ہے۔ اجماع کی حجیت کو فقہ جعفری میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم انعقاد واجماع کے لیے ضروری ہے کہ اس اجماعی فیصلہ سے امام معصوم بھی لازماً متفق ہو؛ کیوں کہ امام کی رائے کے خلاف رائے کسی طرح جائز نہیں ہے۔

شیعہ امامیہ کے ایک گروپ نے حجیت اجماع کی مخالفت کی ہے جب کہ شیعہ زیدیہ کے یہاں اجماع کی ایک نئی قسم 'اجماع عشرہ' بھی متعارف ہے، جس میں آل النبی کے اجماعی مسائل شمار کیے جاتے ہیں۔

6.3.4 عقل

شریعت اسلامی کے بہت سے احکام ایسے ہیں، جن میں عقلی استدلال کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً: نمازوں کے اوقات، رکعتوں کی تعداد، رکوع سجود اور قیام و قعود کی کیفیت، انہیں محض نصوص شریعت سے ہی معلوم کیا جائے گا؛ لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے سلسلہ میں قرآن و سنت یا اجماع میں واضح ہدایات موجود نہیں ہیں۔ ائمہ اسلام نے ان کے حل کے لیے "قیاس" کی راہ تجویز کی ہے اور اسے ایک مستقل ماخذ تسلیم کیا ہے۔ فقہ جعفری میں نام کی تبدیلی کے ساتھ "عقل" کو قیاس کی جگہ ایک مستقل ماخذ شریعت کی حیثیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر پیش آمدہ مسائل کا حل نکالنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ شریعت اسلامی میں "عقل ورائے" کی مداخلت کو کم از کم رکھنے کے لیے فقہ جعفری میں اس کا دائرہ بہت محدود کر دیا گیا ہے۔ یہاں عقل کا کام محض 'اخذ معانی' ہے، استنباط نہیں۔ چناں چہ وہ قیاس کو محض اس حد تک جائز قرار دیتے ہیں کہ "نصوص کی روشنی میں اگر ممکن ہو تو اصل کا حکم فرع پر جاری کر دیا جائے؛ تاکہ غیر منصوص مسئلہ کی منصوص سے مطابقت ہو جائے" واضح رہے کہ قیاس کی تعریف علماء اہل سنت نے بھی کی ہے۔ لیکن علت کی اقسام میں ان کے یہاں بڑی وسعت ہے، جب کہ فقہ جعفری میں توسیع علت پر ہی قدغن لگائی گئی ہے۔ یہاں صرف علت کی وہ قسم معتبر ہے جو نصوص شرعیہ میں صراحتاً مذکور ہو اور اس کی موجوگی ہی میں قیاس کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ گمان ہوا ہے کہ ظواہر کی طرح فقہ جعفری میں بھی قیاس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

6.3.5 ضمنی مآخذ

علمائے شیعہ فقہ اسلامی کے ضمنی مآخذ میں استصحاب کے قائل ہیں جس میں مسائل کی بنیاد عقل ورائے کے بجائے مصالح شرعیہ پر رکھی ہے اور قرآن و سنت کے بعد سب سے زیادہ اس سے استفادہ کیا ہے۔ یہ حضرات استحسان اور استصلاح وغیرہ کو حجت نہیں مانتے، جس کا فقہ حنفی و فقہ شافعی میں بہت چلن ہے۔

6.3.6 فقہ جعفری کی امتیازی خصوصیات

1. فقہ جعفری کی بنیاد قرآن و سنت اور ارشادات ائمہ اہل بیت پر ہے۔ دوسرے درجے میں عقل و اجماع ہیں۔
2. فقہ جعفری کا رئیس المسلم (امام) اور پھر اعلم فقہاء (مجتہد) ہوتا ہے، جس کی جامعیت مسلم ہوتی ہے اور تمام شیعہ مذہبی طور پر اس کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔ اس میں سلطان و رعایا سب برابر ہیں۔ امام معصوم نافذ الامر حاکم ہے، مجتہد نہیں۔ بارہ اماموں کے بعد مجتہد حاکم شرع ہے۔

3. فقہ جعفری میں قیاس، استحسان، استصلاح اور ملکی قانون وغیرہ کی بہت گنجائش ہے۔
4. جو شخص مدارک شرعیہ، علوم دینیہ اور مقدمات ومباحث اجتہاد پر عبور حاصل کرے، مجتہد ہو جائے اس پر تقلید حرام ہے۔
5. فقہ جعفری میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور ائمہ کے بعد ہر دور میں مجتہدین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ نجف و قم قدیم زمانے سے فقہ جعفری کے عظیم شہر ہیں۔ عموماً اپنے وقت کا ''مجتہد المسلم''یعنی مرجع اعظم ان دو شہروں میں سے کسی ایک شہر کو اپنے لیے مرکز قرار دیتا ہے۔

6.4 فقہ اہل حدیث

اہل حدیث: دو لفظوں کا مرکب ہے۔ اہل اور حدیث۔ یہ لفظ اب ایک مخصوص طبقے کے لیے بولا جاتا ہے، عقائد و عبادات کا بنیادی مصدر و ماخذ قرآن و سنت کو مانتا ہے۔ وہ دین و شریعت کے معاملہ میں فرد واحد کی تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ اس طبقے کی ابتدا تقریباً دو صدی قبل ہوئی۔ مگر اہل حدیث علماء کا کہنا ہے کہ ان کا سلسلہ قدیم اصحاب الحدیث یا اہل الحدیث سے جا کر ملتا ہے۔ ابراہیم سیالکوٹی نے ''تاریخ اہل حدیث'' میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ اور علامہ ابن حجر عسقلانیؒ اور ان کے ماسوا دوسرے متقدمین بھی دراصل یہی رجحان رکھتے ہیں کہ یہ مسلک زمانہ قدیم ہی میں نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی موجود تھا۔

مسالک اربعہ کے علاوہ یہ علیحدہ مسلک بیسویں صدی عیسویں کے آغاز میں ایک تحریک کی شکل میں رونما ہوا۔ ورنہ ابتدائے سلطنت مغلیہ سے زمانۂ ظہور تک حنفیہ کا ہی مذہب رائج رہا۔ ڈاکٹر محمد بہاؤالدین محمد حسین بٹالوی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ مسلک شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی کے ذریعہ تمام ہندوستان میں پھیلا۔ (تاریخ اہل حدیث، ڈاکٹر محمد بہاؤالدین، مکتبہ ترجمان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، جلد دوم، ص140) دہلی میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے ایک ملک گیر تنظیم قائم ہوئی، جس نے مکتبوں اور درس گاہوں کے قیام، مبلغوں کے وعظ و ارشاد اور جلسوں کے انعقاد کے ذریعے پورے ملک میں تحریک و مسلک اہل حدیث کو عام کیا۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے ساتھ مسلکی تنظیم و تبلیغ کے لیے دو بڑے ادارے معرض وجود میں آئے۔ ایک مغربی پاکستان میں ''جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان'' اور دوسرا مشرقی پاکستان کے نام سے قیام پاکستان سے پہلے مؤخر الذکر ادارے کا نام ''کل بنگال آسام اہل حدیث جمعیت'' تھا۔ اہل حدیث مسلک کے مؤرخین شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شیخ عبد القادر جیلانی کو بھی ''اہل حدیث'' میں شامل کرتے ہیں۔ (تاریخ اہل حدیث، ص150) اسی طرح شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ کو بھی 'اہل حدیث' سے منسلک قرار دیتے ہیں۔ یہ رائے اختلافی ہے؛ تاہم کچھ شبہ نہیں کہ ان بزرگوں نے دین میں حدیث کی مخصوص اور قطعی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ اگرچہ حدیث کی طرح تفسیر بھی خانوادۂ شاہ ولی اللہ کا خاص موضوع رہا ہے۔

مسلک اہل حدیث بھی اہل سنت کا ہے۔ ابراہیم میر کے نزدیک چوں کہ ان کی روش سنت نبوی اور سیرت صحابہ کی پابندی تھی، اس لیے اس کا نام 'اہل حدیث' ہو گیا۔

اہل حدیث علماء کے نزدیک "عقائد و عبادات کا بنیادی مصدر و مآخذ قرآن مجید اور احادیث نبویہ ﷺ ہیں اور یہی اصل دین ہے۔" وہ دین و شریعت کے معاملات میں تقلیدِ شخصی کے قائل نہیں۔ عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ فقہ حنبلی سے مرتب ہیں۔

6.4.1 فقہ اہل حدیث کی خصوصیات

1. تمسک بالکتاب والسنۃ

دورِ رسالت میں آپ ﷺ پر قرآن مجید کا نزول ہو رہا تھا اور آپ ﷺ قرآنی آیات و احکام کی تعبیر و تشریح خود ہی صحابہ کرامؓ کو فرمادیا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ آپ کی تشریحات کے مطابق عمل بجالاتے تھے۔ صحابہ کو کسی شرعی مسئلہ میں عملی دقت پیش آتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع ہوتے اور دقت کا ازالہ ہو جاتا؛ چناں چہ عہدِ رسالت تک شریعت میں کسی اجتہاد و قیاس کی چنداں ضرورت نہیں پڑی؛ مگر جب آپؐ کی وفات ہو گئی اور خلفائے راشدین کا دور آیا تو متعدد مسائل میں انہیں اجتہاد کرنا پڑا۔ خلفائے راشدین نے بھی اس کا اہتمام فرمایا کہ قرآن اور حضور ﷺ کے فرمودات کے مطابق عمل کریں۔ عہد صحابہ و تابعین تک یہی سلسلہ چلتا رہا چناں چہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد نے احادیث نبویہ کو مآخذ شریعت مان کر حفظ کیا اور انہیں دوسرے صحابہ و تابعین تک پہنچایا اور بالآخر حدیث کی تدوین ہوئی۔

سلطنت کی حدود وسیع تر ہونے لگیں تو نت نئے مسائل پیدا ہوئے جن کو نصوص کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا؛ چناں چہ فقہاعظام نے اپنے اپنے دور میں یہی خدمت انجام دی اور پھر فقہ کی تدوین ہوئی گویا اسلامی فکر کے دو دھارے جاری ہوئے، ایک محدثین عظام نے جاری کیا، جس میں براہ راست نصوص سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے فقہاء کرام نے جاری کیا جس میں فقہ و اجتہاد سے کام لیا جاتا ہے۔ فقہ اہل حدیث محدثین کے منہج پر مبنی ہے۔

2. تقلید شخصی کی نفی

مسلک اہل حدیث فقہاء اسلام، ائمہ اربعہ اور ان کے علاوہ دیگر امامانِ فقہ و اجتہاد، محدثین اور بزرگان دین کی اور ان کے تمام دینی کارناموں کی بے حد قدر کرتا ہے اور نہایت ہی تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ ان کے علوم و معارف اور اجتہادات و آراء سے استفادہ ضروری سمجھتا ہے۔ نیز انبیاء کرام کی توہین کو کفر اور بزرگان دین کی توہین کو فسق قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔ البتہ کسی مسئلہ میں علمائے اسلام، فقہائے عظام اور بزرگان دین میں سے کسی کا قول و عمل اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ کے خلاف ملے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مقدم رکھا جائے گا۔

فقہ اہل حدیث کا بنیادی اصول ہے کہ رسول اللہؐ کے علاوہ کوئی بھی ایسا انسان نہیں ہے، جس کی ہر بات کا ماننا امت محمدیہؐ پر لازم ہو اور رسول اللہ کے علاوہ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے کہ جس سے احکام شرعیہ میں غلطی و خطا کا امکان نہ ہو لہٰذا رسول اللہؐ کے علاوہ کسی بھی متعین شخص کو جمیع امور شرعیہ میں اتھارٹی و مرجع مان لینا درست نہیں۔ اس لیے اہل حدیث لٹریچر میں جملہ فقہائے اسلام اور بزرگان دین

کی آراء سے استفادہ کی مثالیں تو ملتی ہیں؛ مگر کسی ایک متعین امام، فقیہ اور عالم کی اراء کی تقلید کی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ چناں چہ فقہ اہل حدیث میں کسی متعین فقیہ، عالم اور مجتہد کی نفی کی گئی ہے۔ جب تک کہ اس کے دلائل شرعیہ کا علم نہ ہو جائے۔

بہر حال اہل حدیث تقلیدِ شخصی کے علاوہ توحید کے مسئلے میں ایک خاص تجریدی نظریہ رکھتے ہیں اور ہر اس رسم اور عقیدے کے مخالف ہیں جو ذرا بھی توحید کے تصور پر اثر انداز ہوتا ہو۔ وہ خدا کی خدائی میں کسی جن وانس کو دخیل نہیں سمجھتے۔ انبیائے کرام کی عصمت اور عبودیت وبشریت کے بہ شدت قائل ہیں اور علمِ غیب صرف خدائے تعالیٰ کے لیے جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مجالس میلاد، زیارت مقابر اور انعقاد عرس سب بدعت میں داخل ہیں۔

اسی طرح تاریخ اہل حدیث کے مصنف 'ڈاکٹر محمد بہاؤالدین' ایک جگہ "فقہ التقلید" سرخی لگا کر لکھتے ہیں:

> قریباً چوتھی صدی کے بعد ادلہ تفصیلیہ سے استدلال بتدریج متروک ہو گیا۔ فقہ کے مروجہ متون کو من وعن قبول کر لیا گیا۔ عام طور پر شروح میں اصل ادلہ سے بہت کم تعرض کیا گیا، پہلے بزرگوں سے جو کچھ منقول تھا اس پر اکتفا کر لیا گیا۔ استدلال اور استنباط کی راہ ترک کر دی گئی۔ متقدمین کی استنباط شدہ فروع کافی سمجھے گئے اور جزوی تعبیر کو جو کسی امام نے فرمائی شریعت سمجھ لیا گیا، اصل ادلہ یعنی قرآن وسنت، اجماع اور قیاس ان سے تعرض صرف مجتہد کا وظیفہ طے پایا اور اجتہاد کے دروازوں پر چوتھی صدی کے بعد تالا لگا دیا گیا۔

3. اتباع سنت

ایمان بالرسالت کا لازمی تقاضا محبت رسول اور اتباع رسول ہے۔ چناں چہ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کو مطلقاً مطاع اور اسوہ قرار دیا گیا ہے۔ اصول وفروع کی تفریق وتمیز کے بغیر ہر معاملہ میں رسول کی پیروی کرنا فقہ اہل حدیث کا امتیازی وصف ہے۔ اہل حدیث اپنے ماننے والوں کا ایسا مزاج تشکیل کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام معمولات میں رسول کریمؐ کا پیروکار بن جائے۔

4. توحید خالص کی دعوت

انبیاء ورسل کی دعوت کا مرکزی نقطہ، اساسی محور اور اصل غایت ومقصد توحید ذات باری تعالیٰ ہے۔ رسولوں کی بعثت اور کتب سماویہ کے نزول کی غرض وغایت دعوت الی التوحید ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ" (النحل: 36)

ترجمہ: (اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبر دار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو)

اہل حدیث کے یہاں بے داغ اور بے لچک توحید ہے۔ شرک کا کوئی شائبہ گوارا نہیں۔ امت مسلمہ میں جب انحراف کا دور شروع ہوا اور توحید خالص پر شرکیات کی آمیزش ہو گئی۔ کلمہ لا الہ الا اللہ کے حقیقی مفہوم اور تقاضوں سے صرف نظر کیا جانے لگا، رسول

اکرم ﷺ کی شان میں غلو اور افراط کرتے ہوئے آپ کو مقام عبدیت سے اٹھا کر مرتبہ الوہیت پر فائز کیا جانے لگا۔ ساتھ ہی اہل صلاح وتقویٰ اولیاء اللہ کی شان میں غلو آمیزی کرتے ہوئے انہیں وہ مقام دینے کی جسارت کی گئی جس کے وہ مستحق نہیں تھے۔ ان حالات میں اہل حدیث نے توحید خالص کا نعرہ بلند کیا اور بلالاگ ولپیٹ کے توحید خالص کی پاسبانی کی۔ شرک اور اہل شرک سے براءت اہل حدیث کا امتیازی وصف ہے۔

5. بدعات وخرافات سے اظہار براءت

فقہ اہل حدیث کا ایک امتیازی وصف ان امور سے اظہار براءت کرنا ہے جن کی مصادر شریعت میں بنیاد اور دلیل نہ ہو چاہے ان کی ایجاد کرنے والا جتنا بڑا بزرگ اور صاحب تقویٰ اور عالم وفقیہ کیوں نہ ہو۔ تعبدی امور میں امت نے بہت سے بدعات کو قبول کیا؛ مگر علمائے اہل حدیث نے انہیں مسترد کر دیا۔ مثلاً: محبت رسول ﷺ اور محبت اہل بیت نبویؐ کے نام پر بہتیری بدعات امت میں عام ہوئیں؛ مگر اہل حدیث نے ان کو قرآن وحدیث کے دلائل سے رد کیا۔

6. غیر شرعی رسوم ورواج کا رد

مسلک اہل حدیث کا اٹھان؛ چوں کہ کتاب وسنت کی تعلیمات پر ہے اور تمسک بالکتاب والسنۃ اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ لہذا اس میں غیر شرعی رسوم ورواج کی گنجائش نہیں ہے۔ معاشی، معاشرتی اور سماجی امور میں بہت سے رسوم ورواج، ہندو معاشرے سے مسلمانوں نے قبول کیا۔ مگر اہل حدیث نے انہیں غیر شرعی قرار دیا اور ان کا رد کیا۔

7. اعتدال وتوازن

فقہ اہل حدیث کے امتیازات میں سے ایک یہ ہے کہ تمام شرعی امور میں اعتدال وتوازن رکھا جائے۔ یہی امت وسط اور خیر امت کی سچائی ہے، یہاں نہ غلو ہے اور نہ تقصیر وتفریط ہے۔ جس کا جو مقام اور حیثیت قرآن سے ثابت ہے من وعن تسلیم کرنا اہل حدیث کا امتیازی وصف ہے۔

6.5 کلیدی الفاظ

ناقلین : حدیث یا روایت کو آگے نقل کرنے والے۔

سدّ ذرائع : ایسا عمل جو فی نفسہ درست ہو لیکن وہ مال وانجام کے اعتبار سے یقینی طور پر فساد کی طرف لے جائیں۔ ایسے عمل کی روک تھام کرنے کے لیے ممنوع قرار دینا سد ذرائع کہلاتا ہے۔

ناسخ ومنسوخ : لغت میں نسخ: ازالہ کرنا، ایک چیز کو زائل کر کے اس کی جگہ دوسری چیز کو لانا، ایک شے کو دوسری جگہ منتقل کرنے کو کہتے ہیں۔ علم حدیث میں اس سے مراد حدیث کا وہ خاص شعبۂ علم ہے جس میں روایات یا احادیث پر اس حوالے

سے بحث کی جاتی ہے کہ کون سی حدیث منسوخ ہے اور کون سی ناسخ ہے اور کن علل و اسباب اور مصالح کے باعث کوئی بھی حدیث ناسخ یا منسوخ ہے۔

6.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- امام احمدؒ نے فقہ پر کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ ان کا مجتہدین عصر مثلاً: امام شافعیؒ اور حافظ ہیثمؒ وغیرہ سے شاگردانہ تعلق رہا۔ ان کی مخصوص تربیت اور عنایات کی وجہ سے خود ان کے اندر اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ آزادانہ و مجتہدانہ طور پر فتوی دینے لگے۔
- فقہ جعفری میں شریعت اسلامی کے بنیادی مآخذ وہی ہیں جس کے علمائے جمہور قائل ہیں؛ مگر ان سے استدلال کی نوعیت اور ان کی صحت و ثقاہت کے جانچنے کا طریقہ فقہاء اہل سنت سے بہت مختلف ہے۔
- اہل حدیث: دو لفظوں کا مرکب ہے۔ اہل اور حدیث۔ یہ لفظ اب ایک مخصوص طبقے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس طبقے کی ابتدا تقریباً دو صدی قبل ہوئی۔ مگر اہل حدیث علماء کا کہنا ہے کہ ان کا سلسلہ قدیم اصحاب الحدیث یا اہل الحدیث سے جا کر ملتا ہے۔
- فقہ جعفری کے بانی امام جعفر الصادق کے والد محمد باقرؒ ہیں۔ امامیہ روایات کے مطابق انہوں نے فقہ کے بنیادی اصول مرتب کیے اور انہیں کی روشنی میں مسائل کا استنباط و استخراج کیا۔ ان کے بعد امام صادق نے اسے پروان چڑھایا اور مختلف مسائل پر اپنے فتاوی کے ذریعہ اس فقہ کو مالا مال کیا؛ کیوں کہ فقہ و فتاویٰ سے آپ کو خصوصی دل چسپی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ صحیح معنوں میں والد بزرگوار کے جانشین تھے، ان کی فقہی مہارت اور اجتہادی کوششوں سے خصوصی استفادہ کیا تھا۔ ان کی تمام تر ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں، ان کی فقہی مہارت کو ہر مکتبۂ فکر کے علماء نے تسلیم کیا ہے اور اپنے دور کے نامور ائمہ میں شمار کیا ہے۔
- امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی شریعت اسلامی کے مآخذ وہی ہیں جو دوسرے فقہاء کے ہیں؛ مگر ان کے مراتب اور استفادہ کی نوعیت میں قدرے فرق ہے۔ اس ضمن میں وہ سب سے بلند رتبہ قرآن کو دیتے ہیں، جسے لفظی طور پر سمجھا جائے اور اس کی تشریح میں تاویل یعنی مجاز یا تمثیلی تفاسیر کا استعمال نہ کیا گیا ہو پھر قرآن کے بعد سنت کا درجہ ہے۔
- فقہ جعفری میں نام کی تبدیلی کے ساتھ ”عقل“ کو قیاس کی جگہ ایک مستقل مآخذ شریعت کی حیثیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر پیش آمدہ مسائل کا حل نکالنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ شریعت اسلامی میں ”عقل و رائے“ کی مداخلت کو کم از کم رکھنے کے لیے فقہ جعفری میں اس کا دائرہ بہت محدود کر دیا گیا ہے۔

6.7 نمونہ امتحانی سوالات

6.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. دینی معاملات میں بدعات سے اجتناب۔۔۔۔۔ کی دوسری امتیازی خصوصیت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کبھی ایسے معاملات میں فتوی نہیں دیا جو ابھی وقوع پذیر نہ ہوئے ہوں۔
2. فقہ حنبلی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دار و مدار۔۔۔۔۔۔۔۔ پر ہے۔
3. فقہ حنبلی میں۔۔۔۔۔۔ کی اصل پر بہت زور دیا گیا۔
4. فقہ جعفری میں سب سے زیادہ مقبول اور غالب مسلک .... کا ہے۔
5. فقہ جعفری کے بانی امام۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔ امامیہ روایات کے مطابق انہوں نے فقہ کے بنیادی اصول مرتب کیے اور انہیں کی روشنی میں مسائل کا استنباط واستخراج کیا۔
6. فقہ اہل حدیث کا ایک امتیازی وصف ان امور سے۔۔۔۔۔۔۔۔ کرنا ہے۔
7. فقہ جعفری کی بنیاد قرآن و سنت اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پر ہے۔ دوسرے درجے میں عقل واجماع ہیں۔
8. علمائے شیعہ فقہ کے ضمنی مآخذ میں۔۔۔۔۔۔ کے قائل ہیں جس میں مسائل کی بنیاد رائے کے بجائے مصالح شرعیہ پر رکھی ہے۔
9. انبیاء ورسل کی دعوت کا مرکزی نقطہ، اساسی محور اور اصل غایت ومقصد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔
10. فقہ اہل حدیث کے امتیازات میں سے ایک یہ ہے کہ تمام شرعی امور میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رکھا جائے۔

6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. فقہ حنبلی کے حلقہ اثر پر گفتگو کیجیے۔
2. فقہ اہل حدیث کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
3. فقہ جعفری کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔
4. فقہ حنبلی کے ناقلین پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. فقہ جعفری کی معتبر کتب حدیث کے مصنفین کے ۵/ نام رقم کیجیے۔

6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. فقہ اہل حدیث کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. فقہ جعفری پر اپنی معلومات تفصیل سے قلم بند کیجیے۔
3. فقہ حنبلی کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. حیاۃ الامام الصادق : پروفیسر ابوزہرہ مصری
2. تاریخ اہل حدیث : ڈاکٹر محمد بہاؤالدین
3. مناقب امام احمد : امام ابن جوزی
4. محاضرات فی فقہ الجعفری : ابوالقاسم علی بن اکبر خوئی
5. امام احمد بن حنبل حیاتہ وعصرہ، آراؤہ وفقہہ : پروفیسر ابوزہرہ مصری

اکائی 7: ہندوستان میں فقہی خدمات (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 ہندوستان میں علم فقہ
7.3 عہد سلطنت کا فقہی جائزہ
7.3.1 فتاویٰ غیاثیہ
7.3.2 فتاوی تاتارخانی
7.3.3 فوائد فیروزشاہی
7.3.4 فتاویٰ ابراہیم شاہی
7.4 مغلیہ عہد میں فقہی خدمات
7.4.1 فتاویٰ عالمگیری
7.5 اکتسابی نتائج
7.6 نمونہ امتحانی سوالات
7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

اسلامی علوم میں فقہ کو بہت اہمیت حاصل ہے کیوں کہ فقہ کا تعلق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ہے جو تمام شریعت کا ماخذ

ہے۔ اسلام کے آغاز سے ہی ہندوستان میں اسلام کے عظیم فقہاو علما تشریف لائے۔ اسلام کی اشاعت کی جدوجہد کی اور فقہ کی تدوین تدریس کا کام انجام دیا۔ فقہ کی تعلیم کو شروعاتی دور سے ہی برصغیر پاک وہند میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستان مسلم دور حکومت کو عہد وسطیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جو عہد سلطنت (1206-1526) اور عہد مغلیہ (1526-1857) دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے۔ ان ادوار میں اسلامی قانون کی ترویج واشاعت ہوئی۔ عہد وسطی کے بادشاہ وسلاطین شریعت کے مسائل جاننے اور سمجھنے میں ان کی دل چسپی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ سیاست وحکومت، معاشرت ومعیشت سے متعلق امور میں وقتاً فوقتاً علما سے بات چیت کرتے تھے۔ دہلی سلطنت کے قائم ہونے کے بعد مرکزی ایشیا کے مختلف حصوں سے ہندوستان میں علمائے کرام خاص طور سے فقہا کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سینٹرل ایشیا میں منگولوں کی تباہی وبربادی کے بعد علما کی کثیر تعداد ہندوستان پہنچی۔ سلاطین ہند کی علم نوازی اور معارف پروری سے اس کو کافی فروغ ملا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی دہلی ماہرین فقہ کا مرکز بن گیا۔ ان علما وفقہا نے تربیت اور افراد کے ذریعے ہندوستان میں فقہ اسلامی اور اسلامی قانون کو مختلف طریقے سے فروغ دیا۔ جس میں درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور بحث ومباحثہ شامل ہیں۔ فتاویٰ کے مجموعے مسلم حکمرانوں کی فقہ سے دلچسپی اور ان کی سرپرستی تاریخی شواہد سے ظاہر ہے مسلمان حکمراں اور صاحب ثروت لوگوں کے علاوہ صوفیا کرام نے برصغیر میں فقہ کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس بات سے واقف ہو سکیں کہ فقہ اسلامی کے موضوع پر ہندوستان میں کیا کام ہوئے اور کس نوعیت کی فقہی خدمات انجام دی گئیں۔ اس اکائی میں آپ عہد سلطنت اور مغلیہ عہد میں فقہ پر کیا کام ہوا اس کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں گے۔ نیز یہ بھی جانیں گے ان کاوشوں کو اس وقت کے سلاطین اور امرا نے پروان چڑھانے میں کیا کردار ادا کیا۔

7.2 ہندوستان میں علم فقہ

اسلام کے ابتدائی دور میں ہی برصغیر میں اسلامی نقوش کے نشانات ملتے ہیں اور مسلمان ہندوپاک کے مختلف علاقوں میں پھیل گیے جس میں صحابی، تابعی اور تبع تابعین سبھی کا ذکر ملتا ہے۔ عرب کی سرزمین سے علماء ومحدثین کا قافلہ جب ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پہنچا، ان علاقوں میں سکونت اختیار کی اور اسلامی علوم کی روشنی کو اپنے کردار سے منور کیا جس سے اسلامی طرز زندگی کے پیغام کو قبولیت ملی۔

برصغیر میں جب اسلام فروغ پایا تو بے شمار علمائے وفقہائے کرام وجود میں آئے۔ کچھ باہر سے تشریف لائے اور کچھ اسی سرزمین سے پیدا ہوئے۔ عہد سلطنت اور مغلیہ عہد کا جب مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس ملک نے متعدد حکمرانوں کو دیکھا اور انقلاب وتغیر کی مختلف لہروں سے سابقہ پڑا۔ لیکن یہ بات غالب رہی کہ ہر عہد میں مختلف علوم وفنون کا چرچا رہا۔ علم حدیث وفقہ کو اس سرزمین میں خوب عروج حاصل ہوا۔ غرض آمریت اور شخصی عہد حکومت میں بھی فقہائے کرام کو بڑی قدر واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، کیوں کہ یہ جماعت ہر دور میں علم کو پھیلانے میں مصروف رہی۔

فقہی کتابوں کی تالیف وتصنیف کا آغاز برصغیر میں سترہویں صدی کے آخری دور میں شروع ہوچکا تھا لیکن طباعت کا کام اٹھارہویں صدی عیسوی میں منظر عام پر آیا۔ ابتدائی دور میں فقہی کتاب منظوم پیرائے میں لکھی گئیں۔ شروعات میں رسائل لکھنے کا رواج تھا جو کسی خاص مسئلے پر منطبق ہوتا تھا لیکن بہت جلد ہی فقہائے ہندوستان نے اس طرف توجہ دی اور فقہ، اصول فقہ کی بنیادی عربی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کر دیا۔ بیسویں صدی میں اردو زبان میں فقہی کتابوں کا متعدد جلدوں پر فتاویٰ منظر عام پر آئے۔ اس سے پہلے فقہی کتابیں، رسالے، کتابچے اور رسائل وجود میں آچکے تھے۔ یہ بات عیاں ہے کہ برصغیر میں فقہی ورثہ جو کتابیں اور فتاوی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

مذکورۃ عہد کے دوران ہندوستان میں فقہی تعلیم کو برتری حاصل رہی۔ سلطنت ومغلیہ عہد میں علماء کرام نے اس طرف اپنی توجہ مبذول رکھی اور دلچسپی کا موضوع بنایا کیوں کہ علماء میں ایسے فقہیہ کی اکثریت تھی جو سینٹرل ایشیا سے ہجرت کرکے ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔ اس علم کے فروغ میں اس بات نے اہم رول ادا کیا کہ راجاوں اور سیاسی فرماں رواوں کی قربت کا ذریعہ بھی تصور کیا جانے لگا۔ اس تعلیم کے ذریعہ سے سیاسی عہدہ بھی ملنے کی امید بندھ جاتی تھی اس لیے تدریس وتصنیف کے ذریعہ فقہ کو ایک بلند مرتبہ حاصل ہوگیا۔ سیاسی فرماں رواوں نے اپنے دور کے علماء کی ماتحتی میں علم فقہ کو پروان چڑھایا اور اس سے حکومت کی بعض ضرورتوں کی تکمیل کی۔ ان سلطانوں نے اپنے وقت علماوں کی مالی مدد کی تاکہ علماء کرام دنیادی بکھیڑوں سے آزاد رہ کر فقہ کی خدمت کرسکیں اور حکومتی ادارے میں تعاون دے سکیں۔ غرض علماء کرام نے فقہ کی تدریس وتصنیف کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ غرض بہت سے علمائے کرام نے متعدد ملوک وسلاطین اور امراووزراء کے عہد میں کتابیں تصنیف کیں۔ برصغیر کی سرزمین میں ہر مسلکی فقہ کو پذیرائی ملی اور اس سے جڑے ہوئے علماء نے خدمات بھی انجام دیں لیکن سب سے زیادہ فروغ فقہ حنفی کو ہوا۔

7.3 عہد سلطنت کا فقہی جائزہ

تیرہویں صدی کی شروعات میں جب ہندوستان میں دہلی سلطنت قائم ہوئی۔ ترکوں کی فتوحات اور حکومت کے وجود میں آنے کے بعد وسط ایشیا سے علماء فضلاء کی جو تعداد منتقل ہوکر آئی تھی اس میں ایک اچھی تعداد فقہیہ کی تھی اور ان لوگوں نے فقہ اسلامی کو پروان چڑھانے کے لیے اپنی خدمات انجام دیں۔ ان لوگوں کی علمی جدوجہد نے دہلی کو بغداد اور دوسرے بڑے اسلامی شہر کے ہم پلہ بنادیا۔ اس کے علاوہ علماء کا وہ طبقہ حکومت کے قریب رہا جو ماہرین فقہ تھے اس کی وجہ یہ تھی انہی لوگوں کے درمیان سے قاضی، مفتی اور شیخ الاسلام کا تقرر کیا جاتا تھا۔ انہی قاضیوں اور مفتیوں کے ذریعہ ہی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حکومت کو جب ان لوگوں کی ضرورت پڑنے لگی تو دہلی سلطنت کے بادشاہوں نے اس طرف توجہ مرکوز کی اور اس علم کے فروغ میں دلچسپی ظاہر کی، اس کے لیے سلطنت میں مدرسے قائم کیے گیے اور اس کے نصاب میں فقہ کو امتیازی حیثیت دی گئی۔ غرض اس فن پر مستقل کتابیں مدون کی گئیں اور کثیر تعداد میں حاشیے اور شرحیں تیار کی گئیں۔ اس دور میں جو بھی حکومتی علمی مجالس قائم ہوئی یا کتابیں لکھی گئیں اس میں فقہی مسائل کو زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ سلاطین دہلی معاملات میں اسلامی نقطہ نظر جاننے کے خواہاں ہوتے تھے اس کے لیے وہ علماء کی انفرادی واجتماعی محفلیں منعقد کرتے

تھے۔ البتہ یہ مشکل ہے کہ وہ معاملے میں علماء کی رایوں سے اتفاق کرتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے لیکن وہ شرعی مسائل میں خصوصی توجہ دیتے تھے۔ علمائے کرام جو حق بات کو دینی خدمت سمجھتے تھے اور سلاطین کے غیر شرعی اعمال و طرز زندگی پر تنقید کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جو بادشاہوں کی اصلاح مختلف ذرائع سے کرتا تھا رمزو کنایہ میں بات کہتا، کوئی کہانیوں کے ذریعہ اور کوئی اپنی شاعری کے ذریعہ کوشش کرتا تھا۔

دہلی سلطنت کا پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک (1206-1210) بڑا دین دار تھا وہ علماء و فقہاء کی بڑی عزت کرتا تھا اس نے کوشش کی سلطنت میں اسلامی شریعت کا نفاذ کیا جائے۔ قطب الدین ایبک نے اپنے دور حکومت میں جو بھی ٹیکس غیر شرعی طریقے سے حاصل کیے جاتے تھے ان سب پر مکمل پابندی لگادی اور ہدایت کی کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے ہی ٹیکس لیے جائیں۔ قطب الدین ایبک کے دامن سے جو علما وابستہ رہے اس میں قاضی حمید الدین افتخار علی بن عمر المحمودی، فخر مدبر، صدرالدین حسن نظامی اور مولانا بہاء الدین اوشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلطان التتمش جو علماء و فقہاء کا بے معتقد، پرہیز گار اور شریعت کا پابند تھا۔ ایلتتمش (1211-1236) کے دور حکومت میں بغداد اور بخارا سے بزرگ و علمائے کرام کثرت سے ہندوستان تشریف لائے، ایلتتمش نے ان بزرگوں کا خیر مقدم کیا اور بطور شاہی مہمان رکھا۔ ایلتتمش کے دور میں قاضی وجیہ الدین کاشانی، سید نورالدین مبارک غزنوی، شیخ نظام الدین ابوالمؤید، قاضی حمید الدین ناگوری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، مولانا جمال الدین بسطامی، مولانا نجم الدین صغری، قاضی سعد اور قاضی عماد وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ در حقیقت ایلتتمش نے اپنے دور حکومت میں سیاسی اور مذہبی امور میں بہت حد تک توازن قائم کر رکھا تھا۔

مورخین نے بلبن (1266-1287) کے عہد کو "خیر الاعصار" سے تعبیر کیا ہے اور آپ کا عہد کچھ خصوصیات کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ بلبن نے پورے بائیس سال تک حکومت کی، بلبن اکثر کہا کرتا تھا کہ ہمیشہ علماء آخرت سے ہی دینی معاملات میں مشورہ لینا چاہیے اور ان ہی کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ بلبن علماء و فضلاء کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ ہمیشہ علماء کے ساتھ کھانا کھاتا تھا اور اس موقع پر ان سے فقہی مسائل پوچھتا اور رائے جانتا۔ برنی اور دوسرے مورخین نے بلبن کے عہد کے علماء کی فہرست دی ہے جو درج ذیل ہے۔ قاضی رفیع الدین گازرونی، قاضی رکن الدین سامانہ، قاضی سدید الدین، قاضی شمس الدین مراجی، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی ظہیر الدین، قاضی جلال الدین، قاضی شرف الدین ولواجی، مولانا سراج الدین سنجری، مولانا کمال الدین زاہد اور مولانا نجم الدین دمشقی وغیرہ۔ بلبن جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد مولانا برہان الدین بلخی کے مکان پر بڑی عقیدت کے ساتھ حاضری دیتا تھا، برہان الدین علوم شریعت و جامعیت کے پابند تھے، مشارق الانوار مولانا رضی الدین صغانی سے پڑھی تھی۔ غیاث الدین بلبن کے دور حکومت میں بڑی علمی خدمات انجام دی گئیں جس میں فتاویٰ غیاثیہ کو شہرت حاصل ہے۔ اس فتاوے کو فقہی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔ بلبن کو فقہی مسائل سے خاص لگاؤ تھا جس کی وجہ سے وہ فقہاء کی کاوشوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان مسائل پر عمل کی دیواریں استوار کرتا تھا۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ فتاویٰ آج بھی موجود ہے۔

ایلتتمش اور بلبن نے علمی فضا کی جو بنیاد رکھی تھی اس کو سلطان علاء الدین خلجی (1296-1316) نے اپنی ذہانت اور صلاحیت

سے پروان چڑھایا۔ علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں سرزمین ہند مشائخ و علماء کا گہوارہ بن گئی تھی اور دہلی و اس کے اطراف میں کثیر تعداد میں فقہاء سکونت اختیار کیے ہوئے اپنی دینی خدمات کو انجام دے رہے تھے۔ علاء الدین کے عہد میں جس پایہ کے علما دہلی میں موجود تھے اس کا ثانی کہیں اور نہیں ملتا۔ ان علماؤں میں سے ہر علماء اپنے فن کا امام تصور کیا جاتا تھا۔ بقول خلیق احمد نظامی: "فقہ کے ایسے ایسے ماہرین موجود تھے کہ ابو یوسفؒ اور محمد شیبانی کا مرتبہ ان کو حاصل تھا"۔ اس دور کے علما کی فہرست بہت طویل ہے جن میں کچھ کے نام درج کیے جا رہے ہیں۔ قاضی مغیث بیانہ، قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی محی الدین کاشانی، قاضی زین الدین ناقلہ، مولانا شمس الدین یحیٰ، مولانا افتخار برنی، وغیرہ۔ سلطان علاء الدین خلجی و قاضی مغیث کے درمیان کئی اہم فقہی مسائل پر مکالمے بہت مشہور ہیں۔ علاء الدین پہلا سلطان ہے جس نے اپنے دور حکومت میں مے نوشی اور شراب فروشی کو مکمل طور پر روکنے کی کوشش کی۔ خلیق احمد نظامی اپنی کتاب سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات میں فرماتے ہیں: "حقیقت میں عہد علائی، اسلامی ہند کی تاریخ کا عہد شباب تھا۔ اس دور میں زندگی کے جس شعبے پر نظر ڈالیے خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو، ادب سے ہو یا سیاست سے، شگفتگی اور امید اور امنگ کا ایک عجیب عالم نظر آئے گا۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام اسلامی دنیا کی آرزوئیں اور تمنائیں دلی کے قلب میں سمودی گئیں ہیں۔"

تغلق خاندان کے اولین سلطان غیاث الدین تغلق (1320-1325) کو بھی عبادت و ریاضت کا کافی شوق تھا اور وہ بدمذہب لوگوں کی صحبت سے احتراز کرتا تھا۔ اس بات کی کوشش کرتا کہ دین کے معاملات میں کوتاہی نہ ہو۔ آپ نے خود بھی شراب نوشی سے پرہیز کیا اور عوام کو بھی متنبہ کیا۔ قضا و افتا سے جو لوگ منسلک تھے اس دور میں ان لوگوں کی عزت و وقعت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سلطان محمد بن تغلق (1325-1351) کو دینی علوم کا گہرا مطالعہ تھا، حافظ قرآن تھے اور فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" ازبر تھی۔ فقہاء کی ایک تعداد اس کے آس پاس موجود رہتی تھی اور وہ اسلامی ممالک سے فقہی کتابوں اور اس کے ماہرین کو ہندوستان لانے کی کوشش کرتے۔ اس دور میں فقہی علوم کا بہت چرچا تھا، دینی علوم پر کافی توجہ دی اور سلطان نے مدرسوں میں فقہا کو درس و تدریس کے لیے مقرر کیا۔ اس عہد میں بہت سارے لٹریچر فقہ کے تعلق سے وجود میں آئے جس کی مثال تاریخ میں دیکھنے کو شاذ و نادر ملتی ہے۔ فقہ کی مشہور کتابوں پر کثرت سے حاشیے اور شرحیں لکھی گئیں۔ مثلاً ہدایہ، بزودی، حسامی، کنز الدقائق، منار وغیرہ۔ ابن بطوطہ کو محمد بن تغلق نے دہلی کا قاضی بنایا اس کے علاوہ اس عہد میں مولانا ضیاء الدین بخشی، مولانا معین الدین عمرانی، مولانا عفیف الدین کاشانی، مولانا ناصر الدین واعظ ترمذی، مولانا عبد العزیز اردبیلی اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فیروز شاہ تغلق (1351-1388) کا عہد اسلامی قوانین اور تنفیذ کے لیے کافی مشہور ہے۔ اس عہد میں فقہی علوم زیادہ پروان چڑھا۔ شاہی محلات سے بازاروں تک فقہی بازار کو ہوا ملی، اس دور میں تصانیف پر حاشیے لکھے گیے اور فتاوی کی نئی کتابوں کی تدوین کی گئی۔ فوائد فیروز شاہی آپ کے اشارے پر ہی مرتب کی گئی۔ فیروز شاہ دور پر نظر ڈالیں سلطنت دور میں کوئی اس دور کا ثانی نظر نہیں آتا۔ اس میں اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ فقہ اسلامی کی اشاعت پر زور دیا گیا۔ سلطان فیروز شاہ کو علم فقہ سے کافی لگاؤ تھا اور فقہی مذاہب کی کیفیت سے بخوبی آشنا تھے اور مشہور فقہ کی کتاب کو پڑھوا کر سنی تھی۔ اسی وجہ سے علم فقہ کو سلطان کی خصوصی دلچسپی سے ہندوستان میں فروغ حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ اس فن کے ماہرین پیدا ہوں تاکہ درس و تدریس، تصنیف تالیف وعلمی

مجالس کے ذریعہ اشاعت کی جائے۔ عہد فیروز شاہی کے جو علماء فقہ کے میدان میں مشہور تھے قابل ذکر ہیں: شیخ اسحاق مغربی، مولانا جلال الدین رومی، شیخ حسین ابن احمد بخاری، شیخ داود بن حسین شیرازی، شیخ عثمان چشتی اودھی، شیخ علاء الدین نیلی اودھی، مولانا کمال الدین دہلوی، شیخ محمد بن محمد صغانی، مولانا نجم الدین انتشار دہلوی، مولانا نجم الدین سمرقندی اور شیخ یوسف حسینی ملتانی وغیرہ۔

فوائد فیروز شاہی کے علاوہ فتاویٰ تاتارخانی بھی اسی عہد میں مرتب کی گئی۔ اس فتاویٰ کو عہد تغلق کے ایک صاحب ثروت خان اعظم تاتار خاں کی خواہش پر مرتب کیا گیا۔ علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کمیٹی کے سربراہ مشہور عالم بن العلاء الحنفی الاندرپتی تھے۔ اس کے علاوہ عقائد پر ایک کتاب مولانا شرف محمد العطائی نے فوائد فیروز شاہی کے نام سے ترتیب دے کر فیروز شاہ کے نام منسوب کی۔ اس کے علاوہ فیروز شاہی کے عہد میں منظوم فقہی تالیفات کا ذکر ملتا ہے۔ تحفۃ النصائح یہ شیخ یوسف گدا دہلوی کی منظوم تالیف ہے جو 55 ابواب اور 786 ابیات پر مشتمل ہے۔ مولف نے اس کتاب میں بڑے آسان انداز میں فرائض و سنن اور احکام و آداب بیان کیے گیے ہیں۔ دوسری اہم منظوم فقہی کتاب طرفۃ الفقہاء جو مولانا رکن الدین ملتانی سے منسوب ہے۔ یہ تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اس کتاب میں فقہی مسائل بڑے آسان انداز میں بیان کیے گیے ہیں اور اس وقت کے عصری مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فقہی درسیات کی متعدد شروح حواشی بھی تیار کی گئی۔ شرح ہدایہ: شیخ حمید الدین مخلص بن عبد اللہ دہلوی، حاشیہ ہدایہ: شیخ حسین بن عمر غیاث پوری، شرح کنز الدقائق: مولانا معین الدین عمرانی دہلوی، شرح منار: شیخ یوسف بن جمال الدین ملتانی وغیرہ۔ سلطان سکندر لودھی مذہبی فرائض بڑی پابندی سے ادا کیا کرتا تھا۔ سکندر لودھی (1489-1517) کے عہد کے چند علما کے نام ذکر کیے جا رہے ہیں۔ شیخ سعد اللہ، شیخ رزق مشتاقی، مولانا الہداد، شیخ عبد الوہاب بخاری، شاہ جلال الدین تبریزی، شیخ عبد اللہ تلبنی وغیرہ۔ مولانا الہداد جونپور کے مشہور علما تھے اور انہوں نے فقہ پر متعدد کتابیں تصنیف کی۔

درج بالا سطروں میں عہد سلطنت کے مشہور فقہا و علماء کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں بہت سارے فقیہہ نے درس و تدریس اور قاضی کی خدمات انجام دیتے ہوئے تصنیف و تالیف بھی جاری رکھا۔ ہندوستان میں فقہی میدان میں تصنیف و تالیف کی سرگرمیوں کا تعلق بالکل ابتدائی دور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی (998-1030) کی خواہش پر فارسی زبان میں فقہ کی ایک کتاب "مجموع سلطانی" کے نام سے تالیف کی گئی۔ ذیل میں کچھ تصانیف کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

7.3.1 فتاویٰ غیاثیہ

فتاویٰ غیاثیہ کو حنفی فقہ کے مدنظر مرتب کیا گیا ہے اور اس کی زبان عربی ہے۔ فتاویٰ غیاثیہ فتاویٰ کا پہلا مجموعہ شمار کیا جاتا ہے اور یہ غیاث الدین بلبن کے دور حکومت میں صفحہ قرطاس پر منظر عام پر آیا، مصنف نے اس فتاویٰ کو غیاث الدین بلبن کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس سے قبل ہندوستان میں اس طرح سے مسائل فقہ کی جمع و تدوین نہیں کی گئی تھی۔ اس فتاوے کے مصنف شیخ داود بن یوسف الخطیب ہے۔ فی الحال اس فتاویٰ کی حیثیت ایک مخطوطے کی ہے، یہ فتاویٰ پہلی بار بولاق، مصر سے 1909ء میں شائع ہوا۔ اس فتاویٰ میں فقہی کتب کا متداول طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے مشتملات کتاب، باب اور فصل میں تقسیم کیے گیے ہیں۔ اس فتاویٰ میں ان مسائل کو ترجیح دی گئی

ہے جو عام فقہ کی کتابوں میں انسان کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اس وقت کے موجودہ مسائل پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے اور پرانے مسائل پر بھی اس وقت کے سیاق میں روشنی ڈالی ہے۔ اس فتاویٰ کے مآخذ بھی فقہ حنفی پر مشتمل ہیں اور تمام مسائل اسی کی روشنی میں بیان کیے گیے ہیں۔ عصری مسائل پر مصنف نے جو اپنی رائے پیش کی ہے ان میں سے چند مسائل درج کیے جارہے ہیں۔ مسائل میں وقت اور حالات کی رعایت دیتے ہیں۔ جس دور میں یہ تصنیف ترتیب گئی وہ دنیائے اسلام کے لیے بہت پریشان کن اور مصیبتوں کا دور تھا۔ تاتاریوں نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی چاروں طرف فتنہ وفساد کی آگ بھڑکی ہوئی تھی راستے مسدود ہوچکے تھے تو ایسے پر خطر ماحول میں حج کا سفر انتہائی مشکل ہوگیا تھا۔ کتاب الحج میں مصنف وقت کی حالات ونزاکت کو دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مشائخ بلخ کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ہمارے زمانے میں حج فرض نہیں رہا۔ اس کے علاوہ اس دور میں ایک بدعت بادشاہ کے سامنے آداب تسلیم بجالاتے ہوئے سجدہ کرنے پر انہوں نے بڑی ہمت کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور کہا کہ کسی مسلمان کو اگر کہا جائے کہ بادشاہ کے سامنے سجدہ کرو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے تو افضلیت کا تقاضا یہ ہے کہ سجدہ نہ کرے۔ کیوں کہ سجدہ کرنا کفر ہے اور افضل یہ ہے کہ کفر سے احتراز کیا جائے، اگر چہ اس کے لیے کتنا ہی مجبور کیا جائے۔

7.3.2 فتاویٰ تاتارخانی

عہد وسطی سے تعلق رکھنے والے ملوک وامرا کے دور میں جو علمی فقہی تصنیفات منظر عام پر آئیں ان میں فتاویٰ تاتارخانی کو ایک حیثیت حاصل ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور ومعروف کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اس کا اصل نام زاد المسافر، زادالسفر بھی ہے لیکن شہرت فتاویٰ تاتارخانی کے نام سے ملی۔ اس فتاویٰ کی تصنیف اس وقت کے مشہور فقیہ عالم بن علاء حنفی نے کیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس فتاویٰ کو ترتیب دینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کمیٹی کا سربراہ عالم بن علاء حنفی کو منتخب کیا گیا۔ یہ فتاویٰ تیس جلدوں میں مرتب کیا گیا۔ اس کو امیر اعظم تاتارخاں کی خواہش پر لکھی گئی۔ اس کتاب میں مسائل کو نہایت باریک بینی اور تفصیل سے واضح کیا گیا ہے اور ان تمام مسائل میں جس میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے ان کی آراء کو مآخذ کے حوالے کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ مورخ عفیف (تاریخ فیروز شاہی کے مصنف) کے مطابق فتاویٰ تاتارخانی کی تدوین کے وقت فتاویٰ کے ان تمام مجموعوں کو اکٹھا کیا گیا جو دہلی میں دستیاب تھے تاکہ مرتبین ان کی مدد سے مختلف مسائل میں فقہاء کے موقف اور ان کی اختلافی رایوں سے واقف ہوسکیں۔ اس فتاویٰ میں مراجع کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان میں المحیط، الهدایہ، ذخیرۃ الفتاویٰ فتاویٰ قاضی خاں، فتاویٰ ظہیریہ، فتاویٰ سراجیہ، خلاصۃ الفقہ، فتاویٰ غیاثیہ قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب کو جامعیت، تفصیلی بحث اور جزئیات کے احاطے کی وجہ کافی شہرت حاصل ہوئی اور اس کے بعد ہندوستان یا کسی ممالک میں فقہ کی جو کاوشیں بھی منظر عام پر آئیں اکثر تصانیف میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ اس اہم فتاوی کو مدرسہ شاہی مرادآباد کے مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب نے ایڈٹ کر کے شائع کروایا ہے، جو بیس (20) ضخیم جلدوں میں ہے، مکتبہ زکریا دیوبند نے اسے 1431ھ (2010ء) میں شائع کیا ہے،، یہ تاتارخانیہ کا مکمل نسخہ ہے، ورنہ اس سے قبل کچھ مجلدات اور کچھ ابواب ہی شائع ہوتے رہے۔

7.3.3 فوائد فیروز شاہی

فوائد فیروز شاہی ایک فارسی تصنیف ہے جس کو معروف عالم دین شرف بن محمد العطائی نے تالیف کیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت عقائد، عبادات، معاملات وغیرہ سے متعلق جامع معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ فوائد فیروز شاہی کے مباحث کا زیادہ تر حصہ فقہی مسائل سے بحث کرتا ہے۔ یہ 115 ابواب پر مشتمل ہے اور 574 فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے فیروز شاہ تغلق کے تعریف کی ہیں اور ان کی سلطنت کی حفاظت کے لیے دعائیں بھی کیں ہیں۔ اس کتاب میں فقہیات کا بڑا حصہ ان عنوانات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مثلاً نماز، زکوۃ، روزہ، حج، صدقہ، عیدین، جمعہ، تجارت، بیوع، نکاح، طلاق، خلع، ایلا، ظہار، لعان، اجارہ، شراکت، زراعت، احتکار، ہبہ، عشر، خراج، جزیہ، قصاص وغیرہ امور پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی بات کی تائید کے لیے جگہ جگہ کتابوں سے اقتباسات درج کیے گیے ہیں۔ ان کے مآخذ میں الجامع الصغیر، مبسوط، ہدایہ، شرح طحاوی، فتاوی سمرقندی، فتاوی سراجیہ اور نصاب الاحتساب شامل ہیں۔ اس کتاب میں اصل ترجمانی فقہ حنفی کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود مصنف نے وسعت قلب کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسائل کو بیان کرنے میں ایک ہی نقطہ نظر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تمام فقہی مدارس کو واضح کیا ہے۔

7.3.4 فتاویٰ ابراہیم شاہی

اس فتاوی کے مولف کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے مولانا اسحٰق بھٹی نے اس کے مرتب کی حیثیت سے احمد بن حمید الملقب بنظام کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ کشف الظنون میں اس کے مصنف کا نام شہاب الدین احمد بن محمد الملقب بنظام الکیکانی ہیں۔ اس فتاویٰ کے مصنف قاضی احمد بن محمد جون پوری ہیں جو سلطان ابراہیم شرقی والی جون پور کے دور کے علما شمار کیا جاتے ہیں۔ جون پور کے قاضی تھے اور اپنے علم و مرتبے کی وجہ سے ہر طبقے میں مقبول تھے۔ ان کا خانوادہ عرب سے گجرات منتقل ہوا تھا ان کو فقہی علوم پر درک حاصل تھا اور جونپور منتقل ہوئے۔ جہاں سلطان ابراہیم شرقی کی معیت میں اپنی علمی مصروفیات کو جاری رکھا۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کے مولف سلطان ابراہیم شرقی (1400-1440ء) کے ہم عصر تھے۔ اس فتاویٰ کے دو مخطوطے دستیاب ہیں ایک فارسی میں اور دوسرا عربی میں۔ اصحاب علم نے اس فتاویٰ کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ مصنف نے سلطان ظالم کو عادل کہنے کی بابت فرماتے ہیں "ظالم سلطان کی کسی صورت میں حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی حوصلہ افزائی اس کو ظلم پر آمادہ کر دینے کے مترادف ہے۔ ظالم حکمران کو عادل کے لفظ سے یاد کرنا کفر ہے۔" فتاویٰ ابراہیم شاہی کا جو حصہ فارسی زبان میں ہے وہ عبادات پر مشتمل ہے۔ قرآن و حدیث کے علاوہ حنفی فقہ کی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں۔ دوسرا حصہ جو عربی میں ہے وہ معاملات پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب فقہی معلومات کا بیش قیمتی ذخیرہ ہے۔

اس کے علاوہ بھی دیگر فقہی کتب منظر عام پر آئیں

- نصاب الاحتساب: اس کی تالیف عمر بن محمد السنامی نے کی ہے ان کو شہرت ضیاء الدین سنامی سے ملی۔ اس کتاب کی زبان عربی ہے اور یہ کتاب احتساب کے مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔
- مطالب المومنین: یہ عربی زبان میں فقہ کی کتاب ہے۔ جس کی تصنیف بدر بن تاج لاہوری نے کی ہے۔ آپ کا تعلق لاہور سے تھا

اور وہاں کے مشہور فقیہہ تھے۔ اس کتاب میں ان تمام اہم مسائل کو جگہ دی گئی ہے جس کا سامنا ایک مسلمان روزمرہ کی زندگی میں کرتا ہے۔

- مجموع خانی: اس کتاب کو "مجموع و بحر المعانی" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور اس کو کمال کریم ناگوری نے ترتیب دیا۔ اس کتاب میں فقہ کے معروف مسائل بیان کیے گیے ہیں اور تقریباً 25ہزار مسائل بحث کیے گیے ہیں۔
- شرح ہدایہ: شیخ حمید الدین مخلص بن عبد اللہ دہلوی
- شرح ہدایہ (موسوم بہ توشیخ) شیخ عمر بن اسحاق غزنوی
- حاشیہ ہدایہ: شیخ حسین بن عمر غیاث پوری
- شرح کنز الدقائق: شیخ محمود بن محمد دہلوی
- حاشیہ کنز الدقائق: مولانا معین الدین عمرانی دہلوی
- شرح منار: (موسوم بہ توجیہ الکلام) شیخ یوسف بن جمال الدین ملتانی

سلطنت عہد میں عربی و فارسی دونوں میں فقہی تالیفات منظر عام پر آئیں۔ شروعاتی دور میں عربی زبان کو ترجیح دی گئی لیکن جیسے جیسے فارسی زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ سرکاری زبان کے علاوہ عام لوگ بھی بول چال کے لیے اسے استعمال کرنے لگے تو علماء کرام نے فقہی تالیفات کے لیے بھی استعمال کیا تاکہ لوگوں کو رہنمائی حاصل ہو سکے۔ عہد سلطنت میں علما، سلاطین اور امرا نے فقہ کو فروغ دینے میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔

7.4 مغلیہ عہد میں فقہی خدمات

سلطنت عہد کے گزرنے کے بعد مغلیہ عہد میں بھی اسلامی علوم کو ترقی ملی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکومت کا استحکام اور یہاں کے بادشاہ کی علوم کو سرپرستی حاصل تھی۔ مغلیہ خاندان کی بنیاد سلطان ظہیر الدین بابر نے رکھی جو تیمور کی نسل سے تھے۔ بابر بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ بابر کا کتب خانہ متنوع کتابوں پر مشتمل تھا اور وہ اسے سفر و حضر میں اپنے پاس رکھتا تھا اس عہد کے مشہور علما درج ہیں: شیخ زین الدین، مولانا شہاب الدین معمائی وغیرہ میں سے ظہیر الدین بابر کو بھی علم دین اور فقہیات سے دلچسپی تھی۔ اس نے ایک مثنوی مبین لکھی جو کہ دوہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کو بابر نے اپنے لڑکے کامران کے لیے لکھا تھا جو کہ مذہبی و فقہی مسائل کا مجموعہ ہے۔ اس کو فقہ مبین اور فقہ بابری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مثنوی مبین کی شرح شیخ زین الدین نے مبین کے نام سے لکھی۔ اس کے علاوہ بابر کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی کتاب ہو جو شرعی مسائل کو محیط کیے ہوئے ہو اور اس کے لیے اعلان بھی کیا۔ جس کو بعد میں شیخ نورالدین خوانی نے مستند روایات و کتابوں سے شرعی مسائل کو ترتیب دیا اور ہدایہ، شرح وقایہ، شرح مختصر وقایہ، کافی، فتاوی قاضی خان وغیرہ فقہ کی کتابوں کی مدد سے ایک کتاب تیار کی جس کو فقہ بابری کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ فارسی زبان میں تصنیف کی گئی۔

ہمایوں جو نماز و روزے کا بڑا پابند تھا معمولی شرعی احکام پر بھی سختی سے عمل پیرا ہوتا تھا۔ ہمایوں جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو بیرم خان کے ساتھ مولانا زین الدین محمود سے ملاقات کی اور ان سے استفادہ کرتا رہا۔ ہمایوں کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اس کے کتب خانے میں مختلف عنوانات پر کتابیں موجود تھیں۔ اسی طرح اکبر اپنے ہم عصر کے مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی کے حلقہ ارادت میں داخل تھے جو فتح پور سیکری میں پناہ گزیں تھے۔ اکبر کے دل میں علما و فقہا کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ درجے کے حساب سے ان کو مالی تعاون فراہم کرتا۔ اکبر کا پہلا دور خالص مذہبی اور دینی تھا اور اس دور میں دربار علما کا مرکز بن گیا تھا۔ اکبر کی مذہبی زندگی کا دوسرا پہلو جو صحیح العقیدہ مسلمانوں کے لیے ذہنی کوفت کا سبب تھا۔ اکبر کے مذہبی خیالات سے اختلاف کے باوجود اس بات کا اقرار کرنا پڑے گا اس دور میں علم و فن کو ترقی ملی۔ آپ کے دور کے علما و صلحا درج کیے جا رہے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، خواجہ باقی باللہ، شیخ نور الحق دہلوی، شیخ عبد النبی گنگوہی، مولانا عبد اللہ سلطان پوری، مولانا حاتم سنبھلی وغیرہ۔ ان میں اکثر و بیشتر فکری نشو و نما کے ساتھ روحانی اصلاح بھی کرتے تھے۔ غرض عہد مغلیہ میں علما کی ایک کثیر تعداد تھی کیونکہ ہر دور میں سلاطین و امرا کی سرپرستی کی وجہ سے ملک میں مدارس کی بہت زیادہ تعداد تھی اور ان مدارس میں معلمین کی تنخواہ شاہی خزانہ سے طے کی جاتی تھے۔

اورنگ زیب عالم گیر نیک طبیعت کا مالک تھا اور علماء و مشائخ کا بہت قدردان تھا، اورنگ زیب ان کی صحبتوں میں بیٹھتا اور شرعی مسائل دریافت کرتا۔ اورنگ زیب نے علما کے زیر اثر اپنی زندگی گزاری اور ان کے مشورے سے اس نے دربار کے رنگ کو ہی بدل دیا۔ غیر شرعی تمام ٹیکس کو ختم کر دیا اور ان رسومات پر پابندی عائد کر دی جو اسلامی تعلیمات کے منافی تھی اور ایسی چیزیں نافذ کیں جس کی شریعت نے اجازت دے رکھی تھی۔ عالم گیر امن پسند بادشاہ تھا اور پورے ملک میں امن و امان قائم رکھنا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے کوششیں بھی کیں۔ برصغیر میں اسلامی احکام و اوامر کی نشر و اشاعت میں اورنگ زیب کا بڑا حصہ ہے۔ تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے شیخ احمد سرہندی کے دونوں بیٹوں خواجہ معصوم اور شیخ محمد سعید دربار میں آنے کی دعوت دی جس کو ان لوگوں نے قبول فرمایا اور اس کے بعد کئی دفعہ دربار کو زینت بخشی۔ اورنگ زیب عالمگیر کو علمی لحاظ سے عالم دین کہا جاتا ہے۔ آپ کو فقہ حنفی پر درک حاصل تھا اور قرآن مجید سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ اورنگ زیب کے عہد کو علم و فضل اور تحقیق کے لحاظ سے زریں عہد تعبیر کیا جاتا ہے۔

7.4.1 فتاویٰ عالمگیری

اورنگ زیب عہد کی سب سے اہم تصنیف فتاویٰ عالمگیری ہے اور حنفی علما ہدایہ کے بعد سب سے معتبر کتاب سمجھتے ہیں۔ اورنگ زیب نے اپنے عہد حکومت میں جب یہ محسوس کیا کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے لیے شرعی مسائل میں رہنمائی مطلوب ہے، انہوں نے علما کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ فقہی کتب سے مسائل یکجا کر کے ایسی تصنیف تیار کی جائے جو فقہ کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہو۔ اس کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی اور کمیٹی کے سربراہ شیخ نظام کو منتخب کیا گیا۔ اس کے لیے علما کے وظائف طے کیے گیے اور آٹھ سال کی مشقت کے بعد یہ تصنیف مکمل ہوئی۔ اس کی تدوین و تالیف میں اورنگ زیب بذات خود شامل تھا اور روزانہ کتاب کا ایک صفحہ ملا نظام سے پڑھوا کر سنتا تھا اور بحث و مباحثہ ہوتا۔ فتاویٰ عربی زبان میں ہے جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس کا اردو ترجمہ نول کشور پریس نے فتاوی ہندیہ کے نام سے شائع

کیا اس کے علاوہ فارسی زبان میں علامہ عبد اللہ رومی جو چلپپی کی نسبت سے مشہور تھے فتاوی عالمگیری کا ترجمہ کیا۔ مضامین و مندرجات کے اعتبار سے یہ فقہ کی نہایت مفصل کتاب ہے۔ اس فتاویٰ کی ترتیب کے بعد عالم گیر نے یہ حکم جاری کیا کہ پورے ملک میں عدالتی فیصلے اسی کے مطابق کیے جائیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر (کتاب) کے آغاز میں متعلقہ مسئلہ کے معنی و مطلب کو واضح کیا گیا ہے مثال کے طور پر کتاب الحوالہ، کتاب الشہادات یا کتاب الوکالہ ان سبھی کے شروعات میں ان کی وضاحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وکالہ، شہادات یا وکالہ کے کیا معنی ہیں اور کیا مطلب ہے۔ اس میں جو مسائل پیش کیے گیے ہیں وہ یا تو حنفی فقہ کے مطابق صحیح ہو اور مفتی نے اس مسائل پر فتوی دیا ہو۔ یعنی فقہ حنفی کی ان چھ کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے جو امام محمدؒ کی تصنیف شمار کی جاتی ہے اور جس کو ظاہر الروایت تصور کیا جاتا ہے۔ مثلاً جامع الکبیر، جامع الصغیر، المبسوط، الزیادات، السیر الکبیر اور السیر الصغیر۔ حنفی فقہ میں ان کتابوں کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اس فقہ کی بنیاد انہی کتابوں پر ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تمام اہم اور قابل ذکر کتابوں کا نچوڑ ہے۔

ہندوستان کے علما کا سب سے پسندیدہ موضوع فقہ رہا ہے اسی وجہ سے جو علما دوسرے ممالک سے ہندوستان میں تشریف لائے وہ محدث یا مفسر ہونے کے بجائے فقیہ بنے کیوں کہ فقہ پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے سلاطین یا بادشاہ کا بڑا آسانی سے قرب حاصل ہو جاتا تھا۔ سلاطین و بادشاہ حکومت چلانے میں شرعی مسائل کی طرف ان علما سے ہی رائے لیتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کا رواج دیا اور اجتہاد و تقلید کی وضاحت کر کے کتاب وسنت کی پیروی کی دعوت دی۔ علما و صلحا میں شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ شیخ احمد سرہندی نے اس وقت بدعتوں کے خلاف تجدیدی اور اصلاحی تحریکی کا آغاز کیا اور ایسے تصوف کو ضلالت سے تعبیر کیا جس میں شرعی احکام کی خلاف ورزی ہو۔ شیخ مجدد کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اکبر کے دین الٰہی فتنوں کا سدباب اپنے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں سے کیا اور تصوف کی تجدید کی۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے انحطاط پر غور وخوض کرنے کے بعد قلمی جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے فقہی جمود کو توڑا اور حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی ان سب کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی مشہور و معروف کتاب "حجۃ البالغۃ" ہے جس میں آپ نے نہایت واضح انداز میں شرعی احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب آج تک علما کے لیے شمع ہدایت ہے۔ "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" اور دوسری "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" یہ دو مشہور فقہ کے موضوع پر دو رسالے لکھے۔

7.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ہندوستان مسلم دور حکومت کو عہد وسطیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں عہد سلطنت (1206-1526) اور عہد مغلیہ (1526-1857) دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے۔ ان ادوار میں اسلامی قانون کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ عہد وسطی کے بادشاہ

وسلاطین شریعت کے مسائل جاننے اور سمجھنے میں ان کی دل چسپی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ سیاست و حکومت، معاشرت و معیشت سے متعلق امور میں وقتاً فوقتاً علما سے بات چیت کرتے۔

- فقہی کتابوں کی تالیف و تصنیف کا آغاز برصغیر میں سترہویں صدی کے آخری دور میں شروع ہوچکا تھا لیکن طباعت کا کام اٹھارہویں صدی عیسوی میں منظر عام پر آیا۔ ابتدائی دور میں فقہی کتاب منظوم پیرائے میں لکھی گئیں۔ شروعات میں رسائل لکھنے کا رواج تھا جو کسی خاص مسئلے پر منطبق ہوتا تھا لیکن بہت جلد ہی فقہائے ہندوستان نے اس طرف توجہ دی اور فقہ، اصول فقہ کی بنیادی عربی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کر دیا۔
- عہد وسطی سے تعلق رکھنے والے ملوک و امرا کے دور میں جو علمی فقہی تصنیفات منظر عام پر آئیں ان میں فتاویٰ تاتارخانی کو ایک حیثیت حاصل ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور و معروف کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اس کا اصل نام زاد المسافر، زادالسفر بھی ہے لیکن شہرت فتاویٰ تاتارخانی کے نام سے ملی۔ اس فتاویٰ کی تصنیف اس وقت کے مشہور فقیہ عالم بن علاء حنفی نے کیا۔
- ظہیر الدین بابر کے عہد میں شیخ نورالدین خوانی نے مستند روایات و کتابوں سے شرعی مسائل کو ترتیب دیا اور ہدایہ، شرح وقایہ، شرح مختصر وقایہ، کافی، فتاوی قاضی خان وغیرہ فقہ کی کتابوں کی مدد سے ایک کتاب تیار کی جس کو فقہ بابری کے نام سے موسوم کیا گیا۔ فارسی زبان میں تصنیف کی گئی۔
- اورنگ زیب عہد کی سب سے اہم تصنیف فتاویٰ عالمگیری ہے اور حنفی علما ہدایہ کے بعد سب سے معتبر کتاب سمجھتے ہیں۔ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کمیٹی کے سربراہ شیخ نظام کو منتخب کیا گیا۔ فتاویٰ عربی زبان میں ہے جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مضامین و مندرجات کے اعتبار سے یہ فقہ کی نہایت مفصل کتاب ہے۔ اس فتاویٰ کی ترتیب کے بعد عالم گیر نے یہ حکم جاری کیا کہ پورے ملک میں عدالتی فیصلے اسی کے مطابق کیے جائیں۔

7.6 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. فتاویٰ عالمگیری کا اردو ترجمہ کس نام سے شائع ہوا؟

(a). فتاویٰ ہندیہ (b). فتاویٰ غیاثیہ (c). فتاویٰ اورنگ زیب (d). کوئی نہیں

2. فتاویٰ عالمگیری مرتب کرنے کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس کے سربراہ کون تھے۔

(a). شرف بن محمد العطائی (b). شیخ نظام (c). قاضی احمد جونپوری (d). شیخ یوسف

3. فوائد فیروز شاہی کو کس نے تصنیف کیا۔

(a). . شرف بن محمد العطائی (b). شیخ نظام (c). قاضی احمد جونپوری (d). شیخ یوسف

4. شیخ یوسف گدا دہلوی کی۔۔۔۔۔۔تصنیف ہے۔

(a). تحفۃ النصائح (b). طرفۃ الفقہاء (c). فتاویٰ تاتارخانی (d). کوئی نہیں

5. مثنوی مبین کس نے لکھی؟

(a). اورنگ زیب (b). ظہیر الدین بابر (c). ہمایوں (d). کوئی نہیں

6. فقہ بابری کو کس نے تصنیف کیا؟

(a). شیخ نورالدین خوانی (b). شیخ نظام (c). قاضی احمد جونپوری (d). شیخ یوسف

7. فتاویٰ غیاثیہ کو کس کے عہد میں مرتب کیا گیا؟

(a). غیاث الدین بلبن (b). اورنگ زیب (c). فیروز شاہ (d). سکندر لودھی

8. فتاویٰ غیاثیہ کس زبان میں مرتب کیا گیا؟

(a). عربی (b). اردو (c). انگریزی (d). پشتو

9. نصاب الاحتساب کی تالیف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کی۔

(a). ضیاء الدین سنامی (b). شیخ نظام (c). محمود بن محمد دہلوی (d). شیخ یوسف

10. فتاویٰ عالمگیری کتنی جلدوں پر مشتمل ہے؟

(a). چھ (b). دو (c). تین (d). ایک

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. فتاویٰ غیاثیہ پر مختصر مضمون لکھیے۔
2. فتاویٰ تاتارخانی پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔
3. فتاویٰ فیروز شاہی پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
4. فتاویٰ ابراہیم شاہی پر لکھیے۔
5. فتاویٰ عالمگیری پر روشنی ڈالیے۔

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عہد سلطنت میں فقہی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
2. مغلیہ سلطنت میں فقہی خدمات پر مفصل مضمون تحریر کیجیے۔
3. ہندوستان میں علم فقہ کی ترویج پر جامع مضمون قلم بند کیجیے۔

7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. برصغیر میں علم فقہ	:	محمد اسحاق بھٹی
2. فقہائے ہند	:	محمد اسحاق بھٹی
3. اسلامی علوم کا ارتقاء: عہد سلطنت کے ہندوستان میں	:	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
4. سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	:	پروفیسر خلیق احمد نظامی
5. برصغیر ہند میں علوم فقہ اسلامی کا ارتقاء	:	ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

اکائی 8: ہندوستان میں فقہی خدمات (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 فقہی کتابوں کے اردو ترجمے

8.3 اردو زبان میں فقہی تصنیفات

8.3.1 عام (Common) فقہی مسائل پر کتابیں

8.3.2 فتاوی کی کتابیں

8.3.3 نئے مسائل اور خاص موضوع پر کتابیں

8.4 دور جدید میں فقہی خدمات

8.5 اکتسابی نتائج

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

8.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

ہندوستان میں جب اسلامی علوم کی کرنیں طلوع ہونے لگیں تو ابتدا ہی سے حدیث سے زیادہ فقہ کو اہمیت حاصل رہی اور فقہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گیا اور فقہ اور اصول فقہ اور اس کی تاریخ پر عربی فارسی میں کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اردو زبان کے آغاز کے ساتھ ہی فقہ کی کتابیں رسائل اور کتابچوں کی شکل میں لکھیں جانے لگیں۔ اردو زبان کے ارتقاء کے ساتھ ہی دوسری زبانوں سے دیگر اسلامی علوم کی

کتابوں کی طرح فقہ کی کتابوں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالنے کی بناپڑی اور اب عربی کے بعد فقہ کی سب سے زیادہ کتب اردو زبان میں پائی جاتی ہیں۔اس اکائی میں اردو زبان میں تصنیف کی گئی اہم تصانیف اور تراجم کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس بات سے واقف ہو جائیں کہ علمائے برصغیر ہند نے فقہ کے میدان میں نہایت اہم کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ۔ آپ اس بات کو بھی جانیں گے کہ اردو زبان میں فقہ کی اہم تالیفات کونسی ہیں، اور فقہ کی ان تالیفات سے بھی واقف حاصل کر سکیں گے جن کا عربی اور فارسی زبان سے ترجمہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں اسلامی فقہ کی اہمیت اور جدید مسائل اور ان پر ہونے والے کام کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کریں۔

اس اکائی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ یہ جان لیں کہ برصغیر ہند میں فقہی کتب کی تصنیف اور تالیف کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے مسلمانوں نے یہاں سکونت اختیار کی اور ان کتب کی تالیف کا اصل مقصد لوگوں کو دین اسلام کے بنیادی ارکان سے واقفیت اور ان کی صحیح ادائیگی سے واقف کرانا تھا اور ان میں دین کا اصل تفقہ پیدا کرنا تھا۔

8.2 فقہی کتابوں کے اردو ترجمے

ہندوستان میں فقہی علوم کے میدان میں جو خدمات انجام دی گئی ہیں ان میں ایک اہم خدمت یہ بھی ہے کہ یہاں کے علماء نے متعدد اہم فقہی کتابوں کو عربی اور دوسری زبانوں سے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کتابیں دور قدیم سے ہی اسلامی مدارس کے نصاب کا حصہ رہیں ہیں۔ جیسے کہ ہدایہ، شرح وقایہ، الدرالمختار، القدوری، المنار وغیرہ۔ مسلم قانون پر عربی، فارسی اور اردو میں کتب فقہ کی تصنیف کے علاوہ اردو زبان میں دوسری زبانوں سے فقہی کتب کو ترجمہ کیا گیا جس میں عربی فارسی اور انگریزی شامل ہیں۔ ذیل کی سطور میں چند اہم ایسی کتابوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

عربی کتابیں جن کو اردو کا جامہ پہنا گیا ان میں سے چند اہم اور معروف کتابیں:

مختصر القدوری کا ترجمہ:

قدوری فقہ حنفی کی ایک اہم نصابی کتاب ہے۔اس کا ایک اردو ترجمہ مولانا عبدالحفیظ نے ''اشرف النوری'' کے نام سے کیا ہے جو دیوبند سے طبع ہوا۔اس کا دوسرا ترجمہ 'الصبح النوری' کے نام سے مولانا محمد حنیف گنگوہی نے کیا ہے۔یہ بھی دیوبند سے طبع ہو چکا ہے۔

الہدایہ کا ترجمہ:

فقہ حنفی کی نصابی کتابوں میں 'ہدایہ' بے نظیر کتاب ہے۔اس کے کئی اردو ترجمے ہوئے ہیں۔ان میں ایک ترجمہ مولانا امیر علی مترجم فتاوی عالمگیری نے کیا جو 'عین الہدایہ' کے نام سے معروف ہے عین الہدایہ زبان واسلوب کے اعتبار سے اردو زبان کی ایک اہم اور مستند علمی کاوش شمار کی جاتی ہے۔دوسرا ترجمہ 'اشرف الہدایہ' کے نام سے مولانا جمیل احمد سکروڈوی نے کیا ہے۔ایک ترجمہ مع شرح مولانا

محمد حنیف گنگوہی کا ہے جس کا نام 'غایۃ السویۃ فی حل مافی الہدایہ' ہے۔

شرح وقایۃ کا ترجمہ :

شرح الوقایۃ کا پورا نام عمدۃ الرعایۃ فی شرح الوقایہ ہے۔ یہ کتاب وقایۃ الروایہ فی مسائل الھدایہ کی شرح ہے۔ جسے برہان الشریعہ محمود بن احمدؒ نے تالیف کیا۔ مؤلف نے یہ تصنیف اپنے نواسے عبید اللہ ابن مسعود کے لیے بطور یاداشت تحریر کی۔ اس کتاب میں دلائل کو حذف کر کے الہدایہ کے اصل مسائل جمع کیے گئے ہیں۔ فقہ حنفی میں اس کتاب کو اہل علم کے ہاں بڑی پزیرائی حاصل ہوئی اور اس پر کئی شرحیں اور حاشیے لکھے گئے۔ ان تمام حاشیوں میں صدر الشریعہ عبید اللہ ابن مسعود کی شرح وقایہ کو بہت پزیرائی حاصل ہے یہ کتاب درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے۔

شرح وقایہ کے کئی اردو تراجم مختلف نام سے کیے جا چکے ہیں جن میں دو بہت معروف ہیں۔

مولانا وحید الزماں نے "نور الہدایہ ترجمہ شرح الوقایہ" کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ مطبع نظامی کانپور سے 1847ء میں شائع ہوا۔ اسکی چار جلدیں ہیں۔ شرح وقایہ کا یہ قدیم ترین ترجمہ ہے۔ اس میں تمام مسائل شریعہ کو وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مولانا عبد الحفیظ نے نے شرح وقایہ کا ترجمہ 'اشرف الوقایہ' کے نام سے کیا یہ ترجمہ دیوبند سے 1984ء میں طبع ہوا۔ یہ ترجمہ آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ مصنف نے شرح وقایہ کی اصل عبارت عربی میں دے کر اس کا ترجمہ اور تشریح الگ الگ ابواب کے تحت دی گئی ہے۔ زبان اور اسلوب عام فہم ہے۔

درمختار کا ترجمہ:

الدر المختار فقہ کی کتاب تنویر الابصار کی شرح ہے۔ اسکے مولف امام حصکفی ہیں۔ درمختار معتبر و مستند ہونے کے اعتبار سے اور جامع و مختصر ہونے کے لحاظ سے بڑی شہرت رکھتی ہے۔ یہ کتاب فتاویٰ کی صورت میں ہے۔ بڑے بڑے علما نے اس پر حواشی لکھے فتاویٰ جات میں سے کوئی اور ایسا فتاویٰ نہیں کہ اس پر اس طرح شروع سے آخر تک حواشی لکھے گئے ہوں۔

درمختار فقہ بھی فقہی نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کے بھی متعدد اردو تراجم ہو چکے ہیں۔

اس کا ایک ترجمہ 'غایۃ الاوطار' کے نام سے والی رامپور نواب کلب علی کی ہدایت پر مولانا خرم علی نے کیا۔ یہ ترجمہ مطبعہ نول کشور سے چار جلدوں میں 1915ء میں شائع ہوا۔ اور دوسرا ترجمہ 'کشف الاسرار' کے نام سے مولانا ظفیر الدین مفتاحی کا کیا ہوا ہے۔

فتاوی عالمگیری کا ترجمہ:

فتاوی عالمگیری کا تعارف آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان میں ہی اورنگ زیب عالمگیر کے زیر اہتمام تیار ہوئی۔ اس کا عربی سے اردو ترجمہ مولانا احتشام الدین مرادآبادی اور مولانا امیر علی نے کیا ہے۔ اس کا دوسرا ترجمہ مولانا مفتی کفیل الرحمن صاحب اور مولانا انظر شاہ کشمیری کا ہے۔ جو بہت مقبول اور معروف ہے۔

فقہی انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ:

حکومت کویت کی وزارت اوقاف نے بڑے مستند طریقہ پر پینتالیس (45) جلدوں میں چاروں فقہی مسالک کی فقہی انسائیکلوپیڈیا عربی زبان میں شائع کی ہے۔ اس کا مکمل اردو ترجمہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا دہلی کے زیر نگرانی متعدد علماء نے انجام دیا ہے۔

دیگر ترجمے:

ان کے علاوہ بہت سی ایسی فقہی کتابیں ہیں جن کے اردو ترجمے انجام دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی قانون پر ملا کی کتاب کا اردو ترجمہ 'اصول شرع اسلام' کے نام سے مولوی مسعود علی نے 'شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب 'الانصاف فی بیان سبب الاختلاف' کا ترجمہ مولانا صدر الدین اصلاحی نے 'ان کی دوسری کتاب عقد الجید کا ترجمہ مولانا احسن ناناتوی نے اور جدہ فقہ اکیڈمی اور مکہ کی اسلامی فقہی اکیڈمی کے فقہی فیصلوں کا اردو ترجمہ محمد فہیم اختر ندوی نے 'ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی 'فقہ الزکاۃ' اور 'حلال و حرام' کے ترجمے مولانا شمس پیرزادہ نے اور کئی ایک درسی و غیر درسی فقہی کتابوں کے اردو ترجمے مختلف اہل علم نے انجام دیے ہیں۔ اور اس طرح اسلامی قانون اور فقہ کے موضوع پر دوسری زبانوں کا سرمایہ ہندوستانی علماء کی خدمات کے نتیجے میں اردو زبان میں منتقل ہوا ہے۔

Principles of Mohammadan Law کا ترجمہ:

یہ کتاب انگریزوں کے عہد میں جسٹس امیر علی نے انگریزی میں تصنیف کی تھی اس کتاب میں مسلمانوں کے قانون شخصی کے مسائل اور احکام شرع محمدی ﷺ کے مطابق سنی اور شیعہ تمام مذاہب کے مطابق شرح اور بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کیا۔ یہ ترجمہ مطبعہ نول کشور سے دو جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ کتاب آسان زبان اور عام محاورے کے مطابق ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اہل سنت چاروں فقہی مذاہب اور فقہ جعفریہ کا نقطہ نظر بڑی وضاحت اور سلیس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اسکے علاوہ اردو زبان میں کتب فقہ کی منتقلی کے سلسلے میں ہندوستانی فقہا نے بڑے پیمانے پر اصول فقہ، مآخذ فقہ، اجتہاد اور عرب مفکرین فقہ کی تصنیفات اور فقہا کی سوانح کو اردو میں متعارف کروایا۔

8.3 اردو زبان میں فقہی تصنیفات

علم فقہ ایک وسیع سمندر ہے اور اسکا علم بہت وسیع ہے کیونکہ اس کا بالواسطہ تعلق انسان کی زندگی سے ہے۔ دیگر اسلامی علوم کی بہ نسبت فقہ اسلامی کے حوالے سے اردو زبان کا دامن بہت ہی مالا مال ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے ساتھ ہی تفسیر او حدیث کی تعلیم واشاعت سے زیادہ فقہ کا ارتقاء عمل میں آیا۔ مختلف امرا اور سلاطین کے دربار میں فقہا عرصہ سے اس زبان میں اسلامی فقہ و قانون کی کتابیں مختلف جہتوں سے لکھی جا رہی ہیں۔ اردو زبان میں برصغیر ہند میں جو کتب تصنیف کی گئیں اور کی جا رہی ہیں ان کو ہم بنیادی طور پر تین خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

- عام فقہی مسائل پر لکھی گئی اردو کتابیں
- اردو زبان میں طبع ہوئی فتاوی کی کتابیں
- نئے حالات میں پیدا ہونے والے نئے مسائل اور موضوعات پر لکھی جانے والی فقہی کتابیں

ان تین قسموں میں سے ہر قسم پر کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس اکائی میں فقہی موضوعات کے اعتبار سے چند اہم کتابوں کا ذکر کیا جائے گا۔

8.3.1 عام (Common) فقہی مسائل پر کتابیں

اردو زبان میں فقہی تصنیفات کا آغاز چھوٹے کتابچوں اور رسائل کی شکل میں ہوا زیادہ تر ان مسائل پر مشتمل ہوتا جن کا تعلق براہ راست روزمرہ کی زندگی کے اہم مسائل سے ہوتا۔ ان تصنیفات میں دو طرح کی کتب نظر آتی ہیں پہلی قسم ایسی کتب پر مشتمل ہے جن میں فرائض وواجبات سے متعلق تفصیلی بحث ہوتی تھی۔ دوسری قسم ان کتب پر مشتمل ہے جن کے ذریعہ مسلمان روزمرہ کی زندگی میں سماجی، معاشرتی اور معاشی معاملات میں اسلامی قوانین سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ اردو زبان میں فقہ کے موضوعات پر صرف نثر ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی کتابیں تحریر کیں گئیں۔

عام فقہی احکام ومسائل پر جو کتابیں تصنیف کی گئیں اور بڑے پیمانے پر عام ومقبول ہوئیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

علم الفقہ: یہ چھ جلدوں میں فقہی مسائل کی جامع کتاب ہے جسے مولانا عبدالشکور فاروقی نے تصنیف کیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں روزمرہ کے فقہی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں مصنف نے اس دور کے نئے مسائل کا اور ان کے فقہی حل پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں چالیس احادیث اور حضرت عمر کے چالیس آثار نقل کیے گئے ہیں۔

حقیقۃ الفقہ: دو جلدوں میں مولانا انوار اللہ خاں نے فقہی مسائل پر یہ کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

اسلامی فقہ: مولانا مجیب اللہ ندوی نے تین جلدوں میں لکھی ہے یہ نہایت جامع کتاب ہے جس میں قدیم وجدید مسائل کا احاطہ اور مختلف فقہی مسالک کی آراء کا ذکر کیا گیا ہے۔

عمدہ الفقہ: یہ کتاب سید زوار حسین نے تین حصوں میں تصنیف کی۔ اس کتاب میں ایمان وعقائد اور طہارت سے روزے تک کے احکام ہیں۔ ابتدائی دو حصوں میں دلائل کو ذکر نہیں کرتے لیکن تیسرے حصہ میں مسائل کے ساتھ دلائل کا بھی اہتمام کیا ہے۔

بہار شریعت: یہ بھی تین ضخیم جلدوں پر مشتمل فقہی مسائل کی جامع کتاب ہے جسے مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی نے سہل اسلوب میں لکھا ہے۔

بہشتی زیور: گیارہ حصوں پر مشتمل یہ مشہور کتاب مولانا اشرف علی تھانوی کے افادات کا مجموعہ ہے جسے مولانا سید احمد علی فتحپوری نے تیار کیا ہے۔ یہ کتاب اصلاً عورتوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ بہشتی زیور سے مردوں سے متعلقہ اہم مسائل کا استخراج کرنے کے لیے بہشتی ثمر کے نام سے مولانا عیسی خان نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کے ہر باب کے آخر میں سوالات بھی درج ہیں یہ دونوں کتابیں مدارس

کے نصاب میں شامل ہیں۔

دین کی باتیں: یہ کتاب مولانا سعید نے بہشتی زیور اور بہشتی گوہر سے مسائل منتخب کر کے ترتیب دی ہے۔ اس کتاب میں پیش آنے والے کچھ مسائل اور انکا حل بھی شامل کیا گیا ہے۔

تعلیم الاسلام: اس کتاب کو بچوں کے مفتی کفایت اللہؒ نے تصنیف کیا ہے۔ یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب سوال جواب کے انداز میں لکھی گئی ہے بچوں اور بڑوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

آسان فقہ: یہ مولانا یوسف اصلاحی کی تصنیف ہے اور بچوں کے مزاج کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔

شافعی فقہ: فقہ شافعی کے مسائل پر یہ کتاب دو جلدوں میں ہے' اس کے مصنف شافعی عالم مولانا محمد ایوب ندوی بھٹکلی ہیں۔

قاموس الفقہ: یہ کتاب معاصر عالم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی تیار کردہ فقہی انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں حروف تہجی کی (الف بائی) ترتیب سے فقہی مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔ کتاب چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں فقہی اصطلاحات کی وضاحت کے ساتھ تاریخ فقہ اسلامی، اصول فقہ، مقاصد شریعت اور آئمہ اربع کے مذاہب کا تعارف ان کی خصوصیات اہم مطبوعات کا بھی اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔

مجموعہ قوانین اسلامی: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت علماء کی کمیٹی نے فقہ حنفی کے عائلی مسائل پر یہ قانونی مجموعہ دفعہ وار اسلوب میں تیار کیا ہے۔

اسلامی عدالت: اسلام کے عدالتی آداب و احکام اور مسائل پر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی یہ تصنیف ایک جلد میں ہے۔ اس کتاب میں عدل کی اہمیت اور معاشرے میں امن کے قیام اور شر و فساد کے خاتمے میں عدل کی اہمیت اور اس سے متعلق قرآن اور احادیث کی تعلیمات تفصیلاً ذکر کی گئیں ہیں۔ قضاء کیا ہے قاضی کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں؟ اور اسلامی عدالت میں کیا طریقہ کار ہونا چاہیے اس موضوع پر اردو دفعات پر مشتمل فقہ اسلامی کی پہلی کتاب ہے جو نہایت جامع اور مستند ہے اس کتاب کی ترتیب میں تمام ائمہ فقہ کی آراء سے استفادہ کیا گیا ہے

برصغیر ہند میں علوم فقہ اسلامی کا ارتقاء: ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی کی تصنیف ہے جو کہ دراصل انگریزی زبان میں ایم فل کا مقالہ ہے جسے خود مصنف نے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے فاضل مصنف نے فقہ اسلامی کی حقیقت اور اس کے ارتقاء پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اپنی اس کاوش کا تعارف کرایا ہے باب اول میں برصغیر میں فقہ اسلامی کے ارتقاء پر گفتگو کرتے ہوئے 1857ء سے قبل کی فقہی خدمات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز 1857ء کے بعد اس میدان میں ہونے والی غیر معمولی علمی ترقی کی طرف اجمالی طور اشارہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں عربی، فارسی اور انگریزی زبان کے فقہی لٹریچر کے اردو ترجمہ کا ذکر کیا ہے۔ تیسرے باب میں اردو میں تالیف شدہ کتب فقہ کی فہرست پیش کی ہے۔ چوتھے باب میں ہندوستان کے فقہی مدارس و مکاتب پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں ان درسگاہوں کا بھی ذکر ہے جن کی فقہ اسلامی پر خصوصی توجہ رہی ہے اس باب میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی خدمات کو خاص طور پر خرج

تحسین پیش کیا گیا ہے۔ نیز ان اداروں کا بھی ذکر کیا ہے جو مسائل کو اجتماعی غور و فکر کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پانچویں باب میں چند اہم فقہی کتابوں کا تعارف اور چھٹے باب میں پاکستان کی سرکاری جامعات اور بعض حکومتی اور پرائیوٹ اداروں کی خدمات کا تعارف ہے۔

8.3.2 فتاوی کی کتابیں

ہندوستان میں فتاوی کے مجموعوں کی ترتیب اور اشاعت کی بھی روایت چلی آ رہی ہے۔ علماء کرام اور دارالافتاء سے عام لوگ جو تحریری سوالات پوچھتے ہیں اور وہاں سے ان کے شرعی جوابات دیے جاتے ہیں' یہی جوابات بعد میں فقہی ترتیب سے مرتب کرکے شائع کیے جاتے ہیں۔ ایسے فتاوی کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل میں صرف چند کتب فتاوی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

فتاوی عزیزیہ:

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (1239ھ) کے فتاوی کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ اس کتب میں فقہ عقیدہ تصوف اور علم کلام کے مضامین شامل ہیں۔ اس فتاوی میں پانچ بڑے ابواب کے تحت مسائل ہیں۔

- باب التفسیر والتشریح (قرآن کریم کی مختلف آیات کی تفسیر اور احکام و مسائل کا ذکر ہے)
- باب التصوف (وحدت الوجود، وحدت الشہود، کشف الہام، بدعات و رسومات وغیرہ سے متعلق مسائل شامل ہیں)
- باب الخلافہ (تفصیل شیخین، بارہ خلفا آئمہ اثنا عشریہ خلافت علی منہاج النبوہ وغیرہ شامل ہیں)
- باب العقائد (عقیدہ، روئیت باری تعالی، شفعت انبیا، عدالت صحابہ، واقعہ معراج، عصمت انبیا وغیرہ کا ذکر ہے)
- باب الفقہ (طہارت، نماز، روزہ، حج۔ نکاح، طلاق بیع رہن، سود وغیرہ کے متعلق فقہی احکام ہیں)

یہ فتاوی فارسی زبان میں ہے اس کا اردو ترجمہ مولانا عبد الواحد غازی پوریؒ نے 1322ھ میں کیا۔ بعد دیگر علما، نے بھی اس کا ترجمہ کیا ان میں مولانا محمد نواب علی، ایچ ایم سعید اور مولانا عبد الجلیل شامل ہیں۔

مجموعۃ الفتاوی:

یہ معروف عالم مولانا عبد الحی لکھنوی کے فتاوی کا مجموعہ ہے۔ آپ نہایت محقق العصر عالم تھے۔ آپ کو علم حدیث، فن رجال اصول حدیث اور فقہ میں ید طولی حاصل تھا۔ مجموعۃ الفتاوی تین حصوں پر مشتمل ہے ان میں درج ذیل موضوعات پر سوالات و جوابات شامل ہیں۔ کفر و ایمان، عقائد، سنت و بدعت، قرآن و حدیث، جنت و جہنم، علم و علماء طہارت و نجاست، صلوۃ و زکوۃ، قضا و شہادت، بیعت و خلافت وغیرہ۔

اس فتاوی میں اکثر سوالات عربی اور فارسی میں تھے۔ ابتدا میں محمد برکت اللہ فرنگی محلیؒ نے اس فتاوی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس فتاوی کے منتشر مسائل کو فقہی ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا۔ پھر حضرت مفتی وصی علی ملیح آبادیؒ نے ان تمام مسائل کی از سر نو فہرست مرتب کی۔ اس فتاوی کا ایک اور ترجمہ مولانا خورشید عالم نے بھی مرتب کیا۔

فتاوی رشیدیہ:

یہ فتاوی فقیہ النفس مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاوی کا مجموعہ ہے جس میں اعتقادی مسائل پر زیادہ توجہ ہے۔ یہ فتاوی جملہ ایک ہزار اکتیس (1031) پر مشتمل ہے۔ یہ فتاوی آپ نے زندگی کے مختلف اوقات میں اور خصوصا دار العلوم دیوبند کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے آنے والے استفتاء کے جواب میں لکھے ہیں۔ اس وقت کے اعتبار سے ان کے زیادہ تر فتاوی بدعات اور رسومت اور عقائد پر مبنی سوالات کے جواب میں ہیں۔

فتاوی خلیلیہ (فتاوی مظاہر العلوم):

یہ فتاوی حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے فتاوی کا مجموعہ ہے۔ جو آپ نے مظاہر العلوم کے دار الافتا سے جاری کیے تھے۔ اس لیے ان کو فتاوی دار العلوم بھی کہتے ہیں۔ ان فتاوی کو مولانا سید خالد نے مرتب کیا ہے۔ اس کے شروع میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کا قیمتی پیش لفظ ہے۔ یہ فتاوی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

فتاوی دار العلوم دیوبند:

یہ فتاوہ مولانا مفتی عزیز الرحمنؒ کے فتاوی کا مجموعہ ہے۔ آپ دار العلوم دیوبند میں افتاء کے عہدہ پر چھتیس سال فائز رہے۔ آپ کے ابتدا کے اٹارہ سال کے فتاوہ قلم بند نہ ہونے کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکے جبکہ دوسرے اٹھارہ سال کے فتاوی چودہ ضخیم رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔ فتاوی کا یہ مجموعہ 12 جلدوں میں طبع ہوا اس میں جملہ 8484 فتاوی شامل ہیں۔ فتاوی کا یہ مجموعہ ابھی بھی نامکمل ہے۔

عزیز الفتاوی:

حضرت مولانا شفیعؒ نے حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ کے 1329ھ سے 1334ھ تک لکھے گئے فتاوی کو جمع کیا ہے۔ مفتی صاحب کے فتاوی کل چودہ رجسٹروں پر مشتمل تھے جن میں سے مفتی شفیع صاحب نے دو اور مفتی ظفر الدین مفتاحیؒ نے باقی جسٹروں کے فتاوی کو مرتب کیا۔ یہ فتاوی دار العلوم دیوبند سے آٹھ جلدوں میں شائع ہوئے۔

امداد الفتاوی:

مولانا اشرف علی تھانوی (1943ء) کے فتاوی کا مجموعہ ہے، چھ جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ اس کتاب کو مولانا نے اپنے استاد مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی نسبت کے ساتھ امداد الفتاوی کا نام دیا۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین مفتی شفیعؒ اور مولانا ظہور احمدؒ نے کی۔ یہ فتاوی کی کتاب بر صغیر ہند کے علاوہ دیگر بلاد اسلامیہ کے علما کے لیے ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں جملہ 3448 فتاوی شامل ہیں۔

فتاوی نذیریہ:

یہ مجموعہ اہل حدیث عالم مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے فتاوی کا ہے۔ عربی و فارسی فتاوی کے اردو ترجمہ کے ساتھ دو جلدوں میں مطبوعہ ہے۔

فتاوی رضویہ:

اس کا پورا نام 'العطایا النبویۃ فی الفتاوی الرضویہ ہے' جو مشہور عالم مولانا احمد رضا خاں (1340ھ) کے تحقیقی فتاوی کا مجموعہ ہے۔ 30 جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ اس کو فقہ حنفیہ کا فقہی انسائیکلوپیڈیا بھی کہا جاتا ہے۔

فتاوی نظامیہ:

یہ حیدرآباد کے معروف قدیم دینی ادارہ جامعہ نظامیہ کے مفتی مولانا محمد رکن الدین کے فتاوی کا مجموعہ تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں طبع ہوا ہے۔ اس میں آپ نے فقہی مسائل کے ساتھ ساتھ عقائد و معمولات اہل سنت والجماعت اور باطل فرقوں کے رد میں فتاوی تحریر کیے ہیں۔ یہ فتاوی ابتدا تین جلدوں میں شائع ہوئے تھے بعد میں تحقیق و ترتیب کے بعد ایک ہی جلد میں طبع کر دیے گئے ہیں۔ اسکے علاوہ جامعہ نظامیہ کے فتاوی مجلہ انوار نظامیہ میں سالانہ شائع کیے جاتے ہیں۔

کفایت المفتی:

مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ (1372ھ۔1952ء) کے فتاوی کا مجموعہ ہے' یہ نو جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ اسے آپ کے فرزند مولانا حفظ الرحمن واصف نے مرتب کیا۔ آپ کے فتاوی سہ روزہ الجمیعہ میں حوادث و احکام کے عنوان سے شائع ہوتے تھے۔ اس مجموعے میں جملہ 4502 فتاوی شامل ہیں۔ ان فتاوی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت عام فہم ہیں اور فنی اصطلاحات اور پیچیدگیوں سے گریز کیا گیا ہے۔ ہر مسئلے کی تخریج میں کم از کم تین حوالے نقل کیے ہیں۔

فتاوی محمودیہ:

فقیہ الامت مفتی محمود حسن (1996ء) گنگوہیؒ کے فتاوی کا مجموعہ ہے آپ نے تقریباً دس ہزار استفتاء کے جوابات تحریر کیے اس لیے آپ کو فقیہ الامت کے لقب موسوم کیا گیا۔ آپ کے ان فتاوی کو مولانا محمد فاروق میر ٹھی نے مرتب کیا ہے۔ اس فتاوی کی کتاب میں 9885 استفتاء اور 12577 مسائل درج ہیں۔ اٹھارہ جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ اردو فتاوی میں یہ نہایت ضخیم اور مفصل ترین فتوی کا مجموعی ہے۔ اس میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق فتاوی جات موجود ہیں۔

فتاوی رحیمیہ:

یہ مفتی عبد الرحیم لاجپوری (2001ء) کے فتاوی کا مجموعہ ہے، نو جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ اس فتاوی کے شروع میں کئی اکابر اہل علم کی تقریظات ہیں۔ یہ مجموعی 2758 فتاوی پر مشتمل ہے۔ تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے یہ فتاوی نہایت بلند پایہ ہے۔ اس میں فقہی کتب کے حوالوں کے علاوہ احادیث اور آثار کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ بعض مسائل پر اس قدر تحقیقی تفصیل ہے کہ وہ ایک رسالے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اسلوب و زبان نہایت عام فہم اور سلیس ہے۔

نظام الفتاوی:

دارالعلوم دیوبند کے مفتی مولانا نظام الدین کے فتاوی کا مجموعہ ہے۔ اس کے منتخب فتاوی دو جلدوں میں علاحدہ سے بھی مطبوعہ

ہیں۔

8.3.3 نئے مسائل اور خاص موضوع پر کتابیں

تیسری قسم کی فقہی کتابیں وہ ہیں جو مختلف اہل علم کے قلم سے ایسے موضوعات اور مسائل پر سامنے آئی ہیں جو بدلے حالات میں غور و فکر کے متقاضی ہوئے۔ ایسی کتابیں بہت بڑی تعداد میں ہیں اور مختلف علمی حلقوں سے تحقیقی اسلوب میں طبع ہو رہی ہیں۔ بطور نمونہ ذیل میں صرف چند کتابوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

جواہر الفقہ:

پانچ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب مفتی محمد شفیع کے تحقیقی مقالات اور تحریروں کا مجموعہ ہے، جس میں اعضا کی پیوند کاری، انتخابات، جدید آلات کے استعمال اور کرنسی وغیرہ کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے مجلات:

اسلامک فقہ اکیڈمی کے سمیناروں میں نئے موضوعات پر مختلف اہل علم تحقیقی مقالات پیش کرتے ہیں' یہ مجلات ان ہی مقالات کے مجموعے ہیں۔ اب تک بیس سے زائد مجموعے شائع ہو چکے ہیں' جن میں انشورنس' کلوننگ' جنیٹک سائنس' کرنسی نوٹ' برتھ کنٹرول' بینک انٹرسٹ' بینکنگ' طبی اخلاقیات' شیرز اور نئے سماجی مسائل وغیرہ کے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

جدید فقہی مسائل:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی یہ کتاب سینکڑوں جدید قسم کے ان مسائل پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے جو زندگی کے مختلف میدانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایضاح النوادر:

مفتی شبیر احمد قاسمی کی دو جلدوں میں یہ کتاب تجارت' ایکسپورٹ وامپورٹ' شیرز وانشورنس اور زکاۃ کے مختلف مسائل وغیرہ پر مشتمل ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی حل: مولانا برہان الدین سنبھلی کی یہ تصنیف حق طباعت کی فروخت' فیملی پلاننگ اور عشری اراضی کے احکام وغیرہ سے متعلق ایک جلد میں مطبوعہ ہے۔

کتاب العشر والزکاۃ:

مولانا عبد الصمد رحمانی کی تالیف ہے اور ہندوستان کی اراضی کی شرعی حیثیت پر تحقیقی گفتگو پر مشتمل ہے۔

سماجی مسائل پر کتابیں:

نئے مسائل پر لکھی گئی کتابوں میں جہاں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے' وہیں بسا اوقات صرف ایک موضوع پر بھی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر سماجی مسائل پر متعدد کتابیں سامنے آئی ہیں' جیسے مولانا اشرف علی تھانوی کی "الحیلۃ الناجزۃ' مولانا عبد الصمد رحمانی کی 'کتاب الفسخ والتفریق' مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی 'طلاق و تفریق' اور 'معاشرتی مسائل' مولانا عبید اللہ اسعدی کی

"تحدید نسل' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی 'اسلام اور ضبط ولادت' اور 'حقوق الزوجین'۔ اور اسی طرح نکاح' طلاق اور میراث کے مسائل پر مفتی نسیم احمد قاسمی کی کتابیں وغیرہ۔

معاشی مسائل پر کتابیں:

معاشی مسائل پر بھی مختلف اہل علم نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جیسے مولانا برہان الدین سنبھلی کی 'بینک انشورنس اور سرکاری قرضے' 'مولانا مودودی کی 'سود' مولانا عبید اللہ اسعدی کی 'الربا'، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی 'غیر سودی بینک کاری' اور مولانا مجیب اللہ ندوی کی 'اسلامی قانونی اجرت' وغیرہ۔

طبی مسائل پر کتابیں:

طبی مسائل پر لکھی گئی کتابوں میں مولانا برہان الدین کی جدید میڈیکل مسائل' مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی 'اسلام اور جدید میڈیکل مسائل' وغیرہ مطبوعہ ہیں۔

عبادات سے جڑے مسائل پر کتابیں:

وہ مسائل جن کا تعلق عبادات سے ہے ان پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں' جیسے مولانا عتیق احمد قاسمی کی 'مصارف زکاۃ' اور 'مسئلہ تملیک' مولانا شہاب الدین 'ندوی کی زکاۃ اور مصالح عامہ' مولانا برہان الدین سنبھلی کی 'رویت ہلال' مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی عبادات اور چند اہم جدید مسائل' مولانا عبد الصمد رحمانی کی 'ہندوستان اور مسئلہ امارت' اور اسی طرح طہارت' نماز کے مختلف مسائل اور روزہ وزکاۃ وغیرہ پر مولانا محمد رفعت قاسمی کی متعدد کتابیں۔

فقہی تاریخ پر کتابیں:

فقہی مسائل اور احکام کے علاوہ فقہ اسلامی کی تاریخ پر بھی اردو زبان میں کتابیں لکھی گئی ہیں' یا دوسری زبان سے اردو میں منتقل کی گئی ہیں۔ فقہ اسلامی کی تاریخ پر عربی میں شیخ محمد خضری بک کی "تاریخ التشریع الاسلامی' مشہور کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا عبد السلام ندوی نے 'تاریخ فقہ اسلامی' کے نام سے کیا ہے جو دارالمصنفین اعظم گڑھ سے طبع ہو چکی ہے۔ فقہ اسلامی کے تعارف اور تاریخ پر مشترکہ تصنیف پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی کے قلم سے طبع ہوئی ہے۔ اس عنوان پر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب بھی طبع ہوئی ہے۔ نیز مولانا مناظر احسن گیلانی کی 'تدوین فقہ' بھی ایک مختصر تحریر ہے۔

8.4 دور جدید میں فقہی خدمات

ماضی قریب اور معاصر دور میں بھی عربی زبان میں فقہی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ ان میں ایک اہم کتاب "القواعد الفقهية' ہے جس میں فقہی قواعد کو جمع کیا گیا ہے اور ان پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کے مصنف محقق عالم مولانا علی احمد ندوی ہیں۔

دار لعلوم ندوۃ العلماء لکھنو ہی کے ایک استاذ مولانا شفیق الرحمن ندویؒ نے نصابی ضرورت کے لیے "الفقه الميسر" لکھی جو فقہ کی

ابتدائی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا عبد الحی لکھنوی نے شرح وقایہ کی ایک شرح 'السعایۃ فی کشف مافی شرح الوقایہ' لکھنی شروع کی تھی۔ کتاب بہت اہم اور محققانہ ہے، لیکن مکمل نہ ہو سکی۔ آپ کا ایک حاشیہ فقہ کی مشہور کتاب 'ہدایہ' پر بھی ہے۔ اسی طرح 'شرح وقایہ' پر بھی آپ کا حاشیہ 'عمدۃ الرعایہ' کے نام سے ہے۔

حواشی میں 'نورالایضاح'، 'النقایہ' اور 'کنزالدقائق' پر حاشیہ مولانا اعزاز علیؒ نے اور 'کنزالدقائق' پر ایک اور حاشیہ مولانا احسن نانا تویؒ نے لکھا ہے۔ نیز 'قدوری' پر حاشیہ مولانا فیض الحسن کے قلم سے ہے۔ اسی طرح مولانا نظام الدین کیرانویؒ نے بھی متعدد کتابوں پر حواشی تحریر کیے ہیں۔

اصول فقہ پر ایک اہم کتاب معاصر عالم مولانا عبید اللہ الاسعدی کی تالیف ہے۔ اس کا نام 'اصول الفقہ' ہے اور متعدد جگہوں پر داخل نصاب ہے۔

ہندوستانی علماء کی فقہی خدمات میں قدیم فقہی مخطوطات کی تحقیق و اشاعت بھی شامل ہے۔ اس ضمن میں دیوبند کے مشہور عالم مولانا ارشد مدنی نے حسن بن عمار شرنبلالی (1069ھ) کی کتاب 'شرح منظومۃ ابن وھبان' کو اپنی تحقیق سے شائع کیا ہے۔ اسی طرح ایک نوجوان عالم مولانا رحمت اللہ ندوی نے امام نوویؒ کے فتاوی 'المنثورات فی عیون المسائل المہمات' کو ایڈٹ کر کے شائع کرایا ہے۔ ہندوستان کے اہم فقہی ادارہ اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی نے امام برہان الدین مرغینانی کی کتاب "مختارات النوازل' کی تحقیق و اشاعت کی ہے۔

ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور تیز رفتار سیاسی تبدیلیوں، معاشی انقلابات اور وسائل و ذرائع کی ایجادات کا ہے۔ اس لئے اس عہد میں مسائل بھی زیادہ پیش آتے ہیں، چنانچہ ماضی قریب میں مختلف اسلامی ممالک میں اس مقصد کے لئے فقہ اکیڈمیوں کا قیام عمل میں آیا، جدید مسائل کو حل کرنے میں ان کی خدمات بہت ہی عظیم الشان اور قابل تحسین ہیں، اس سلسلہ کی ایک کڑی انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی (جدہ) بھی ہے جو کہ اسلامی کانفرنس کی تنظیم OIC کے تحت 1983ء میں جدہ میں قائم ہوئی۔ اس اکیڈمی کے تحت اب تک مختلف موضوعات پر کئی سیمینار ہو چکے ہیں۔ ان سیمیناروں میں معاشی، معاشرتی، طبی اور اجتماعی مسائل پر بحث ہو چکی ہے اور اس کے فیصلے پوری دنیا میں قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی (جدہ) کے تحت ہونے والا سیمینارز میں عصر حاضر کے جدید معاشی، طبی، معاشرتی و سیاسی اور سائنسی مسائل کے بارے میں علمائے عالم اسلام کے شرعی فیصلے اور سفارشات پر مشتمل ہے۔ جسے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے مولانا مفتی ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی (سابق انچارج علمی امور اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا) سے ترجمہ کروا کر شائع کیا۔

جدید فقہی کتابوں میں "اسلام اور جدید فکری مسائل" مولانا خالد سیف رحمانی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں آپ نے اسلامی شریعت سے متعلق ملکی و بین الاقوامی سطح پر پھیلے ہوئے پروپیگنڈوں اور غلط فہمیوں کا جائزہ لیا ہے اور اسلام کی اصل تعلیمات اور اس کی عقل فطرت اور حکمت و مصلحت سے ہم آہنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

8.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- فقہ کے میدان میں ایک اہم کام ماضی قریب اور معاصر دور میں یہ بھی ہوا کہ دوسری زبانوں میں لکھی گئی فقہی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا اور اہل اردو کے لیے ان کتابوں سے استفادہ کی راہ کھولی گئی۔ اس کی وجہ سے اردو زبان کا دامن مزید مالا مال ہوا۔
- جن فقہی کتابوں کے اردو ترجمے کئے گئے ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ جن کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ان میں ہدایہ، شرح وقایہ، در مختار اور قدوری شامل ہیں۔ ترجمہ کی گئی ان کتابوں میں مراجع کی نصابی کتابیں بھی ہیں، فقہی انسائیکلوپیڈیا بھی ہے اور فتاوی کے علاوہ نئے مسائل پر کتابیں بھی ہیں۔
- اردو زبان میں برصغیر ہند میں جو کتب تصنیف کی گئیں اور کی جارہی ہیں ان کو ہم بنیادی طور پر تین خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ عام فقہی مسائل پر لکھی گئی اردو کتابیں، اردو زبان میں طبع ہوئی فتاوی کی کتابیں، نئے حالات میں پیدا ہونے والے نئے مسائل اور موضوعات پر لکھی جانے والی فقہی کتابیں۔
- ہندوستان میں فتاوی کے مجموعوں کی ترتیب اور اشاعت کی بھی روایت چلی آرہی ہے۔ علماء کرام اور دارالافتاء سے عام لوگ جو تحریری سوالات پوچھتے ہیں اور وہاں سے ان کے شرعی جوابات دیے جاتے ہیں، یہی جوابات بعد میں فقہی ترتیب سے مرتب کرکے شائع کیے جاتے ہیں۔ ایسے فتاوی کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔
- اردو زبان میں کتب فقہ کی منتقلی کے سلسلے میں ہندوستانی فقہانے بڑے پیمانے پر اصول فقہ، مآخذ فقہ، اجتہاد اور عرب مفکرین فقہ کی تصنیفات اور فقہا کی سوانح کو اردو میں متعارف کروایا۔
- فقہی مسائل اور احکام کے علاوہ فقہ اسلامی کی تاریخ پر بھی اردو زبان میں کتابیں لکھی گئی ہیں، یا دوسری زبان سے اردو میں منتقل کی گئی ہیں۔ فقہ اسلامی کی تاریخ پر عربی میں شیخ محمد خضری بک کی ''تاریخ التشریع الاسلامی'' مشہور کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالسلام ندوی نے 'تاریخ فقہ اسلامی' کے نام سے کیا ہے۔
- اردو زبان فقہ اسلامی کی کتابوں سے مالا مال ہے۔ بلکہ دور جدید میں بھی فقہ اسلامی کے ہر مسئلے اور موضوع پر کتابیں لکھی جارہی ہیں یا ترجمہ کی جارہی ہیں۔ اور ہندوستان میں فقہی خدمات کا دائرہ وسیع اور وقیع ہوتا جارہا ہے۔

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

8.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. امداد الفتاوی کے مصنف.................................. ہیں۔

(a). شاہ ولی اللہ (b). اشرف علی تھانوی (c). عبدالسلام ندوی (d). کوئی نہیں

2. اشرف علی تھانوی کی علم فقہ پر معروف کتاب.................ہے۔

(a). بہشتی زیور (b). حقیقۃ الفقہ (c). عمدۃ الفقہ (d). اسلامی فقہ

3. آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت علماء کی کمیٹی نے فقہ حنفی کے عائلی مسائل پر........... قانونی مجموعہ دفعہ وار اسلوب میں تیار کیا ہے۔

(a). قاموس الفقہ (b). مجموعہ قوانین اسلامی (c). مجالات فقہ (d). کوئی نہیں

4. .... عربی کتاب کا ترجمہ غایۃ الاوطار' کے نام سے مولانا خرم علی نے کیا ہے۔

(a). ہدایہ (b). قدوری (c). در مختار (d). کوئی نہیں

5. تعلیم الاسلام کے مصنف...........................ہیں۔

(a). مفتی کفایت اللہ (b). مفتی انوار اللہ (c). مفتی امداد اللہ (d). کوئی نہیں

6. فتاوی عالمگیر ہندوستان میں...........................بادشاہ کے زیر اہتمام مرتب کی گئی۔

(a). اکبر (b). شاہجہاں (c). اورنگ زیب (d). دارالشکوہ

7. اسلام کے عدالتی آداب واحکام اور مسائل پر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی..............تصنیف ہے۔

(a). اسلامی عدالت (b). مظالم عدالتیں (c). دونوں (d). کوئی نہیں

8. "العطایا النبویۃ فی الفتاوی الرضویہ" مشہور عالم..............................کے تحقیقی فتاوی کا مجموعہ ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(a). مولانا احمد رضا خاں (b). مولانا انوار اللہ فاروقی (c). مولانا قاسم نانوتوی (d). کوئی نہیں

9. Principals of Mohammadan Law کے مصنف.........................ہیں۔

(a). سر گوڈی (b). جسٹس امیر علی (c). سخاو (d). ولیم مور

10. خالد سیف اللہ رحمانی کی تصنیف .... نئے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔

(a). جدید طبی مسائل (b). تحدید نسل (c). پردہ (d). سبھی

8.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اردو زبان میں فقہی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے فقہ کے عام موضوعات پر لکھی گئی کتابوں پر گفتگو کیجیے۔
2. اردو زبان میں فتاویٰ کی کتابوں پر ایک تعارفی نوٹ لکھیے۔
3. اردو زبان میں فقہی کتب کے ترجمے کی تاریخ کا جائزہ لیجیے۔

4. اردو زبان میں نئے مسائل پر لکھی جانے والی فقہی کتب کا جائزہ لیجیے۔

5. عصر جدید میں فقہی خدمات پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

8.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اردو زبان میں فقہی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے فقہ کے عام موضوعات پر لکھی گئی کتابوں پر گفتگو کیجیے۔

2. فقہی کتب کے اردو تراجم کا تفصیلی تعارف پیش کیجیے۔

3. ہندوستان میں اردو زبان میں فقہی کتب کی تصنیفات اور تراجم پر اپنی معلومات پیش کیجیے۔

8.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ : المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

2. فقہ اسلامی، اصول، خدمات اور تقاضے : مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

3. برصغیر ہند میں فقہ اسلامی کا ارتقاء : ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

4. اردو کتب فتاوی کا تعارف : محمد رحیم الدین انصاری، محمد جمال الدین قاسمی اور طلبائے تخصص دارالعلوم حیدرآباد

5. اردو کی فقہی کتب کا تحقیقی جائزہ : ارشاد الحق قدوسی

6. کتب فقہ اصول فقہ اور اردو فتاوی کا تعارف : مولانا محمد نعمان

اکائی 9: تصوف کا آغاز وارتقاء(حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 اسلام میں تصوف کا آغاز وارتقاء

9.3 تصوف کے معنی ومفہوم

9.4 تصوف کی تعریفات

9.5 تصوف کی بنیادی خصوصیات

9.6 تصوف کے بارے میں علما اور مفکرین کے آرا

9.7 آداب تصوف

9.8 تصوف کی اہم اصطلاحات

9.9 تصوف کا تجزیاتی نقطہ نظر

9.10 اکتسابی نتائج

9.11 نمونہ امتحانی سوالات

9.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

9.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

اسلام جب نمودار ہوا تو روحانی زندگی سے معمور تھا جس میں خوف خدا احساس بندگی علائق دنیاوی سے بے نیازی شامل تھی اور

اس کی تعلیمات زہد و تقوی سے مزین تھیں۔ اسلام کا یہ رنگ ابتدائی زمانے میں سارے مسلمانوں کے درمیان عام تھا، کیوں کہ ان کے درمیان نبی کریم ﷺ کی ذات بہترین نمونہ کے طور پر موجود تھی۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام کی ذات نے مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے متاثر کیا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور کچھ ہی مدت بعد اجنبی عناصر نے اسلامی تعلیمات میں ایک قسم کا امتزاج پیدا کیا اور وہ سادگی و اخلاص جو اسلام کا خاصہ تھی باقی نہ رہی۔ اور اس طرح مقصد اور راستے بھی متعین ہونے لگے اور روحانی اور قلبی سکون نیز تصفیہ قلب اور اپنے خالق سے رشتہ مضبوط کرنے کے لیے تصوف کا ایک نظام وجود میں آیا۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ تصوف یا صوفی ازم کی ابتدا ایک تحریک کے طور پر ہوئی تھی۔ آپ یہ بھی جانیں گے کہ تصوف کیا ہے۔ اور شریعت سے اس کا کیا تعلق کیا ہے۔ اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ شریعت سے مراد محض اصول وضوابط کا وہ مجموعہ نہیں ہے جو قرآن، سنت میں موجود یا اس سے مستنبط ہے بلکہ اس سے وہ پورا دین مراد ہے جو عقائد، عبادات اخلاق معاشرت معیشت اور حکومت سب کو محیط ہے۔ اس کے دائرے میں وہ طریقہ بھی آتا ہے جس کے ذریعہ رسول کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کا تزکیہ فرمایا۔ اسی طرح عہد رفتہ کے ساتھ تصوف نے کس طرح اپنی ایک علاحدہ شناخت بنائی اور کس طرح تصوف کے بارے میں علما و مفکرین نے اثبات و اختلاف کیا اس سے بھی واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

9.2 اسلام میں تصوف کا آغاز و ارتقاء

انسانیت کی تاریخ میں تصوف یا صوفی ازم (Sufism) مختلف ناموں کے ساتھ، ایک عالمگیر تحریک رہی ہے۔ ابتدا ہی سے انسانوں میں دو رجحان بہت عام رہے ہیں۔ ایک رجحان دنیا پرستی کا ہے جس میں انسان مال و دولت، شہرت، اور لذت حاصل کرنے کے لئے اپنے دین و ایمان کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اس کے بالکل بر عکس دوسرا رجحان دنیا سے گریز کا ہے جس میں انسان دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جاتا ہے۔ قدیم دور سے یہ دونوں رجحان انسانوں میں موجود رہے ہیں۔ ایسے خواتین و حضرات جن میں دنیا سے گریز کا رجحان قوی تھا، انہوں نے ضروریات زندگی سے منہ موڑ کر جنگلوں صحراوں کی راہ لی اور اپنا پورا وقت اپنے رب کی تلاش میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں میں بھی تصوف یا صوفی ازم کو نمایاں مقام حاصل رہا۔

اسلام میں تصوف کا آغاز کب ہوا؟ اس سوال کے کئی جواب تاریخ میں آتے ہیں۔ اکثر علماء اسلام اور مفکرین کے مطابق تصوف عین اسلام ہے اور اس کا آغاز نبی کریم محمد مصطفی ﷺ کے عہد سے ہی ہو گیا تھا اور صحابہ اسلام کے اولین صوفی تھے۔ کیوں کہ وہ نبی ﷺ کے صحبت یافتہ تھے اور حب دنیا سے بے نیاز تھے ان کا جینا اور مرنا دنیا کے لیے نہیں تھا۔ ان میں ایمان کی قوت اور یقین کی حرارت بدرجہ اولی موجود تھی۔ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں تصوف کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی۔ دوسری صدی ہجری کے آخر میں تصوف کی اصطلاح منظر عام پر آئی اور مخصوص وضع قطع کے لوگوں پر صوفی لفظ کا اطلاق ہونا شروع ہوا۔

9.3 تصوف کے معنی و مفہوم

لفظ ”تصوف،، کے اشتقاق کے بارے میں محققین کے درمیان کافی اختلاف رہاہے، کیونکہ تصوف کالفظ نہ قرآن میں موجود ہے اور نہ ہی صحاح ستہ میں آیاہے۔ قبل اسلام کی عربی کی قاموس اور عربی ادب بھی میں بھی یہ لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ فی زمانہ لفظ ”صوف،، پر اکثر علماء کا ایک قسم کا اتفاق نظر آتا ہے، لیکن علما اسلام اس کے کسی ایک اشتقاق و معنی پر متفق نہیں ہیں۔

- ### تصوف کا لغوی معنی

تصوف کی لغوی تحقیق میں علمائے اسلام کو ہمیشہ اختلاف رہا۔ عام طور پر صوفی لفظ کو کو صوف (پشمینہ) سے مشتق قرار دیا جاتا رہا۔ جس کا اصل مادہ ”صوف،، ہے، جس کا معنی ہے ”اون،،۔ اور ”تَصَوُّف،، کا لغوی معنی ہے ”اون کا لباس پہننا،، جیسے ”تَقَمُّص،، کا معنی ہے قمیص پہننا۔ عربی لغت کے لحاظ سے تصوف کے معنی ہیں اُس نے لباس صوف پہنا۔ اور ابن خلدون کے مطابق ابتدا میں صوفیا کو ان کی صوف پوشی کی وجہ سے صوفی کہنے لگے۔ امام علی ہجویری صاحب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں: الصفا من الله تعالى انعام واكرام والصوف لباس الانعام۔ چونکہ صوفیہ نے جلیل القدر انبیاء ورسل مثلاً حضرت موسیٰؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے عام لباس اور حضرت محمد مصطفی ﷺ کے لباس بوقت وصال کو اپنایا، شہرت سے گریز اور سادہ زندگی اختیار کی، اس لیے وہ صوفی کہلائے۔

بعض علما کی رائے میں صوفی لفظ صف سے مشتق ہے۔ یعنی صوفیہ اول صف میں نظر آتے ہیں، یعنی عبادات شاقہ، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ میں سب سے آگے آگے رہیں تاکہ اللہ کے نزدیک ان کا شمار مقربین وصالحین کی صف اول میں ہو۔ لیکن معنی کے اعتبار سے صف سے صفی لفظ بنتا ہے صوفی نہیں۔

اسی طرح بعض علمانے صوفی کو اصحاب صفہ (مسجد نبوی کے چبوترے صفہ) کی طرف نسبت دی ہے۔ اس کی یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ عہد نبی ﷺ میں تقریباً ستر صحابہ نے دنیوی تعلقات کو ترک کر دیا تھا۔ جو عہد رسالت میں مستقل ذرائع معاش کے نہ ہونے کے باعث مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی کے شمالی جانب کے پیش دالان میں رہتے تھے، تلاوت قرآن مجید، ذکر اللہ اور عبادات کے ذریعہ اللہ کی خوشنودی وتوجہ کی امید رکھتے، رسول اللہ ﷺ سے علم کی تحصیل میں مصروف رہتے اور نو مسلموں کو مبادی اسلام اور فرائض دین و ممنوعات شرعیہ کی بابت تعلیم دیتے، ان کی زندگی توکل علی اللہ کی مظہر تھی۔

صوفیہ بنو صوفہ کی طرف منسوب ہیں جو ایک ایسا بدوی قبیلہ تھا جس نے حرم کعبہ اور زائرین کی خدمت میں شہرت حاصل کی تھی۔

علامہ لطفی نے اپنی کتاب ”تاریخ فلاسفہ الاسلام“ میں اپنی تحقیق میں بیان کیاہے کہ صوفی کالفظ ”تھیو صوفیا، سے مشتق ہے جو ایک یونانی کلمہ ہے اور جس کے معنی ’حکمت الٰہی، کے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ صوفی وہ حکیم جو حکمت الٰہی کا طالب ہوتا ہے اور اس کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ البیرونی کے بموجب لفظ ”سوفوس،، اور لفظ ”سیوسوفیا،، کا حرف ”س،، تعریب کے بعد حرف ”ص،، سے بدل گیا۔

بعض علما کے مطابق یہ مادہ صوف سے باب تفعل کا مصدر رہے، اور اس کے معنی عادۃ اونی لباس کو پہن لینے اور دنیاوی نام ونمود، عیش

وعشرت اور نفسانی لذات سے کنارہ کشی کر کے متصوفانہ زندگی کے لیے خود کو وقف کر دینے کے ہیں۔

- تصوف کے اصطلاحی معنی

اصطلاحی اعتبار سے صوفیا یا تصوف صرف صوف پوشی کے ساتھ ہی مختص نہیں ہیں نہ ہی اہل معرفت کو اس معنی تک محدود کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے صوفیا کی اصطلاح میں تصوف کے معنی ہیں: اپنے اندر کا تزکیہ اور تصفیہ کرنا، یعنی اپنے نفس کو نفسانی کدورتوں اور رذائل اخلاق سے پاک وصاف کرنا اور فضائل اخلاق سے مزین کرنا۔ اور صوفیاء ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنے ظاہر سے زیادہ اپنے اندر کے تزکیہ اور تصفیہ کی طرف توجہ دیتے ہیں اور دوسروں کو اسی کی دعوت دیتے ہیں۔

امام قشیری کے مطابق لفظ صوفی 200ھ کے کچھ پہلے مشہور ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد جس لقب سے اس زمانے کے افاضل یاد کیے جاتے تھے وہ صحابہ تھا۔ انہیں کسی دوسرے لقب کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ 'صحابیت'، سے بہتر کوئی فضیلت نہ تھی جن بزرگوں نے صحابی کی صحبت اختیار انہیں تابعین کا لقب ملا اور تابعین کے متبعین تبع تابعین کے قابل فخر لقب سے سرفراز تھے۔ اس کے بعد زمانے کا رنگ بدلا اور لوگوں کے احوال و مراتب میں نمایاں فرق پیدا ہونے لگا کچھ لوگوں کو زہاد اور عباد کے ناموں سے پکارا گیا۔ جب بدعات کا ظہور ہوا تو اہل سنت نے جن کے دل خشیت الٰہی سے معمور تھے اور اللہ کی یاد سے سرشار تھے انہوں نے اپنے زمانے سے علاحدگی اختیار کرلی اور ان کو ہی صوفیا کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

تصوف کی اصل

تعلیماتِ تصوف پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تصوف میں دو باتیں اصل کی حیثیت رکھتی ہیں: تزکیۂ نفس اور احسان۔ تزکیۂ نفس کا ذکر قرآنِ کریم میں بعثت نبوی کے مقاصد میں بار بار آیا ہے اور احسان کا ذکر حدیثِ پاک میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث جبریل کو تصوف کی اصل سمجھا جاتا ہے جس میں احسان کی تعریف کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسولِ اَکرم ﷺ ارشاد فرمایا کرتے: "مجھ سے (دین کی باتیں) پوچھا کرو،،۔ مگر بارگاہِ نبوی کے ادب اور غلبۂ ہیبت کی وجہ سے صحابۂ کرامؓ کو سوالات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ لہٰذا حقائقِ دینیہ سکھانے کے لیے اللہ عزوجل نے حضرت سیّدنا جبریلؑ کو انسانی شکل میں بھیجا تاکہ وہ سوال کریں اور معلم کائنات جواب دیں اور صحابۂ کرام کو علم حاصل ہو جائے۔

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا. اس کے بال انتہائی سیاہ اور کپڑے انتہائی سفید تھے، اس پر سفر کے کوئی آثار نہیں تھے اور نہ ہی صحابہ کرامؓ میں سے کوئی اُس سے واقف تھا. بہر حال وہ شخص بڑھتا چلا گیا اور رسول اللہ ﷺ کے عین سامنے جا کر بیٹھ گیا، آپؐ کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دیے اور آپؐ کے زانوؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے. اس شخص نے آپؐ سے کچھ سوالات کیے جن کے آپؐ نے جوابات دیے. جب وہ شخص روانہ ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ "اے عمر! تمہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کون تھا؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

”اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں“۔ آپؐ نے فرمایا: ”یہ جبریلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے“۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اکرم ﷺ سے پہلا سوال کیا: ”**یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ!**“ اے محمد ﷺ! مجھے بتائیے کہ اسلام کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پاک کے وجود اور اس کی وحدانیت پر ایمان لاؤ اور اس کے فرشتوں کے وجود پر اور اس (اللہ) کی ملاقات کے برحق ہونے پر اور اس کے رسولوں کے برحق ہونے پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لاؤ“۔ آپؐ نے جواب دیا تو جبریلؑ نے تصدیق و توثیق کرتے ہوئے کہا: ”**صَدَقْتَ**“ آپ ﷺ نے سچ فرمایا۔ انہوں نے دوسرا سوال کیا: ”**فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ!**“ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اسلام یہ ہے کہ تنہا اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو اور فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو“۔ انہوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! احسان کیا ہے آپ ﷺ نے اس کا جواب دیا تو انہوں نے کہا: ”**صَدَقْتَ**“ آپؐ نے سچ فرمایا۔ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے تیسرا سوال کیا: ”**فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ!**“ مجھے احسان کے بارے میں بتائیے۔ آپؐ نے فرمایا: ”**اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ، فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ**“ تمہارا اس کیفیت میں اللہ کی بندگی کرنا گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو. پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ احسان کے جواب میں آپ ﷺ اصلاحِ باطن کے حوالے سے جو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ اللہ تعالی کو دیکھ رہے ہو اور اگر اس مقام کو نہ پاسکو تو یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالی تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے۔ یہی تصوف کی اصل ہے۔ بندہ کے دل میں اسی احسان کی کیفیت پیدا کرنے کا صوفیاؒ کی زبان میں دوسرا نام ”تصوف“ یا ”سلوک“ ہے۔ ”تصوف“ دراصل بندہ کے دل میں یقین اور اخلاص پیدا کرتا ہے۔ حضرت حارثہؓ یقین و معرفت کے جس مرتبے پر فائز تھے اسی کا نام علم حال یعنی تصوف ہے۔

9.4 تصوف کی تعریفات

تصوف کے متعلق بزرگانِ دین سے بے شمار اقوال منقول ہیں، کیوں کہ ہر ایک نے اپنے مقام و مرتبہ اور حال کے اعتبار سے تصوف کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ، امام ابوالقاسم عبد الکریم بن ہوازن قشیریؒ (متوفی 465ھ) رسالہ قشیریہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت ردیم بن احمدؒ سے تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؒ ارشاد فرمایا: تصوف یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس کو اپنے رب کی مرضی پر چھوڑ دے کہ وہ جو چاہے اس سے کام لے اور جنید بغدادی سے تصوف کے متعلق پوچھا گیا تو آپؒ نے ارشاد فرمایا: تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالی کے سوا کسی سے بھی کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔

حضرت ابو الحسن قنادؒ سے جب صوفی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ نے ارشاد فرمایا: صوفی وہ ہوتا ہے جو اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ شیخ ابونصر سراج طوسیؒ مزید ایک قول نقل فرماتے ہیں کہ صوفی وہ لوگ ہیں جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کو خوب پہچانتے ہیں، اس کے احکام کا علم رکھتے ہیں، جو کچھ اللہ تعالی کے علم میں ہوتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں، اللہ تعالی ان سے جو کام لینا چاہتا ہے یہ اس کو

پورا کرنے کے لیے ثابت قدمی دکھاتے ہیں، پختہ عمل کی بدولت وہ اللہ تعالی سے کچھ پا لیتے ہیں اور جو کچھ ملتا ہے اس کی وجہ سے فنا ہو جاتے ہیں اور ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ ہر پا لینے والا آخر کار فنا ہو جایا کرتا ہے۔

9.5 تصوف کی بنیادی خصوصیات

حضرت سید علی بن عثمان جلابی المعروف حضور داتا گنج بخش ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب کے صفحہ ۳۹ پر سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیادی خصوصیات آٹھ ہیں: (1) سخاوت (2) رضا (3) صبر (4) اشارہ (5) غربت (6) گدڑی (لباس) (7) سیاحت اور (8) فقر۔ یہ آٹھ خصلتیں آٹھ انبیائے کرام علیھم السلام کی سنت ہیں۔

(1) سخاوت حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے۔ کیوں کہ آپ نے راہِ خدا میں اپنے جگر گوشہ کی قربانی دینے سے بھی گریز نہ کیا۔

(2) رضا حضرت اسماعیلؑ کی سنت ہے۔ کیوں کہ آپ نے رب کی رضا کے لیے اپنی جان کو بھی بارگاہِ خداوندی میں پیش کر دیا۔

(3) صبر حضرت ایوبؑ کی سنت ہے۔ کیونکہ آپنے بے انتہا مصائب پر صبر کا دامن نہ چھوڑا اور اپنے رب کی آزمائش پر ثابت قدم رہے۔

(4) اشارہ حضرت زکریاؑ کی سنت ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے ان سے ارشاد فرمایا: "اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا" (آل عمران:41) ترجمہ: تین دن تو لوگوں سے بات نہ کرے مگر اشارہ سے۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا: "اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا" (مریم:3) ترجمہ: جب اسنے اپنے رب کو آہستہ پکارا۔

(5) غربت حضرت سیّدُنا یحییٰؑ کی سنت ہے کہ انہوں نے اپنے وطن میں بھی مسافروں کی طرح زندگی بسر کی اور خاندان میں رہتے ہوئے بھی اپنوں سے بیگانہ رہے۔

(6) گدڑی (صوف کا لباس) حضرت سیّدُنا موسیٰؑ کی سنت ہے جنھوں نے سب سے پہلے پشمینی لباس زیب تن فرمایا۔

(7) سیاحت حضرت سیّدُنا عیسیٰؑ کی سنت ہے جنھوں نے تنہا زندگی گزاری اور ایک پیالہ و کنگھی کے سوا کچھ بھی پاس نہ رکھا۔ بلکہ ایک مرتبہ کسی کو اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی پیتے دیکھا تو پیالہ بھی توڑ دیا اور جب کسی کو دیکھا کہ انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر رہا ہے تو کنگھی بھی توڑ دی۔

(8) فقر محسنِ کائنات، فخر موجودات محمد ﷺ کی سنت ہے جنہیں رُوئے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں عنایت فرمائی گئیں مگر آپ نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی: اے خدا! میری خواہش تو یہ ہے کہ ایک روز شکم سیر ہوں تو دو روز فاقہ کروں۔

9.6 تصوف کے بارے میں علما اور مفکرین کے آرا

صوفیہ کرام نے خود تصوف اور صوفی کی مختلف انداز سے تعریف، تفسیر و توضیح کی ہے۔ اختلاف کا سبب بظاہر کہنے والے کا اپنا حال

اور مخاطب کے حال و مقام و کیفیت کی رعایت ہے۔ ان تعریفات کی تعداد بقول شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی ایک ہزار سے زیادہ ہے۔

ذیل میں چند تعریفات درج کی جاتی ہیں:

1. ابو محمد جریری نے فرمایا کہ تصوف فضائل اخلاق کو اختیار کرنا اور رذائل اخلاق سے نکلنے کا نام ہے۔

2. جنید بغدادی سے ایک مرتبہ پوچھا گیا تو فرمایا کہ تصوف یہ ہے کہ حق تعالیٰ تجھے تیری اپنی ذات سے (شعوراً) فنا کر دے اور اپنی ذات کے ساتھ (شعوراً) زندہ رکھے۔

3. عمرو بن عثمان مکی سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ بندہ ہر وقت ایسے حال میں رہے جو اس کے لیے وقت کے مطابق (اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے) بہتر ہو۔

4. سمنون سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ نہ تو کسی چیز کا مالک بنے اور نہ کوئی (بجز اللہ) تیرا مالک بنے۔ یہی قول ابوالحسین نوری کی طرف بھی منسوب ہے۔

5. رویم سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ نفس کو کاملاً اللہ کے ساتھ چھوڑ دینا کہ وہ نفس پر جیسا چاہے تصرف کرے۔

6. ابوالحسین نوری نے فرمایا کہ تصوف نفس کی لذتوں کو چھوڑنے کا نام ہے۔

7. جنید بغدادی ہی نے فرمایا کہ تصوف یہ ہے کہ تو اللہ کی معیت کے احساس سے ایسا معمور ہو جائے کہ علائق دنیوی کالعدم ہو جائیں۔

8. حضرت جنید ہی نے فرمایا کہ تصوف (نفس و شیطان کے خلاف) ایک حالت جنگ ہے جس میں کوئی صلح نہیں۔

9. ابو علی روذباری نے فرمایا کہ تصوف عبارت ہے حبیب کے در پر ڈیرہ ڈال دینے سے، خواہ اس کی طرف سے جھڑکیاں اور دھکے ہی کیوں نہ سہنا پڑیں۔

10. سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا کہ صوفی وہ ہے جو اپنا خون معاف اور اپنی ملک (خلائق کے لیے) مباح کر دے۔

11. ابو محمد جریری نے فرمایا کہ تصوف اپنے احوال کی نگہداشت اور پاس ادب کے لزوم کا نام ہے۔

12. ابوتراب نخشبی نے فرمایا کہ صوفی وہ ہے جسے کوئی چیز مکدر نہیں کر سکتی بلکہ ہر چیز کو اس سے صفائی حاصل ہوتی ہے۔

13. ابن الجلاء نے فرمایا کہ صوفی کی تعریف کسی علم میں نہیں پائی جاتی لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو فقیر (محتاج) ایسا ہو کہ اس نے اسباب کی قید سے خود کو آزاد کر لیا ہو اور مکانیت کی قید کے بغیر اللہ کی معیت حاصل کر لی ہو اور حق سبحانہ و تعالیٰ اسے کسی مکان (وحال) کے علم سے غافل نہیں رہنے دیتے تو وہ صوفی کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

ان تعریفات کا خلاصہ یہ کہ تصوف ادب، خاموشی، ذکر و وجد، فنا، صفائی یا صفاء باطن، صبر و تحمل، عطا و سخا، ترک آرزو، ترک شہوات، ترک اخلاق بد، حسن خلق، نیک اعمال، نفس و شیطان کے جال سے آزادی، جوانمردی، حقوق نفس کی ادائیگی، توجہ الی اللہ اور قرب

حق کے شعوری احساس کے ساتھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے قریب تر ہونے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک جہد مسلسل سے عبارت ہے۔

ابو نصر سراج نے کتاب اللمع فی التصوف میں صراحت کی ہے کہ صوفیہ کرام کے تمام طبقے محدثین وفقہاء کے معتقدات سے کامل اتفاق کرتے ہیں اور ان کے علوم وفنون، مطالب ومفاہیم اور طریقوں سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے بشرطیکہ ان میں لہو ولعب پر مبنی بدعات کی آمیزش نہ ہو اور خود ان محدثین وفقہاء پر پیروی رسول ﷺ کا غلبہ ہو۔

وہ صوفیہ جو علمی لحاظ سے محدثین وفقہاء کے مرتبے کے نہیں ہوئے، قوانین حدود شریعت کے مشکل مسائل کے حل کے لیے انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور جس مسئلہ پر محدثین وفقہاء متفق ہوں اس کو تسلیم کر لیتے ہیں، اور جہاں محدثین وفقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہو وہاں صوفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ احسن، اولیٰ اور اکمل صورت کو اختیار کیا جائے تاکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو احکام صادر فرمائے ہیں ان پر انتہائی احتیاط کے ساتھ عمل ہو سکے۔ صوفیہ کے پاس امور دین کے سلسلے میں کسی قسم کے جھوٹ، تاویل، تحصیل آسائش اور شبہات کو راہ دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان کے ماسوا صوفیہ کے پاس عمل کا ایک اور درجہ ہے، اور وہ ہے (اللہ کے قرب، خوشنودی اور دیدار کی خاطر) مراتب بلند کی طرف بڑھنا۔

سراج مزید لکھتے ہیں کہ صوفیہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب "فرائض و حقوق کی ادائیگی اور افعال ممنوعہ سے احتراز کرتے ہیں تو اس کے ساتھ اپنے سے غیر متعلق چیزوں کو علیحدہ کر دیتے ہیں اور ہر اس تعلق کو ختم کر دیتے ہیں جو ان کے اور مطلوب و مقصود (اللہ سبحانہ) کے درمیان حائل ہو۔

9.7 آداب تصوف

صوفیہ کے کچھ مخصوص آداب ہیں مثلاً:

(1) زیادہ کے مقابلہ میں تھوڑی سی دنیوی دولت پر قناعت (2) قوت لایموت پر اکتفاء (3) ضروری لباس، بچھونا اور دیگر انتہائی ضروری چیزوں پر گزارہ (4) امیری پر فقیری کو ترجیح (5) شکم سیری پر بھوک کو ترجیح (6) انانیت، فخر اور علو مرتبت سے کنارہ کشی (7) چھوٹوں پر شفقت اور ہر ایک کے آگے تواضع (8) خلق خدا کے لیے قربانی دینے کا جذبہ (9) دنیا حاصل کرنے والوں پر رشک سے گریز (10) اللہ سبحانہ سے حسن ظن (11) امور اطاعت میں مسابقت (12) تمام نیکیوں کی طرف پیش قدمی (13) توجہ الی اللہ (14) آزمائشوں پر صبر (15) اللہ کے ہر فیصلہ پر قلبی رضامندی (16) مسلسل مجاہدہ نفس، خواہشات مذمومہ کی مخالفت اور نفس امارہ اور شیطان سے دشمنی (17) خوف خدا اور امید رحمت (18) تفکر بالاء اللہ (اللہ کے احسانات کے بارے میں غور کرنا) (19) حدیث نفس سے اجتناب (20) متشابہات قرآن وحدیث پر غور وفکر سے گریز اور ذکر الٰہی سے دور کرنے والی اشیاء سے مکمل احتراز (21) اخلاص نیت (22) ارادۂ حق سے اپنے ارادے کو ہم آہنگ رکھنے کی کوشش (23) رسول کریم ﷺ کے خلق عظیم کو اپنانے کا شوق (24) اپنی اپنی بساط کے مطابق

حقائق کا بیان (25) عرفان نفس (26) غیر اللہ سے قلب وروح کی حفاظت۔

محققین کے نزدیک قرآنی الفاظ **قٰنتین** (فرماں بردار مرد) ، **قٰنتٰت** (فرماں بردار عورتیں)، **صٰدقین** (سچے مرد) ، **صٰدقٰت** (سچی عورتیں)، **خٰشعین** (انکساری کرنے والے مرد) **خٰشعٰت** (انکساری کرنے والی عورتیں)، **محسنین** (اللہ سبحانہ کے استحضار کے ساتھ بھلائی کرنے والے) **عٰبدون** (اللہ کی کثرت سے عبادت کرنے والے)، **حٰمدون** (ظاہر و باطن کو اللہ کی حمد میں مشغول رکھنے والے)، **سآئحون** (زمین و آسمان میں ابداع و تخلیق کے دیکھنے کی غرض سے سیاحت کرنے والے) **الرٰکعون السٰجدون** (اللہ کی کبریائی کے پیش نظر کثرت رکوع و سجود میں مشغول)، **الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر** (نیکی کی تلقین وترغیب اور منکرات کے نتائج سے آگاہ کرنے اور ان کے ارتکاب سے روکنے والے) **الحٰفظون لحدود اللہ** (اللہ کی بتائی ہوئی حدود کی حفاظت کا اہتمام کرنے والے)، **اولیاء اللہ** (اللہ کے دوست) **ابرار** (نیکوکار)، **متقین** (اللہ سبحانہ کے استحضار کے ساتھ ظاہر و باطن کی غیر اللہ کے خوف، ہیبت اور محبت کے اثر سے حفاظت کرنے والے) **مقربین** (اللہ سبحانہ کی جانب سے تقرب خاص سے نوازے جانے والے) **متصدقین** (کثرت سے صدقہ دینے والے مرد) **متصدقٰت** (کثرت سے صدقہ دینے والی عورتیں) **صائمین** (کثرت سے روزے رکھنے والے مرد) **صائمات** (کثرت سے روزے رکھنے والی عورتیں)، **حٰفظین لفروجھم و الحافظات** (اپنی اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے) **الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات** (اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے اور ذکر کے تقاضوں پر عمل کرنے والے) کے جامع مصداق صحابہ کرام کے بعد صوفیہ عظام ہی ہیں۔

چنانچہ، امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن قشیریؒ (متوفی ۴۶۵ھ) رسالہ قشیریہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت رُوَیم بن احمد تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: تصوف یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس کو اپنے ربّ کی مرضی پر چھوڑ دے کہ وہ جو چاہے اس سے کام لے اور جب حضرت سیِّدُنا جنید بغدادیؒ سے تصوف کے متعلق پوچھا گیا تو آپؒ ارشاد فرمایا: تصوف یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے بھی کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔

حضرت سیِّدُنا ابو الحسن قنادؒ سے جب صوفی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ نے ارشاد فرمایا: صوفی وہ ہوتا ہے جو اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ شیخ ابو نصر سراج طوسی مزید ایک قول نقل فرماتے ہیں کہ صوفی وہ لوگ ہیں جو اللہ کو خوب پہچانتے ہیں، اس کے احکام کا علم رکھتے ہیں، جو کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں، اللہ عَزَّ وَجَلَّ ان سے جو کام لینا چاہتا ہے یہ اس کو پورا کرنے کے لیے ثابت قدمی دکھاتے ہیں، پختہ عمل کی بدولت وہ اللہ سے کچھ پالیتے ہیں اور جو کچھ ملتا ہے اس کی وجہ سے فنا ہو جاتے ہیں اور ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ ہر پالینے والا آخر کار فنا ہو جایا کرتا ہے۔

9.8 تصوف کی اہم اصطلاحات

علمائے تصوف میں مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ ان میں سے کچھ اہم اصطلاحات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

سالک: مرید (راہ سلوک کا مسافر)

پیر: مرشد، رہنما جسکی نگرانی میں سالک سلوک کی منازل طے کرتا ہے

تخلیہ: دل کا غیر اللہ سے خالی ہونا

حال: ایک خاص قسم کی کیفیت جن سے صوفی راہ سلوک میں دوچار ہوتے ہیں

خرقہ: وہ لباس جو مرشد اپنے مرید کو اپنے سلسے میں شامل کرتے وقت عنایت کرتے ہیں

خلوت: سالک کا مخلوق سے کٹ کر ذات باری تعالی کے تصور میں محو ہو جانا

ذکر جلی: با آواز بلند ذکر کرنا

ذکر خفی: خاموشی کے ساتھ ذکر کرنا

ذکر قلبی: دل ہی دل میں اللہ کا ذکر کرنا

جذب: سالک کا خدا کی ذات میں گم ہو کر اپنی انفرادی شخصیت کا گم کر دینا، اور دوسرا معنی ہے خدا کا اپنے بندے کو اپنی طرف کھینچنا

سکر: مدہوشی کی کیفیت (جو سالک کو ریاضات اور سلوک کے منازل کے دوران پیش آتی ہے)

شطح: ایسے کلمات جو سالک کی زبان سے ایسے وقت نکلتے ہیں جب اس پر حال یا سکر کی کیفیت میں ہو

عارف: اس صوفی کو کہتے ہیں جس کو معرفت حاصل ہو

کشف: کسی غائب چیز کا ظاہر ہو جانا

وجد: ایک خاص کیفیت جس میں سالک پر مدہوشی طاری ہو جاتی ہے

سماع: ایک خاص قسم کی موسیقی

مراقبہ: سر جھکا کر خدا کا تصور جمانا

فنا فی اللہ: عشق الہی میں اپنے نفس کو ختم کر دینا

بقاباللہ: ایک کیفیت ہے یا ایک حال ہے، جو اپنی حقیقت کو ذات خداوندی کے ساتھ وابستہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے

چلہ کشی: چالیس دن تک کسی بزرگ کے مزار پر عبادت کرنا

9.9 تصوف کا تجزیاتی نقطہ نظر

تصوف کو قرآنی اصطلاح میں تزکیہ نفس اور حدیث کی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں۔ متعدد فقہی علمائے کرام بھی یہی مراد لیتے

رہے لیکن بعد میں تصوف میں ایسے افکار ظاہر ہونا شروع ہوئے کہ جن پر شریعت و فقہ پر قائم علما کرام نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسکا رد کیا۔ اس طرح اسلامی علماو مفکرین تصوف کے بارے میں ہمیشہ دو حصوں میں بٹے رہے۔ امام ابن تیمیہ، ابن قیم اور بھی بہت سے علمانے غیر اسلامی تصوف کے خلاف کتابیں رقم کیں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تصوف اسلام کی سرزمین پر ایک اجنبی درخت ہے۔

ان تمام تضادات کے باوجود مسلم اہل تصوف نے چند ایسی خدمات سرانجام دی ہیں جن کی مثال دوسری قوموں کے صوفیوں میں نہیں ملتیں۔ ہندو اور عیسائی صوفیاء کے برعکس مسلم صوفیاء نے جنگلوں میں چھپ کر زندگی گزارنے کی بجائے معاشرے کے بیچ میں رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ابتدائی صدیوں میں فقہ اور حدیث کی تدوین اور کلامی و فلسفیانہ بحثوں میں مشغولیت کے باعث اہل علم کی بڑی تعداد عوام الناس کی اخلاقی تربیت نہ کر سکی تھی۔ صوفیاء نے اس خلا کو پر کیا۔ انہوں نے انسانی نفسیات میں گہری مہارت حاصل کی اور اس کو اپنے نظریات پھیلانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اخلاقی تربیت کے لئے استعمال کیا۔

مسلمانوں کے علماء میں بالعموم عوام سے دوری کا رجحان رہا ہے۔ انہوں نے عام طور پر دین کو دلوں میں اتارنے کی بجائے ڈنڈے کے زور پر اسے لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس مسلم صوفیاء نے عوام سے قربت اختیار کی۔ انہوں نے اپنے لباس، رہن سہن اور نشست و برخاست کو عوامی بنایا۔

علماء نے اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا طریقہ اختیار کیا۔ برصغیر کے علماء نے عام طور پر مقامی زبانوں کی بجائے عربی و فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس طریقے سے وہ پڑھے لکھے طبقے تک تو اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو گئے مگر عوام الناس تک ان کی رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس صوفیاء نے عوامی طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے عوامی ذوق کے مطابق مقامی زبانوں میں اپنا پیغام پیش کیا۔ ہمارے ہاں پنجابی، پشتو اور سندھی زبان کی شاعری کا بڑا حصہ صوفیانہ کلام پر مشتمل ہے۔

صوفی بزرگ آسان آسان نظموں کی صورت میں اپنا پیغام لکھ دیتے۔ اس پیغام کو لے کر ان کے مرید گویے، بھانڈ اور میراثی گرد و نواح کے دیہات میں پہنچ جاتے اور چوپالوں میں گا گا کر یہ پیغام لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دیہاتی معاشرت میں صوفی ازم کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ علماء کے برعکس صوفیاء میں رواداری کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ تشدد اور سختی کے ذریعے اپنی بات منوانے کی بجائے ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنی بات کو اعلیٰ ادبی شہ پاروں اور خوبصورت تمثیلات کی مدد سے منوایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل انتہاپسندی کے خاتمے کے لئے صوفی ازم کے احیاء کی بات کی جارہی ہے۔

ان سب معاملات کے ساتھ ساتھ صوفی بزرگ طب اور بعض پیرا سائیکالوجیکل علوم جیسے ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی، تعویذ گنڈوں وغیرہ میں مہارت حاصل کرتے اور اسے عام لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لئے استعمال کرتے۔ جس کا مسئلہ حل ہو جاتا، وہ ان بزرگ کا بے دام غلام بن جاتا اور جس کا مسئلہ حل نہ ہوتا، وہ اسے رضائے الٰہی پر صابر و شاکر رہنے کی تلقین کرتے۔ ان کی ان خدمات کے باعث انہیں معاشرے میں غیر معمولی مقام حاصل ہو گیا جو کہ اب تک باقی ہے۔

''تصوف،، اور اہلِ تصوف کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ: ''ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں سے

چھ کروڑ (۸۵ فیصد) مسلمان یقیناً اہلِ تصوف کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں،،۔

9.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- تصوف کے اشتقاق کے بارے میں مختلف علما کے مختلف اقوال ہیں۔ اکثر علما اسے صوف سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی اون کے آتے ہیں۔
- روزِ اول سے ہی تصوف کے معنی کی اصل کے بارے میں علماء کے درمیان مختلف رائیں رہی ہیں۔ البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ تصوف، ادب، خاموشی، ذکر و وجد، فناء، صفاءِ باطن، صبر و تحمل، عطا و سخا، ترکِ شہوات، ترکِ اخلاقِ بد، حسنِ خلق، نیک اعمال، نفس کو شیطان کے جال سے آزادی، قرب و توجہ الی اللہ اور خوشنودیٔ رب کے حصول کے لیے جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔
- حضرت سیّدُنا ابو الحسن قنادؒ سے جب صوفی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ ارشاد فرمایا: صوفی وہ ہوتا ہے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔
- شیخ ابو نصر سراج طوسیؒ مزید ایک قول نقل فرماتے ہیں کہ صوفی وہ لوگ ہیں جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کو خوب پہچانتے ہیں، اس کے احکام کا علم رکھتے ہیں، جو کچھ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے علم میں ہوتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں، اللہ عَزَّوَجَلَّ ان سے جو کام لینا چاہتا ہے یہ اس کو پورا کرنے کے لیے ثابت قدمی دکھاتے ہیں، پختہ عمل کی بدولت وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ سے کچھ پالیتے ہیں اور جو کچھ ملتا ہے اس کی وجہ سے فنا ہو جاتے ہیں اور ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ ہر پالینے والا آخرکار فنا ہو جایا کرتا ہے۔
- حضرت سید علی بن عثمان جلابی المعروف حضور داتا گنج بخش ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب کے صفحہ ۳۹ پر سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیادی خصوصیات آٹھ ہیں: (1) سخاوت (2) رضا (3) صبر (4) اشارہ (5) غربت (6) گدڑی (لباس) (7) سیاحت اور (8) فقر۔ یہ آٹھ خصلتیں آٹھ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت ہیں۔
- تصوف کو قرآنی اصطلاح میں تزکیہ نفس اور حدیث کی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں۔ متعدد فقہی علمائے کرام بھی یہی مراد لیتے رہے لیکن بعد میں تصوف میں ایسے افکار ظاہر ہونا شروع ہوئے کہ جن پر شریعت و فقہ پر قائم علما کرام نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسکار دکیا۔ اس طرح اسلامی علما و مفکرین تصوف کے بارے میں ہمیشہ دو حصوں میں بٹے رہے۔
- امام ابن تیمیہ، ابن قیم اور بھی بہت سے علمانے غیر اسلامی تصوف کے خلاف کتابیں رقم کیں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تصوف اسلام کی سرزمین پر ایک اجنبی درخت ہے۔

9.11 نمونہ امتحانی سوالات

9.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. لفظ تصوف.......................سے مشتق ہے۔

(a).صفا (b).اصحاب صفہ (c).صوف (d). سبھی

2. حضرت جنید بغدادی کے مطابق صوفیا میں .... خصلتیں ہوتی ہیں۔

(a). تین (b).پانچ (c).سات (d).آٹھ

3. ....نے کہا کہ تصوف سر زمین اسلام پر ایک اجنبی درخت ہے۔

(a).حسن بصری (b).جنید بغدادی (c). علی ہجویری (d).علامہ اقبال

4. اکثر علما کے مطابق تصوف تزکیہ اور.....................کا دوسرا نام ہے۔

(a).احسان (b).سلوک (c).عبادت (d).جہاد

5. نبی کریم ﷺ کے زمانے میں......................اصطلاح رائج نہیں تھی۔

(a).تصوف (b).تزکیہ (c).احسان (d).کوئی نہیں

6. ....فرشتے انسان کی شکل میں صحابہ کو تعلیم کے آئے تھے۔

(a).حضرت جبرئیل (b).حضرت اسرافیل (c).حضرت میکائیل (d).حضرت عزرائیل

7. ....کے مطابق لفظ صوفی 200ھ کے کچھ پہلے مشہور ہوا۔

(a).علی ہجویری (b).ابونصر سراج (c).امام قشیری (d). سبھی

8. ....نے فرمایا کہ صوفی وہ ہے جو اپنا خون معاف اور اپنی ملک (خلائق کے لیے) مباح کردے"۔

(a).شہاب الدین سہروردی (b). سہل بن عبداللہ تستری (c).باقی باللہ (d).ابن عربی

9. تصوف کا لفظی معنی.....................ہے۔

(a).اون کا لباس پہننا (b).سادہ لباس پہننا (c).ریشم کا لباس پہننا (d). سبھی

10. ....میں سالک پر مدہوشی طاری ہوجاتی ہے۔

(a). تخلیہ (b).مراقبہ (c).وجد (d).کوئی نہیں

9.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. تصوف کے لغوی معنی اور مفہوم پر روشنی ڈالیے۔
2. تصوف کی اصل کیا ہے؟
3. تصوف کی مختلف تعریفات اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
4. تصوف کے کیا آداب ہیں؟ مختصراً بیان کیجیے۔
5. تصوف کے اصطلاحات پر مختصر مضمون قلمبند کیجیے۔

9.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. تصوف کے معنی مفہوم پر ایک مضمون قلمبند کیجیے۔
2. تصوف کے آغاز وارتقا پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
3. تصوف کے آداب وتعلیمات پر ایک تجزیاتی بحث پیش کیجیے۔

9.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. کشف المحجوب : سید علی ہجویری (اردو ترجمہ)
2. رسالہ قشیریہ : ابوالقاسم قشیری (اردو ترجمہ)
3. تلبیس ابلیس : عبدالرحمن ابن الجوزی (اردو ترجمہ)
4. قرآن وتصوف : ڈاکٹر میر ولی الدین
5. تذکرۃ الاولیاء : فرید الدین عطار (اردو ترجمہ)
6. تزکیہ واحسان : سید ابوالحسن علی ندوی
7. اردو دائرہ معارف اسلامیہ
8. Annemarie Schemmel :Mystical Dimensions of Islam

اکائی 10: تصوف کا آغاز وارتقا (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 تصوف کے تاریخی ادوار
10.2.1 دوراول
10.2.2 تصوف کی تاریخ: دوسرا دور
10.2.3 تصوف کی تاریخ: تیسرا دور
10.2.4 تصوف کی تاریخ: چوتھا دور
10.2.5 تصوف کی تاریخ: پانچواں دور
10.2.6 تصوف کی تاریخ: چھٹا دور
10.2.7 تقسیم ادوار مطابق شاہ ولی اللہؒ
10.3 اکتسابی نتائج
10.4 نمونہ امتحانی سوالات
10.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
10.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
10.5 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

مسلمانوں میں ہمیشہ سے ایک گروہ ایسا رہا ہے جس نے تمام دنیوی مقاصد سے قطع نظر کر کے اپنا نصب العین محض یاد خدا اور ذکر

الہی کو رکھا۔ اکثر علما کی رائے کے مطابق احسان کے معنی میں۔ تصوف کا آغاز نبی ﷺ کے دور سے ہی ہو گیا تھا۔ صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں صوفیا اور سلوک اور تربیت کا باقاعدہ سلسلہ پایا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تصوف کی تعلیمات کتابوں کی شکل میں مرتب اور تصنیف کی گئیں اور آگے چل کر تصوف کے مختلف سلسلے وجود میں آئے۔ اس ارتقائی مراحل کو علما نے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ تصوف کے مختلف ادوار سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ نیز ان ادوار کی خصوصیات اور انفرادیت کا بھی جائزہ لیں سکیں۔ ان ادوار میں تصوف کن مراحل سے گذرا کس اعتبار سے علماء نے ان ادوار کو تقسیم کیا ہے وجان سکیں۔ آپ اس اکائی میں مختلف مشہور سلسلے اور ان کے بانیین اور تعلیمات سے بھی واقف ہو سکیں گے۔

10.2 تصوف کے تاریخی ادوار

مورخین نے تصوف کی تاریخ کو مختلف زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ عموما مورخین تصوف کی تاریخ کو چھ مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہاں پر ان کا تفصیلی تعارف دیا جارہا ہے۔

10.2.1 دوراول

تصوف کا پہلا دور رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں قرآن حکیم نازل ہوتا ہے۔ جس میں تدریجا دینی احکام کا نزول ہوتا ہے۔ اور مختلف قرآنی آیات کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق کے سائے میں امت کو اپنی فکر، اپنی حیات اور اپنے اخلاق کی تربیت کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے۔ حدیث جبریل میں ایمان و اسلام کے مبادی وارکان کے بعد احسان کی بابت سوال ہوتا ہے تو صحیح روایت کے مطابق جناب رسالت مآب ﷺ جواب میں فرماتے ہیں۔ ”ان **تعبدالله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك**“ (یعنی تو اللہ کی ایسے عبادت کرے جیسے اسے دیکھ رہا ہو، اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے)۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت اور اس کے معانی پر غور و فکر کرتے، خود کو اس کی میزان میں تولتے، ذکر و اذکار اور صلوۃ و سلام علی النبی سے اپنی زبانیں تر رکھتے، اپنی دنیاوی ذمہ داریاں نبھاتے بشرطیکہ کسی معاملہ میں شریعت مقدسہ سے ٹکراؤ نہ ہو رہا ہو، اور اگر اپنے قلوب یا اعمال میں اللہ سے غفلت پاتے یا تکوینأً کسی معصیت کے مرتکب ہوتے تو اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے، روتے، گڑگڑاتے اور عفو و درگزر کی دعا کرتے اور نمازوں میں تلاوت کی مقدار اور رکعات کی تعداد بڑھادیتے اور مالدار صحابہ صدقات و خیرات کی مقدار میں اضافہ فرمادیتے۔ ان کے سامنے ارشادات رسول ﷺ تھے۔ جن کا وہ حتی المقدور تقاضہ پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن نہ ان میں کوئی بے قابو ہو کر چیختا، چلاتا، نہ بے ہوش ہو جاتا، نہ وجد کے عالم میں رقص کرنے لگتا، نہ کوئی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسرار و تجلیات پر تقریر کرتا، نہ ان کی زبان سے عادۃً وہ کلمات ادا ہوتے جو ظاہری معنی

کے لحاظ سے قابل گرفت سمجھے جاتے (جن کو صوفیہ نے شطحات کا نام دیا) جہنم کے خوف اور جنت کی امید کے ماسوا اللہ تبارک و تعالیٰ سے ملاقات کا اشتیاق حسب ارشاد نبوی ﷺ من احب لقاء الله فاحب الله لقآئه کبھی کبھی ظاہر ہو جاتا اور کبھی کبھی جیسا کہ طلبہ حدیث نبوی واقف ہیں نادراً شطحات بھی ادا ہو جاتے۔ ان کی اپنی زندگی اللہ واحد کی ذات و صفات پر غیر متزلزل یقین اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہر شعبہ حیات میں اطاعت اور حقوق اللہ، حقوق الرسول اور حقوق العباد کی ادائیگی میں توازن سے عبارت تھی۔ "کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر و تؤمنون بالله الخ ۔ یحبهم و یحبونه الخ. والذین امنوا اشد حبا لله" الخ،رضی الله عنهم و رضواعنه وغیرہ آیات مبارکہ کے مقصود اول صحابہ ہی تھے۔ شیخ ہجویریؒ نے ابوالحسن فوشنجی (م 348ھ) کا قول نقل کیا ہے کہ "آج تصوف ایک نام ہے بغیر حقیقت کے، لیکن زمانۂ سابق میں یہ ایک حقیقت تھی بغیر نام کے۔" ہجویریؒ اپنی طرف سے وضاحت کرتے ہیں کہ "صحابہ کرام اور سلف صالحین کے زمانے میں یہ نام موجود نہ تھا۔ لیکن اس کی حقیقت ہر (حساس ومتدین) شخص میں جلوہ گر تھی۔"

خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ کا اختیاری فقر، تقویٰ، ورع، توکل، تسلیم، رضا، صدق اور تفرید جس طرح مسلم حقیقت ہیں۔ اسی طرح خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کا پیوند لگا لباس، کثرت تلاوت، تقویٰ، جمیع امت کی فکر، خاک آلودہ بدن، آہنی عزم، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت، شب نوردی، ذوق عبادت، احساس جوابدہی۔ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کا صبر و تحمل، حیاء، استقامت و حزم و یقین، فیاضی، تمکن، کثرت تلاوت و اذکار و عبادت، ایثار و قربانی اور خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کا صبر، عدل، علم، خوف، فقر، حصول و مقاصد شریعت اور معانی و مفاہیم قرآن پر عبور، کثرت تلاوت و عبادت، انکساری اور اصحاب صفہؓ کی متوکلانہ زندگی اور اشاعت دین و تعلیم و تعلم و تلاوت قرآن و اذکار میں مشغولیت جس کی طرف قرآن حکیم نے "للفقراء الذین احصروا فی سبیل الله" کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ آخر کیا پیغام دیتے ہیں؟ ان کے علاوہ معصب بن عمیر، عبداللہ بن مسعود، بلال بن رباح، عمار بن یاسر، عثمان بن مظعون، جعفر الطیار، سلمان فارسی، عبداللہ ابن عمر، ابوذر غفاری، حذیفہ بن الیمان، ابوالدردا، ابوہریرہ، تمیم الداری رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے شب و روز فوشنجیؒ کے قول کی تائید کرتے ہیں۔

10.2.2 تصوف کی تاریخ: دوسرا دور

اس دور میں جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہر علماء وفضلاء اور فقہاء و مجتہدین قرآن و حدیث کے لفظ و معانی کی حفاظت اور دینی علوم کی اشاعت کے لیے کمربستہ ہوئے وہیں نساک، زہاد اور صوفیہ نے باطن دین و شریعت اور احوال و کیفیات رسول ﷺ کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھالی۔

بصرے میں حسن بصری، مالک بن دینار، فضل رقاشی، رباح بن عمر تمیمی، صالح اور عبدالواحد بن زید اپنی حقیقت پسندی، ناقدانہ رویے اور زہد و تقویٰ و علم کے لیے مشہور ہوئے جب کہ کوفے میں ربیع بن خثیم، ابو اسرائیل ملائی، منصور بن عمار، ابوالعتاھیہ اور عبدک اپنی روایت پسندی، ظاہریت، زہد و تقویٰ اور فکر مثالی کے لیے جانے گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بکاؤون اور قصاص سامنے آئے جن پر دنیا میں

آلودگی کے باعث رقت قلبی، آہ وبکا اور یوم جزا اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں جوابدہی کے احساس کا غلبہ ہوا۔ حسن بصری کی خشیت کے بارے میں چنانچہ کہا گیا کہ ان کو دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا جہنم کی آگ عمر بن عبد العزیز اور حسن بصری ہی کے لیے بھڑکائی جارہی ہے۔ فضیل بن عیاض (متوفی 803ء) نے رہزنی اور بدکاری سے توبہ کر کے ابو حنیفہ کی صحبت اختیار کی تو یہ عالم ہو گیا کہ خلیفہ ہارون رشید جب ان سے ملے اور اندھیرے میں خلیفہ کے بدن سے ان کا ہاتھ لگ گیا تو ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا: کاش یہ نرم بدن جہنم کی آگ سے بچا رہے، خلیفہ بے اختیار روپڑا اور اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ابراہیم بن ادہم (متوفی 790ء) نے بلخ کی امارت ترک کی، گدڑیے سے لباس و سواری کا تبادلہ کیا، مکہ کی راہ لی، وہاں سے ابو حنیفہ کی مجلس میں پہنچے اور حصول علم کے بعد کاشت کاری کو ذریعہ روزگار بنایا۔ حتی کہ نصرانیوں کے خلاف ایک جہاد میں شہید ہو گئے۔ جنید بغدادی نے ان کی بابت فرمایا کہ وہ علم تصوف یا علم باطن کی چابی تھے۔ بشر حافی (متوفی 841ء) نے میکشی چھوڑنے کے بعد فضیل سے رشتہ جوڑا اور فکر و عمل میں کمال اخلاص حاصل کرنے میں لگ گئے۔ رابعہ بصریہ (متوفی 776ء) نے اللہ سبحانہ کی محبت میں کمال وحدانیت پیدا کی حتی کہ **من احب للہ و ابغض للہ واعطی للہ و منع للہ فقداستکمل الایمان** (جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے نفرت کی، اللہ کے لیے دیا، اللہ کے لیے روکا، اس نے ایمان مکمل کر لیا) کا مظہر بن گئیں۔

یہ وہی دور تھا جس میں حسن بصری کے صحبت یافتہ عبد الواحد بن زید نے اب تک کی معلومات کے مطابق، پہلی خانقاہ کی بنیاد ڈالی جس کی اصل بظاہر صفہ مسجد نبوی سمجھا جا سکتا ہے، جس میں دین دار طبقہ کے خواص نے دولت، شہرت اور دنیاوی جاہ و مرتبت اور فنا ہونے والی آسائشوں سے رفتہ رفتہ خود کو دور کیا۔ اقتدار کے حصول کی سیاسی کوششوں کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھا اور کسی بھی فریق کا عملاً ساتھ دینے کے بجائے، گوشہ نشینی اختیار کی اگرچہ ان کا رجحان اہل علم وعدل و تقویٰ کی خاموش تائید کی طرف رہا۔ مزید برآں محدثین کی نقد و جرح، فقہا کی موشگافیوں، اہل کلام و فلسفہ کے ماوراء عقل حساس موضوعات پر محکم اظہار خیال اور قرآن و حدیث پر بے باک و بے مہار آزاد خیالی میں انھوں نے عافیت اسی میں جانی کہ گوشہ نشینی اختیار کر لیں۔ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت، احکام شریعت کی پابندی، عبادت و نیکوکاری میں مشغولیت، خود احتسابی، تلاوت و تدبر قرآن و اذکار مسنونہ میں زبان و قلب کا انہماک، علم کلام سے احتراز، فروعی مسائل میں زیادہ محتاط طریقے پر عمل، بعض میں خشیت اور بعض میں محبت کا غلبہ ان کی خصوصیات رہیں۔

یہ دور اس معنی میں سنہری دور سمجھا جاتا ہے کہ قرآن حکیم اور سنت مطہرہ کے سوتوں سے اس کی آبیاری ہوئی تھی۔ ظاہر و باطن شریعت یا حقیقت، طریقت اور شریعت کی تقسیم کا تصور ابھی جزو تصوف نہیں بنا تھا، صحابہ کرام کے عہد کی مجالس صحبت اور سنت بیعت احسان کا احیاء ہوا تھا، عبد اللہ بن مبارک مروزی اور وکیع بن الجراح اور احمد بن محمد بن حنبل کی تصانیف بالترتیب **کتاب الزہد والرقائق ، کتاب الزہد** اور، حارث محاسبی کی **کتاب الرعایہ لحقوق اللہ ، وصایا ، کتاب التوہم ، البعث والنشور ، آداب النفوس، محاسبۃ النفوس ، مسترشدین ، کتاب العلم ، الرزق الحلال ، الصبروالرضا ، التفکرو الاعتبار ، فہم الصلوٰۃ ، فہم القرآن ، الزہد ، العظمتہ وغیرہ** اورسہل بن عبداللہ کی **تفسیر القرآن** سامنے آنے لگی تھیں۔ لیکن ان کے علاوہ عمر بن عثمان المکی، ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی، جنید بغدادی، ابو سعید الخراز اور حسین بن منصور الحلاج کی ایسی تصانیف سامنے آنے

لگیں جو عوام تو عوام خواص تک کے لیے معمہ بن گئیں۔

راسخ العقیدہ مسلمانوں کا ایک گروہ عقلی و منطقی اسلوب پر امام احمد بن محمد بن حنبل کے اظہار ناپسندیدگی پر حارث محاسبی کے مقاطعہ پر اتر آیا اور اس نے ایسا بے لچک و متشدد رویہ اپنایا کہ حارث محاسبی روپوش ہونے پر مجبور ہوگئے اور اسی روپوشی کے عالم میں ان کی وفات ہوئی۔ حنابلہ کے خوف سے جنازہ میں صرف چار افراد شریک ہوئے۔

10.2.3 تصوف کی تاریخ: تیسرا دور

نویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں تصوف کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جو تقریباً بارھویں صدی کی ابتدا تک جاری رہتا ہے۔ جس میں دیگر علوم کی ترتیب و تہذیب کے ساتھ علم تصوف کی بھی صورت گری ہونے لگی۔

گوشہ نشینی میں قرآن کریم کی تلاوت و تدبر اور سنت نبویہ کے باطنی پہلوؤں پر غور و فکر اور ہر دو کے معنی المعنی کی تلاش کے ساتھ ساتھ کثرت ذکر لسانی و قلبی صوفیہ کرام کو ان کے مجاہدوں، مراقبوں اور قرآن و حدیث کے الفاظ و معنی کے انجذاب سے ناقابل بیان کیفیات سے دوچار کرتا ہے، امراض نفس و قلب و روح کی تشخیص اور تجربہ کار مشائخ تصوف کے طریقہ علاج ان کو صحت باطن سے روشناس کراتے ہیں۔ علم تصوف علم القلوب کے نام سے معروف ہو جاتا ہے اور شیخ التربیت کی رہنمائی میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی معرفت، محبت اور جذبہ اطاعت و عبدیت عادت ثانیہ میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ مستحبات شریعت بالطبع محبوب اور مکروہات شریعت بالطبع مبغوض ہونے لگتے ہیں۔

اسی دور میں شقیق بلخی نے "توکل" (اللہ پر کامل بھروسہ)، معروف کرخی نے "فنائے حسی" سری سطقی نے "توحید" ذوالنون مصری نے "حال مقام اور معرفت و فنا" ابو یزید طیفور بن عیسیٰ نے "عشق الہیٰ و سکر شعوری" جنید بغدادی نے "عشق الہیٰ، عبدیت، رضا بر رضائے الہیٰ اور صحو شعوری" ابو صالح حمدون القصار نے ملامت" ابو سعید الخراز نے فنا و بقاء اور عین الجمع ابو عبداللہ محمد ابن خفیف نے "حضور و غیبت" ابوالعباس السیار نے "شوق و الم" حارث محاسبی نے "محاسبہ نفس و روح و وقت و توانائی اور حال و مقام سہل بن عبداللہ تستری نے معصیات سے کلی اجتناب اور اطاعات میں کلی انجذاب" حکیم ترمذی نے "ولایت" ابوالحسین نوری نے "ترجیح صحبت بر عزلت و ایثار نفس" کے نظریات اپنے اپنے علم و احوال اور مخاطب کے فہم کے مطابق بیان کرنا شروع کیے۔ عمرو بن عثمان المکی اور حسین ابن منصور الحلاج کی تصنیفات و مکتوبات سامنے آئیں۔

اس دور میں دین دار طبقہ شریعت اور اس کے احکام پر قائم رہا، البتہ خواص نے تقرب و خوشنودی باری تعالیٰ کے لیے مجاہدے اپنائے، یکسوئی کے لیے جنگلوں، ریگستانوں، ویرانوں اور پہاڑوں کا رخ کیا تاکہ یکسوئی سے اذکار الہیٰ اور کائنات میں غور و فکر کے لیے وقت دے سکیں۔ بعض سماع حمد و نعت کی طرف جھکے تاکہ دل کی سخت زمین کاشت کے قابل بن سکے اور بعض پر انکشاف حقائق ہونے لگا، فراست ایمانی ان کا وصف بن گئی اور تمام اطاعات و عبادات شرعیہ میں عشق الہیٰ کی حرارت ان کی توانائی بن گئی۔ بقول شاہ ولی اللہ توجہ کی نسبت چونکہ ابھی درجہ کمال تک نہیں پہنچ پائی تھی چنانچہ مقصود نہیں بن پائی۔ یہاں "توجہ" کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے: حقیقتہ

الحقائق (یعنی ذات باری تعالیٰ) کی طرف کاملاً ایسے متوجہ ہونا کہ نفس انسانی مکمل طور پر اللہ کے رنگ (صبغتہ اللہ) میں ایسے رنگ جائے کہ اس کے بعد کوئی دوسرا رنگ چڑھ ہی نہ سکے۔

یہ وہ دور ہے کہ ایک طرف ابو عبد الرحمن السلمی کے قلم سے حقائق التفسیر لکھی جارہی ہے جس میں ظواہر قرآن کو چھوڑے بغیر بطون قرآن تک پہنچنے کی کوشش کی دعوت دی جارہی ہے۔اور طبقات النساک، طبقات الصوفیہ اور حلیتہ الاولیاء تصنیف ہورہی ہیں، تاکہ صوفیہ کے اقوال و احوال اور ان میں نبوی اقوال و احوال کے ساتھ کمال ہم آہنگی محفوظ ہوجائیں۔تو دوسری طرف کتاب اللمع از نصر سراج طوسی،قوت القلوب از ابو طالب مکی،التعرف لمذھب اھل التصوف از ابو بکر کلابازی،الرسالہ فی علم التصوف از ابو القاسم قشیری، صدمیدان اور منازل السائرین از ابو اسماعیل عبد اللہ انصاری حنبلی،کشف المحجوب از علی بن عثمان ہجویری،احیاء علوم الدین ، کیمیائے سعادت ، الاربعین ،معارج القدس،روضہ الطالبین ، قواعد العقائد ، مشکوۃ الانوار از ابو حامد محمد الغزالی سامنے آتی ہیں۔اور مصنفین اور مؤلفین کے نام کے باعث تصوف سے بیگانگی دور ہونے لگتی ہے۔جہاں تصوف کے عقائد و عمل بے نقاب ہوجاتے ہیں۔ان تصانیف کا مطالعہ ہم کو مؤلفین کے درج ذیل ممکنہ مقاصد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

1. تصوف کے مبادی، مقاصد و سائل اور حقیقت سے اہل علم کو آگاہ کرنا اور مسائل تصوف کی قرآنی و نبوی بنیادوں کی وضاحت کرنا۔
2. تصوف کا ظواہر شریعت محمدی سے رشتہ بتانا کہ یہ دونوں روح و جسم کی طرح ہیں۔
3. کلمات سکر (شطحات) کی توضیح
4. عقائد و اعمال اور اقوال صوفیہ کی وضاحت اور احوال صوفیہ کی ممکنہ توضیحات و توجیہات بیان کرنا
5. جہلاء صوفیہ کے کلمات باطلہ کا رد کرنا
6. متصوفین اور فرق باطلہ سے بے تعلقی کا اظہار کرنا
7. اہل غلو کو اصلاح کی طرف متوجہ کرنا
8. رسم پرست اہل تصوف کو رسوم تصوف کے بجائے اصول و قواعد کی پابندی اور حق پرستی کی تلقین کرنا
9. اہل ظاہر کو حقائق و مقاصد شریعت جاننے کی دعوت دینا
10. نااہل، ہوس پرست اور انانیت پسندوں کی حوصلہ شکنی کرنا

یہ بات پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ بعض اساطین علم کی جانب سے ان کتابوں اور ان کے مؤلفین پر سخت نقد بھی ہوا ہے۔دور وسطیٰ کے ناقدین میں عبد الرحمن ابن الجوزی، تقی الدین ابن تیمیہ،اور شمس الدین ذہبی کے نام نمایاں ہیں جنھوں نے اصلاً ضعیف، موضوع اور بے اصل احادیث سے استدلال اور اپنے نزدیک صوفیہ کے غلو اور حدود شرع سے مبینہ تجاوز کو نشانہ بنایا۔یہ بات بھی پیش نظر رکھنی

چاہیے کہ ہر علم و فن کے اصول، قواعد و ضوابط اور اصطلاحات کے علاوہ مقدمات و مبادی بھی ہوتے ہیں جن سے ناواقفیت اس علم و فن کی جانب غلط فہمیاں پیدا کرتی ہے۔ اس کا اطلاق ناقدین و مؤیدین ہر دو پر ہوتا ہے۔

10.2.4 تصوف کی تاریخ: چوتھا دور

بارہویں صدی کی ابتدا ہی میں تصوف کے چوتھے دور کا آغاز ابو سعید بن ابی الخیر اور ابوالحسن علی الخرقانی کے ظہور سے ہوا جب اہل دین کے عوام ظواہر احکام شریعت پر قائم رہے، خواص نے تزکیہ و تہذیب نفس، تصفیہ قلب و روح، فضائل اخلاق میں رسوخ اور احوال میں ترقی کے ذریعہ اللہ سبحانہ کے تقرب و خوشنودی کے حصول کو نصب العین بنایا۔ اور خواص الخواص نے اعمال و احوال اور مقامات سلوک سے گزر کر "جذب" تک رسائی حاصل کرلی جس نے ان کے سامنے "توجہ" یعنی حقیقت احسان کا راستہ کھول دیا۔ اور انہوں نے بذات خود مشاہدہ کرلیا کہ در حقیقت اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کی ذات فعال لما یرید (جو چاہے وہ کرنے والی ذات) اور قیوم حقیقی ہے، وہی غنی ہے اور باقی سب وجود کے ہر مرحلہ پر ہر صفت میں اس کے محتاج ہیں۔ یہ ابو علی روذباری، قشیری، غزالی، ہجویری، کلاباذی اور ابو طالب مکی کے معاصر تھے لیکن ان کا طریقہ ان سب سے جداگانہ اور ان کا طرز حیات و فکر و عمل ان سب سے مختلف تھا۔ بہر حال شہاب الدین سہروردی ابو علی روذباری، قشیری، کلاباذی، ابو طالب مکی،، غزالی، عبد القادر جیلانی وغیرہ کی تصوف سے وابستگی نے مذبذب علماء کے دل میں تصوف کی طرف ایک مثبت تاثر قائم کر دیا۔ ان کی مجالس کی شرکت نے ان کی تالیفات کے مشکل و مبہم مقامات کو صاف اور مبرہن کر دیا، اشکالات دور کر دیے اور وہ تاثیر پیدا کر دی جس نے ان کی زندگی میں ایک انقلاب کی راہ کھول دی۔ وہی قرآن، وہی حدیث لیکن معانی و مفاہیم کی بارش نئی جس کے قطرہ قطرہ نے یا تو ان کی روح کی پیاس بجھائی یا اللہ عزیز کے خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت کے جذبات قوی سے قوی تر کر دیے، یا ان کی چشم باطن ایسے کھول دی کہ علمی اشکالات ہوا ہو گئے، یا شوق شہرت فنا ہو گیا، یا علماء دین مجسم دین بن گئے، چنانچہ اس دور سے اہل تفسیر، اہل حدیث اور اہل فقہ میں ایک معتد بہ تعداد ہمیں صوفیہ سے منسلک ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

10.2.5 تصوف کی تاریخ: پانچواں دور

بارہویں صدی کی لگ بھگ تیسری دہائی سے تصوف کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے جو چودھویں صدی کے اواخر تک جاری رہتا ہے۔ اس دور میں وہ ذی اثر شخصیتیں ظاہر ہوتی ہیں جن کے نام نامی سے مختلف سلاسل منسوب ہوئے۔

1. شیخ عبد القادر جیلانی (متوفی 1166ء)… طریقہ قادریہ
2. ضیاء الدین ابوالنجیب عبد القاہر سہروردی (متوفی 1168ء)… طریقہ سہروردیہ
3. سید احمد ابن الرفاعی (متوفی 1182ء)… طریقہ رفاعیہ
4. احمد الیسوی (متوفی 1166ء)… طریقہ یسویہ
5. نجم الدین کبری (متوفی 1221ء) طریقہ کبرویہ

6. معین الدین حسن سجزی (متوفی 1336ء)... طریقہ چشتیہ

7. ابو الحسن علی الشاذلی (متولی 1257ء)... طریقہ شاذلیہ (ابو مدین شعیب (متوفی 1197ء) کے خلفاء سے مستفیض)

8. احمد البدوی (متوفی 1276ء)...... طریقہ بدویہ

9. جلال الدین رومی (متوفی 1273ء)... طریقہ مولویہ / جلالیہ

10. بہاء الدین محمد نقشبند (متوفی 1389ء) طریقہ نقشبندیہ

(طریقہ نقشبندیہ پہلے طریقہ خواجگان کے نام سے یوسف الہمدانی (متوفی 1140ء) اور عبد الخالق وغجدانی (متوفی 1179ء) کی طرف منسوب تھا)

ہر طریقہ یا سلسلہ اپنے مخصوص اصول اور قواعد وضوابط رکھتا تھا، لیکن اللہ سبحانہ کی محبت، خوشنودی اور عبدیت کا حصول سب میں مشترک تھا۔ اجتماعی تعلیم اور باقاعدہ انفرادی تربیت سلوک کا سلسلہ اسی دور میں شروع ہوتا ہے۔ تصوف میں درآمد مبینہ انحرافات کو دور کر کے متصوفین کو قانون شریعت کا پابند بنایا جاتا ہے۔ شیخ کی موجودگی ونگرانی میں ذکر وسماع کی مجلسیں منعقد کرنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اور ایسے اذکار، اشغال، مجاہدے اور مراقبے تجویز کیے جانے لگتے ہیں جو اہل شقاوت کو اہل سعادت میں تبدیل کر دیں۔

یکے بعد دیگرے مختلف مقامات پر خانقاہوں اور ان سے ملحق مسجدوں کی تعمیر ہوتی ہے جس میں صاحب دل امراء وسلاطین بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان خانقاہوں اور ان کے مکینوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے زمینیں، جاگیریں وقف کی جاتی ہیں۔ تاکہ شیخ ومرید یکسوئی، مجاہدہ وتصفیہ باطن کے ذریعہ مشاہدۂ حق تک پہونچنے کی کوشش میں لگے رہیں۔

اس دور میں مشائخ وسالکین کی رہنمائی کے لیے سلوک / تصوف کے شرائط، ارکان وآداب پر متعدد رسالے وکتب لکھی جاتی ہیں۔ ان میں آداب المریدین از ضیاء الدین سہروردی، عوارف المعارف از شہاب الدین سہروردی، مرصاد العباد از نجم الدین دایہ رازی، اور الامر المحکم المربوط از شیخ اکبر ابن عربی حاتمی کا مقام نمایاں ہے۔ ان میں عوارف المعارف کو اتنی مقبولیت حاصل ہوتی ہے کہ نہ صرف خانقاہوں میں طالبان حق کے لیے یہ نصاب کا جزو بن جاتی ہے بلکہ کثرت سے اس کی شرحیں بھی لکھی جاتی ہیں۔

تیرہویں صدی کی ابتدا میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اندلس سے مشرق کا رخ کرتے ہیں۔ اور بکثرت مشائخین قرأت، تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، لغت وتصوف سے اکتساب فیض کرتے مکہ معظمہ پہنچتے ہیں، حج ادا کرتے ہیں، دمشق کا رخ کرتے ہیں جہاں ان کا والہانہ خیر مقدم ہوتا ہے۔ قلب وروح پر اسرار وحقائق ایسے بے نقاب ہوتے ہیں کہ تحریر وتقریر میں ان کا اظہار معاصرین میں انتشار پیدا کر دیتا ہے۔ چار سو سے متجاوز آپ کی تصنیفات کی فہرست میں اس تفسیر کا کوئی تذکرہ نہیں جو مسلسل ان ہی کے نام سے منسوب شائع ہوتی آ رہی ہے اور جو اصلاً محققین کی رائے میں عبد الرزاق کاشانی کی تصنیف ہے۔ آپ نے بھی تفسیر لکھنے کا آغاز کیا تھا لیکن سورہ کہف تک پہنچے تھے کہ قضا نے آلیا۔ بہر حال تصوف میں فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کو غیر معمولی شہرت ملی۔ اگرچہ فصوص شروع سے تنقید وتنازعہ کا شکار بنی۔

فتوحات مکیہ اپنی ندرت، جامعیت، تنوع، تحقیق، تدقیق، اسلوب اور حسن عبارت میں ہنوز بے مثال ہے۔ لغت کی تنگ دامانی نے اسرار و حقائق کے بیان کے لیے ابن عربی کو الفاظ سازی کی تجدید اور متداول الفاظ کے معانی کی توسیع پر مجبور کر دیا۔ آپ نے ایک طرف نا اہل قارئین کو اپنی تصنیفات دیکھنے سے روکا اور ان کو اپنی تصنیفات میں نظر کرنا حرام قرار دیا، اور دوسری طرف ہوس کاروں کی حوصلہ شکنی کی غرض سے اپنے افکار کے تار و پود اپنی مختلف تصانیف میں بکھیر دیے، جس سے عوام و خواص ہی نہیں، خواص الخواص کے لیے بھی مضامین کا سمجھنا کٹھن ہو گیا۔ عینیت، غیریت، تنزلات، تعینات، وجود، شہود، کشود، لوائح، لوامع، یوم، اعیان ثابتہ ایسی ہی چند اصطلاحات ہیں جن کے مرادی معنی تک، خص الخواص ہی پہنچ پائے۔ ورنہ دوسروں نے بشمول اکابر صوفیہ (مثلاً ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی، سید محمد گیسو دراز، شیخ احمد سرہندی) ابن عربی پر اپنے نقد کا اپنے اپنے انداز میں اظہار کیا۔ جو سمجھے، ان کے لیے بھی سمجھانا دشوار ہو گیا، چنانچہ محب اللہ الہٰ آبادی اور ان کی تصانیف سے اورنگ زیب عالمگیر کی ناراضگی جاننے والے بخوبی جانتے ہیں۔ لیکن جو بگل ابن عربی نے پھونکا تھا اس نے تقریباً ساری اسلامی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اب تک جو اسرار و حقائق اصول و ارکان تصوف پر کاربند سالکین پر منکشف ہوتے وہ زوائد میں سمجھے جاتے تھے اور ان سے توجہ ہٹا لینے کی باتیں ہوتی تھیں، لیکن اب جو اسرار و حقائق ابن عربی کے قلم نے وا کیے ان کو بجائے زوائد کے مقاصد کا درجہ دے دیا گیا۔ محقق صوفیہ نے اسی لیے ابن عربی کی تحریروں کو پڑھنے سے اپنے اپنے مریدین کو روکا، اور صرف خاص خاص منتہی مریدین کو فتوحات یا فصوص کا درس دیا۔ فصوص الحکم کی کثرت سے شرحیں لکھی گئیں۔ شارحین میں داود قیصری، جامی، عبدالغنی نابلسی، محب اللہ الہٰ آبادی، شاہ مبارک علی حیدر آبادی، محمد صدیقی سوداگر کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسی دور میں جلال الدین محمد رومی نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی بزبان فارسی / پہلوی لکھی جس میں دین شریعت، توحید، رسالت، آخرت کے علاوہ تصوف و کلام کے مسائل دلکش اور عام فہم انداز میں بیان کیے ہیں۔ اس کی بھی تلخیصات، شروحات اور اصطلاحات کی توضیحات پر کام کیا گیا ہے۔ شروحات میں مولی مصطفی، کمال الدین خوارزمی، اسمٰعیل انقروی، اسمٰعیل قیصری، بحر العلوم فرنگی محلی، محمد افضل الہ آبادی، ولی محمد اکبر آبادی، اشرف علی تھانوی 'نذیر عرشی کی تالیفات اہمیت کی حامل ہیں۔

اسی دور میں شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی اپنے مشائی و اشراقی فلسفہ کو جو فیثا غورس، افلاطون، ارسطو طالیس، زرتشت اور رہبانیت کے امتزاج سے عبارت تھا۔ تصوف میں گوندھ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ عقلاء کی عقلیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔ ان کی تصانیف میں تلویحات، مطارحات، حکمتہ الاشراق، ہیکل النور، اعتقادات الحکماء، یزداں شناخت کے علاوہ علامتی زبان میں لکھی گئیں عقل سرخ، رسالہ فی المعراج، روزے بجماعت صوفیاں وغیرہ کے اثرات ایرانی / عجمی زہاد، حکما اور الہیین پر بڑی قوت سے مرتب ہوئے۔ اس سلسلہ میں جلال الدین دوانی، نصیر الدین طوسی، شمس الدین شہر زوری، قطب الدین شیرازی، میر داماد، ملا صدر الدین شیرازی، احمد احسائی اور ہادی سبزواری کے نام مشہور ہیں۔ شیخ الاشراق کو بھی مجد الدین بغدادی کی طرح زندقہ (گمراہی) کے الزام کا سامنا کرنا پڑا اور وہ 38 سال کی عمر میں بغدادی کی طرح قتل کر دیے گئے۔

اسی دور میں تاتاریوں نے چنگیز خاں کی قیادت میں مسلم ممالک پر یلغار کر دی، خوارزم شاہی سلطنت کے ساتھ ساتھ دوسری

سلطنتیں بھی تاش کے پتوں کی طرح تاتاری یورش کے آگے ڈھیر ہو گئیں، خوارزم شاہ نے مسلم سلاطین سے مسلسل جنگیں کر کے کسی کو اس لائق نہیں چھوڑا تھا کہ وہ تاتاری طوفان کو روک پائے، سقوط بغداد کے ساتھ تاتاریوں کے حوصلے اور بلند ہو گئے، آگ، خون، تباہی کا ایسا منظر سامنے آیا کہ دیکھنے والوں کا دل دنیا سے سرد ہو گیا اور اللہ کی بارگاہ میں رجوع پر خود کو انہوں نے مجبور پایا۔ رکن الدین بیبرس نے عین جالوت میں، غیاث الدین بلبن کی افواج نے شمالی ہند میں تاتاریوں کو شکست دے کر ان کی پیش قدمی روک دی، لیکن لاکھوں سروں کے مینارے، لاکھوں کتابوں کے الاوے، ان گنت بستیاں اور باغات راکھ ہو چکے تھے، علمی مراکز اجڑ چکے تھے، علماء و صوفیہ بھی نہ بچ پائے تھے، چنانچہ نجم الدین کبری اسی فتنہ میں شہید ہوئے۔ عالم اسلام پر ایسی اداسی چھائی کہ دولت عثمانیہ کی رفعت و سطوت بھی اسے دور نہیں کر پائی، ایسے میں صوفی خانقاہوں نے اپنا مفوضہ کام انجام دیا، سیف الدین باخرزی اور صدر الدین ابراہیم کے ہاتھ پر تاتاری بھاری تعداد میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

صوفیہ شروع سے اسلام کے داعی رہے، ان کی زبانیں خاموش رہتیں تو ان کے کردار بولنے لگتے۔ قرآن و حدیث ان کی دعوت کی بنیاد اور سیرت رسول ﷺ و اسوہ صحابہؓ ان کے پیغام کے جسم و جان تھے۔ جو بات کرتے دل سے نکلتی اور دل ہی میں ترازو ہو جاتی، وسطی ایشیا ہو، جنوبی ایشیا ہو یا جنوب مشرقی ایشیا دین اسلام کی تبلیغ میں امانت دار تاجروں کے علاوہ صوفیہ کرام نے اہم کردار ادا کیا، ان کے ایثار و قربانی اور خدمت خلق کے جذبات سے سرشار دعوت اسلام نے نہ صرف زخمی دلوں پر مرہم رکھا بلکہ ذات پات میں بٹے سماج کو یکجا کیا اور تمام امتیازات سے بلند ہو کر عالم انسانیت کو الٰہ واحد کی بندگی اور قانون شریعت کے آگے خود سپردگی کی جانب متوجہ کیا۔ جو لوگ دنیوی مصائب سے بدحال تھے، ناموافق حالات سے مایوس تھے، خانقاہوں میں ان کو پناہ ملی، غذا ملی، چھت اور بستر ملے، غم دور نہ ہو سکا تو غم کو بانٹنے والے سچے غم گسار ملے جنہوں نے دنیوی مصائب و آلام اور دنیوی لذت و آرام کے ناپائیدار ہونے کا حکیمانہ انداز سے یقین دلایا اور بتایا کہ انسان حتی المقدور کوشش کا مکلف ہے، نتائج اللہ عزوجل نے اپنے اختیار میں رکھے ہیں۔ زندگی، وقت، توانائی، صلاحیت اللہ عزوجل کی نعمت و امانت ہیں لہٰذا ان کو مصائب پر کڑھ کر ضائع کرنے کے بجائے ان کے مطلوبہ مصارف پر ان کو اس طرح خرچ کیا جائے کہ یہ نفع بخش سرمایہ بن جائیں۔

10.2.6 تصوف کی تاریخ: چھٹا دور

پندرھویں صدی عیسوی میں تصوف کا چھٹا دور شروع ہوا جو اٹھارہویں کے اواخر تک چلا۔ اس دور میں مختلف سلاسل کی نظریاتی بنیادیں مستحکم کی گئیں۔ اگرچہ گزرتے وقت کے ساتھ بدلتے حالات میں نظریوں میں کمی بیشی و ترمیمات جاری رہیں۔ سلاسل خود شاخ در شاخ بٹتے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ بانی سلسلہ کا احترام و اکرام قائم رہا۔

مختلف سلاسل کے درمیان حریفانہ شکلیں بھی پیدا ہوئیں۔ باہمی رقابتیں بھی کبھی کبھار بے حجاب ہوئیں، بانیان سلاسل کی بابت افضل و مفضول کی بحثیں بھی چھڑیں جن سے دلوں میں غبار پیدا ہو گیا، محقق مشائخین نے اس کے حل کی یہ تدبیر کی کہ بذات خود مختلف طریقوں سے وابستہ ہو گئے، سلوک کی از سر نو تکمیل کی، مجاز بیعت ہوئے، پھر مریدین کے رجحانات اور صلاحیتوں پر نظر کرتے ہوئے ان

سے مختلف سلاسل میں بیعت لی تاکہ کسی سلسلہ کی بابت ان کے دل میں تحقیر کا جذبہ نہ پیدا ہو، اور حسب صلاحیت مرید سلوک کی تعلیم دی۔ شیخ احمد سرہندی مثلاً اپنے والد گرامی شیخ عبد الاحد کے ہاتھ پر چشتی سلسلہ میں بیعت ہوئے، پھر والد کے حکم پر شاہ سکندر کیتھلی کے ہاتھ پر قادری سلسلہ میں بیعت کی، پھر دوسرے صوفیہ کے ہاتھ پر سہروردی اور کبراوی سلسلوں سے وابستہ ہوئے۔ تکمیل سلوک کے بعد حجاز کے ارادے سے وطن سے نکلے، لیکن دہلی میں حضرت باقی باللہ کی زیارت کی تو خود بخود نقشبندی سلسلہ میں بیعت ہونے اور راہ سلوک طے کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا، حضرت باقی باللہ نے اپنے اصول کے بر خلاف فوراً بیعت کر لیا۔ آگے شیخ احمد سرہندی کی شہرت نقشبندی شیخ کی حیثیت سے ایسے پھیلی کہ صرف انبالہ جیسے چھوٹے شہر میں بیک وقت آپ کے 42 خلفاء اشاعت حق میں لگے رہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، اگر چہ ان کے پاس مختلف سلاسل کے درمیان توازن ملتا ہے۔ آگے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شخصیت مجمع البحار کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ انہوں نے مختلف سلاسل سے اپنی وابستگی کی بابت 'الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا جو محققین کی رائے کے مطابق مستقلاً ناتمام طبع ہوتا آرہا ہے۔

10.2.7 تقسیم ادوار مطابق شاہ ولی اللہؒ

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب 'ہمعات، میں جو تقسیم کی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ وہ تصوف کو چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں. شاہ ولی اللہ کے مطابق تصوف کا پہلا دور رسول اللہ ﷺ صحابہ کے زمانہ تک کا ہے وہ اسے احسان کے دور سے تعبیر کیا ہے۔ اس زمانے میں رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری اعمال پر رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے ذیل ہی میں حاصل ہو جاتے تھے۔ تصوف کا دوسرا دور حضرت جنید بغدادی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کا نیا رنگ ظاہر ہوا جو کہ دور صحابہؓ سے مختلف تھا۔ اس زمانے میں اہل کمال نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں اور دنیا سے بلکل قطع تعلق کر لیا اور مستقل طور پر ذکر و فکر میں لگ گئے۔ انہوں نے طویل مراقبے کرنے کے سلسلہ شروع کیا۔

تصوف کا تیسرا دور شاہ صاحب کے مطابق سلطان الطریق ابو سعید ابی الخیر اور شیخ ابو الحسن خرقانی کے زمانے سے ہوتا ہے۔ اس عہد میں طریق تصوف میں صوفیا کی تمام کوششیں کا مقصد یہ ہوتا کہ وہ باری تعالی کی توجہ کی نسبت کی تکمیل میں اپنی کوششیں تمام کر دیں۔ تصوف کے چوتھے دور کا آغاز شیخ محی الدین ابن عربی کے دور سے کچھ عرصے قبل سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں حقائق تصوف کی بحث شروع ہوئی اور ذات واجب الوجوب سے اس کائنات کے صدور اور اسکے مراحل موضوع بحث بن گئے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تصوف کے چاروں ادوار میں جو بھی صوفیا اور اہل کمال بزرگ گزرے ہیں گو وہ اپنے ظاہری اعمال میں جدا نظر آتے ہوں لیکن انکی اصل اور باطن کے اعتبار سے سب ایک ہیں۔

10.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شاہ ولی اللہؒ نے تصوف کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دیگر مورخین نے تصوف کو اسکے ارتقائی مراحل کے اعتبار سے چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔
- تصوف کا پہلا دور رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور مسلمانوں کی توجہ شرعی اعمال کے پورا کرنے پر مرکوز رہی۔ اس دور کے حضرات باطنی مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذریعہ حاصل کرتے تھے۔
- تصوف کا دور ثانی کو تصوف کا تشکیلی دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور کے اہم صوفیا میں حضرت حسن بصری، فضیل بن عیاض اور حضرت مالک بن دینار وغیرہ ہیں۔ ان صوفیا نے اس دور کے مسلمانوں میں پائی جانے والی حد سے زیادہ دنیاداری سے بے زاری کا اظہار کیا اور اس ماحول سے قطع تعلق کر کے تنہائی میں رہنے کو زیادہ ترجیح دی۔
- نویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں تصوف کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جو تقریباً بارھویں صدی کی ابتدا تک جاری رہتا ہے۔ اس دور میں مسلمان یونانی فلسفے سے مرعوب ہوئے اور ان کے عقائد میں شکوک وشبہات کی بنا پر فرقوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ اس دور میں دیگر علوم کی ترتیب وتہذیب کے ساتھ علم تصوف کی بھی صورت گری ہونے لگی۔ اس دور کے صوفیا میں حضرت بایزید بسطامی، ذوالنون مصری اور جنید بغدادی بہت زیادہ مقبول اور مشہور ہیں۔
- تصوف کے تیسرے دور میں عباسی خلافت روبہ زوال تھی اور مسلم دنیا میں علاقائی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اس دور میں تصوف اصطلاحات مقبول ہونا شروع ہوئیں اور اس فن کی ابتدائی کتب تصنیف کی گئیں جن میں کتاب اللمع، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب شامل ہیں۔ اس دور کے اہم صوفیا میں ابونصر سراج، حارث محاسبی، ابوطالب مکی، علی ہجویری وغیرہ شامل ہیں۔
- بارہویں صدی کی لگ بھگ تیسری دہائی سے تصوف کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے جو چودھویں صدی (ساتویں صدی ہجری) کے اواخر تک جاری رہتا ہے۔ اس دور میں وہ ذی اثر شخصیتیں ظاہر ہوتی ہیں جن کے نام نامی سے مختلف سلاسل منسوب ہوئے۔ اس عہد میں تصوف نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اسلامی ممالک منگولوں کے ظلم وستم کا شکار ہوئے اور مسلمان مایوسی کا شکار تھے اور اس قتل وخون وغارت گری نے دنیا کی بے ثباتی کے یقین نے تحریک تصوف کو جلا بخشی اور تصوف کے اہم سلسلے اس دور میں وجود میں آئے۔ اس زمانے میں تصوف کی معرکہ الاراء کتب تصنیف کی گئیں فتوح الغیب، احیاء علوم الدین، فصوص الحکم وغیرہ شامل ہیں۔ اس دور میں تصوف کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔
- پندرہویں صدی عیسوی میں تصوف کا چھٹا دور شروع ہوا جو اٹھارہویں کے اواخر تک چلا۔ اس دور میں مختلف سلاسل کی نظریاتی

بنیادیں مستحکم کی گئیں۔ اس دور میں تصوف نے باقاعدہ ایک نظام کی شکل اختیار کر لی۔ مختلف سلاسل میں رقابتیں پیدا ہوئیں اور محقق مشائخین نے مختلف سلاسل سے بیعت کر کے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔

- شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تصوف کے چاروں ادوار میں جو بھی صوفیا اور اہل کمال بزرگ گزرے ہیں گو وہ اپنے ظاہری اعمال میں جدا نظر آتے ہوں لیکن ان کی اصل اور باطن کے اعتبار سے سب ایک ہیں۔

10.4 نمونہ امتحانی سوالات

10.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. تصوف کا پہلا دور رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور.....................کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔

(a). حضرت ابو بکرؓ (b). حضرت عمرؓ (c). حضرت عثمانؓ (d). حضرت علیؓ

2. تصوف کی بنیادی کتب.........................دور میں تصنیف کی گئی۔

(a). دور اول (b). دور ثانی (c). دور ثالث (d). دور چہارم

3. تیسرے دور کے ایک اہم صوفی.........................ہیں۔

(a). حسن بصری (b). بایزید بسطامی (c). ابن عربی (d). امام غزالی

4. سلاسل تصوف کا آغاز.........................دور میں ہوا۔

(a). تیسرے (b). چوتھے (c). پانچویں (d). چھٹے

5. تصوف کے چوتھے دور کا آغاز.........................کے ظہور سے ہوا۔

(a). ابوالحسن خرقانی (b). حسن بصری (c). ابن عربی (d). علی ہجویری

6. حسن بصری کے صحبت یافتہ.........................نے پہلی خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔

(a). بشر حافی (b). رابعہ بصریہ (c). عبد الواحد بن زید (d). جنید بغدادی

7. جنید بغدادی نے...............................کی بابت فرمایا کہ وہ علم تصوف یا علم باطن کی چابی تھے۔

(a). حسن بصری (b). بشر حافی (c). ابراہیم بن ادھم (d). رابعہ بصریہ

8. دور وسطی میں..............................نے مولفین تصوف پر نقد کیا۔

(a). عبد الرحمن بن الجوزی (b). تقی الدین ابن تیمیہ (c). شمس الدین ذہبی (d). ابو نصر سراج

9. ”آج تصوف ایک نام ہے بغیر حقیقت کے، لیکن زمانۂ سابق میں یہ ایک حقیقت تھی بغیر نام کے، یہ کس کا قول ہے؟

(a). علی ہجویری (b). ابوالحسن قوشنجی (c). حارث محاسبی (d). ابو نصر سراج

10. ....صوفی، امام احمد بن حنبل کے ہم عصر ہیں۔

(a). حارث محاسبی (b). بشر حافی (c). امام غزالی (d). ابن عربی

10.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. تصوف کے دور اول میں تصوف کا کیا مفہوم تھا؟ بیان کیجیے۔
2. تصوف کے دوسرے دور میں تصوف کے احوال پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
3. تیسرے دور میں تصوف کے ارتقائی مراحل اور افکار کا جائزہ لیجیے۔
4. تصوف کے چوتھے دور پر روشنی ڈالیے۔
5. عصر حاضر میں تصوف اور صوفیا کے احوال پر مختصر اتبصرہ کیجیے۔

10.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. تصوف کے ارتقائی ادوار کا جائزہ لیجیے۔
2. تصوف کی ابتدائی کتب کس دور میں تصنیف کی گئیں؟ اور کس دور میں تصوف کے سلسلے وجود میں آئے؟ تفصیلی نوٹ قلم بند کیجیے۔
3. پانچویں صدی ہجری کے اہم صوفیا اور ان کے طرق و تعلیمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

10.5 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. کشف المحجوب : سید علی ہجویری (اردو ترجمہ)
2. ہمعات : شاہ ولی اللہ (اردو ترجمہ)
3. تلبیس ابلیس : عبد الرحمن ابن الجوزی (اردو ترجمہ)
4. تذکرۃ الاولیاء : فرید الدین عطار (اردو ترجمہ)
5. تزکیہ و احسان : سید ابوالحسن علی ندوی
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ
7. Mystical Dimensions of Islam. Annemarie Schemmel
8. Encyclopedia of Islam (3rd Edition)

اکائی 11: ابتدائی دور کے صوفیاء کرام اور ان کی تعلیمات (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 حضرت حسن بصریؒ
11.2.1 حسن بصریؒ کی تعلیمات
11.3 حضرت رابعہ بصریہؒ (متوفیہ 185ھ)
11.4 حضرت حارث الحاسبی (متوفی 243ھ)
11.4.1 حارث محاسبی کی تعلیمات
11.5 اکتسابی نتائج
11.6 نمونہ امتحانی سوالات
11.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

ذیل کی اکائی میں ہماری کوشش ہوگی کہ دور اول کے صوفیہ کے کچھ معروف اور بلند مرتبہ صوفیائے کرام کے احوال و کوائف اور تعلیمات کو اس طرح بیان کریں کہ ان کے توسط سے اس دور کی صوفی روایت کے مختلف انداز و اطوار سامنے آجائیں۔ ساتھ ہی ہماری کوشش یہ بھی ہوگی کہ اس اکائی میں ابتدائی دور کے صوفیوں کی زیادہ سے زیادہ تعلیمات کا احاطہ کرلیا جائے۔ ابتدائی دور کے صوفیاء میں حضرت حسن بصری اولین صوفی شمار ہوتے ہیں۔ اسلامی تصوف کی تاریخ میں خواتین صوفیا بھی گزری ہیں جن میں حضرت رابعہ بصریہ نہایت معروف

تابعی صوفیہ تھیں۔ اسی طرح حارث المحاسبی اولین طبقہ کے نہایت جلیل القدر صوفیا میں ہیں جنہوں نے تصوف کی ابتدائی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ اسلام کے ابتدائی دور کے اکابر صوفیائے کرام گزرے ہیں ان سے واقف ہو سکیں۔ یہاں پر کوشش کی گئی ہے کہ دور اول کے چند اہم صوفیا کے احوال اور اقوال نقل کر دیے جائیں۔ تاکہ آپ ان صوفیہ کے حالات و کوائف کے ساتھ ان کی تعلیمات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

11.2 حضرت حسن بصریؒ

ابو سعید حسن بن یسار حضرت عمرؓ کی خلافت کے دور میں سنہ 21 ہجری میں پیدا ہوئے، آپ کے والدین آزاد کردہ غلام تھے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے سایہ شفقت میں آپ پروان چڑھے۔ امہات المومنین کے گھروں میں بچپن میں برابر آتے جاتے رہتے جو بلوغ کے ساتھ رک گیا۔

علامہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ حسن بصری ایک بلند مرتبت عالم، رفیع منزلت فقیہ، غلطیوں سے پاک، عابد و زاہد اور وسیع العلم، فصیح و بلیغ اور حسین و جمیل، غرض جامع کمالات بزرگ تھے۔ ظاہری و باطنی نعمتوں سے مالا مال ایک ایسے مشہور عالم تھے جن کی جلالت شان پر سب کا اتفاق تھا، تعلیمات اسلامی اور اخلاق نبوی کے مجسم نمونوں یعنی صحابہ کرام کی صحبت میں تاثیر ہی ایسی تھی۔ امام شعبی فرمایا کرتے کہ میں نے اس ملک (یعنی عراق) میں حسن سے افضل کسی کو نہیں دیکھا۔ اور قتادہ کہتے حسن کا دامن پکڑو، میں نے رائے میں کسی کو اس شخص سے زیادہ عمر بن الخطاب کے مشابہ نہیں پایا۔ اور کبھی کہتے کہ حسن حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ امام باقرؒ فرماتے کہ حسن کی باتیں انبیاء کے کلام کے مشابہ ہوتی ہیں۔

صحابہ کرام میں حضرات عثمانؓ، علیؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن عمروؓ، انس بن مالکؓ، جابر بن معاویہؓ، معقل بن یسارؓ، ابو بکرہؓ، عمران بن حصینؓ اور جندب بجلیؓ سے راست استفادہ کیا تھا، اور حضرت عمر بن الخطابؓ ابی بن کعبؓ سعد بن عبادہؓ، عمار بن یاسرؓ، ابوہریرہؓ، ثوبانؓ، عثمان بن ابی العاصؓ اور معقل بن سنانؓ سے بالواسطہ۔ اکابر تابعین کی ایک بڑی جماعت سے بھی مستفید ہوئے۔ چنانچہ روایت بالمعنی کے قائل ہونے کے باوجود شائقین علم کا مرجع بن گئے۔ مکہ مکرمہ تک میں لوگوں کا ہجوم لگ جاتا، آپ کو تخت پر بٹھایا جاتا۔ مجاہد، عطاء، اور طاؤس جیسے اکابر تابعین آپ سے احادیث سنتے اور یہ کہتے کہ ہم نے اس شخص کا مثل نہیں دیکھا۔

تفسیر میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی۔ لیکن حدیث، فقہ اور عربیت میں امام سمجھے گئے۔ ایک مرتبہ مطر الوراق نے ایک فقہی مسئلہ میں آپ کی رائے دریافت کی۔ جواب ملنے پر کہا کہ فقہاء تو اس بابت آپ سے اختلاف کرتے ہیں۔ حسن بصری نے اس پر فرمایا" ...تو نے فقیہ دیکھا بھی ہے؟ اور جانتا ہے کہ فقیہ کسے کہتے ہیں؟ فقیہ وہ ہے جو زاہد اور متورع ہو، اپنے سے اونچے مرتبہ والے سے مرعوب نہ

ہو تا ہو نہ اپنے سے کم مرتبہ والے کا مذاق اڑاتا ہو، اور اللہ نے اس کو جو علم عطا کیا ہے اس سے قلیل دنیاوی نفع نہ حاصل کرتا ہو۔"

حضرت ابوبردہؒ جو ایک جلیل القدر تابعی تھے فرماتے تھے کہ میں نے کسی غیر صحابی کو حسن سے زیادہ اصحاب رسول ﷺ سے مشابہ نہیں دیکھا۔ امام شعبی جنہوں نے ستر صحابہ کرام کو دیکھا تھا حسن بصری کی بڑی تعظیم کرتے، ان کے صاحبزادے نے پوچھا کہ جیسا برتاؤ آپ اس شیخ (حسن بصری) کے ساتھ کرتے ہیں، ایسا کسی دوسرے شخص کے ساتھ نہیں کرتے۔ شعبی نے جواب دیا۔ "بیٹا میں نے رسول اللہ ﷺ کے ستر اصحاب کو دیکھا ہے اور حسن سے زیادہ کسی کو ان سے مشابہ نہیں پایا۔"

حسن بصریؒ پر ہمیشہ حزن و غم چھائے رہتے، قلبی سوز و گداز نے لبوں کو ہنسی سے اور قلب کو خوشی سے ناآشنا کر دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ مومن کی ہنسی قلب کی غفلت کا نتیجہ ہے، زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے۔ قرآن عظیم کی جب تلاوت کرتے تو شدت تاثر سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

خشیت الٰہی کا اس قدر غلبہ تھا کہ ہر آن لرزاں و ترساں رہتے، یونس بن عبید کا بیان ہے کہ حسن آتے تو معلوم ہوتا جیسے اپنے کسی قریبی عزیز کو دفن کر کے آرہے ہیں۔ بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ ایک قیدی بیٹھا ہے جس کی گردن مارنے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ جہنم کا ذکر ہوتا تو معلوم ہوتا کہ گویا جہنم صرف انہی کے لیے بنائی گئی ہے۔ ان کی مجلس میں شاذ و نادر ہی آخرت کے علاوہ کسی شئے کا ذکر ہوتا۔ ایک بار شعبی اجازت لے کر چند لوگوں کے ہمراہ ان کے گھر گئے تو ان کو تنہا قبلہ رو خود کلامی کرتا پایا۔ ایک عجیب عالم میں کہہ رہے تھے "ابن آدم تو نیست (معدوم) تھا، ہست (موجود) کیا گیا، تو نے مانگا، تجھے دیا گیا، مگر جب تیری باری آئی اور تجھ سے مانگا گیا تو تو نے انکار کر دیا، ہائے افسوس تو نے کیسا برا کام کیا" یہ کہتے اور بے ہوش ہو جاتے، ہوش آتا، پھر وہی کلمات دہراتے اور پھر بے ہوش ہو جاتے۔

اخلاص کے بغیر صوف پوشی اور حلقہ نشینی کو فریب نفس تصور کرتے۔ ایک مرتبہ آپ کے سامنے گلیم پوشوں کا تذکرہ کیا گیا، فرمایا۔ "یہ لوگ دل کی گہرائی میں تکبر کے بت چھپائے ہیں اور ظاہری لباس سے تواضع و خاکساری ظاہر کرتے ہیں۔ بخدا یہ اپنی گلیم گدائی میں بیش قیمت رداء پوشوں سے زیادہ متکبر ہیں۔" ایک بار یمنی جبہ اور رداء (چادر) اوڑھ کر نکلے، ایک ساتھی نے اعتراض کیا تو جواب دیا۔ "تم کو یہ معلوم نہیں کہ دوزخیوں کا بڑا حصہ گلیم پوشوں میں سے ہوگا"۔ آپ خوش لباس اور جامہ زیب تھے، یمن کی رداء اور پھول دار چادر زیب بدن ہوتے، جبہ، چادر اور عمامہ کا اتنا اہتمام تھا کہ بغیر عمامہ کے گھر سے نہ نکلتے۔

فریب نفس سے اتنے خائف تھے کہ اٹھتے بیٹھتے دعا فرماتے۔ "اے اللہ! شرک، تکبر، نفاق، ریاء، فریب دہی، شہرت طلبی اور اپنے دین میں شک و شبہ سے ہمارے قلوب کو محفوظ رکھ، اے مقلب القلوب! ہمارے دلوں کو اپنے دین پہ قائم رکھ اور اسلام کے سیدھے راستے کو ہمارا دین بنا۔"

جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ دل میں موجزن تھا، کابل، اندقان اور ازبکستان کی مہمات میں آپ کی شرکت کی صراحت ملتی ہے، شہرت سے نفور نے ممکن ہے تذکرہ نگاروں کو دیگر مہمات میں شرکت سے بے خبر رکھا ہو۔

حکام کے ظلم کا جواب صبر سے دینے کی تلقین کرتے، خروج کے خلاف تھے، مگر حکام کے روبرو اظہار حق میں کوئی تذبذب نہ

کرتے۔

جوانی میں جواہر و موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔ تجارتی سفر میں ایک مرتبہ روم گئے۔ وزیر کے ایما پر اس کے ساتھ ایک جنگل میں گئے۔ دیکھا کہ دیبائے رومی کا ایک خیمہ استادہ ہے جس کی طنابیں ریشم کی اور میخیں سونے کی ہیں۔ ایک بڑی فوج اور امراء کو دیکھا، حکماء، دبیروں اور منشیوں کو دیکھا، خوبصورت کنیزوں کو زر و جواہر کی کشتیاں لیے دیکھا۔ یہ سب خیمہ کے گرد پھرے، کچھ کہا اور رخصت ہوئے پھر قیصر روم اور اس کا وزیر خیمہ کے اندر گئے، باہر نکلے اور رخصت ہو گئے۔ تجسس جاگا تو وزیر سے پوچھ بیٹھے، پتہ چلا کہ قیصر روم کا چہیتا ایک خوش جمال لڑکا بیمار ہوا، اطباء، اہل دانش، اہل حکمت سے علاج کرایا گیا، دولت حکومت کی مدد لی گئی، غرض جو جو تدبیریں کی جاسکتی تھیں کی گئیں لیکن سب بے کار ثابت ہوئیں اور شہزادہ چل بسا، اس واقعہ نے حسن پر ایسا اثر کیا کہ تجارت دنیا چھوڑ کر تجارت آخرت میں لگ گئے۔

11.2.1 حسن بصریؒ کی تعلیمات

1. لوگوں نے کہا کہ بعض افراد کہتے ہیں کہ خلق کو نصیحت اس وقت کرنا چاہیے جب اپنی ذات کو پاک صاف بنالیا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ شیطان چاہتا ہے کہ حق تعالی کے احکام کی تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جائے۔

2. لوگوں نے ایک رات حسن کو دیکھا کہ گھر میں بیٹھے روئے جارہے ہیں۔ پوچھا کہ ہماری نظر میں تو آپ جیسا عابد و متقی کوئی اور نہیں، آپ کیوں اس طرح رو رہے ہیں؟ حسن نے فرمایا کہ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ خدا نہ کرے نادانستگی میں یا بھول میں مجھ سے کوئی کام ایسا ہو گیا ہو یا کوئی قدم غلطی سے ایسی جگہ پڑ گیا ہو کہ اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ ہو اور باری تعالیٰ حسن سے کہہ دے کہ جا، ہماری بارگاہ میں اب تیرا کوئی مقام نہیں، اب ہم تیری کوئی عبادت قبول نہ کریں گے۔

3. ایک روز آپ بہت روئے اور آپ کے آنسو کسی کے بدن پر لگ گئے اس نے پوچھا کہ یہ پانی پاک ہے یا ناپاک۔ حسن نے فرمایا کہ بھائی اسے دھوڈالو کیوں کہ یہ ایک گنہ گار بندے کے آنسو ہیں۔

4. ایک مرتبہ امیر المومنین عمر بن عبد العزیزؒ نے آپ کو خط لکھا اور درخواست کی کہ کوئی ایسی نصیحت فرمایئے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں۔ حسن نے لکھا کہ اگر اللہ تیرے ساتھ ہے تو خوف کس کا رکھتا ہے اور اگر اللہ تیرے ساتھ نہیں تو امید کس سے رکھتا ہے۔

5. حسن نے کسی اور روز عمر بن عبد العزیزؒ کو خط لکھا کہ اس دن کو آیا ہوا جان کہ اس دن کے بعد کوئی نہ جیے گا۔ عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب میں لکھا کہ اس دن کو آیا ہوا جان کہہ دینا خود ہی نہ ہوگی اور یوم آخرت ہوگا۔

6. حضرت ثابت بنانی نے ایک روز حسن کو خط لکھا، میں نے سنا ہے کہ آپ حج کے لیے جارہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں بھی حج میں آپ کے ساتھ چلوں۔ حسن نے جواب میں لکھا، ہمیں معاف رکھیے اور تنہا چھوڑیے کہ اللہ کی ستاری میں زندگی بسر کریں، اکٹھے ہونے سے ایک دوسرے کے عیب پر نظر پڑے گی اور ایک دوسرے کو برا خیال کریں گے۔

7. حسن نے سعید بن جبیر کو نصیحت فرمائی کہ تین کام کبھی مت کرنا۔ ایک تو یہ کہ بادشاہ کے بچھونے پر ہرگز قدم نہ رکھنا اگرچہ

وہ تیرے حال پر مہربانی فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ کسی سے اپنا راز ظاہر نہ کرنا اگرچہ وہ رابعہ ہی کیوں نہ ہوں۔ تیسرے یہ کہ راگ اور گانا ہرگز نہ سننا اگرچہ مردانگی کا درجہ ہی کیوں نہ رکھتا ہو، اس لیے کہ راگ اور گانا آفت سے خالی نہیں اور آخر کار اپنا اثر بتا کر رہتا ہے۔

8. مالک بن دینار نے نقل کیا کہ میں نے حسن سے پوچھا کہ لوگوں کی خرابی کس چیز میں ہے؟ آپ نے فرمایا دل کے مرنے میں۔ میں نے پوچھا دل کا مرنا کیا ہے؟ کہا دنیا سے محبت کرنا۔

9. ایک بار اپنے مخاطبین سے کہا: تم لوگ صورت و شکل میں تو صحابہ کے مشابہ ہو لیکن عمل اور کردار میں ان سے جدا۔ اگر تم ان کو دیکھتے تو سب کو دیوانہ سمجھتے اور اگر وہ تم کو دیکھتے تو کسی کو مسلمان نہ کہتے۔

10. ایک بدوی حسن کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ صبر کس کو کہتے ہیں۔ حسن نے فرمایا کہ صبر دو قسم کا ہے: ایک بلا اور مصیبت پر، اور ایک ان چیزوں پر جن کے اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو روک دیا ہے۔ آگے آپ نے مزید تفصیل بتائی جس سے بدوی بے حد متاثر ہوا اور کہہ اٹھا کہ حضرت! نہ میں نے آپ کے مثل کوئی زاہد دیکھا نہ آپ سے بڑھ کر صابر سنا۔ حسن نے متانت سے کہا کہ اے بدوی! میرا زہد تمام خواہش اور میرا صبر بے صبری کے سبب ہے، بدوی بڑا حیران ہو، اور اس نے کہا کہ اپنا مطلب صاف صاف بیان فرمائیے، کیوں کہ آپ کے کلمات سے میرا دل متردد ہو گیا ہے۔ حسن نے فرمایا کہ میرا صبر بلاء اور مصیبت پر یا اطاعت الٰہی پر جو ہے وہ خود بتا رہا ہے کہ دراصل دوزخ کی آگ کا ڈر اس کا سبب ہے جسے جزع کہتے ہیں، رہا زہد سو جنت کی رغبت اس کا سبب ہے۔ صبر اور زہد تو حقیقتاً اس شخص کے قوی ہیں جو صبر اور زہد دونوں کو خالصتاً اللہ کے لیے اختیار کرے۔ نہ جنت کی نعمتوں کا حصول اس کا محرک ہو اور نہ دوزخ کا ڈر۔

11.3 حضرت رابعہ بصریہؒ (متوفیہ 185ھ)

حضرت رابعہ بنت اسمٰعیل العدویہ القیسیہ البصریہ ایک تنگ حال گھرانہ میں بصرہ میں پیدا ہوئیں۔ اپنی بہنوں میں چوتھی ہونے کے باعث ان کا نام رابعہ رکھا گیا۔ ان کے بڑے ہوتے ہوتے ان کے والدین انتقال کر گئے۔ شہر بصرہ میں اسی زمانے میں قحط پڑا اور بہنیں منتشر ہو گئیں۔ رابعہ کو ایک ظالم نے پکڑ کر زبردستی اپنی خادمہ بنالیا اور پھر چند درہم کے عوض ان کو بیچ ڈالا۔ خریدار گھر لے گیا اور آپ سے سخت محنت کے کام لینے لگا۔ ایک روز راستہ میں جارہی تھیں کہ اچانک ایک غیر محرم سامنے آ گیا۔ رابعہ گھبرا گئیں اور گھبراہٹ میں ایک طرف بھاگ پڑیں۔ راستہ میں گریں، آپ کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ آپ نے اپنا منھ خاک پر رکھا اور کہا۔ "بارالہا! میں غریب، یتیم، قیدی اور ہاتھ ٹوٹی باندی ہوں لیکن مجھے ان باتوں کا غم نہیں، ہاں تیری رضا (خوشنودی) کی طالب ہوں، مجھ پر فضل فرما اور آگاہ کر کہ تو مجھ سے راضی ہے یا نہیں؟" آپ نے غیبی آواز سنی کہ تو غم مت کھا کہ کل بروز قیامت تیرا وہ رتبہ ہو گا کہ مقرب فرشتے تجھ پر فخر کریں گے۔ رابعہ مطمئن اپنے مالک کے گھر لوٹ گئیں۔

حضرت رابعہ بصریہ کا دن روزہ میں اور مالک کی خدمت میں گزرتا اور رات قیام نماز میں۔ ایک رات مالک کو کوئی ضرورت آن پڑی، اس نے رابعہ کو آواز دی لیکن رابعہ کہیں اور مشغول تھیں۔ وہ کمرہ سے نکلا، رابعہ کے حجرہ کی طرف چلا۔ دیکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے

اور رابعہ کسی سے ہم کلام ہیں۔ تجسس کے تحت اس نے اپنی آنکھ دروازے کی جھری سے لگادی۔ دیکھا کہ رابعہ سجدے میں گری کہہ رہی ہیں۔ "الٰہی! تو جانتا ہے میرے دل کی آرزو تیرے فرامین کی بجاآوری ہے، میری آنکھوں کی روشنی تیری بارگاہ میں حاضری ہے۔ اگر میں مختار ہوتی تو ہر دم تیری عبادت میں لگی رہتی لیکن تونے مجھے اپنی مخلوق کا ماتحت کیا ہے۔ اسی سبب تیری خدمت میں آنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔" مالک نے دیکھا کہ سارا حجرہ بقعہ نور بنا ہوا ہے اور ایک قندیل نور بغیر کسی ڈور وز نجیر کے ہوا میں معلق ہے۔ مالک نے یہ کیفیت دیکھی تو رابعہ کے مقام ولایت کا اسے اندازہ ہوا۔ صبح ہوتے ہی اس نے رابعہ کو آزاد کیا اور درخواست کی کہ اگر آپ یہاں رہیں گی تو ہم سب آپ کی خدمت کریں گے اور اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو آپ مختار ہیں۔ رابعہ اجازت لے کر باہر آئیں اور مٹی کی ایک جھونپڑی کو عبادت خانہ بنا کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئیں۔

رابعہ نے عجز و نیاز کے ساتھ بصرہ سے مکہ معظمہ تک کا راستہ طے کیا اور اسی عجز و نیاز سے حج ادا کیا، پھر زار و قطار رونے لگیں اور کہنے لگیں۔ 'الٰہی! تونے حج پر بھی وعدہ اجر فرمایا ہے اور مصیبت پر بھی۔ اب اگر میرا حج مقبول نہیں تو یہ بڑی مصیبت ہے پس میری مصیبت کا اجر کہاں؟"

رابعہ نے دوسرا حج ادا فرمایا تو رب البیت کے دیدار کی آرزو کی، جب پتہ چلا کہ اس کی برداشت نہیں تو رتبہ فقر کی خواہش کی۔ جب پتہ چلا کہ وہ بھی ناقابل برداشت ہے تو بے قرار ہو کر کہہ اٹھیں۔ "الٰہی! تو مجھے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا تو کم از کم بصرہ میں رہنے کی اجازت دے دے، بے شک میں تیرے گھر میں رہنے کے قابل نہیں کیوں کہ تیرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی میں نے تیرے دیدار کی آرزو کی جسارت کی، اس لیے سزاوار اس محرومی کی ہوں۔"

حسن بصری نے ایک بار رابعہ سے کہا کہ کسی سے نکاح کر لو۔ رابعہ نے فرمایا "عقد نکاح اس شخص کے لیے مناسب ہے جو جسم و ہستی رکھتا ہو، یہاں تو نہ اپنا جسم ہے نہ اپنی ہستی، میں تو رب کائنات کی مملوکہ ہوں، نکاح کی بابت بات کرنی ہو تو مالک سے کی جائے۔"

اسی طرح چند لوگوں نے آپ سے نکاح کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تین چیزوں کی فکر ہے، اگر تم مجھے ان چیزوں سے بے فکر کر دو تو میں نکاح کر لوں۔ پہلے یہ کہ بتاؤ میری موت ایمان پر ہوگی یا نہیں؟ لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ فرمایا: دوسرے یہ کہ میرا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا یا نہیں؟ لوگوں نے پھر کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ فرمایا: تیسرے یہ کہ ایک جماعت داہنی طرف سے بہشت لے جائی جائے گی اور دوسری بائیں طرف سے جہنم میں بھیجی جائے گی۔ میں کس جماعت کے ساتھ چلوں گی؟ لوگوں نے سہ بارہ کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ رابعہ نے فرمایا کہ جب مجھ کو یہ فکر و رنج و الم درپیش ہیں تو بتاؤ کس طرح خاوند کی آرزو کروں؟

رابعہ بصریہ اکثر روتی رہتیں، لوگوں نے پوچھا کہ آپ آخر اس قدر روتی کیوں ہیں؟ فرمایا کہ میں اس کی جدائی سے ڈرتی ہوں، اس لیے کہ اس کی خوگر ہو گئی ہوں، ڈرتی ہوں کہ کہیں موت کے وقت ندا نہ آئے کہ تو ہماری بارگاہ کے لائق نہیں۔

لوگوں نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ گنہگار جب توبہ کرتا ہے تو توبہ قبول بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ فرمایا کہ جب تک حق تعالیٰ گنہگار کو توبہ کی توفیق نہ دے گنہگار توبہ نہیں کر سکتا۔ جب توبہ کی توفیق ملی تو حق تعالیٰ قبول بھی فرمائے گا۔ ایک اور مرتبہ فرمایا کہ جو توبہ خود بینی کے

ساتھ ہو وہ خود توبہ کی محتاج ہے، اور فرمایا کہ محض زبان سے استغفار کرنا جھوٹوں کا کام ہے۔

ایک بار جب فصل بہار شباب پر تھی رابعہ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ آپ کی خادمہ نے عرض کیا۔ "سیدہ! باہر تشریف لائیے تاکہ حق تعالیٰ کی صنعت کے آثار دیکھیں۔" رابعہ نے فرمایا۔ "ذرا تو یہاں اندر آجا کہ خود صانع ہی کا مشاہدہ کرلے۔" پھر فرمایا۔ "میرا شغل صانع کا مشاہدہ ہے نہ کہ صنعت کا مطالعہ۔"

ایک مرتبہ چند بزرگ رابعہ کی خدمت میں آئے۔ رابعہؒ نے کہا کہ تم میں سے ہر شخص بتائے کہ وہ حق تعالیٰ کی عبادت کس غرض سے کرتا ہے۔ ایک نے کہا کہ جہنم کے سات طبقے ہیں اور سب خوف و دہشت سے پُر، سب کو ان پر سے گزرنا ہے اس لیے خوف و دہشت سے حق تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ بہشت کے آٹھ درجے ہیں اور بہشت کے مکینوں کو طرح طرح کی نعمتوں اور آسائشوں کا وعدہ کیا گیا ہے، چنانچہ بہشت کی امید میں حق تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں۔ رابعہ یہ سن کر جلال میں آگئیں اور کہنے لگیں کہ وہ بڑا برا بندہ ہے جو کسی چیز کے ڈر کے سبب یا مزدوری کی امید پر حق تعالیٰ کی عبادت کرے۔ ان بزرگوں نے پوچھا کہ آپ کی عبادت کا مقصد کیا ہے؟ فرمایا۔ "پہلے مکین، پھر مکان۔ عبادت ہمارے لیے فرض عین ہے۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر جہنم و بہشت نہ ہوتے تو کیا ہم اس کی عبادت نہ کرتے؟ کیا حق تعالیٰ کا یہ حق نہیں کہ اس کی عبادت بلا غرض کی جائے؟"

ایک روز لوگوں نے دیکھا کہ رابعہ ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی بھرا برتن لیے راستہ میں تیزی سے چلی جارہی ہیں، پوچھا کہ سیدہ! یہ مشعل اور یہ پانی کس غرض سے اٹھا رکھے ہیں؟ اور کہاں جارہی ہیں؟ فرمایا کہ مشعل جنت کو جلانے اور پانی جہنم کو بجھانے کی غرض سے ساتھ لیے جارہی ہوں۔ جس کسی سے پوچھتی ہوں کہ عبادت و اطاعت کا محرک کیا ہے؟ تو کوئی بتاتا ہے جنت کی نعمتوں کی آرزو، اور کوئی بتاتا ہے جہنم کی آگ کا خوف، چاہتی ہوں کہ جنت کو جلا ڈالوں اور جہنم کو بجھا ڈالوں کہ خلق محض حق تعالیٰ کی محبت کی غرض سے اس کی عبادت و اطاعت کرے۔

حضرت مالک بن دینار ایک بار رابعہ کی قیام گاہ گئے، دیکھا کہ ایک ٹوٹی بدھنی رکھی ہے جس سے رابعہ وضو کرتی ہیں اور اسی سے پانی پیتی ہیں، ایک پرانا بوریہ پڑا ہے جس پر کچھ آرام کرلیتی ہیں، اور ایک اینٹ رکھی ہے جسے تکیہ کے طور پر سر کے نیچے رکھتی ہیں۔ مالک کو بڑا رنج ہوا، انہوں نے ادب سے رابعہ سے عرض کیا کہ میری چند دولت مندوں سے دوستی ہے اگر آپ اجازت دیں تو ان سے آپ کے واسطے کچھ مانگ لوں۔ رابعہ نے فرمایا کہ مالک! آپ نے بڑی غلطی کی، کیا میرا اور ان کا روزی دینے والا ایک ہی نہیں ہے؟ مالک نے کہا کہ کیوں نہیں! بے شک وہی سب کا رزاق ہے۔ فرمانے لگیں "تو پھر کیا وہ درویشوں کی روزی ان کی درویشی کے سبب بھول گیا اور دولت مندوں کی روزی ان کی دولت مندی کے سبب یاد رکھی؟" مالک نے کہا کہ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ رابعہ نے فرمایا۔ "تو جب وہ ہر ایک کا حال جانتا ہے کیا ضرورت ہے کہ ہم اس کو یاد دلائیں۔ اس کو جس حال میں رکھنا پسند ہے ہم بھی وہی پسند کرتے ہیں۔"

لوگوں نے رابعہ سے پوچھا کہ کیا آپ شیطان سے دشمنی رکھتی ہیں؟ فرمایا کہ رحمن کی دوستی سے مجھے فرصت کہاں کہ شیطان کی دشمنی میں مشغول ہوں؟

اپنی ایک مناجات میں رابعہ کہتی ہیں۔ ”الٰہی! جو کچھ تونے دنیا سے ہمارا حصہ مقدر کیا ہے، وہ اپنے دشمنوں کو دے دے، اور جو کچھ آخرت میں ہمارا حصہ مقرر کیا ہے، وہ اپنے دوستوں کو دے دے ہمارے لیے تو بس تو ہی کافی ہے۔“

ایک اور مناجات میں کہتی ہیں۔ ”الٰہی! اگر میں جہنم کے خوف سے تیری عبادت کروں تو مجھ کو جہنم میں ڈال دے، اور اگر جنت کی آرزو میں تیری عبادت کروں، تو جنت کو مجھ پر حرام کر دے۔ اور اگر خاص تیرے لیے ہی تیری عبادت کروں تو اپنے جمال بے نہایت سے مجھے بے نصیب نہ کر۔“

ایک اور مناجات میں کہتی ہیں۔ ”الٰہی! میرا کام اور میری آرزو دنیا میں فقط تیری یاد اور آخرت میں فقط تیرا دیدار۔ میری آرزو و خواہش تو یہی ہے۔ باقی تو مالک ہے جو چاہے سو کر۔“

ایک رات کہنے لگیں۔ ”اے پروردگار! یا تو میرا دل حاضر کر یا میری بے دلی کی نماز قبول فرما۔“

جب وقت وفات آیا تو اطراف میں بیٹھے بزرگوں سے فرمایا کہ تم سب اٹھ جاؤ اور اللہ کے سفیروں کے لیے جگہ خالی کر دو، لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، باہر آئے اور دروازہ بند کر دیا ایک آواز سنی۔

پھر دیر تک کچھ آواز نہ آئی، دروازہ کھولا، اندر گئے، تو دیکھا رابعہ آخرت کی جانب سفر کر گئیں۔

11.4 حضرت حارث المحاسبی (متوفی 243ھ)

ابو عبداللہ حارث بن اسد المحاسبی سنہ 165 ھجری کے آس پاس بصرہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں آپ نے تعلیم و تربیت پائی۔ امام شافعی کے تفقہ سے متاثر ہو کر شافعی مذہب فقہ سے منسلک ہو گئے، پھر بغداد منتقل ہوئے جہاں ظاہری و باطنی علوم کے اصول و فروع میں درجہ کمال حاصل کیا۔ والد کے قدری ہونے کے باعث، ان کی میراث (بشکل درہم، زمین و جائیداد) بیت المال میں جمع کرا دی۔ خود ایک حبہ نہ لیا۔ بغداد میں اس وقت معتزلہ کا طوطی بول رہا تھا۔ کلامی مسائل پر مباحثے ہو رہے تھے۔ حارث محاسبی نے کچھ وقت معتزلہ کے ساتھ گزارا۔ ان سے زبان و بیان کی فصاحت اور دلائل کی زینت سیکھی جس کے نتیجہ میں سری سقطی، امام ابو زرعہ رازی اور امام احمد بن محمد بن حنبل کی ناراضگی اور موخر الذکر کے جوشیلے متبعین کی انتہا پسندی کا شکار ہونا پڑا، اپنے علم و فضل کے باوجود گوشہ نشین ہونے پر مجبور ہو گئے، حتیٰ کہ وفات کے وقت صرف چار لوگ موجود تھے۔ انہی نے تجہیز و تکفین کی، نماز جنازہ پڑھی اور تدفین کا خاموشی سے انتظام کیا۔ انتقال سے کوئی ایک ساعت قبل جعفر کلبی سے فرمایا۔ ”اگر میں نے اپنا مقصود پا لیا تو میرے چہرہ پر تبسم دیکھو گے، اور اگر نہ پایا تو نایافت میرے چہرے ہی سے ظاہر ہو جائے گی۔“ ایک ساعت بعد حارث محاسبی کے چہرہ پر مسکراہٹ کھل اٹھی اور آپ جاں بحق ہو گئے۔

خود احتسابی عادت ثانیہ بن گئی تھی، غالباً اسی وجہ سے لفظ ”محاسبی“ آپ کے نام کا جزو بن گیا۔

حارث محاسبی کے اساتذہ میں امام شافعی کے علاوہ یزید بن ہارون، ھشیم بن بشیر، مروان بن شجاع، وکیع بن الجراح، ابو بکر بن ابی شیبہ، ابو نعیم، فضل بن دکین جیسے اساطین علم حدیث اور ابو عبید قاسم بن سلام جیسے ماہرین قرآن و لغت کے نام ملتے ہیں۔

ابو عبد اللہ ابن خفیف نے فرمایا:" شیوخ میں سے پانچ کی اقتدا کرو کیوں کہ انہوں نے علم و حقائق کو جمع کر لیا ہے۔ باقی کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ حارث بن اسد محاسبی، جنید، ابو احمد رویم، ابن عطا اور عمرو بن عثمان المکی۔ قشیری نے آپ کی بابت فرمایا کہ حارث اپنے زمانے میں علم وورع و حسن معاملہ وحال میں عدیم النظیر تھے۔ تمیمی نے کہا کہ وہ فقہ، تصوف، حدیث و کلام میں مسلمانوں کے امام اور حسن معاملات میں خیر امت تھے۔ سب سے پہلے آپ ہی نے عیوب نفس اور آفات عمل کے دقائق پر کلام کیا۔ خطیب بغدادی نے لکھا کہ زہد و معرفت اور علم ظاہر و باطن آپ میں جمع ہو گئے تھے۔ سبکی نے لکھا کہ آپ عارفین کے سردار اور سالکین کے استاد تھے جن میں ظاہری و باطنی علوم جمع تھے۔ ابو نعیم نے کہا کہ آپ کو علم الاصول میں پختگی حاصل تھی۔ ابن العماد حنبلی نے فرمایا کہ آپ زاہد اور حکیم ناطق تھے، فرید الدین عطار نے آپ کو معاملات و اشارات میں مرجع اولیاء قرار دیا۔

حارث محاسبی نے کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن میں الرعایہ لحقوق اللہ، الوصایا، المسائل فی اعمال القلوب و الجوارح، المکاسب، ماھیتہ العقل، آداب النفوس، المعرفتہ، القصد والرجوع الی اللہ، رسالتہ المسترشدین، الرضا، اخلاق الحکیم، بدء من اناب الی اللہ، النوم، البعث والنشور، محاسبتہ النفوس، العظمتہ، احکام التوبہ، التنبیہ، الزھد، الرزق الحلال، فھم الصلوۃ، کتاب العلم، الحب للہ، الصبر والرضا، الدماء، التفکر والاعتبار، فھم القرآن، الغیبتہ، الخلوۃ والتنقل فی العبادہ اور درجات العابدین معروف ہیں اور ان میں سے بعض طبع بھی ہو چکی ہیں۔

ان کا طریقۂ تصنیف بڑا دلچسپ تھا، جنید فرماتے ہیں کہ حارث میرے گھر آتے اور مجھ کو اپنے ساتھ لے کر آبادی سے باہر کسی ایسے پر فضا مقام پر لے چلتے جہاں کسی قسم کی خلل اندازی نہ ہو، میں احتجاج کرتا کہ مجھے گھر ہی پر رہنے دیں جسے وہ مسکرا کر نظر انداز کر دیتے، پھر مجھ سے مختلف موضوعات پر گفتگو شروع کرتے، میرے سوالات و اشکالات کے جواب دیتے، ان کو ذہن نشین کر لیتے اور جب مطمئن ہو جاتے تو میرے ساتھ شہر لوٹ آتے، مجھے گھر پر چھوڑتے اپنے مکان چلے جاتے جہاں ساری گفتگو کو منطقی و استدلالی طریقہ پر ضروری اضافوں کے ساتھ رسالہ کی شکل میں مرتب کر لیتے۔ جنید بغدادی جیسا شاگرد اور حارث محاسبی جیسا استاد ہو تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گفتگو کتنی دقیق اور کتنی جامع رہتی ہو گی۔ مطبوع کتابیں اس پر زندہ شاہد ہیں۔

"**کتاب الوصایہ**" دراصل حارث محاسبی کی آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ کیسے امت مسلمہ میں سر اٹھاتی فرقہ بندی نے ان پر منفی اثر ڈالا۔ ہر فرقہ حق پرستی کا دعویدار اور نجات اخروی کا اجارہ دار بنا ہوا تھا، حارث محاسبی نے ان سب سے ملاقاتیں کیں، جو علم حق اور اس کی اتباع کے مدعی تھے، لیکن حارث مطمئن نہ ہو سکے۔ ان میں اکثریت کا میلان دنیا کی طرف دکھائی دیا۔ اپنی رہنمائی کے لیے حارث نے علم کو آزمایا، غور و فکر کیا اور کتاب اللہ، سنت نبوی اور اجماع مومنین نے حارث پر یہ حقیقت روشن کر دی کہ اتباع نفس انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور وہ سیدھا راستہ کھو بیٹھتا اور حق سے دور بھٹک جاتا ہے۔ چنانچہ حارث خود احتسابی کی طرف متوجہ ہوئے اور خود آموزی کے ذریعہ ایک اخلاقی انقلاب سے گزرے، انہوں نے اہل تقویٰ، اہل ورع اور اہل آخرت کی صحبت اختیار کی اور دیکھا کہ ان کی ہدایات ائمہ ہدیٰ کے نصائح سے ہم آہنگ ہیں، ان میں اس بات پر اتفاق ہے کہ جب بھی مشورہ دیں امانت سمجھ کر بھلائی کا مشورہ دیں، نہ گناہ

کے ارتکاب پر جسارت دلائیں نہ اللہ کی رحمت سے مایوسی، مصائب میں صبر، قضاءالہیٰ پر رضا اور اللہ کی نعمتوں پر شکر، کی تلقین کریں۔ وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کیسے اللہ کے بندوں کو اللہ کی محبت اور اس کی نعمتوں اور احسانات کی یاد دلائیں، طلب مغفرت کی جانب متوجہ کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی معرفت، اس کی کتاب اور شریعت کا علم، ایمان کی حقیقت کی خبر رکھتے اور پسندیدہ و ناپسندیدہ باتوں کو اچھی طرح جانتے ہیں، گمراہی اور خواہشات نفسانی کے بارے میں باریک بیں، حیات بعد الممات، حشر و نشر، اللہ کی رحمت کی وسعت اور اس کی گرفت کی قوت سے بخوبی آگاہ ہیں، ان کی صحبت سے ثمر آور ہو کر حارث نے مزید کسی شہادت کی حاجت نہیں محسوس کی اور ان کے طریقہ حیات کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح حارث نے تصوف کا رخ کیا اور اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا۔

حارث محاسبی اپنے مریدوں پر کڑی نظر رکھتے اور ایسی عبارات اور معاملات میں سختی سے اصلاح کرتے جن میں کسی قسم کا ابہام یا خطا ہو یا کسی فرقہ باطلہ سے تشابہ ہو اگرچہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔

11.4.1 حارث محاسبی کی تعلیمات

ایک دن ابو حمزہ بغدادی حارث محاسبی کے پاس آئے۔ وہ حارث کے مرید اور صاحب حال بزرگ تھے۔ حارث کے پاس ایک سیمرغ تھا۔ ابو حمزہ بغدادی کی موجودگی میں اس نے اچانک بانگ دینی شروع کر دی، ابو حمزہ پر حال طاری ہوا اور انہوں نے زور سے ایک نعرہ لگایا۔ حارث محاسبی نعرہ سنتے ہی غضب ناک ہو کر ایک خنجر لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ابو حمزہ کو قتل کرنے کے ارادے سے آگے بڑھے۔ دوسرے مریدوں نے بمشکل تمام انہیں روکا، حارث نے ڈانٹ کر ابو حمزہ سے کہا۔ "اے مردود! اسلام میں از سر نو داخل ہو جا۔" دوسرے مریدوں نے کہا کہ ہم آپ سب ابو حمزہ کو پختہ موحد جانتے ہیں پھر آپ کے اس قول و فعل اور سخت رویہ کا سبب کیا ہے؟ حارث محاسبی نے فرمایا کہ میں ابو حمزہ کے ایمان میں شک نہیں کرتا میں جانتا ہوں کہ وہ مشاہدہ حق اور توحید میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک بے عقل پرندہ اگر بانگ دیتا ہے تو اس بانگ کو حق تعالیٰ کی آواز سمجھنے کا تاثر دینا حلول و نزول میں یقین رکھنے والوں کا شیوہ ہے۔ اللہ سبحانہ ان تمام باتوں سے پاک و بالاتر ہے۔ ابو حمزہ نے حارث محاسبی کی دقت نظری دیکھی تو اپنے فعل سے توبہ کی اور رجوع کر لیا، اگرچہ ان کے نعرہ مارنے کی وجہ گمراہ حلولیوں سے بالکل جداگانہ تھی جس میں سوز و گداز اپنا کام کر رہا تھا نہ کہ نظریہ حلول و نزول۔

حارث محاسبی نے فرمایا کہ اہل محاسبہ میں چند خصائل ہیں، حق تعالیٰ کی توفیق سے وہ ان پر قائم اور بلند مرتبوں کو پہنچے ہیں۔ نفس و خواہشات نفس کو مغلوب کرنے اور قوت ارادی مضبوط کرنے سے یہ خصائل حاصل ہوتے ہیں۔ قوت ارادی جتنی مضبوط ہو گی خواہشات نفسانی کی مخالفت اتنی ہی آسان ہو گی۔ حارث محاسبی نے فرمایا:

(1) کبھی حق تعالیٰ کی قسم نہ کھائے، نہ سچ پر نہ جھوٹ پر، نہ قصداً نہ بلا قصد

(2) جھوٹ سے پرہیز کرے

(3) حتی الامکان وعدہ نہ کرے اور اگر کر لیا تو قول و قرار پورا کرے

(4) کسی پر لعنت نہ کرے اگرچہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو

(5) کسی کے حق میں دعائے بد نہ کرے اور نہ گفتار و کردار سے بدلہ کا خواہاں ہو بلکہ اللہ کے لیے صبر کرے

(6) کسی کے کفر، شرک یا نفاق کی شہادت نہ دے

(7) ظاہراً و باطناً کسی طرح کسی گناہ کا قصد نہ کرے، اپنے اعضاء کو (بشمول قلب) تمام گناہوں سے پاک رکھے

(8) کسی پر اپنا یا اپنے رنج کا بار (بوجھ) نہ ڈالے بلکہ دوسروں کا بار اتارنے یا دفع کرنے کی کوشش کرے

(9) لوگوں سے کوئی امید نہ رکھے اور طمع (لالچ) بالکلیہ منقطع کر دے

(10) دنیا میں بلند مرتبے کی خواہش نہ کرے اور ساری اولاد آدم کو اپنے سے بہتر جانے۔

فرمایا: رضا یہ ہے کہ احکام الٰہی کی بجا آوری میں صبر و سکون ہو۔

فرمایا: صبر یہ ہے کہ تیر بلا کا نشانہ بنے اور اف نہ کرے۔

فرمایا: تسلیم یہ ہے کہ بلا کے نزول کے وقت ظاہر و باطن میں تغیر کو راہ نہ دے۔

فرمایا: فتوت (جوانمردی) یہ ہے کہ تو انصاف کرے مگر انصاف طلب نہ کرے۔

فرمایا: تین چیزیں (دنیا سے غالباً) مفقود ہو چکیں: (1) حسن جس کے ساتھ کمال خلق پایا جاتا ہو (2) صدق جس کے ساتھ امانت پائی جاتی ہو اور (3) اخوت جس کے ساتھ وفاداری بھی ہو۔

فرمایا: محبت یہ ہے کہ تو ہمہ تن کسی کی جانب مائل ہو جائے، پھر اپنا نفس، روح اور مال سب اس پر قربان کر دے، پھر ظاہر و باطن میں (کاملاً) اس کی موافقت کرے لیکن اپنی جگہ یہ احساس رہے کہ تو نے محبت میں کوتاہی کی ہے۔

فرمایا: جس نے اپنے باطن کو خوف الٰہی اور اخلاص کے ساتھ درست کیا، اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو مجاہدہ اور اتباع سنت سے زینت بخشتا ہے۔

فرمایا: اس امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جنہیں ان کی آخرت ان کی دنیا سے، اور ان کی دنیا ان کی آخرت سے مشغول نہ کرلے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ کیا متوکل کو طبعاً طمع لاحق ہو سکتی ہے؟ فرمایا کہ طبیعت کے تقاضے کے مطابق کچھ خطرے کچھ وساوس اسے لاحق ہو سکتے ہیں مگر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاتے (بشرطیکہ وہ ثابت قدم رہے)

فرمایا: بندہ کے لیے پہلی مصیبت دل کو آخرت کی فکر سے منقطع کر دینا ہے جس سے دل میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔

11.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اسلام کے دور اول کی صوفی روایت میں ایسی برگزیدہ ہستیاں رہی ہیں، جو اپنے زمانہ میں تو بلند مرتبہ تھی ہی انہوں نے بعد کی صوفی

روایت پر بھی اپنے لازوال اثرات چھوڑے۔ جن ہستیوں نے صوفی روایت پر اپنے لازوال اثرات چھوڑے ان میں حسن بصری، رابعہ بصریہ اور ذوالنون مصری بہت معروف ہیں۔

- حضرت حسن بصری ابو سعید حسن بن یسار حضرت عمرؓ کی خلافت کے دور میں سنہ 21 ہجری میں پیدا ہوئے، آپ کے والدین آزاد کردہ غلام تھے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے سایہ شفقت میں آپ پروان چڑھے۔ امہات المومنین کے گھروں میں بچپن میں برابر آتے جاتے رہتے تھے۔
- حضرت حسن پر ہمیشہ حزن و غم چھائے رہتے، قلبی سوز و گداز نے لبوں کو ہنسی سے اور قلب کو خوشی سے ناآشنا کر دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ مومن کی ہنسی قلب کی غفلت کا نتیجہ ہے، زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے۔ قرآن عظیم کی جب تلاوت کرتے تو شدت تاثر سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔
- حضرت رابعہ بنت اسمٰعیل العدویہ القیسیہ البصریہ ایک تنگ حال گھرانہ میں بصرہ میں پیدا ہوئیں۔ اپنی بہنوں میں چوتھی ہونے کے باعث ان کا نام رابعہ رکھا گیا۔ حضرت رابعہ بصریہ تابعیہ تھیں۔
- حضرت رابعہ بصریہ کا ماننا تھا کہ اللہ کی عبادت جنت کے شوق اور جہنم کے خوف سے نہ کی ائے اور محض اللہ کی محبت میں کی جائے۔ اس سلسلے میں آپ کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک روز لوگوں نے دیکھا کہ رابعہ ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی بھرا برتن لیے راستہ میں تیزی سے چلی جارہی ہیں، پوچھا کہ سیدہ! یہ مشعل اور یہ پانی کس غرض سے اٹھا رکھے ہیں؟ اور کہاں جارہی ہیں؟ فرمایا کہ مشعل جنت کو جلانے اور پانی جہنم کو بجھانے کی غرض سے ساتھ لیے جارہی ہوں۔ جس کسی سے پوچھتی ہوں کہ عبادت واطاعت کا محرک کیا ہے؟ تو کوئی بتاتا ہے جنت کی نعمتوں کی آرزو، اور کوئی بتاتا ہے جہنم کی آگ کا خوف، چاہتی ہوں کہ جنت کو جلاڈالوں اور جہنم کو بجھاڈالوں کہ خلق محض حق تعالیٰ کی محبت کی غرض سے اس کی عبادت واطاعت کرے۔
- ابو عبد اللہ حارث بن اسد المحاسبی سنہ 165ھ کے آس پاس بصرہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں آپ نے تعلیم و تربیت پائی۔ امام شافعی کے تفقہ سے متاثر ہو کر شافعی مذہب فقہ سے منسلک ہو گئے، پھر بغداد منتقل ہوئے جہاں ظاہری و باطنی علوم کے اصول و فروع میں درجہ کمال حاصل کیا۔ خود احتسابی عادت ثانیہ بن گئی تھی، غالباً اسی وجہ سے لفظ "محاسبی" آپ کے نام کا جزو بن گیا۔
- حارث محاسبی نے کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن میں الرعایہ لحقوق اللہ، الوصایا، المسائل فی اعمال القلوب و الجوارح اور درجات العابدین معروف ہیں اور ان کی کتابیں طبع بھی ہو چکی ہیں۔ ان کا طریقۂ تصنیف بڑا دلچسپ تھا، آپ اپنے شاگرد جنید بغدادی کو اپنے ساتھ لے کر آبادی سے باہر کسی ایسے پر فضا مقام پر لے چلتے جہاں کسی قسم کی خلل اندازی نہ ہو، پھر مختلف موضوعات پر گفتگو شروع کرتے، اور ان کے سوالات و اشکالات کے جواب دیتے، ان کو ذہن نشین کر لیتے اور جب مطمئن ہو جاتے تو شہر لوٹ آتے، اور انہیں گھر پر چھوڑتے اپنے مکان جاکر ساری گفتگو کو منطقی و استدلالی طریقہ پر ضروری اضافوں کے ساتھ رسالہ کی شکل میں مرتب کر لیتے۔

- حارث محاسبی اپنے مریدوں پر کڑی نظر رکھتے اور ایسی عبارات اور معاملات میں سختی سے اصلاح کرتے جن میں کسی قسم کا ابہام یا خطا ہو یا کسی فرقہ باطلہ سے تشابہ ہو اگرچہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔
- حارث محاسبی فرماتے ہیں: تین چیزیں (دنیا سے غالباً) مفقود ہو چکیں: (1) حسن جس کے ساتھ کمال خلق پایا جاتا ہو (2) صدق جس کے ساتھ امانت پائی جاتی ہو اور (3) اخوت جس کے ساتھ وفاداری بھی ہو۔

11.6 نمونہ امتحانی سوالات

11.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ابو سعید حسن بن یسار حضرت عمرؓ کی خلافت کے دور میں سنہ............................میں پیدا ہوئے"۔

(a).10ہجری (b).21ہجری (c).35ہجری (d).40ہجری

2. حضرت حسن بصری............................تھے۔

(a).صحابی (b).تابعی (c).تبع تابعی (d).کوئی نہیں

3. حضرت رابعہ بصریہؒ............................کی وفات ہوئی۔

(a).185ھ (b).100ھ (c).205ھ (d).605ھ

4. معتزلہ کے دور اقتدار میں............آپ کو بھی مظالم سہنا پڑے کیونکہ آپ نے قرآن مجید کو مخلوق ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

(a). حضرت حسن بصری (b).رابعہ بصری (c).ذوالنون مصری (d). جنید بغدادی

5. "....................نے فرمایا کہ آدمی پر خرابی چھ چیزوں سے آتی ہے۔

(a). حضرت حسن بصری (b).رابعہ بصری (c).ذوالنون مصری (d). جنید بغدادی

6. حارث محاسبی کے شاگرد............................ہیں۔

(a).ذوالنون مصری (b).امام شافعی (c).سری سقطی (d). جنید بغدادی

7. الرعایالحقوق اللہ کے مصنف............................ہیں۔

(a).حضرت حسن بصری (b).رابعہ بصری (c).حارث محاسبی (d). جنید بغدادی

8. حارث محاسبی کی پیدائش........................سن ہجری میں ہوئی۔

(a). سن295ہجری (b). سن243ہجری (c).سن165ہجری (d). سن125ہجری

9. کتاب الوصایہ دراصل.......................... کی آپ بیتی ہے۔

(a). حضرت حسن بصری (b). حارث محاسبی (c). ذوالنون مصری (d). جنید بغدادی

10. حارث محاسبی کے اساتذہ میں.................... شامل ہیں۔

(a). حضرت امام مالک (b). حضرت امام شافعی (c). حضرت سری سقطی (d). جنید بغدادی

11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. حضرت رابعہ بصریہؒ کے ملفوظات اور تعلیمات کا تذکرہ کیجیے۔
2. حضرت حسن بصری کی ابتدائی زندگی پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
3. حضرت حسن بصری کے بارے میں علما کی آراء تحریر کیجیے۔
4. حضرت حارث محاسبی کی تعلیمات کو اپنے الفاظ میں قلم بند کیجیے؟
5. ابتدائی دور کے صوفیا کرام کے دور کا اجمالی جائزہ پیش کیجیے۔

11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. حضرت حسن بصریؒ کی زندگی پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. حضرت رابعہ بصریہؒ کا تعارف کرایے۔
3. حضرت حارث محاسبی کے افکار اور احوال اور تصنیفات پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

11.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تابعین : از شاہ معین الدین احمد ندوی
2. تذکرہ الاولیاء : از فرید الدین عطار (اردو ترجمہ)
3. طبقات : از عبدالوہاب شعرانی (اردو ترجمہ)
4. رسالہ قشیریہ : از ابوالقاسم قشیری (اردو ترجمہ)
5. کشف المحجوب : از سید علی ہجویری (اردو ترجمہ)
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ
7. M. Smith: Early Mystics in Islam
8. Encylopedia of Islam (3rd Edition)

اکائی 12: ابتدائی دور کے صوفیاء کرام اور ان کی تعلیمات (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 حضرت ذوالنون مصری (متوفی 245ھ)

12.3 حضرت جنید بغدادی (متوفی 297ھ)

12.4 اکتسابی نتائج

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

اس اکائی میں دور اول کے دو اہم صوفیائے کرام کے احوال و کوائف اور تعلیمات کو بیان کریں گے۔ ان کے احوال کے ذکر سے اس دور کی صوفی روایت کے مختلف انداز و اطوار سامنے آجائیں گے جن میں اول صوفی بزرگ حضرت ذوالنون مصری ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں دین کی نسبت سے کافی مصائب برداشت کیے۔ اسی طرح اسلامی تصوف کی تاریخ میں حضرت جنید بغدادی کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ انکے افکار و خیالات و تعلیمات ہر دور کے صوفیہ اور سالکین کے لیے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ تصوف کے راہ کے دو اہم صوفیا حضرت ذوالنون مصری اور حضرت جنید بغدادی کے احوال سے واقف ہو سکیں جو اولیا میں نہایت اہم مقام رکھتے ہیں اور اہل معرفت اور مشائخ طریقت میں بڑے برگزیدہ شمار ہوتے ہیں نیز آپ اولیا میں

نہایت اہم مقام رکھتے ہیں اور اہل معرفت اور مشائخ طریقت میں آپ بڑے برگزیدہ شمار ہوتے ہیں۔ نیز آپ بھی ان کے احوال اور تعلیمات سے بھی استفادہ کر سکیں۔ آپ یہ بھی جانیں کہ دین پر استقامت کے لیے انہوں نے کتنے مصائب برداشت کیے اور کس طرح اپنی ریاضت سے عشق الٰہی کی منازل کو طے کیا۔

12.2 حضرت ذوالنون مصری (متوفی 245ھ)

ابوالفیض ثوبان بن ابراہیم ذوالنون مصری سنہ 180ھ میں اخمیم (بالائی مصر) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد افریقی تھے اور ذوالنون مصری ایک آزاد کردہ غلام۔ سعدان مصری کو آپ کا شیخ بتایا گیا ہے کیونکہ آپ کی باطنی تعلیم و تربیت میں ان کا خاصا دخل رہا ہے۔

ذوالنون مصری نے مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور دمشق کے سفر کیے۔ امام مالک بن انس کے تلامذہ سے آپ نے مؤطا پڑھی اور مالکی مذہب اختیار کیا۔

معتزلہ کے دور اقتدار میں آپ کو بھی مظالم سہنا پڑے کیونکہ آپ نے قرآن مجید کو مخلوق ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ متوکل علی اللہ کے اقتدار سنبھالنے کے بعد آپ کو بھی قید خانہ سے آزاد کیا گیا۔

مختلف اسباب کی بنا پر آپ کو فلسفی "زندیق" "کیمیا ساز اور تصوف کی تعلیمات سے عوام کو گمراہ کرنے والا قرار دیا گیا۔ چنانچہ زندگی کے آخری دور میں آپ کو دوبارہ گرفتار کیا گیا اور بغداد میں قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ متوکل علی اللہ نے آپ سے گفتگو کے بعد آپ کی آزادی کے احکام جاری کیے۔ آپ مصر لوٹ گئے اور سنہ 245 ہجری میں جیزہ کے مقام پر وفات پائی۔

ایک روز ایک نہر کے کنارے جس کے قریب ایک محل تھا ذوالنون مصری نے وضو کیا پھر نظر اٹھی تو محل کے بالاخانے میں کھڑی ایک حسینہ پر جا رکی ذوالنون نے اس سے گفتگو کرنی چاہی۔ اس نے کہا کہ اے ذوالنون جب میں نے آپ کو دور سے دیکھا تو خیال ہوا کہ شاید ایک دیوانے ہیں جب قریب آئے تو خیال ہوا کہ شاید ایک عالم ہیں اور جب اور زیادہ نزدیک آئے تو سمجھا کہ شاید عارف ہیں لیکن اس وقت جو میں غور کرتی ہوں تو دل یہ کہتا ہے کہ آپ نہ دیوانے ہیں نہ عالم اور نہ عارف۔ ذوالنون نے پوچھا کہ اس خیال کی بنیاد کیا ہے؟ تو اس حسینہ نے کہا کہ اگر دیوانے ہوتے تو وضو نہ کرتے عالم ہوتے تو نامحرم کی طرف نظر نہ جماتے اور اگر عارف ہوتے تو اپنی آنکھ اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی کے لیے نہ کھولتے۔ یہ کہہ کر وہ حسینہ غائب ہو گئی' ذوالنون سمجھ گئے وہ کوئی انسان نہ تھی بلکہ غیبی تنبیہ تھی۔ آپ کا دل بے قرار ہو گیا اس میں سوزش پیدا ہوئی اور آپ دریا کی طرف روانہ ہوئے۔ دیکھا کہ ایک کشتی میں مسافر سوار ہیں اور کشتی روانگی کے لیے تیار ہے۔ آپ بھی کشتی پر سوار ہو گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک تاجر نے دیکھا کہ اس کا ایک قیمتی موتی غائب ہے موتی کی تلاش شروع ہوئی ذوالنون کے حلیہ کی وجہ سے تمام مسافرین کی نظریں ذوالنون پر جا کر رک گئیں ان کا اس پر اتفاق ہوا کہ ہو نہ ہو اسی شخص نے وہ موتی چرایا ہے' چنانچہ آپ کو سخت سست کہنے لگے طعنے کسنے اور تذلیل کرنے لگے آپ نے خاموشی اختیار کی اور بجائے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے بے عزتی برداشت

کرتے رہے جب مسافروں کی بدتمیزی حد سے گزری تو آپ نے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر فریاد کی کہ خداوندا! تو حقیقت جانتا ہے۔ یہ کہنا ہی تھا کہ مسافروں نے دیکھا کہ دریا کی سطح سے بکثرت مچھلیاں اپنے اپنے مونہہ میں ایک ایک موتی لیے اوپر آئیں۔ ذوالنون نے ہاتھ بڑھایا ایک موتی لیا اور اس تاجر کے حوالے کر دیا کشتی میں سوار مسافر یہ دیکھ حیرت زدہ رہ گئے پھر ہوش آیا تو آپ سے اپنی زیادتیوں کی معافی چاہنے لگے۔ اس واقعہ کے بعد آپ کی شہرت ذوالنون (مچھلی والے) کے لقب سے ہو گئی۔

جس رات ذوالنون مصری کی وفات ہوئی اس رات تقریباً ستر (70) لوگوں نے رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ میں اللہ کے ولی ذوالنون مصری کے خیر مقدم کے لیے آیا ہوں۔

ذوالنون نے ملامت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ابراہیم القصار جنھوں نے ذوالنون کو بچپن میں دیکھا تھا فرماتے ہیں کہ میں ان کو دیکھ کر بڑا مایوس ہوا کیونکہ ایک عظیم صوفی شیخ کی حیثیت سے میرے دل میں ان کے بارے میں جو تصور تھا اسے ان کی ظاہری شکستہ حال متواضع شخصیت نے پاش پاش کر دیا مگر ذوالنون نے بذریعہ کشف یا کرامت میرے خیالات پڑھ لیے اور میری اصلاح فرمائی۔

یوسف بن حسین فرماتے ہیں کہ ایک دن وہ ذوالنون کی مجلس میں گئے۔ اس وقت ان کے پاس سالم مغربی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ذوالنون سے سوال کیا۔ ''ابو الفیض! تمہاری توبہ کا کیا سبب تھا؟'' ذوالنون نے فرمایا۔ ''یہ ایک عجیب واقعہ ہے جس کے سمجھنے کی آپ میں طاقت نہیں۔'' سالم نے کہا ''آپ کو آپ کے معبود کی قسم مجھے ضرور بتایئے۔'' ذوالنون نے کہا ''میں نے مصر سے نکل کر کسی بستی کا ارادہ کیا۔ راستہ میں جنگل پڑا میں سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک اندھی چنڈول (خوش آواز پرندہ) زمین پر اپنے گھونسلے سے گر پڑی پھر زمین پھٹ گئی اور اس میں سے کوزے نکلے ایک سونے کا تھا دوسرا چاندی کا۔ ایک میں تل تھے اور دوسرے میں پانی۔ چنڈول نے تل کھائے اور پانی پیا۔ یہ واقعہ دیکھ کر میں نے کہا کہ میرے لیے (اللہ کی قدرت کا) اتنا (نظارہ) کافی ہے۔ میں نے توبہ کر لی اور اللہ کے دروازے سے چمٹا رہا یہاں تک کہ اس نے مجھے قبول کر لیا۔''

ایک روز کسی مسجد میں ذوالنون کا خطاب ہو رہا تھا دوران خطاب آپ کی زبان سے نکلا کہ کوئی شخص اس کمزور سے زیادہ احمق نہ ہوگا جو ایک زبردست کے ساتھ لڑتا ہے۔ اس وقت ایک شہزادہ اپنے خدام کے ہمراہ مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا اس کے کان میں یہ جملہ پڑا وہ چونکا کر مسجد کے اندر آیا اور ذوالنون سے اس جملہ کے معنی پوچھے ذوالنون نے کہا کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے اور اپنے ضعف کو جانتے ہوئے اللہ عزیز کے ساتھ لڑتا ہے۔ شہزادہ کا چہرہ فق ہو گیا اور وہ وہاں سے چلا گیا دوسرے روز پھر آیا اور پوچھا کہ اللہ عزیز کی طرف کا راستہ کونسا ہے۔ ذوالنون نے کہا کہ دو راستے ہیں۔ ایک بہت چھوٹا اور دوسرا بہت بڑا چھوٹا راستہ ترک گناہ ترک دنیا اور ترک خواہشات نفسانی پر مشتمل ہے اور بڑا راستہ ترک ماسوی اللہ پر۔ شہزادے نے کہا کہ میں تو بزرگ راستے (الطریق الاکبر) کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہ کروں گا۔ اگلے روز وہ صوف کا لباس پہنے آیا اور ذوالنون کی صحبت میں عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گیا۔

ایک جوان آپ کی مجلس وعظ و دعوت میں شریک رہتا لیکن صوفیہ کرام پر برابر نقد و جرح کرتا۔ ایک دن ذوالنون نے اس کو اپنی انگوٹھی دی اور کہا کہ اسے نان بائی کے پاس لے جائے اور ایک دینار کے عوض اسے گروی رکھ دے حسب ہدایت وہ انگوٹھی لے کر نانبائی

کے پاس پہنچا۔ نانبائی نے ایک درہم سے زیادہ پر اسے گروی رکھنے سے انکار کر دیا۔ وہ انگوٹھی واپس لے آیا ذوالنون نے اس سے کہا کہ اب اسے کسی صراف کے پاس لے جائے۔ وہ جوان انگوٹھی لیے ایک صراف کے پاس آیا' صراف نے اس انگوٹھی کی قیمت ایک ہزار دینار لگائی وہ ذوالنون کے پاس لوٹ آیا ذوالنون نے فرمایا کہ تیرا علم صوفیہ کرام کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسا کہ نانبائی کا علم انگوٹھی کے بارے میں۔ ناقد جوان پر حقیقت روشن ہوئی' اس نے نقد و جرح سے توبہ کی اور صوفیہ کرام کی جانب اپنا رویہ بدل دیا۔

چونکہ ذوالنون نے راہ ملامت اختیار کی تھی وہ علماء سوء کو ان کی دنیا میں آلودگی پر توجہ دلاتے تھے اور آپ سے کرامتوں کا ظہور کثرت سے ہوتا تھا اس لیے مصریوں نے آپ کو ساحر و زندیق سمجھا۔ عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ کے پاس ذوالنون کے خلاف شکایتیں پہنچنے لگیں۔ پھر ایک بڑی تعداد نے متحد ہو کر ذوالنون کے مبینہ زندقہ کے خلاف نمائندگی کی۔ خلیفہ کے حکم پر آپ کو بیڑیاں ڈال کر مصر سے بغداد لایا گیا۔ جس وقت متوکل علی اللہ کے دربار میں پیش کرنے کے لیے آپ کو لے جایا جا رہا تھا ایک بڑھیا راہ میں ملی اور اس نے کہا کہ خلیفہ سے ہرگز نہ ڈرنا کیونکہ وہ بھی تمہاری طرح اللہ ہی کا ایک بندہ ہے اور جب تک اللہ نہ چاہے کوئی بندہ کچھ نہیں کر سکتا اور دیکھو اپنے نفس کے لیے نہ حجت بازی کرنا نہ اس کی پاکیزگی بیان کرنا۔ پھر راہ میں ایک سقہ ملا جس نے ذوالنون کو پاکیزہ پانی دیا ذوالنون نے اپنے اصحاب کو اشارہ کیا کہ وہ اس کو ایک دینار دے دیں۔ سقہ نے کہا کہ کسی قیدی سے کچھ لینا جوانمردی کے خلاف ہے۔ خلیفہ کے حکم پر ذوالنون کو قید خانے لے جایا گیا جہاں چالیس دن آپ بغیر کچھ کھائے پیے قید میں رہے۔ پھر خلیفہ کے حکم پر آپ کو قید خانے سے نکال کر دربار لے جایا گیا۔ کمزوری ونقاہت کے باعث آپ راہ میں گر پڑے پیشانی زخمی ہوگئی سپاہیوں نے اسی حال میں آپ کو متوکل علی اللہ کے سامنے پیش کیا۔ خلیفہ نے آپ پر لگائے گئے الزامات بالخصوص کفر و گمراہی کی بابت سوال کیا۔ آپ خاموش رہے۔ وزیر نے اس موقع پر الزامات کے درست ہونے پر زور دیا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟ ذوالنون نے کہا کہ امیر المومنین! اگر میں انکار کروں تو مسلمانوں کی تکذیب ہوگی اور اگر اقرار کروں تو اپنے نفس پر ایک جھوٹ کا اعتراف ہوگا۔ نہ میں مسلمانوں کی تکذیب کر کے انہیں شرمندہ کرنا چاہتا ہوں نہ کفر و زندقہ کا اعتراف کر کے اللہ کے علم کی تکذیب اور برائے خود کافر و زندیق بننا چاہتا ہوں آپ کی سمجھ میں جو آتا ہے آپ وہ کریں میں نہ اپنے نفس کا دفاع کروں گا نہ الزامات کے سچ ہونے کا اعتراف کروں گا نہ کسی سے اپنے نفس کے لیے بدلہ لوں گا۔ خلیفہ نے چند اور سوال کیے جن کے ذوالنون نے صفائی سے جواب دیے۔ متوکل متحیر سنتا رہا پھر خلیفہ نے کہا کہ جو کچھ ذوالنون سے منسوب کیا گیا ہے ذوالنون ان سے بری ہیں۔ بعد ازاں ذوالنون کو آزاد کر دیا گیا اور عزت و احترام سے مصر روانہ کیا گیا۔ مصر روانہ ہونے سے پیشتر ذوالنون ناصح بڑھیا کا پتہ معلوم کر کے اس کے پاس گئے اور کہا کہ اللہ آپ کو جزائے خیر دے آپ نے جو نصیحت کی میں نے اس کی تعمیل کی مگر یہ بتایے کہ اس نصیحت کی حکمت آپ نے کہاں سے حاصل کی۔ اس نے کہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کی گفتگو سے۔ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد ذوالنون فرمایا کرتے کہ جو خالص توحید اور خالص توکل حاصل کرنا چاہتا ہو اسے بغداد کی بوڑھی عورتوں کی خدمت کرنی چاہیے۔ ادھر متوکل علی اللہ کہا کرتا کہ اہل ورع کا ذکر ہو تو ذوالنون کا ضرور ذکر کیا کرو۔

ذوالنون نے فرمایا کہ آدمی پر خرابی چھ چیزوں سے آتی ہے:

1. آخرت کے عمل پر نیت کا کمزور ہونا۔

2. شیطان کی باتوں کو ماننے کی کوشش کرنا۔

3. موت کی نزدیکی کے باوجود لمبی زندگی کی امید کا غالب ہونا۔

4. اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا پر مخلوق کی رضا کو مقدم رکھنا۔

5. نفس کی پیروی میں سنت رسول اللہؐ کو ترک کرنا۔

6. اکابر کے فضائل و کمالات اختیار کرنے سے ہمت ہارنا اور ان کی لغزشوں کو اپنے لیے سند و دلیل ماننا جس کے باعث بزرگان دین پر الزام عائد ہوں۔

فرمایا کہ اگر تو چاہتا ہے کہ (اللہ کا) مصاحب کہلائے تو دوست (یعنی اللہ) کے ساتھ ایسا معاملہ کر جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریمؐ کے ساتھ کیا کہ دین و دنیا میں نبی کریمؐ کی ذرہ برابر مخالفت نہ کی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صدیق اکبر کو" صاحب"کا خطاب دیا۔

فرمایا کہ اللہ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ اخلاق افعال احکام اور سنتوں میں اس کے حبیب کی اتباع کرے۔

فرمایا کہ عبودیت اسے کہتے ہیں کہ تو دل و جان اور ہر طرح سے اللہ رب العزت کا مخلص بندہ ہو جائے جس طرح کہ اللہ رب العزت ہر طرح سے تیرا معبود ہے۔ مقام عبودیت کو پہنچنے والے شخص کی علامت یہ ہے کہ وہ خواہشات نفسانی کا مخالف اور لذات دنیوی کا تارک ہوتا ہے۔

ذوالنون نے توبہ کی نسبت فرمایا: عوام کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور خواص کی غفلت سے۔

فرمایا کہ توبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک توبہ انابت اور دوسرے توبہ استجابت توبہ انابت یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کی سزا کے خوف سے توبہ کرے۔ اور توبہ استجابت یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کی شرم سے توبہ کرے۔ یعنی بندہ کو اپنے اعمال و عبادات اللہ جل جلالہ کی بزرگی کے سامنے ہیچ نظر آئیں اور اس کو شرمندگی محسوس ہو۔

ایک شخص نے ذوالنون مصری سے درخواست کی کہ میرے لیے اللہ سے دعا کیجیے۔ آپ نے فرمایا۔" اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے علم غیب کی تائید توحید کی صداقت کے یقین کے ساتھ کی ہے تو تمہارے لیے بہت سی دعاؤں کی قبولیت مقدر ہو چکی ہے۔ ورنہ محض پکارنے سے کسی ڈوبتے ہوئے کو نہیں بچایا جا سکتا۔"

ذوالنون نے فرمایا: توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ زمین اپنی فراخی کے باوجود تمہارے لیے اس قدر تنگ معلوم ہو کہ تم بے قرار ہو جاؤ ،بلکہ تمہارا نفس بھی تمہارے لیے تنگ ہو جائے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"وضاقت عليهم أنفسهم و ظنوا أن لا ملجأ من الله إلا إليه ثم تاب عليهم ليتوبوا"(توبہ:118)

(اور ان پر ان کے نفس تنگ ہوگئے اور انہوں نے گمان کرلیا کہ اللہ کے سوا کہیں پناہ نہیں ہے پھر اللہ نے انہیں توبہ کی توفیق دی کہ وہ توبہ کرلیں)

میں نے کوئی چیز خلوت سے بڑھ کر اخلاص پر اکسانے (اور جمانے) والی نہیں دیکھی۔

فرمایا: متقی (پرہیز گار) وہ ہے جو نہ اپنے ظاہر کو خلاف شرع باتوں سے میلا کرے نہ اپنے باطن کو دل بہلاوے سے اور اللہ کے فیصلہ کے ساتھ موافقت پر قائم رہے۔

ذوالنون مصری سے پوچھا گیا کہ بندہ کے لیے خوف کی راہ کب آسان ہو جاتی ہے؟ فرمایا! جب بندہ اپنے آپ کو بمنزلہ بیمار سمجھے تو بیماری کی طوالت کے خوف سے ہر چیز سے پرہیز کرتا ہے۔ ایک اور موقع پر فرمایا۔ جب تک لوگوں (کے دلوں) سے (اللہ کا) خوف زائل نہیں ہوتا وہ صحیح راستہ پر یہ گامزن رہتے ہیں جوں ہی خوف زائل ہوتا ہے' بھٹک جاتے ہیں۔

ایک شخص نے توکل کی بابت پوچھا تو فرمایا: (ماسوی اللہ) تمام خداؤں کو اتار پھینکنا اور (ظاہری) اسباب و ذرائع (میں یقین) کو توڑ ڈالنا۔ سائل نے وضاحت کی درخواست کی تو فرمایا: نفس کو فرائض بندگی میں ڈال دینا اور اس کو اپنی بابت وہم ربوبیت سے نکال لینا۔

یقین کے متعلق فرمایا کہ اس کی تین علامتیں ہیں:

(1) لوگوں سے کم سے کم میل جول (2) ان کے عطیوں پر ان کی مدح کرنے سے گریز (3) ان کے کچھ نہ دینے پر ان کی مذمت سے پرہیز

اور فرمایا کہ یقین الیقین کی بھی تین علامتیں ہیں:

(1) ہر چیز میں اور ہر موقع پر اللہ ہی پر نظر رکھنا (2) ہر بات میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا (3) ہر حال میں اللہ ہی سے مدد طلب کرنا۔

ذوالنون نے فرمایا کہ تین چیزیں رضا کی علامت ہیں:

(1) قضاء الہیٰ سے پہلے بندہ کا اختیار کو ترک کر دینا

(2) قضاء الہٰی (کے نزول) کے بعد کسی بھی درجہ میں قضاء الہٰی پر تلخی و کڑواہٹ نہ محسوس کرنا

(3) عین مصیبت / آزمائش کے وقت محبت میں ہیجان پانا۔

توحید کے بارے میں ایک شخص نے ذوالنون مصری سے سوال کیا کہ توحید کیا ہے؟ تو فرمایا: توحید یہ ہے کہ تو جان لے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام اشیا میں جاری ہے مگر یہ قدرت ان اشیاء کے ساتھ نہیں ملتی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو بغیر تگ ودو کے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو پیدا کرنا ہر شئے کی علت ہے مگر اللہ کی صنعت کی کوئی علت نہیں ہے' خواہ بلند آسمان ہوں خواہ زیریں زمین۔ اللہ کے سوا کوئی بھی ان کا مدبر نہیں اور یہ کہ ہر وہ چیز جس کی صورت تمہارے وہم میں آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بالکل مختلف ہے۔

ذوالنون مصری سے کسی نے قرآنی فرمان "الرحمٰن علی العرش استوی" کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا ثبوت دیا ہے اور اپنے مکان کی نفی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ موجود ہے اور اشیاء اس کے حکم سے جیسا اس نے چاہا موجود ہیں۔

12.3 حضرت جنید بغدادی (متوفی 297ھ)

ابوالقاسم جنید بن محمد قواریری بغدادی کی پیدائش بعض محققین کے نزدیک نہاوند میں اور بعض کے نزدیک عراق میں ہوئی۔ آپ کے والد کانچ کا کاروبار کرتے تھے اسی لیے قواریری کہلائے جانے لگے۔ جنید بغدادی کے بچپن ہی میں آپ کے والد بغداد منتقل ہو گئے اور وہاں بھی وہی کاروبار جاری رکھا۔ جنید بغدادی کی تعلیم و تربیت ان کے خالو یا ماموں سری سقطی کی نگرانی میں ہوئی جنھوں نے باتوں باتوں میں جنید بغدادی کے دل پر حسن اخلاق کی اہمیت نقش کر دی۔ سات (7) برس کی عمر ہی سے جنید بغدادی کی زبان سے ایسے کلمات جاری ہونے لگے جن سے حکمت کی کرنیں پھوٹتیں۔ مثلاً ایک مرتبہ جنید بغدادی سے سری سقطی نے شکر کی بابت سوال کیا آپ نے جواب دیا: "اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے اس طرح فائدہ اٹھانا کہ کسی معصیت (گناہ) میں ان سے مدد نہ لی جائے۔" سری سقطی کو یہ جواب سن کر تعجب ہوا اور انہوں نے آپ سے پوچھا کہ یہ باتیں تمہیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟ جنید بغدادی نے عرض کیا۔ "جناب کی صحبت سے"۔

جنید بغدادی نے مسائل فقہ کے علم کے حصول کے لیے امام ابوثور کے حلقہ کا رخ کیا اور اتنی یکسوئی سے علم حاصل کیا کہ بیس سال کی عمر میں امام ابوثور کی موجودگی میں فتوے دینے لگے۔ جنید بغدادی کے ایک ساتھی ابو حفص حداد کہا کرتے کہ اگر عقل انسانی پیکر اختیار کرے تو وہ جنید ہی کا پیکر ہو گا یعنی جنید "مجسم عقل" تھے۔ سری سقطی کے علاوہ جنید بغدادی نے حارث محاسبی اور محمد بن علی قصاب کی صحبتوں سے بھی بڑا فیض اٹھایا ایک بار خود فرمایا کہ میں نے دو سو (200) مشائخ کی خدمت کی ہے جو عجیب صاحبان قدرت تھے۔

ایک مرتبہ سری سقطی سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا کوئی مرید اپنے پیر سے بلند تر مقام حاصل کر سکتا ہے؟ تو سری سقطی نے جواب دیا "کیوں نہیں؟ جنید بغدادی کو دیکھ لو! جنید بغدادی کا مقام مجھ سے بلند تر ہے۔" اس جواب کے پیچھے سری سقطی کی تواضع و انکساری بھی تھی اور جنید بغدادی میں پوشیدہ کمالات کی نشاندہی بھی۔ علی ہجویری نے نقل کیا ہے کہ جنید بغدادی باوجود لوگوں کے اصرار کے اپنے شیخ کی موجودگی میں مجلس وعظ میں خطاب سے عذر فرماتے۔ ایک رات جنید بغدادی نے خواب میں رسول اکرمؐ کو دیکھا کہ آپؐ نے جنید بغدادی کو لوگوں سے خطاب شروع کرنے کا حکم فرمایا۔ جب بیدار ہوئے تو وسوسہ آیا کہ میرا درجہ میرے شیخ کے درجہ کے برابر ہو گیا تبھی رسول اکرمؐ نے مجھے دعوت و تبلیغ کا حکم فرمایا۔ فجر کی نماز کے فوری بعد سری سقطی کا قاصد پہنچا کہ تم نے مریدین کی خواہش مشائخ بغداد کی سفارش بلکہ میرا پیغام بھی رد کر دیا' اب جب کہ نبی اکرمؐ نے حکم دے دیا ہے تو حکم بجالاؤ۔ جنید بغدادی کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے جانا کہ شیخ میرے ظاہری و باطنی حالات سے باخبر ہیں۔ میں شیخ سری سقطی کی مجلس میں پہنچا اور میں نے دریافت کیا کہ ان کو میرے خواب کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے خواب میں رب العزت کو دیکھا جس نے مجھ سے فرمایا کہ اس نے نبی اکرمؐ کو جنید بغدادی کے

پاس بھیجا ہے کہ وہ جنید بغدادی کو وعظ و تبلیغ کا حکم کریں۔

جنید بغدادی کے دل میں ایک بار ابلیس کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مسجد کے دروازہ کے باہر کھڑے تھے کہ کچھ فاصلہ پر بھیانک شکل کا ایک بوڑھا نظر آیا۔ بوڑھا قریب آیا تو جنید بغدادی اس سے پوچھ بیٹھے کہ تو کون ہے؟ تیری مہیب شکل سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ بوڑھے نے کہا کہ میں وہی ابلیس ہوں جسے دیکھنے کی تو نے تمنا کی تھی۔ جنید بغدادی نے اس سے پوچھا کہ حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے باز رکھا؟ ابلیس نے جواب میں پوچھا کہ بھلا میں غیر اللہ کو کیسے سجدہ کرلیتا؟ جنید بغدادی ہکا بکا رہ گئے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اتنے میں غیب سے ایک ندا سنی کہ اس سے کہو کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ اگر تو اللہ کا فرماں بردار بندہ ہوتا تو بغیر کسی تامل کے اس کا حکم بجالاتا انکار نہ کرتا اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے دوری اختیار کرتا یہ ندا ابلیس نے بھی سنی اور چیخ مار کہنے لگا۔ "واللہ تو نے مجھے جلا دیا۔" اور غائب ہو گیا۔

جنید بغدادی نے شہر بغداد میں رہتے ہوئے چالیس سال مجاہدہ کیا جس میں تیس (30) سال ایسے گذرے کہ عشا کی نماز کے بعد خلوت میں تقریباً صبح کاذب تک کھڑے کھڑے اللہ کا ذکر کرتے رہتے اور اسی وضو سے فجر کی نماز باجماعت ادا کرتے۔ ذکر اللہ کی مشغولی قیام کی تھکان کا احساس نہ ہونے دیتی۔ ایک بار فرمایا کہ ہم نے تصوف قیل و قال سے نہیں بلکہ فاقہ کشی بے خوابی ترک دنیا اور ترک مرغوب سے حاصل کیا ہے۔ یہاں فاقہ کشی سے روزہ اور بے خوابی سے نماز شب مراد ہیں۔ فرماتے کہ تصوف میں ایسا شخص چاہیے جو کتاب اللہ کو دائیں ہاتھ میں اور سنت مصطفوی ؐ کو بائیں ہاتھ میں تھام کر دو شمعوں کی روشنی میں راستہ طے کرتا رہے کہ شبہات کے گڑھوں اور بدعات کی تاریکیوں سے بچ سکے۔

فرماتے کہ اگر اس آسمان کے نیچے کوئی علم علم تصوف سے بڑھ کر ہوتا تو میں اس کی اور اس کے جاننے والوں کی طرف دوڑتا ہوا جاتا اور سیکھ لیتا اور اگر کوئی وقت صوفیہ کے اوقات (گذاری) سے بہتر ہوتا تو میں اس کو حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا۔ اور فرماتے کہ میں نے کوئی گروہ علماء کا ایسا نہیں دیکھا جو گروہ صوفیہ سے زیادہ فضیلت رکھتا ہو ورنہ میں ہرگز صوفی علماء کی صحبت اختیار نہ کرتا۔

فرماتے کہ یہ بڑی خست و کمینگی ہے کہ کوئی شخص دین کو حصول طعام کا ذریعہ بنالے۔

اپنے مریدین سے فرمایا کرتے کہ اگر میں جانتا کہ دو رکعت نفل کی ادائیگی میرے لیے تمہارے ساتھ بیٹھنے سے افضل ہے تو میں تمہارے پاس نہ بیٹھتا۔

جعفر خلدی کہتے ہیں کہ ایک شخص جنید علیہ الرحمہ کے پاس آیا اور ان سے کہا۔ "میں اپنی تمام ملکیت چھوڑ کر فقر اختیار کرنا اور فقراء کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔" جنید بغدادی نے جواب میں فرمایا "نہیں! تمام ملکیت مت چھوڑو بلکہ اس قدر باقی رکھو کہ تمہاری ضرورتیں پوری ہو سکیں اور طلب حلال کے لیے جدوجہد کرتے رہو اس طرح یہ خدشہ نہیں رہے گا کہ نفس اپنا حق مانگے (اور حق ادا نہ ہو) رسول اللہ ؐ کی یہ عادت تھی کہ جس کسی کام کا ارادہ کرلیتے تو اس پر ثابت قدم رہتے"۔

جنید بغدادی سے سوال کیا گیا کہ حکایات سے مریدین کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ آپ نے کہا کہ حکایات اللہ کے لشکروں میں سے ایک

لشکر ہیں جو دلوں کے لیے باعث تقویت ہیں۔ پوچھا گیا کہ کیا اس کی کوئی دلیل بھی ہے؟ تو کہاہاں اور قرآنی آیت پڑھی۔"**نحن نقص**" الخ

(ترجمہ: اور سب کچھ جو ہم تمہیں رسولوں کے واقعات سناتے ہیں ان کی غرض تمہاری ثبات قلبی ہے۔)

فرماتے کہ سلامتی اس کی دوست ہوتی ہے جو اس کا طلب گار ہو صوفی مخالفت کو ترک کرتا اور جس چیز کا علم حاصل کرنے سے شریعت روکے اس سے خود کو روک لیتا ہے۔

فرماتے کہ سماع کے لیے تین شرائط ضروری ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو سماع اختیار نہیں کرنا چاہیے پوچھا گیا کہ وہ شرائط کیا ہیں؟ فرمایا: (1)زمان (2) مکان اور (3)(ہم مشرب)اخوان

فرماتے کہ جن چیزوں سے تمہارے ہاتھ خالی ہوں ان سے دل کے خالی ہونے کا نام زہد ہے۔

فرماتے کہ ہر سانس کے ساتھ سزا کا اندیشہ رکھنا خوف ہے مجھے خوف بستگی میں لاتا ہے اور رجا(امید) کشادگی دیتی ہے۔

فرماتے کہ علام الغیوب کے سامنے دلوں کو ذلیل رکھنا خشوع ہے اور آیت پڑھتے۔"**عباد الرحمن**" الخ (ترجمہ: رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی اور عاجزی سے چلتے ہیں)

فرماتے کہ عبودیت دو خصلتوں سے عبارت ہے(1): ظاہر و باطن میں حق تعالیٰ کے ساتھ صدق اختیار کرنا(2) رسول اکرم ﷺ کی (ظاہراًوباطناً) مکمل پیروی کرنا۔

فرماتے کہ صدیق ایک روز میں چالیس(40) بار انقلاب احوال سے گذرتا ہے اور ریاکار چالیس(40) برس تک ایک ہی حال میں رہتا ہے۔

فرماتے کہ میں خوش خلق فاسق کی صحبت کو بد خلق عابد کی صحبت سے بہتر سمجھتا ہوں۔

فرماتے کہ توبہ کے تین مراحل ہیں(1) شرمندگی(2) ترک گناہ کا پختہ ارادہ(3) ظلم و خصومت سے پاکی۔

آپ سے پوچھا گیا کہ توحید کیا ہے؟ فرمایا کہ بندے کی صفت عجز وانکساری اور خواری و فروتنی ہے۔ حق تعالیٰ کی صفت غلبہ مطلقہ‘ بزرگی مطلق اور قدرت مطلقہ ہے۔ صفات بندگی (کے شعور) کو صفات حق تعالیٰ (کی یکتائی کے استحضار) میں فنا کر دینا توحید ہے۔

آپ فرماتے کہ حجاب تین ہیں (1) نفس (2) خلق (3) دنیا۔ آپ سے ان کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا کہ یہ تو عام لوگوں کی نسبت تذکرہ کرتا ہوں۔ خواص کے لیے دیگر تین حجاب ہیں(1): عبادت پر نظر رکھنا(2) ثواب کے حصول کا قصد کرنا(3) کرامت کا دیکھنا۔

فرماتے کہ اگر ہزار برس تک جیتا رہوں اعمال میں ذرہ برابر کمی نہ کروں الا یہ کہ وہ(یعنی حق تعالیٰ) خود مجھے باز رکھے۔

جنید بغدادی سکر (مدہوشی) کو محل آفت سمجھتے کیوں کہ سکر میں احوال پراگندہ ہوش مفقود اور علایق گم ہوتے ہیں جب کہ صحو (ہوش) مشاہدہ حق اور مقام عبدیت اور اس کے تقاضوں کی ادائیگی میں سرگردانی سے عبارت ہے۔

جنید سے تفکر کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا ایک تفکر اللہ کی آیات میں ہے جس سے معرفت حاصل ہوتی ہے۔ایک تفکر حق تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات پر ہے اس سے محبت پیدا ہوتی ہے ایک تفکر حق تعالیٰ کے وعدوں میں ہے اس سے ہیبت پیدا ہوتی ہے۔اور ایک تفکر نفس کی صفات اور نفس پر حق تعالیٰ کے احسانات پر ہے اس سے حیا(شرم) پیدا ہوتی ہے:

حریری کہتے ہیں کہ میں نے جنید کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا کہ رحمت کی اور بخش دیا کوئی چیز کام نہ آئی سوائے ان دو رکعت نماز کے جو آدھی رات کو پڑھتا تھا۔

12.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ابوالفیض ثوبان بن ابراہیم ذوالنون مصری سنہ 180 ہجری میں اخمیم (بالائی مصر) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد افریقی تھے اور ذوالنون مصری ایک آزاد کردہ غلام۔ سعدان مصری کو آپ کا شیخ بتایا گیا ہے کیونکہ آپ کی باطنی تعلیم و تربیت میں ان کا خاصا دخل رہا ہے۔
- حضرت ذوالنون مصری جلیل القدر صوفی اور مجاہد تھے۔ تذکرہ نگاروں نے آپ کو رئیس الصوفیہ کا لقب دیا تھا۔
- حضرت ذوالنون مصری امام احمد بن حنبل کے ہم عصر تھے اور انکی طرح آپ نے بھی خلق قرآن سے انکار کیا تھا اور معتزلی حکمرانوں نے آپ کو قید میں ڈال دیا تھا۔ خلیفہ متوکل علی اللہ کے دور میں آزاد ہوئے۔
- حضرت زوالنون کی تعلیمات میں ہے کہ: آدمی پر خرابی چھ چیزوں سے آتی ہے: آخرت کے عمل پر نیت کا کمزور ہونا، شیطان کی باتوں کو ماننے کی کوشش کرنا، موت کی نزدیکی کے باوجود لمبی زندگی کی امید کا غالب ہونا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا پر مخلوق کی رضا کو مقدم رکھنا، نفس کی پیروی میں سنت رسول اللہ ﷺ کو ترک کرنا، اکابر کے فضائل و کمالات اختیار کرنے سے ہمت ہارنا اور ان کی لغزشوں کو اپنے لیے سند و دلیل ماننا جس کے باعث بزرگان دین پر الزام عائد ہوں۔
- حضرت جنید بغدادی کا لقب سید الطائفہ تھا۔ آپ بڑے زبردست عالم، فقیہ، صوفی اور خطیب تھے۔ اسلمی تصوف کی تاریخ میں آپ نے اپنی تعلیمات اور سلوک و ریاضت سے لافانی نقوش ثبت کیے ہیں۔
- شیخ جنید بغدادی کی ولادت اور تعلیم و تربیت بغداد میں آپکے ماموں سری سقطی کی نگرانی میں ہوئی۔ امام احمد بن حنبل کے علاوہ اس دور کے جید علما سے کسب فیض کیا۔ آپکے اساتذہ کی طرح آپکے تلامذہ کی بھی کثیر تعداد شیوخ اور علما کی ہے۔
- جنید بغدادی کی تعلیمات میں ہے کہ: عبودیت دو خصلتوں سے عبارت ہے، اولا ظاہر و باطن میں حق تعالیٰ کے ساتھ صدق اختیار کرنا اور دوسرا رسول اکرم ﷺ کی (ظاہراً و باطناً) مکمل پیروی کرنا۔ اسی طرح فرماتے کہ ہیں کہ صدیق ایک روز میں چالیس (40) بار انقلاب احوال سے گذرتا ہے اور ریاکار چالیس (40) برس تک ایک ہی حال میں رہتا ہے۔ آپ یہ بھی فرماتے کہ میں

خوش خلق فاسق کی صحبت کو بد خلق عابد کی صحبت سے بہتر سمجھتا ہوں۔

- حضرت جنید بغدادی کے مطابق توبہ کے تین مراحل ہیں (1) شرمندگی (2) ترک گناہ کا پختہ ارادہ (3) ظلم و خصومت سے پاکی۔
- حضرت جنید بغدادی سے کسی نے توحید کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ بندے کی صفت عجز و انکساری اور خواری و فروتنی ہے۔ حق تعالیٰ کی صفت غلبہ مطلقہ، بزرگی مطلق اور قدرت مطلقہ ہے۔ صفات بندگی (کے شعور) کو صفات حق تعالیٰ (کی یکتائی کے استحضار) میں فنا کر دینا توحید ہے۔

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. معتزلہ کے دور اقتدار میں ....کو بھی مظالم سہنا پڑے کیونکہ آپ نے قرآن مجید کو مخلوق ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

(a). حضرت حسن بصری (b). حارث محاسبی (c). ذوالنون مصری (d). جنید بغدادی

2. ....نے فرمایا کہ آدمی پر خرابی چھ چیزوں سے آتی ہے۔

(a). حضرت حسن بصری (b). رابعہ بصری (c). ذوالنون مصری (d). جنید بغدادی

3. حضرت جنید بغدادی کے مطابق توبہ کے..................مراحل ہیں۔

(a). پانچ (b). چار (c). تین (d). دو

4. حضرت سری سقطی، جنید بغدادی کے..................تھے

(a). بیٹے (b). والد (c). چچا (d). ماموں

5. حضرت جنیدؒ بغدادی بہت بڑے..........................تھے۔

(a). عالم (b). فقیہ (c). صوفی (d). سبھی

6. ذوالنون مصری نے توبہ کی نسبت فرمایا:............کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور خواص کی......................سے۔

7. امام مالک بن انس کے تلامذہ سے ذوالنون مصری نے.........................پڑھی اور مالکی مذہب اختیار کیا۔

8. حضرت جنید بغدادی کی وفات..............................ہجری میں ہوی۔

9. حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں.......................کے لیے تین شرائط ضروری ہیں۔

10. حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ خوش خلق۔۔۔۔۔۔کی صحبت کو بد خلق عابد کی صحبت سے بہتر سمجھتا ہوں۔

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. حضرت ذوالنون مصری کن چیزوں کو آدمی کی خرابی کی وجہ بتاتے ہیں؟ بیان کیجیے۔
2. حضرت ذوالنون مصری کے ابتدائی حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔
3. حضرت جنید بغدادیؒ کا تعارف کرائیے۔
4. حضرت جنید بغدادی کے اقوال کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
5. حضرت جنید بغدادی کے افکار اور احوال کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. حضرت ذوالنون مصریؒ کی حیات و تعلیمات پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
2. حضرت جنید بغدادی کی صوفیانہ تعلیمات کا جائزہ لیجیے۔
3. ذوالنون مصری اور جنید بغدادی کی تعلیمات کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔

12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تابعین : از شاہ معین الدین احمد ندوی
2. جنید بغدادی : ضیاء الحسن فاروقی
3. ذوالنون مصری : ملک محمد دین
4. تذکرہ الاولیاء : فریدالدین عطار (اردو ترجمہ)
5. طبقات : عبدالوہاب شعرانی (اردو ترجمہ)
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ
7. Early Mystics in Islam : M. Smith
8. Encyclopedia of Islam (3rd Edition)

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY Estd. 1998

اکائی 13: تصوف کے مشہور سلسلے (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 پس منظر

13.3 سلسلہ قادریہ

13.3.1 شیخ عبدالقادر کے ارشادات

13.3.2 سلسلہ قادریہ ہندوستان میں

13.3.3 تعلیمات

13.4 سلسلہ چشتیہ

13.4.1 تعلیمات

13.5 سلسلہ رفاعیہ

13.6 اکتسابی نتائج

13.7 نمونہ امتحانی سوالات

13.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.7.3 طویل جوابی سوالات

13.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

ذیل کی اکائی میں ہماری کوشش ہوگی کہ تاریخ تصوف کے طالب علموں کو مختلف صوفی سلسلوں کے آغاز وارتقا کی تاریخ

بتانے کے ساتھ ان صوفی سلسلوں کی اہم تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ انہیں یہ بتایا جائے کہ مختلف صوفی سلسلے کن حالات میں وجود میں آئے ان کی تشکیل اور تنظیم میں کن عناصر نے کلیدی رول ادا کیا اور کن ملکوں اور علاقوں میں ان کو فروغ ملا۔ نیز ان سلاسل کے اہم صوفیاء کرام سے بھی واقفیت حاصل کریں۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو تصوف کے معروف اور اہم سلسلوں کے آغاز و ارتقاء کے اسباب و عوامل سے واقفیت حاصل ہو۔ اس اکائی میں آپ مشہور سلسلہ چشتیہ، قادریہ، اور رفاعیہ کے بارے میں جانیں گے۔ آپ ان سلاسل کے صوفی سلسلوں کے بانیوں ان کی اہم شخصیات اور تعلیمات وغیرہ کی جانکاری فراہم کی جائے۔

13.2 پس منظر

تصوف کے سلسلوں کا آغاز چھٹی صدی ہجری میں ہوا اور ساتویں صدی ہجری میں یہ سماج کی ایک اہم ضرورت بن گیا۔ یہ وہ دور ہے جس میں اندرونی اور بیرونی سطح پر اسلامی دنیا ایک سیاسی اور سماجی خلفشار میں مبتلا تھی۔ اس کے متعدد عوامل تھے جن میں سے چند اہم اسباب یہ ہیں:

1. سیاسی سطح پر بنوعباس کی حکومت کا عروج و زوال اور مختلف سلطنتوں کا آغاز، عروج اور انجام
2. یروشلم اور بیت المقدس کے اسلامی ریاست میں انضمام کا عیسائی دنیا پر صلیبی جنگوں کی شکل میں رد عمل نمودار ہونا
3. خوارزم شاہی سلطنت کا سیاسی عروج اور تاتاریوں سے مڈبھیڑ
4. تاتاریوں کا منگولیا سے خروج اور خوارزم شاہی سلطنت کا تاش کے پتوں کی طرح بکھراؤ
5. تاتاری یلغار کا وسطی ایشیا کی مملکتوں پر اثر
6. سقوط بغداد کے بعد سلطنت عباسیہ کا مصر میں احیاء
7. عین جالوت میں تاتاریوں کی شکست سے ان کے ناقابل تسخیر ہونے کے بھرم کا ٹوٹنا
8. تاتاری یورش کے سبب علماء و فقہا کی ہجرت
9. صلیبی جنگوں اور تاتاری بربریت سے عالم اسلام پر صدمات و یاسیت کا غلبہ، فکری جمود، بے حرکتی اور اخلاقی انحطاط
10. مادیت پسندی، تعیشات اور اخلاقی انحطاط سے مسلم عوام کی بے اطمینانی اور تصوف میں پناہ گزینی
11. اصحاب حدیث، فقہاء اور متکلمین کے درمیان کشمکش
12. اجتہادی صلاحیتوں میں زوال اور تقلید کا فروغ
13. قرآن وحدیث کی تعلیمات سے عوام و خواص کی رفتہ رفتہ دوری

14. للّٰہیت، نفسانیت اور شیطانیت کے درمیان کشاکش

15. مسلمانوں میں تفرقہ اندازی اور فرقہ بندی کا بڑے پیمانے پر ظہور

16. علوم عالیہ اور علوم آلیہ کے درمیان تفریق

17. علمی جمود اور تقلید کے فروغ کے باعث علماء و فقہاء میں بے نتیجہ مباحث، علم، وقت صلاحیتوں اور توانائیوں کا ضیاع اور خواص بشریت کے تحت اخلاقی انحطاط و فکری زوال

18. یورپی ممالک میں علم کی نشاۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب

19. عالم اسلام میں باطنیہ اور گمراہ فرقوں کی سازشیں

20. مسلمانوں میں باہمی جنگوں کے باعث جان، مال، علم توانائیوں کا ضیاع اور امت میں انتشار

21. تصوف کے نام پر بے راہ روی

22. تخلیقی صلاحیتوں پہ مہر بندی

23. عالم اسلام میں دینی، علمی و اخلاقی انارکی

24. علمی مجلسوں میں مقاصد دین و شریعت سے بے اعتنائی اور عجائب و غرائب پر مشتمل واقعات سے دلچسپی

25. متعدد علمی مراکز اور خانقاہوں میں نفسی پروری اور نفاق کا دور دورہ

اس تناظر میں مندرجہ ذیل صوفی سلسلوں کا مطالعہ آپ کے لیے زیادہ مفید و بار آور ہو گا۔

13.3 سلسلہ قادریہ

سلسلہ قادریہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی طرف منسوب برصغیر میں مقبول ترین سلاسل میں سے ایک سلسلہ ہے۔

آپ کا نام عبد القادر اور لقب محی الدین تھا۔ یکم رمضان 470 یا 471 میں قصبہ گیلان (فارس) میں پیدا ہوئے اور ربیع الثانی 561ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ بچپن ہی میں والد ابو صالح موسیٰ کا انتقال ہو گیا، والدہ محترمہ امتہ الجبار فاطمہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں آٹھ سال تعلیم حاصل کر کے علوم قرآن، علوم حدیث، علوم فقہ اور علوم لغت و ادب میں درجہ کمال حاصل کر لیا۔ علم تصوف میں آپ نے ابو الخیر حماد بن مسلم اور ابو سعید مبارک بن علی مخرمی سے فیض حاصل کیا۔ تقریباً پچیس برس عراق کے ویرانوں اور جنگلوں میں مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ پھر خواب میں رسول اللہ ﷺ سے ملی ہدایت پر وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں عوام و خواص کا جم غفیر جمع ہونے لگا۔ آپ کا وعظ سن کر ایک لاکھ سے زائد لوگوں کے تائب ہونے اور ستر ہزار سے زائد غیر مسلموں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ آپ مختلف علوم دینیہ کے درس بھی دیتے رہے، اس کے علاوہ افتاء کی مشغولیت بھی تھی۔ آپ انتہائی متواضع و منکسر المزاج تھے۔ حافظ ابو عبد اللہ محمد اشبیلی فرماتے ہیں: ”آپ مستجاب الدعوات تھے، آپ کی آنکھوں میں جلد آنسو آجاتے، ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے… عبادات و اجتہاد میں آپ کو درجہ رسوخ حاصل تھا۔“

13.3.1 شیخ عبد القادر کے ارشادات

آپ فرماتے تھے کہ اگر ساری دنیا کی دولت میرے قبضے میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلا دوں۔

علم کی نسبت میں آپ نے فرمایا: پہلے علم حاصل کر، پھر گوشہ نشین بن۔ جو شخص بغیر علم کے عبادات الہیٰ میں مشغول ہو جاتا ہے، اس کے جملہ کام بہ نسبت سدھرنے کے زیادہ بگڑتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ مومن کو چاہیے کہ پہلے فرائض ادا کرے، پھر ادائیگی سنن میں مشغول ہو، پھر نوافل و مستحبات میں۔ فرائض کی تکمیل سے پہلے سنن و نوافل و مستحبات میں مشغول ہونا حماقت ہے۔ کیونکہ فرائض کی تکمیل کے بغیر وہ قبول نہیں ہوں گی۔

اس سلسلے کی بابت بعض مستشرقین (مثلاً مارگولیتھ اور ٹرمنگھم) نے شبہات کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی تک اس سلسلہ کی موجودگی کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ لیکن یہ شبہ غلط ہے۔ ان حضرات نے نہ صرف ''فتوح الغیب'، ''الفتح الربانی'، ''سر الاسرار'' بلکہ ''عوارف المعارف' تک سے صرف نظر کیا ہے جس میں حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی نے از خود صراحت فرمائی ہے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی علیہ الرحمہ کے ان کے سینہ پر ہاتھ پھیرنے سے کلام اور علم کلام کی محبت ان کے قلب سے محو ہو گئی۔ بہر حال اس اختلاف سے قطع نظر خود ''فتوح الغیب' میں سلسلہ قادریہ کی بنیادوں کا ذکر ملتا ہے جس کو نظر انداز کرنا عین نصف النہار میں سورج کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے ان کے صاحبزادوں عبد الوہاب اور عبد الرزاق کے علاوہ حضرت علی حداد نے یمن، محمد بطائحی نے شام اور محمد ابن عبد الصمد نے مصر میں سلسلہ قادریہ کی تعلیمات کی اشاعت کی۔

13.3.2 سلسلہ قادریہ ہندوستان میں

ہندوستان میں قادری سلسلہ سے منسلک بزرگ جو سب سے پہلے پہنچے وہ حضرت مخدوم شیخ محمد حسینی جیلانی (793 تا 894ھ) تھے جو حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی اولاد سے اور بڑے باعظمت، صاحب کرامت اور بارعب بزرگ تھے۔ آپ بغداد سے خراسان اور خراسان سے ملتان کے قصبہ اوچ میں آکر مقیم ہوئے۔ آپ نے ایک مرتبہ بغیر ساز و سامان پوری دنیا کا سفر کیا تھا اور دوسری مرتبہ کے سفر میں ہاتھی، گھوڑے، نوکر، شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ مع متعلقین کے اوچ میں قیام پذیر ہوئے۔ بادشاہ وقت بڑا مرعوب و معتقد ہوا پھر حلقہ ارادت میں داخل ہو کر اس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس وقت ملتان علماء و فضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ علم و فضل اور کسبی و نسبی فضیلتوں کے باعث خلقت آپ کی معتقد ہو گئی۔

آپ کے فرزند مخدوم شیخ عبد القادر (862 تا 940ھ) تھے جو حضرت عبد القادر ثانی کہے جاتے تھے۔ بڑے بلند پایہ صاحب کرامات بزرگ تھے۔ آپ کے چہرہ کا نور کفار و فساق کو کفر و فسق سے توبہ کرنے کی طرف راغب کرتا، چنانچہ وہ توبہ کرکے آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جاتے۔ جوانی کا زمانہ بڑے تزک و احتشام سے گزارا تھا، آلات موسیقی کے ساتھ محفل سماع ہوتی، آپ شریک ہوتے، پھر دل ایک تیتر کی آواز سن کر ایسا پلٹا کہ آپ نے آلات موسیقی توڑ دیے، آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی۔ انوار حب الٰہی کی بارش ہوئی

اور اپنے جد امجد کے طریق پر واپس آئے۔ ادھر آپ کے والد نے وفات پائی۔ آپ جانشین ٹھہرے۔ وظیفہ آپ کے نام جاری ہوا لیکن اب دل حب الٰہی سے معمور تھا، دنیا کے لیے اس میں کوئی جگہ نہ بچی تھی، آپ نے وظیفہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ فقر و توکل میں محبوب حقیقی سے جو معاملے ہوتے ہیں ان کی لذت الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ آپ سلسلہ قادریہ کی تعلیمات کے مجسم پیکر بنے اور اسی حال میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند حضرت شیخ عبدالرزاق (825۔ 946ھ) نے سجادہ سنبھالا۔ تربیت باطنی کے قادری طریقہ کو آگے بڑھایا۔ جب ان کی بھی وفات ہوگئی تو مخدوم شیخ حامد (885۔978ھ) نے ذمہ داری سنبھالی۔ آپ کے زمانے میں آپ کی بزرگی و کمال رہنمائی کا بڑا چرچا رہا جس سے سلسلہ قادریہ کو بڑا فروغ ملا۔ آپ کے فرزند حضرت شیخ موسیٰ علیہ الرحمہ علم کے علاوہ حلم، شجاعت اور سخاوت میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کے مثنیٰ سمجھے گئے اور حسن صورت و سیرت میں ائمہ آل اطہار کے سچے عکس۔ آپ کی اور حضرت شیخ داود (899۔982ھ) کی مشترکہ کوششوں سے قادری سلسلہ بڑی تیزی سے مقبول ہونے لگا۔ ان بزرگوں کے مرید بھی ان ہی کے عکس ہوتے چنانچہ حضرت شاہ قمیص قدس سرہ (897 ۔ 992ھ) جب بادشاہ وقت کی خواہش پر بنگال تشریف لے گئے تو سلسلہ قادریہ کی تعلیمات شمال تا جنوب اور پچھم تا پورب بڑے پرزور طریقے پر پھیل چکی تھیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ برصغیر کے قادری بزرگوں کے تعلقات بغداد کے نقیب الاشراف سے بڑے قریبی رہے، بالخصوص دکن کے قادری مشائخ نے بغداد کے نقیب الاشراف یا ان کے افراد خاندان کا ہمیشہ گرم جوشی سے استقبال کیا، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ دکن کے قادری بزرگوں میں حضرت شاہ محبوب اللہ، حضرت شاہ ندیم اللہ، حضرت شاہ شاہد اللہ، حضرت شاہ موسیٰ قادری اور حضرت شاہ عبداللطیف قطب ویلور (صاحب "جواہر السلوک") کی بڑی شہرت ہوئی۔ اسی طرح کاکوری میں تکیہ شاہ کاظم قلندر قادری اور ان کے فرزند شاہ تراب قلندر قادری (مصنف "مطالب رشیدی"۔ "فتح الکنوز"، اور آگے چل کر شاہ علی انور قلندر قادری جیسا لعل شب چراغ نکلا جس نے "الدر المنظم"، "فیض التقی فی حل مشکلات ابن عربی"، "الروض الازہر"، "القول الموجہ" و دیگر شہکار تصنیف کیے۔ جن سے دقیق علمی مسائل پانی ہوگئے۔ وسعت مطالعہ اور وقت نظری میں شاہ علی انور اپنی مثال آپ تھے۔ ادھر مارہرہ شریف میں حضرت شاہ آل رسول مارہروی قادری کی بارگاہ بہت مشہور ہوئی جس سے ایک گوہر یگانہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی قادری کی شکل میں نکلا اور اپنے علم کی وسعت و گہرائی سے اہل علم کی نگاہیں اس نے خیرہ کر دیں۔

13.3.3 تعلیمات

1. سلسلہ قادریہ کے وظائف و اذکار و اوراد میں مختلف مقامات پر مختلف شاخوں میں خاص اختلاف ہے۔ سلسلہ قادریہ میں رائج اذکار میں بالعموم وہ اذکار ہیں جو شیخ عبدالقادرؒ نے تلقین کیے ہیں۔ نوافل کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ذکر خفی اور ذکر جلی دونوں رائج ہیں۔ لفظ اللہ کے ذکر ہر سانس کے ساتھ کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔
2. مسئلہ سماع، سجدہ تعظیمی، طواف مزار، زیارت قبر برائے خواتین میں اکثر مشائخ حرمت کے قائل ہیں۔ بعض مشائخ کا میلان جواز کی طرف بھی ہے۔

3. شریعت محمدیہ کے ہوش وحواس کے ہوتے ہوئے سب کے مکلف ہونے پر بھی سب کا اتفاق ہے۔

4. قادریہ سلسلے کی تعلیمات میں ''الفیوضات الربانیہ'، کو بالعموم معیار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ حضرت حارث محاسبی کے اصول ہشتگانہ، توحید، تفویض، ترک اختیار، کتاب وسنت کے احکام ظاہرہ وباطنہ کے مطابق زندگی کو ڈھالنے صلوٰۃ غوثیہ وظیفہ ''یا شیخ عبدالقادر شیأللہ'' کے پڑھنے اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے تصرفات بعد وفات پر بھی تقریباً سبھی کا اتفاق ہے۔ ''فتوح الغیب'' اور ''الفتح الربانی'' کی تعلیمات کو اپنانے پر بھی سلسلہ قادریہ میں بالعموم اتفاق ہے۔

13.4 سلسلہ چشتیہ

حضرت ابو احمد چشتی سے منسوب سلسلہ جس کے حقیقی بانی بعض محققین کے نزدیک حضرت مشاد علو دینوری تھے۔ اور بعض محققین کے نزدیک حضرت ابو اسحق شامی۔ حضرت ابو احمد چشتی قدس سرہ نے چشت (ہرات کے قریب واقع ایک گاؤں) سے تحصیل علم کے لیے شام کا سفر فرمایا تھا جہاں علوم ظاہرہ کی تکمیل کے بعد حضرت ابو اسحق شامی کے ہاتھ پر باطنی تربیت کے لیے شرف بیعت حاصل کیا اور وہیں کے ہو رہے۔ بعض تذکروں کے مطابق آپ کے فرزند ابو محمد چشتی، بعض کے مطابق سلطان سخی سرور اور اکثر کے مطابق حضرت سید معین الدین حسن سجزی (معروف بہ خواجہ غریب نواز و خواجہ اجمیری) قدس سرہ نے اپنے شیخ حضرت عثمان ہرونی قدس سرہ کے حکم پر ہندوستان کا رخ کیا۔ راستہ میں بغداد، سمرقند، بخارا، نیشاپور، تبریز، اوش، اصفہان، سبزوار، استرآباد، بلخ وغیرہ سے گذرتے لاہور پہنچے، سید علی ہجویری کے مزار کی زیارت کی، مراقبہ کیا، پھر اجمیر کا رخ کیا اور شہر اجمیر کے نواحی علاقہ میں قیام پذیر ہوئے۔

چھٹی صدی ہجری کے اواخر سے آٹھویں صدی ہجری کے وسط تک شمالی ہند، راجپوتانہ اور پنجاب میں اکابر چشتی صوفیہ نے خانقاہیں قائم کرکے ان کو دعوت دین اور تربیت سالکین کا مرکز بنایا اور قصبات اور دیہاتوں میں خدمت خلق میں لگ گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی قدس سرہ کے ایک خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار اوشی کاکی نے دہلی کو مرکز بنایا اور دوسرے خلیفہ حضرت حمید الدین ناگوری نے ناگور (پنجاب) کو۔ ان بزرگوں کی وفات کے بعد حضرت شیخ بابا فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہ نے اجودھن / پاک پٹن سے اپنے خلفاء کو اسلامی ہند کے مختلف علاقوں میں خدمت دین، خدمت باطن اور خدمت خلق کے لیے روانہ فرمایا، بابا فرید کی اپنی شخصیت ایسی مسحور کن تھی کہ آپ پر نظر پڑتے ہی حق پرستی کا جذبہ بیدار ہو جاتا، پاک پٹن کے اطراف مرتاض جوگی اور غیر مسلموں کے گروہ کے گروہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

آپ کے خلفاء میں حضرت جمال الدین ہانسوی، حضرت نظام الدین سلطان المشائخ، حضرت علاء الدین علی احمد صابر، حضرت زین الدین دمشقی، حضرت بدرالدین اسحق، حضرت بدرالدین سلیمان (صاحبزادہ وسجادہ نشین بابا فرید) حضرت عارف سیوستانی، حضرت داؤد پایلی اور حضرت نجیب الدین متوکل نے دین وطریق کی بڑی خدمت کی اور بندگان الٰہی نے بھاری تعداد میں ان سے فیض اٹھایا۔ حضرت بابا فرید کی وفات کی بعد حضرت شیخ نظام الدین سے سلسلہ نظامیہ، حضرت علاء الدین علی احمد صابر سے سلسلہ صابریہ اور حضرت جمال الدین ہانسوی

سے سلسلہ جمالیہ جاری ہوئے۔ سلسلہ جمالیہ بعد میں سلسلہ نظامیہ میں ضم ہو گیا۔

حضرت شیخ نظام الدین سلطان المشائخ نے غیاث پور (دہلی) کو مرکز بنا کر تا عمر بندگان الٰہی کی بڑی رہنمائی کی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء اسلامی ہند میں پھیل گئے۔ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی محمد بن تغلق کی زیادتیاں سہتے دہلی ہی میں طریق کی خدمت میں لگے رہے جب کہ حضرت اخی سراج بنگال چلے گئے۔ جہاں نہ صرف انھوں نے بلکہ ان کے خلیفہ شیخ علاء الدین کے خلفاء حضرت سید نور قطب عالم اور حضرت سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی قدست اسرار ہم نے دین اسلام اور سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات کو بنگال، بہار اور مشرقی اتر پردیش میں مقبول بنا دیا۔ حضرت منتجب الدین زر بخش، حضرت امیر حسن علاء سنجری اور حضرت برہان الدین غریب علیہم الرحمہ نے دولت آباد میں قیام فرمایا اور دین اسلام اور چشتی اصولوں کی آبیاری کی۔ حضرت سید محمد حسینی گیسو درازؒ کی آمد سے گلبرگہ میں چشتی مرکز قائم ہو گیا اور بیجاپور میں میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم اور شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیدرآباد، حضرت سید میراں جی حسین خدا نما، حضرت شاہ حمید اللہ، حضرت حافظ محمد علی خیر آبادی، حضرت مرزا سردار بیگ، حضرت معین الدین شاہ خاموش، گجرات میں حضرت شیخ محمود، حضرت شیخ حمید الدین (خلفاء حضرت قطب الدین بختیار کاکی)، حضرت سید حسن، حضرت حسام الدین ملتانی، حضرت بارک اللہ (مریدین حضرت نظام الدین) علامہ کمال الدین (حضرت شیخ نصیر الدین محمود کے بھتیجے) اور ان کے فرزند حضرت سراج الدین نے سلسلہ چشتیہ کی تنظیم و توسیع کا کام بڑی تن دہی سے کیا، شیخ وجیہ الدین، شیخ کمال الدین اور مولانا مغیث الدین نے مالوہ میں چشتی تعلیمات کو عام کیا۔

حضرت شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی نے دہلی اور شمالی ہند میں اور ان کے خلیفہ حضرت نظام الدین اورنگ آبادی نے دکن میں سلسلہ چشتیہ کا احیاء فرمایا۔ حضرت شاہ فخر الدین کے خلیفہ حضرت شاہ نور محمد، شاہ سلیمان تونسوی اور ان کے مریدین نے چشتی تعلیمات کو پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبوں اور اتر پردیش میں پھیلایا اور حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی نے دہلی اور اتر پردیش میں سلسلہ کی خدمت فرمائی۔

سلسلہ صابریہ کے بانی حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر (متوفی 709ھ) ذات مطلق کے غلبہ مشاہدہ، استغراق، شوق و عشق کی فراوانی اور غیرت احدیت سبحانی و فنا و تحیر میں گم ایسے صوفی تھے جو بابا فرید کے اولین اور ممتاز ترین خلفاء میں شمار کیے جاتے تھے۔ آخری عمر میں اپنے خادم خاص حضرت شمس الدین ترک کو خرقۂ خلافت دے کر شہر پانی پت کی طرف رخصت فرمایا۔ اس علاقہ کی خلقت نے نسبت جذب کے باعث یا کسی اور سبب آپ کی طرف برائے حصول سعادت ہجوم فرمایا اور سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات کو آپ سے اخذ کیا۔ آپ نے اپنے وصال سے پہلے حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء عثمانی پانی پتی کو خلافت کی ذمہ داری عطا کی، ایک جہاں کا جہاں آپ سے فیض یاب ہوا۔

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء عثمانی پانی پتی سے دین اسلام کو شوکت اور سلسلہ چشتیہ صابریہ کو بہت فروغ ملا۔ آپ کے مرید و خلیفہ حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی تھے۔ جن کی بابت حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء نے فرمایا تھا۔ ”بابا عبد الحق! حیات و ممات میں مجھ کو تمہارے کمالات کی انتہا نظر نہیں آتی۔“ حضرت احمد عبد الحق ردولوی ہی نے فرمایا تھا ”حسین ابن منصور بچہ تھا، راز فاش کر گیا۔ بعض مردانِ الٰہی دریا کے دریا پی جاتے ہیں اور آواز نہیں نکالتے۔“ آپ نے اپنے صاحبزادوں کی تربیت بھی حضرت شیخ احمد عبد الحق کے سپرد فرما

دی تھی جس سے حضرت جلال الدین کی نظر میں حضرت شیخ احمد عبد الحق کے مقام شناسی کی جھلک ملتی ہے۔ حضرت شیخ جلال الدین کے دیگر 39 خلفاء نے بھی اپنی اپنی جگہ دین وطریق کی خدمت کی لیکن حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی کے صاحبزادہ وسجادہ نشین حضرت شیخ محمد کے حلقہ ارادت میں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی جیسا شہباز وقت داخل ہوا جس نے ذکر بالجہر کو ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ اس کے آگے کوئی مقام غیر متصور ہے۔ آپ کے مکتوبات کے مجموعہ کا مقام اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت رشید احمد محدث گنگوہی جیسے محتاط متقی فقیہ وقت نے جن کو نسبت حضوری حاصل تھی ایک مرتبہ فرمایا کہ میری مشکلات "مکتوبات قدوسیہ' کے مطالعہ سے حل ہوتی ہیں۔ "اقتباس الانوار" میں ایک صاحب استدراج جوگی کے اپنے سات سو(700) چیلوں سمیت مشرف بہ اسلام ہونے اور آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کا واقعہ درج کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے خلفاء میں حضرت رکن الدین (فرزند عبد اللہ گنگوہی)، حضرت جلال الدین تھانیسری' حضرت عبد الغفور اعظم پوری، حضرت عبد العزیز کیرانوی، حضرت عبد الستار سہارنپوری، حضرت عبد الاحد مخدوم (والد شیخ احمد سرہندی) حضرت میر رفیع الدین اکبر آبادی اور حضرت عبد الرحمن نے خدمت دین وخدمت طریق میں شہرت پائی، ویسے آپ کے خلفاء کی تعداد پانچ ہزار تک بتائی گئی ہے۔ آگے حضرت شیخ نظام الدین بلخی (متوفی 1036ھ) حضرت ابو سعید گنگوہی، حضرت شاہ محب اللہ صدیقی (صدر پوری ثم) الہ آبادی (متوفی 1058ھ)' حضرت شیخ محمد صادق، حضرت عبد الجلیل الہ آبادی،، حضرت داود گنگوہی، حضرت شیخ سوندہا' حضرت شیخ محمد اکرم' حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، شیخ الاسلام حافظ انوار اللہ خاں' حضرت رشید احمد محدث گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی، حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا خلیل احمد انبہٹوی' حضرت معین الدین شاہ خاموش (حیدر آباد) قدست اسرار ہم کی مساعی سے سلسلہ چشتیہ صابریہ کو انتہائی فروغ حاصل ہوا، اور حضرت مولانا الیاس کاندھلوی کی تحریک دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سلسلہ کی تعلیمات، قرآن وسنت کی اتباع کا شوق، پیغام توحید ومحبت وانسانیت، اخلاص وصدق عمل، کلمہ طیبہ کے تقاضوں کا احساس، عبادات میں للّٰہیت، معاملات میں صفائی اور معاشرت میں خوش خلقی کا اہتمام، علم کے حصول اور ذکر الٰہی کا تحقق حسب استعداد گھر گھر پہنچ گئیں۔

13.4.1 تعلیمات

1. چشتی تعلیمات میں توحید کے ساتھ توکل، کے قائل ہیں بادشاہوں، امراسے دوری رکھتے ہیں۔
2. تخلیہ (رذائل سے نجات)، تحلیہ (فضائل اخلاق سے آراستگی)، تجلیہ (آئینہ قلب کی جلاء) کے ذریعہ قرب الٰہی کیکوشش کی جاتی ہے۔
3. ذکر الٰہی کی مداومت، مجاہدات، محاسبات، مراقبات، مشاہدات اور اذکار واوراد کے ذریعہ معائنہ تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔
4. علم الیقین کو حق الیقین اور معرفت اجمالی کو معرفت تفصیلی میں تبدیل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔
5. فناء نفس کے ذریعہ فناء الفنا کے مقام تک پہنچنے کی سعی کی جاتی ہے اور تواضع وانکساری اور، حب شرعی کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے۔ مقام فنا اور حق الیقین کے لیے مخصوص اوقات میں ذکر جہری اور ہمہ وقت ذکر سری کی تلقین کی جاتی ہے۔ اسکے علاوہ مراقبہ کے ذریعہ تزکیہ اور چلہ کاٹنے کے ذریعہ لگاتار عبادت میں لگاتار مشغول رہنے کی تاکید کی جاتی ہے۔

6. چشتیہ سلسلے میں مرید یا سالک کو ان اوصاف کو پیدا کرنے کی تلقین کی جاتی ہے: خود کو آفتاب (جس کی روشنی مومن و کافر سب کے لیے عام ہے)، بے تھاہ میٹھا چشمہ (جو ساری کڑواہٹیں اور کثافتیں قبول کرلیتا ہے لیکن میٹھا اور پاک ہی رہتا ہے) اور زمین (جو برابر پامال ہوتی رہتی ہے لیکن حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی)

7. اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا دائمی استحضار رسول اللہ ﷺ کی محبت و تعظیم و توقیر، اتباع سنت نبی کریم و صحابہ کرام، قرآن وحدیث کی ظاہری و باطنی اطاعت، شریعت، طریقت اور حقیقت پر عمل، علو ہمت، اذکار و اشغال کی پابندی سلسلہ چشتیہ کی خصوصیات سے ہیں۔

8. چشتی تعلیمات میں کتابی اعتبار سے شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب عوارف المعارف کا رواج ہے۔ اس کے علاوہ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کی کتاب کشف المحجوب کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ اسکے علاوہ چشتیہ بزرگوں جیسے بختیار کاکی، نصیر الدین چراغ دہلی، نظام الدین اولیا وغیرہ کے ملفوظات کا مطالعہ بھی شامل ہے۔

13.5 سلسلہ رفاعیہ

اس سلسلہ کے بانی حضرت سید احمد کبیر ابوالعباس محی الدین ابن علی الرفاعی (512 تا 578ھ) تھے۔ آپ کے دادا کا نام سید ابوالمکارم حسن رفاعہ تھا جس کے سبب آپ رفاعی کہلائے۔

آپ کی عمر کا ساتواں سال تھا کہ والد داغ جدائی دے گئے۔ آپ کے ماموں منصور بطائحی نے آپ کی والدہ اور بچوں کی ذمہ داری سنبھالی۔ تھوڑی سی مدت میں آپ نے قرآن مجید حفظ کرلیا اور تحصیل علم کے لیے واسط کا رخ کیا اور شیخ علی واسطی، شیخ ابو بکر واسطی اور شیخ عبدالملک حربونی کے پاس حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، کلام وغیرہ کی تکمیل کرلی۔ بیس سال کی عمر میں اسناد و اجازت کتب حاصل کیں اور سلسلہ تدریس شروع کردیا۔ علوم باطنیہ میں بھی بہت جلد مدارج کمال حاصل کیے۔ آپ کی سادگی، تواضع، فصاحت، ذہانت، تقویٰ اور تحقیقی درس کی شہرت خاص و عام میں پھیل گئی۔

آپ کی زندگی بطائح میں گذری جو جنوبی عراق میں بصرہ اور واسط کے درمیان واقع ہے۔ آپ کے شیخ الصحبتہ حضرت ابوالفضل علی القاری الواسطی اور شیخ التربیہ آپ کے ماموں حضرت منصور بطائحی تھے۔ حضرت منصور بطائحی نے حضرت سید احمد رفاعی کو اپنی وفات سے ایک سال بیشتر خرقہ خلافت پہنایا اور خاص مصلی عنایت فرمایا اور ام عبیدہ میں مامور کیا۔ اس وقت آپ کی عمر 27 برس کی ہوچکی تھی۔ آپ شافعی مذہب فقہ سے وابستہ تھے لیکن مشرب میں وسعت تھی، شہرت کے ساتھ ہی طلبہ، علماء اور فقراء کا ہجوم آپ کے گرد جمع ہوگیا۔ علامہ ابن الجوزی نے خود اپنا مشاہدہ لکھا ہے کہ 15 شعبان کو انھوں نے تقریباً ایک لاکھ لوگ آپ سے استفادہ کرتے پائے۔ علامہ ابن مہذب نے "عجائب واسط" میں لکھا ہے کہ عمر کے آخری دنوں میں آپ کے خلفاء کی تعداد اسی ہزار ایک سو ہوچکی تھی جب کہ عقیدت مندوں اور مریدوں کا کوئی شمار نہ تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ ایک شخص حضرت شیخ عبد القادر جیلانی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے بیعت کا شرف حاصل کرنے کی درخواست کی۔ حضرت شیخ نے مراقبہ فرمایا پھر اس شخص سے معذرت کرلی۔ اس نے وجہ دریافت کی تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ تمہارا نام اہل شقاوت میں لکھا ہے۔ اس لیے تمہارا بیعت کرنا بے سود ہے۔ وہ بڑا مایوس ہوا، مختلف مشائخ سے ملا لیکن کوئی اس کو حلقہ ارادت میں لینے کو تیار نہ ہوا۔ اس کی افسردہ حالی دیکھ کر کسی نے اسے مشورہ دیا کہ حضرت سید احمد رفاعی سے بھی ملاقات کرلے۔ اس نے بطائح کارخ کیا، حضرت سید احمد رفاعی سے ملا اور اپنا درد بیان کیا۔ حضرت سید احمد رفاعی نے فرمایا کہ ہاں! حضرت شیخ عبد القادر کے پاس تو اہل سعادت ہی جاتے ہیں اور ہمارے پاس اہل شقاوت ہی آتے ہیں اور اس کو مرید کرلیا۔ کچھ دن بعد وہ بغداد لوٹا، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی علیہ الرحمہ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا، حضرت شیخ نے فراست باطنی سے تبدیلی تاڑلی، پھر مراقبہ فرمایا تو دیکھا کہ اس شخص کا نام اہل شقاوت سے مٹا کر اہل سعادت میں لکھ دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کام سید احمد ہی کے ہاتھوں ہو سکتا تھا۔ واللہ اعلم۔

آپ کے مناقب و حالات میں کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں "ربیع العاشقین"، "تریاق المحبین"۔ "نفحۃ المسکیہ"۔ "ام البراھین"، "شفاء الاسقام"، "روضتہ الناظرین" معروف ہیں۔ تصنیف و تالیف کی طرف آپ نے توجہ نہیں فرمائی لیکن آپ کے خطابات، مواعظ اور ملفوظات کو آپ کے خدام نے قلم بند کیا، ان میں المجالس الاحمدیہ، الحکم الرفاعیہ' الآثار النافعہ، الحکم الساطعہ اور البرھان المویدشامل ہیں۔

آپ نے سنہ 578ھ میں وفات پائی۔ صلوۃ جنازہ میں شرکت کرنے والوں کا اندازہ نو (9) لاکھ افراد تک کیا گیا ہے۔ صلبی اولاد میں آپ کے فرزند قطب الدین کا آپ کے سامنے وصال ہوا اور آپ کی بیٹیوں بی بی فاطمہ اور بی بی زینب سے سلسلہ آگے بڑھا۔ چونکہ بے شرع رفاعی وحیدری فقراء کے اعمال نے اس سلسلہ کی امتیازی شان پر برا اثر ڈالا، اس لیے یہ ضروری ہے کہ سید احمد رفاعی کی اپنی تعلیمات کو جانا جائے۔

حضرت سید احمد رفاعی الکبیر نے زہد، تقوی، اخلاص کے ساتھ اتباع رسول، تشابہات قرآن میں تفویض اور محکمات پر عمل، ارکان اسلام کی پابندی، بدعات سے اجتناب' اوامر ونواہی میں انکساری سے عمل، عظمت رسول اللہ ﷺ کے قوی احساس، مراتب صحابہ کا خیال اور صحابہ کرام و اہل بیت عظام سے محبت، لزوم صحبت ولی، حدود شریعت کی رعایت، غیر اللہ سے دل کی پاکی، کرامت کو اللہ کی نعمت و فضل جان کر بے نفس خوشی، تحدیث نعمت الہی، طلب کرامت اور دعاوی سے احتراز، ذکر دوام، التزام احسان، مجاہدات، محاسبات، مراقبات اور طاعات کا اہتمام، وقت، زبان اور قلب کی حفاظت، دل کو خوف، ظاہر کو ادب، نفس کو ذلت، انانیت کو محویت اور زبان کو ذکر کا لباس پہنانے، زمانہ سے واقفیت، کام میں دھن، صلحاء کے اعمال پر مداومت، سچے طالب حق بننے اور شریعت پر مضبوطی سے قائم رہنے، حقائق اشیاء کے علم، ایمان کے حقوق و تقاضوں کی ادائیگی، شریعت حقہ کی پیروی، تقاضائے نفس سے بے رخی، سچی معرفت کے حصول (یعنی ذات و صفات و افعال میں اللہ سبحانہ کو یکتا ماننے اور جاننے) اخلاص نیت، ادب میں پختگی، محبت میں خلوص' عبودیت میں استحکام' ظاہر و باطن میں للّٰہیت، عافیت کی قدر دانی، نفس و شیطان و دنیا و عقبیٰ چھوڑ کر اللہ کے سچے طالب بننے اور تقدیر الہی پر قانع رہنے، خوف و رجاء میں اعتدال،

نفس ونفوس سے اوامر ونواہی شرع کی خوش خلقی سے تلقین، موت کی فکر، رحمتوں کے درمیان قہرالٰہی سے آگہی پر جگہ جگہ زور دیا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ حکام کے تقرب سے تکبر، اغنیاء کے تقرب سے حرص، اطفال کی صحبت سے لہو و لعب، عورتوں کی صحبت سے جہالت اور ازدیاد شہوت، اہل علم کی صحبت سے تحریک احتیاط، اہل فسق (گناہ گاروں) کی صحبت سے گناہ کی رغبت اور توبہ میں ٹال مٹول، فقراء کی صحبت سے رضا بقضاء الہیٰ اور صلحاء کی صحبت سے رغبت طاعت کے امکانات قوی ہوتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ:

1. ظاہری و باطنی احکام میں شریعت کی پابندی کرو
2. دل کو اللہ کے ذکر سے آباد رکھو، اسے غفلت سے بچاؤ
3. درویشوں اور فقراء کی خدمت کو لازمی جانو
4. نیکی میں سبقت کرو، سستی اور ملال کو راہ نہ دو
5. اللہ سبحانہ کی مرضیات پر جمے رہو اور اللہ سبحانہ کے در پر کھڑے رہو
6. اپنے نفس کو عبادت کا عادی بناؤ اور ریاء سے بچاؤ، خلوت و جلوت میں پچھلے گناہوں پر روؤ
7. جھوٹے وعدے نہ کرو
8. اپنا عقیدہ ایجابی، ثبوتی اور ایسا پختہ رکھو کہ اس میں کوئی تغیر نہ ہو
9. کسب معاش کے لیے حلال کمائی کا کوئی طریقہ اختیار کرو لیکن اسباب معاش (بڑھانے) کے لیے فکر و اہتمام ترک کرو
10. درویشوں کی دل آزاری سے بچو
11. ذہن کو شیطانی وساوس سے دور رکھو
12. صلۂ رحمی کرتے رہو اور قرابت داروں کی خاطر نوازی کرو
13. جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کرو، اور جو تکبر کرے اس کے سامنے تواضع کرو
14. حکام و وزراء کے دروازوں پر آمد و رفت نہ رکھو
15. درویشوں اور قبروں کی کثرت سے زیارت کرو
16. مخلوق سے نرمی برتو اور ان کی عقل کے مطابق کلام کرو
17. بیواؤں اور یتیموں کی حاجتیں پوری کرنے میں لگے رہو اور ان کی خاطر داری کرو
18. اللہ کے ساتھ رہو، اللہ کو ساتھ پاؤ گے
19. کرامات و خوارق عادات کی طرف رغبت نہ کرو
20. تمام اعمال و اقوال میں اخلاص کا اہتمام کرو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

21. اخلاق کو سنوارو اور لوگوں سے خوش خلقی سے پیش آؤ

22. جاہلوں اور برے دوستوں سے کنارہ کشی اختیار کرو اور جن غرباء کو لوگوں نے چھوڑ دیا ان کے پاس زیادہ آمد و رفت رکھو

23. مخلوق کو اللہ کا راستہ بتلانے کی کوشش میں لگے رہو اور تم دوسروں پر رحم کرو، اللہ تم رحم کرے گا۔

ہندوستان میں رفاعی سلسلہ مہاراشٹر اور کرناٹک میں محدود پیمانہ پر پھیلا۔ نانڈیڑ کی خانقاہ بند پڑی ہے اور بنگلور میں حضرت مصطفی رفاعی ندوی سلسلہ رفاعیہ کی قابل اعتماد توضیح اور اس کی تعلیمات کی اشاعت میں بتوفیق الہیٰ ہنوز سرگرداں ہیں۔

13.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے مندرجہ ذیل نکات سیکھے:

- دسویں صدی عیسوی کے حالات کے خاص پس منظر میں مسلم سماج میں تصوف کے مختلف سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا۔
- صوفیہ کے زیادہ تر سلسلے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے دوران وجود میں آئے، جن میں سلسلہ قادریہ، سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ رفاعیہ شامل ہیں۔
- صوفی سلسلوں نے اس وقت کے حوصلہ شکن حالات میں نہ صرف یہ کہ ٹوٹے دلوں اور شکستہ حال لوگوں کی ڈھارس بندھائی بلکہ ان کے اندر دین پر قائم رہنے کا حوصلہ پیدا کیا۔
- دسویں صدی عیسوی کے بعد بھی ان صوفی سلسلوں نے دلوں کو جوڑنے اور رب سے اور اس کی مخلوق سے رشتہ قائم کرنے کا کام بڑے اور وسیع پیمانے پر جاری رکھا۔
- سلسلہ قادریہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف منسوب ہے۔ آپ کی پیدائش بغداد میں ہوئی تھی۔ حصول علم کے لیے دیگر ممالک کے اسفار کیے اور واپس بغداد آکر وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے کئی کتابیں تڈنیف کیں جن میں فتوح الغیب سلسلہ قادریہ کے نصاب میں شامل ہے۔
- ہندوستان میں یہ سلسلہ قادری سلسلہ کے بزرگ شیخ مخدوم حسینی لے کر آئے اور اچ کے مقام پر فروکش ہو کر اپنے وعظ وارشادات کا سلسلہ شروع کیا۔ قادریہ سلسلہ برصغیر ہندوستان کا سب سے معروف سلسلوں میں سے ایک ہے۔
- قادریہ سلسلہ کی تعلیمات میں اکثر اذکار شیخ عبدالقادر کے تلقین کردہ ہیں۔ اس سلسلے میں نوافل کا بہت زیادہ اہتمام ہوتا ہے۔ ذکر خفی اور ذکر جلی دونوں کا رواج ہے۔
- چشتیہ سلسلہ کی بنیاد خواجہ اسحق چشتی نے رکھی۔ ہندوستان میں اس سلسلے کو غیر معمولی مقبولیت ملی۔ اس سلسلے کو معین الدین اجمیری چشتیؒ ہندوستان لیکر آئے۔
- حضرت خواجہ معین الدین چشتی ایک طویل سیاحت کے بعد لاہور اور ملتان ہوتے ہوئے اجمیر میں قیام پذیر ہوئے اور اپنی

تعلیمات کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو ہندوستان میں عام کیا۔

- خواجہ معین الدینؒ کے خلفا اور مریدین نے اس سلسلے کی اشاعت کی اور دیگر شہروں میں پھیلایا۔ ان میں سے بعض بزرگوں کی سرپرستی میں نئے سلاسل بھی وجود میں آئے۔ جس میں سلسلہ چشتیہ صابریہ (مخدوم صابر کلیری) اور نظامیہ (خواجہ نظام الدین چشتی) بہت معروف ہیں۔
- سلسلہ رفاعیہ کے بانی شیخ احمد کبیر الرفاعی ہیں۔ ہندوستان میں یہ سلسلہ شیخ سید عبدالرحیم رفاعی کے ذریعہ اورنگزیبؒ کے دور میں آیا۔ آپ نے سورت میں قیام کیا اور وہاں سے اپنے ارشادات وعظ و نصیحت کا آغاز کیا۔
- سلسلہ رفاعیہ میں سخت محنت اور ریاضت کا دستور ہے۔ ظاہری و باطنی احکام میں شریعت کی پابندی پر زور دیا جاتا ہے۔

13.7 نمونہ امتحانی سوالات

13.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. تصوف کے سلسلوں کا آغاز............................صدی ہجری میں ہوا۔

(a) پہلی (b) تیسری (c) پانچویں (d) ساتویں

2. قادریہ سلسلے کے بانی....................................ہیں۔

(a) عبدالقادر جیلانیؒ (b) خواجہ معین الدین (c) شیخ احمد (d) خواجہ اسحٰق

3. قادریہ میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔کتاب کے مطالعے پر زور دیا جاتا ہے۔

(a) فتوح الغیب (b) کشف المحجوب (c) عوارف المعارف (d) کوئی نہیں

4. خواجہ معین الدین اجمیری کس سلسلے کے بزرگ ہیں؟

(a) قادریہ (b) چشتیہ (c) سہروردیہ (d) نقشبندیہ

5. حضرت نظام الدین اولیاؒ نے............................شہر میں چشتیہ سلسلے کو عام کیا۔

(a) آگرہ (b) اجمیر (c) دہلی (d) دکن

6. ....میں نوافل پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

(a) قادریہ (b) چشتیہ (c) رفاعیہ (d) سبھی

7. چشتیہ سلسلے میں................................کتاب نصاب تربیت میں شامل ہے۔

(a) رسالہ قشیریہ (b) فتوحات مکیہ (c) مفاتیح الغیب (d) عوارف المعارف

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

8. رفاعیہ سلسلہ .... بزرگ سے منسوب ہے۔

(a). احمد کبیر الرفاعی (b). خواجہ سید مصطفی الرفاعی (c). سید عبد الرحیم الرفاعی (d). کوئی نہیں

9. ظاہری و باطنی احکام میں شریعت کی پابندی پر .... سلسلے میں زور دیا جاتا ہے؟

(a). قادریہ (b). چشتیہ (c). رفاعیہ (d). نقشبندیہ

10. سلسلہ صابریہ اور سلسلہ نظامیہ کس مشہور سلسلے کی شاخیں ہیں؟

(a). نقشبندیہ (b). سہروردیہ (c). چشتیہ (d). قادریہ

13.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. صوفی سلاسل کے آغاز کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
2. سلسلہ قادریہ کے بانی کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
3. سلسلہ قادریہ میں کن کتابوں کو اہمیت حاصل ہے؟ بیان کیجیے۔
4. سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات پر روشنی ڈالیے۔
5. سلسلہ رفاعیہ کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

13.7.3 طویل جوابی سوالات

1. قادریہ سلسلہ کے آغاز و ارتقا اور تعلیمات کا خلاصہ پیش کیجیے۔
2. ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی اشاعت پر گفتگو کیجیے۔
3. سلسلہ رفاعیہ کے اہم بزرگوں اور تعلیمات پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

13.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. قصر عارفاں : از احمد علی چشتی (اردو ترجمہ)
2. الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ : از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
3. سیر الاولیاء : از میر خورد (اردو ترجمہ)
4. سیر العارفین : از حامد بن فضل اللہ جمالی (اردو ترجمہ)
5. تاریخ مشائخ چشت : از پروفیسر خلیق احمد نظامی
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ
7. Encyclopedia of Islam (3rd Edition)

اکائی 14: تصوف کے مشہور سلسلے (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 سلسلہ سہروردیہ
14.3 سلسلہ نقشبندیہ
14.4 دیگر اہم سلسلے
14.4.1 سلسلہ مولویہ
14.4.2 سلسلہ شاذلیہ
14.5 اکتسابی نتائج
14.6 نمونہ امتحانی سوالات
14.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
14.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

آپ نے پچھلی اکائی میں صوفی سلسلوں کے آغاز کا پس منظر کے بارے میں جانا اور اسکے ساتھ ساتھ تصوف کے مشہور سلسلے قادریہ، چشتیہ اور رفاعیہ کے آغاز وارتقااور تعلیمات کے بارے میں جانا۔ اس اکائی میں معروف سلاسل سہروردیہ، نقشبندیہ کے آغاز وارتقااور تعلیمات کے بارے میں جانیں گے۔ اسکے ساتھ دیگر سلسلوں میں سلسلہ مولویہ اور شاذلیہ کا بھی ذکر کیاجائے گا۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ سلسلہ سہر وردیہ اور نقشبندیہ کے اہم بزرگ، اہم کتب اور تعلیمات کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں۔ اسی کے ساتھ سلسلہ مولویہ اور سلسلہ شاذلیہ کی خصوصیات کے بارے میں جانیں گے۔

14.2 سلسلہ سہر وردیہ

اس سلسلہ کا انتساب بالعموم شیخ ابو حفص شہاب الدین سہر وردیؒ کی طرف کیا جاتا ہے جنہوں نے "عوارف المعارف،، جیسی جامع کتاب تصوف پر لکھی، لیکن محققین کے نزدیک حضرت شیخ ضیاء الدین ابو النجیب عبد القاہر سہر وردی (490 تا 563ھ) سلسلہ سہر وردیہ کے حقیقی بانی تھے جن کی تصنیف "آداب المریدین" صوفیہ کرام کے پاس بڑی مقبول ہوئی اور اس پر کثرت سے شرحیں لکھی گئیں اور اضافے بھی کیے گئے، جن میں قابل ذکر "الامر المحکم المربوط" از شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور "خاتمہ" از شیخ کبیر سید محمد حسینی گیسو دراز (معروف بہ بندہ نواز) ہیں۔

حضرت شیخ ضیاء الدین سہر وردی نے بغداد میں علم کی تحصیل کے لیے اپنا وطن سہر ورد چھوڑا۔ ادب، اصول اور فقہ کی تعلیم بغداد میں حاصل کی اور اپنی ذہانت، متانت اور تبحر علمی کے سبب ان کی خدمات مدرسہ نظامیہ (بغداد) میں ایک استاد کی حیثیت سے حاصل کی گئیں، جہاں شیخ ابو الفتوح احمد الغزالی (متوفی 520ھ) تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ حضرت شیخ ابو علی فارمذی (متوفی 477ھ) کی صحبت میں تربیت باطن بطریق عشق حاصل کر چکے تھے۔ وہی محبت الٰہی کی چنگاری انھوں نے شیخ ضیاء الدین سہر وردی کے قلب میں لگادی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ ضیاء الدین سہر وردی نے معاشرہ کی ہماہمی سے کچھ مدت کے لیے خود کو دور کر لیا اور تنہائی میں مقصود حقیقی کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔ طالبین حق کو خبر ہوئی تو ایک ایک کرکے لوگ ان کے پاس تلاش حق میں آنے لگے اور حق کی چنگاری قلب میں لیے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ ہجوم اتنا بڑھا کہ دجلہ کے کنارے ان کے لیے ایک رباط تعمیر کی گئی تاکہ سالکین یکسوئی سے شیخ ضیاء الدین سے استفادہ کر سکیں۔

اسی قیام کے دوران اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں حضرت شیخ ضیاء الدین سہر وردی نے "آداب المریدین" تصنیف فرمائی اور اسی قیام کے دوران آپ کے بھتیجے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہر وردی کے علاوہ آپ کے ارادت مندوں میں حضرت ابو محمد روز بہان بقلی شیرازی (متوفی 606ھ)، حضرت اسمٰعیل قصری (متوفی 589ھ) حضرت عمار بدلیسی (متوفی تقریباً 597ھ) اور حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ (متوفی 618ھ) شامل ہوئے۔ تزکیہ، تصفیہ، تخلیہ اور تجلیہ کی منازل سے گزرے۔ حضرت شیخ ضیاء الدین سہر وردی نے خرقہ خلافت عطا فرما کر اپنے خلفاء کو مختلف مقامات پر تعینات کیا اور دعوت و تبلیغ اسلام اور اشاعت طریق حق کی خدمت ان کے سپرد کی۔ اپنے بھتیجے شیخ الشیوخ کو البتہ بغداد ہی میں اپنے پاس رکھا تاکہ رباط میں تعلیم و تربیت کا نظام استحکام سے آگے بڑھتا رہے۔ حضرت شیخ ضیاء الدین نے

563ھ میں وفات پائی اور حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی جیسا جانشین طریق کی اشاعت کے لیے چھوڑا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے بدلتے حالات میں سجادہ و رباط سنبھالی، حضرت شیخ ضیاء الدین سہروردی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہما الرحمہ کے یکے بعد دیگرے وصال کے بعد طالبین حق کا رجوع آپ کی طرف اتنا بڑھا کہ رباط (خانقاہ) میں توسیع کی ضرورت پڑی، تصانیف کی ضرورت پڑی، دربار خلافت و سلطنت سے دوری کو ترک کرنے کی ضرورت پڑی اور اسلامی دنیا کے دور دراز علاقوں سے آئے ذی استعداد طالبین کی خصوصی رہنمائی کی ضرورت پڑی۔ حضرت شیخ الشیوخ نے اپنی ذمہ داری بخیر وخوبی سنبھالی اور بتوفیق الٰہی اس ذمہ داری کے نباہنے میں حتی الوسع کوئی کمی نہیں کی۔ خانقاہ میں ضروری توسیع دیکھتے دیکھتے ہوگئی، تصوف اور تفسیر میں ''عوارف المعارف'' اور ''نغبتہ البیان'' جیسی معلوماتی اور قلب میں تحریک پیدا کرنے والی متعدد تصانیف سامنے آگئیں۔ دربار سلطنت سے قربت ہوئی تو ایک طرف عباسی سلطان کی ذہن سازی اور دوسری طرف سلطان کے سفیر کی حیثیت سے خوارزم شاہ اور علاء الدین کیقباد کے درباروں میں جانے کا موقع ملا، خلعتیں ملیں، مظلومین کی دادرسی کی طرف حکام کو توجہ دلانے کا موقع ملا۔ مقامی اور دور دور سے آنے والے طالبین حق کی استعداد کے مطابق ان کی تربیت فرمائی اور طریق کی تکمیل پر اجازت بیعت عنایت فرمائی۔ آپ کے خلفاء میں شیخ حمید الدین ناگوری (جنھوں نے حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی سے متاثر ہو کر وصول الی اللہ کے لیے چشتی طریقہ سلوک اپنالیا) شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ نور الدین مبارک غزنوی، شیخ بہاء الدین زکریا ممتاز رہے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا قدس سرہ نے حضرت شیخ الشیوخ کے ارشاد کی تعمیل میں ملتان لوٹ کر وہاں ایک خانقاہ بنوائی اور دعوت و تبلیغ دین کے علاوہ سلسلہ سہروردیہ کی تعلیمات کی اشاعت کا آغاز فرمادیا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا نے اپنے خلفاء کو مختلف علاقوں میں پھیلا دیا جن میں حضرت شیخ سید جلال الدین سرخ پوش بخاری کے ہاتھ پر پنجاب میں قبائل کے قبائل نے اسلام قبول کیا۔ حضرت لعل شہباز قلندر پر جذب کا غلبہ رہا۔ اگرچہ آپ شریعت سے حالت ہوش میں سر مو نہ ہٹے جب کہ فخر الدین عراقی نے شیخ اکبر کا مسلک اپنالیا اور ''لمعات،، جیسی کتاب لکھی۔ حضرت جلال الدین تبریزی نے پہلے ملتان میں اپنے ساتھی بہاء الدین زکریا کے پاس قیام فرمایا۔ پھر دہلی کا رخ کیا جہاں بعض ناگوار واقعات نے ان کو دہلی چھوڑ کر بنگال کے سفر پر آمادہ کیا۔ چنانچہ بنگال پہنچ کر آپ نے جو خانقاہ تعمیر کروائی وہ اشاعت دین اور ذکر و اذکار الٰہی، تصفیہ قلب و روح کا مرکز بن گئی۔

حضرت بہاء الدین زکریا کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ صدر الدین عارف نے سجادہ سنبھالا لیکن ان کی روش، چشتی مشرب کی آئینہ دار رہی، وہی فقر، وہی تواضع، وہی توکل، وہی حکومت بیزاری، وہی پامالی، وہی کشادہ دلی، وہی وسعت ذہنی جس کا اثر لازمی طور پر آپ کے مریدین پر بھی پڑا لیکن پھر آپ کے صاحبزادے حضرت ابوالفتح رکن الدین جب سجادہ نشین ہوئے تو انھوں نے بجائے اپنے والد کے طریق کے اپنے دادا حضرت بہاء الدین زکریا کے طریق کا احیاء فرمایا۔ محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق سے روابط بڑھائے، خلعتیں لیں اور حاجت مندوں میں تقسیم کردیں، وظائف لیے اور فقراء پر صرف کردیے، ہر دو بادشاہوں کو شریعت کی پاسداری، عدل وانصاف اور مظلومین کی دادرسی پر برابر توجہ دلاتے رہے، یہی راستہ حضرت مخدوم سید جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت نے اختیار

فرمایا۔ جن کو نہ صرف اپنے دادا حضرت سید جلال الدین نقوی سرخ پوش بخاری سے اجازت ملی تھی بلکہ ابوالفتح رکن الدین اور حضرت شیخ نصیر الدین محمود چشتی چراغ دہلی نے بھی مجاز بیعت فرمایا تھا۔ حضرت مخدوم کے خلفاء بھی اسلامی ہند میں پھیل گئے۔ تیمور لنگ نے فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی اور نواحی علاقوں کو اس کے سپاہیوں نے بے دریغ تاخت و تاراج کیا، یہاں سے بعض یورپی تاجداروں کی دعوت پر اس نے استنبول کا رخ کیا اور بایزید یلدرم پر جو یورپ فتح کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا ٹوٹ پڑا، ہر دو محاذوں پر خون ہم مذہبوں کا ہی بہا، دولت ان ہی کی لٹی، حکومت انہی کی گئی، علمی سرگرمیاں انہی کی رکیں، شریعت و طریقت کا نظام ان ہی کا درہم برہم ہوا، تیمور اپنے ساتھ کتابیں، اہل علم اور اہل ہنر لے گیا، شمالی ہندوستان میں جو ابتری پھیلی اس کا اثر بعد کی کئی نسلوں تک محسوس کیا جاتا رہا۔ سلسلہ سہروردیہ نے ہمت نہ ہاری، نوشتہ دیوار پڑھا، مشیت باری تعالیٰ کے سامنے سر جھکا دیا اور اپنے مفوضہ کام یعنی اشاعت و استحکام دین اور طالبین حق کی ڈھارس بندھاتے ہوئے ان کی باطنی رہنمائی کے سلسلہ کو منقطع نہ ہونے دیا، دہلی گیا تو کیا غم ہے، شمال (کشمیر)، جنوب (دکن)، مشرق (بہار و بنگال)، مغرب (گجرات و سندھ) کارکرد متحرک ہوگئے۔

سہروردی صوفی بالعموم سلاطین و حکام سے قریبی ربط رکھتے تا کہ مبادی و مسائل دین ان کے ذہن نشین کراتے رہیں، عادل سلطان کا مقام اور اس کی ذمہ داریاں اسے یاد دلاتے رہیں، امانتوں کو ان کے مستحقین تک پہنچانے میں سلاطین کی مدد کریں، امور سلطنت کی دینی اہمیت اور نوافل و کثرت عبادت پر موثر و پرامن نظم و نسق کی برتری ذہن نشین کراتے رہیں، حاجت مندوں کی حاجت روائی، دینی عہدے مثلاً صدر الصدور یا شیخ الاسلام یا مفتی شرع یا قاضی یا محتسب پر مناسب لوگوں کے تقرر کی سفارش کریں بیت المال اور اوقاف کے نظام کو حدود شرع کے مطابق امانت داروں کے سپرد کریں، وہ کبھی کبھی سماع کی محفل میں بھی شریک ہوتے لیکن اسے شعار طریق بنانے سے گریز کرتے۔ مریدین کو علو ہمت کی طرف ترغیب دلاتے، ان کو اذکار و اشغال، مجاہدہ، محاسبہ، مراقبہ، مشاہدہ، معائنہ اور مرتبہ احسان (حضوری) کے حصول کی طرف توجہ کراتے، ساتھ ساتھ اپنی خانقاہوں میں اتنا اناج اور اتنا مال محفوظ رکھتے کہ ہنگامی حالات میں حوائج انسانی پوری ہوتی رہیں، بیش قرار ہدایا پر ممتاز ترین علماء کی خدمات برائے تدریس حاصل کی جاتیں تا کہ وہ یکسوئی سے ذی استعداد طلبہ کو درجہ تحقیق تک پہنچا دیں۔

14.3 سلسلہ نقشبندیہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ بہاء الدین محمد بن محمد البخاری (717 تا 790ھ) سے منسوب ہے جن کا لقب "نقشبند" تھا۔ بعض تذکروں میں وجہ تسمیہ کپڑوں کی رنگ ریزی یا نقش اندازی بتایا گیا ہے جسے ممکن ہے حلال ذریعۂ معاش کے طور پر آپ نے یا آپ کے والد ماجد نے اختیار کیا ہو، اور بعض میں قلب سالک پر اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم یا اللہ تعالیٰ کے ذکر کی نقش اندازی بتایا گیا ہے۔ آپ کی ولادت بخارا سے کچھ فاصلہ پر واقع ایک گاؤں کشک ہندواں یا کوشک ہندواں میں ہوئی جسے بعد میں قصر عارفاں سے موسوم کیا گیا۔ ولادت کے تیسرے روز آپ کے جد امجد آپ کو حضرت خواجہ محمد بابا سماسی قدس سرہ کی خدمت میں لے گئے، بابا سماسی نے آپ کی تربیت کی ذمہ داری اپنے عزیز خلیفہ خواجہ شمس الدین امیر کلال (کوزہ گر) کے سپرد کی۔ اٹھارہ برس کی عمر ہوئی تو حضرت بہاء الدین نقشبند کے جد امجد کو آپ کے نکاح کی فکر ہوئی اور

اس مجلس نکاح میں برکت کے نزول کی غرض سے آپ کو باباسماسی کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت باباسماسی پر آپ کے کچھ واقعات اور خطرات منکشف ہوئے، انہوں نے بڑی شفقت سے اصلاح فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ باطن کی حفاظت کرنی چاہیے۔ حضرت باباسماسی بہاء الدین محمد نقشبند کی تربیت باطنی فرماتے رہے اور وفات سے پیشتر آپ کو خلافت سے نوازا۔ لیکن شورش باطن آپ کو سمرقند و بخارا اور پھر نسف کھینچ لائی جہاں حضرت شمس الدین امیر کلال نے آپ کو بطریق خفی ذکر نفی و اثبات (لا الہ الا اللہ) کی تلقین کی اور اخبار رسول اللہؐ اور آثار صحابہ کی تحقیق اور تحقیق کے مطابق عمل کا حکم فرمایا۔ پھر حضرت امیر کلال ہی کے حکم پر مولانا عارف دیگرانی کی خدمت میں سات برس گزارے، پھر درویش سلطان خلیل کے پاس بارہ برس ملازمت کی، زوال سلطنت کے بعد سات برس خدمت خلق کی اور سات برس راستوں کی مرمت میں صرف کیے۔ پھر وطن لوٹے اور طالبین حق کی رہنمائی میں مشغول ہوگئے۔

حضرت بہاء الدین محمد نقشبند سے پہلے یہ سلسلہ طریقہ خواجگان کہلاتا تھا اور حضرت عبدالخالق غجدوانی خلیفہ یوسف ہمدانی کے بتائے آٹھ کلمات (1) ہوش دردم (2) نظر بر قدم (3) سفر در وطن (4) خلوت در انجمن (5) یاد کرد (6) بازگشت (7) نگاہ داشت اور (8) یادداشت، اس کی خصوصیات سے تھے۔ حضرت نقشبند نے ان میں تین کلمات کا اضافہ فرمایا (9) وقوف عددی (10) وقوف زمانی اور (11) وقوف قلبی۔ حضرت عبدالخالق غجدوانی ہی نے چند وصیتیں بھی فرمائی تھیں جو سلسلہ کی بنیاد مانی گئیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

پیارے فرزند! تقوی کو اپنا شعار بناؤ، وظائف وعبادات کی پابندی کرو اور احوال کی نگہبانی، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ حقوق اللہ، حقوق الرسول، حقوق الوالدین، حقوق المشائخ کی ادائیگی کی سعی کرتے رہو تاکہ رضائے الٰہی سے مشرف ہو جاؤ... قرآن مجید کی تلاوت، بلند آواز سے یا آہستہ، تفکر، خوف اور گریہ کے ساتھ پابندی سے کرو۔ تمام امور میں قرآن کی پناہ لو کہ وہ بندوں پر حق تعالیٰ کی حجت ہے۔ علم فقہ اور علم حدیث سیکھو۔ جاہل صوفیوں سے دور رہو کہ وہ دین کے راہزن ہیں۔ اہل السنت والجماعت اور ائمہ سلف کے مسلک کو اختیار کرو ... عورتوں، نو عمر لڑکوں، بدعتیوں اور دولت مندوں سے صحبت مت رکھو کیوں کہ یہ دین کو برباد کردیتے ہیں۔ فقراء کی صحبت، خلوت نشینی، رزق حلال اور قناعت اختیار کرو۔ حق تعالیٰ کے جلال کا استحضار رکھو اور یوم حساب کو فراموش نہ کرو...نہ کسی کی مدح سے مغرور ہو نہ کسی کی مذمت سے غمگین... لوگوں سے حسن خلق سے پیش آؤ، نہ اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو نہ اس کی رحمت سے ناامید، کثرت سے نمازیں پڑھو، روزے رکھو، مشائخ کی خدمت کرو، ان میں سے کسی کا انکار نہ کرو الا یہ کہ وہ مخالف شرع ہو... جوانمرد سخی بنو... بخل وحسد سے بچو... نفس کی ضرورتوں کا خیال رکھو لیکن نفس کی عزت اور لایعنی کلام سے بچو... کم بولو، کم کھاؤ اور کم سوؤ۔ سماع میں بہت نہ بیٹھو کہ سماع کی کثرت سے نفاق پیدا ہوتا ہے اور دل مردہ، سماع کا انکار بھی نہ کرو۔ سماع جائز نہیں مگر اس شخص کے لیے جس کا دل زندہ ہو اور نفس مردہ ہو... چاہیے کہ تمہارا دل غمگین، بدن بیمار، آنکھ اشکبار، عمل خالص، دعا مجاہدہ کے ساتھ، کپڑا پرانا، رفیق درویش، گھر مسجد، مال کتب دین، آرائش زہد اور مونس باری تعالیٰ ہو۔ اس شخص کی صحبت اختیار کرو جس میں پانچ خصلتیں ہوں: (1) فقیری کو امیری پر ترجیح دے (2) دین کو دنیا پر ترجیح دے (3) ذلت کو عزت پر ترجیح دے (4) علم ظاہر وباطن کا جاننے والا ہو (5) موت کے لیے تیار ہو۔

حضرت بہاء الدین نقشبند قدس سرہ نے حسب ضرورت ان میں ترمیم واضافہ فرمایا۔ مثلاً سماع کی بابت فرمایا کہ ہم یہ کام نہیں

کرتے اور انکار بھی نہیں کرتے اور فرمایا کہ ہمارا طریق صحبت ہے (یعنی موافقان طریق کی صحبت) کیونکہ خلوت میں شہرت ہے اور شہرت میں آفت۔ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کی وفات 3 ربیع الاول 791ھ میں ہوئی۔ آپ کے خلفاء میں حضرت علاء الدین عطار (متوفی 802ھ) سے سلسلہ نقشبندیہ آگے بڑھا اور حضرت ناصر الدین عبید اللہ احرار، حضرت عبد الرحمن جامی (صاحب "نفحات الانس") حضرت محمد زاہد وخشی، حضرت درویش محمد، حضرت خواجگی المکنگی، حضرت باقی باللہ، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (صاحب "مکتوبات امام ربانی") حضرت شیخ محمد سعید، حضرت شیخ محمد معصوم، حضرت شیخ محمد یحیٰ، حضرت شیخ محمد ہاشم کشمی، حضرت سید آدم بنوری، حضرت میر نعمان کشمیری، حضرت سید نور محمد بدایونی، حضرت میر زا مظہر جان جاناں، حضرت شاہ عبد اللہ معروف بہ شاہ غلام علی دہلوی، حضرت شاہ عبد الرحیم فاروقی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صاحب تفسیر مظہری و رسالہ در تصوف "ارشاد الطالبین") اس سلسلے کے معروف بزرگ ہیں۔ دکن میں حضرت مسکین شاہ، حضرت سعد اللہ، حضرت بخاری اور حضرت عبد اللہ نقشبندی نے سلسلہ کی غیر معمولی خدمت فرمائی۔

حضرت عبید اللہ احرار کے ذریعہ سلسلہ نقشبندیہ وسطی ایشیا میں پھیلا، حضرت باقی باللہ اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے ذریعہ برصغیر ہندوپاک اور مولانا خالد رومی نقشبندی کے ذریعہ عالم عرب اور ترکی میں حتیٰ کہ "مکتوبات امام ربانی" کے ترکی، عربی اور اردو میں متعدد مکمل تراجم اور انگریزی میں جزوی ترجمے بھی ہوئے۔

14.4 دیگر اہم سلسلے

14.4.1 سلسلہ مولویہ

حضرت مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی کی طرف منسوب مشہور سلسلہ جسے بعض مقامات پر سلسلۂ جلالیہ بھی کہا جاتا ہے۔ لفظ "مولوی" میں یاء نسبتی مانی جاتی ہے اس لیے مولوی کا ترجمہ ہوتا ہے "مولیٰ والا" یعنی "اللہ والا"۔ صاحب "مناقب العارفین" کے مطابق رومی کو "مولوی" کا لقب ان کے والد حضرت بہاء الدین ولد نے دیا تھا۔ بعد میں جلال الدین محمد رومی کو "مولوی معنوی" کہا گیا، سلسلہ بھی اسی نسبت سے مولویہ کہلایا۔ اور آپ کے پیروؤں نے بھی یہ لقب اختیار کر لیا۔ قونیہ میں مولوی جلال الدین محمد رومی کی وفات کے بعد حسام الدین چلپی نے سجادہ سنبھالا جن کی درخواست پر ہی رومی نے اپنی شہرہ آفاق "مثنوی" لکھی جو تمام صوفی سلاسل میں اپنے سادہ اسلوب، تہہ در تہہ معانی، اسرار و حقائق کی بے نقابی، حکیمانہ و صوفیانہ مضامین اور عارفانہ کلام کے سبب بے حد مقبول ہوئی۔ حسام الدین چلپی کے انتقال کے بعد رومی کے فرزند سلطان ولد نے والد کے احوال زندگی قلم بند کیے اور ان کے طریق کو باقاعدہ ایسی شکل دی جو آج تک چلی آ رہی ہے۔

رومی خود حنفی فقیہ بلکہ قونیہ میں مفتی و مرجع احناف تھے لیکن غنا و رقص کی اباحت کے قائل اور جذب و مستی کی کیفیت میں بکثرت ان پر عامل رقص کی شکل یہ تھی اور اب بھی جاری ہے کہ حلقہ ذکر میں درویش اپنے دائیں پاؤں کو مضبوطی سے جما کر مختلف سازوں کے سر اور تال کے مطابق بایاں ہاتھ دل پر رکھ کر دایاں ہاتھ پھیلائے کاندھے سے قدرے اوپر اٹھا کر، چکر لگاتے اور پاؤں زمین پر مارتے

ہیں، کلام اور ساز کی ہم آہنگی اور درویشوں کی محبوب حقیقی کی طرف کامل توجہ ایک نشاط و انبساط کی ایسی کیفیت پیدا کر دیتی ہے کہ درویش عشق کی مستی میں صرف یہ احساس و شعور رکھتے ہیں کہ وہ قلب و روح و جسم سے محبوب حقیقی کا طواف کر رہے ہیں۔ ذکر لسانی تو تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہتا ہے لیکن درویش کیف و مستی میں کئی کئی دن شب و روز اس خاص رقص میں مشغول رہنے کی توانائی رکھتے ہیں اور نماز پنجگانہ کی ادائیگی کے اوقات سے جداگانہ وقت میں رقص بھی جاری رکھتے ہیں۔ غناء ور قص (پائے کوبی) پر علماء ظاہر نے سخت تنقیدیں کیں۔ بلکہ مصر میں اس پر حکومت کی طرف سے امتناع بھی عائد کیا گیا، مثنوی کی بعض عبارتوں سے اتحاد و توافق بین المذاہب کے نظریات بھی استنباط کیے گئے جس پر مزید شورش ہوئی لیکن سلسلہ مولویہ ان تنازعات سے دور اپنی روش پر قائم رہا۔

سلسلہ مولویہ کی اشاعت کا سہرا سلطان ولد کے سر باندھا جاتا ہے، جنہوں نے ایشیائے کوچک کو اپنے مریدین اور کارکنوں سے بھر دیا۔ ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ سلطان سلیمان قانونی کو ایک مولوی درویش نے کلاہ بھی عطا کی۔ ایک اور روایت کے مطابق جب سلطان مراد ثانی نے 1435ء میں قونیہ فتح کیا تو اس کی ملاقات رومی کی اولاد میں مولوی عارف چلپی سے ہوئی جو ایک باکمال صاحب معرفت بزرگ تھے، سلطان سلیم اول نے دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایران و مصر کی فتح کا عزم کیا اور اس کی فوجیں قونیہ سے گزریں تو اس وقت کے شیخ الاسلام کی تحریک پر اس نے مولوی خانہ تباہ کرنے کا حکم دے دیا۔ جو جلد ہی منسوخ ہو گیا۔ اسی صدی کے اواخر میں مزارات اور مولوی خانوں کی جانب ایک نمایاں تبدیلی آئی اور دولت عثمانیہ نے ان کی قدر و منزلت محسوس کی حتی کہ سلطان مراد چہارم نے سنہ 1634ء میں قونیہ کا خراج مولوی چلپی کے حوالہ کر دیا، قونیہ کے علاوہ منیسا، قرہ حصار، بحریہ، مصر، گیلی پولی، بورسہ، مدینہ طیبہ، دمشق اور بیت المقدس میں مولوی خانے اور کینیہ، کرمان، رملہ، تتز (نسالیہ)، تمپہ، سمرنا، سالونیکا اور قبرص میں مولوی تکیہ موجود تھے۔ اقتدار ملنے پر مصطفی کمال اتاترک نے تمام تکیے بند کروا دیے اور قونیہ کے مولوی خانہ کا کتب خانہ عجائب خانے میں منتقل کروا دیا۔

شیخ سلسلہ کا قیام قونیہ میں تھا اور اس کے القاب مختلف تھے: ملاخنکار، حضرت پیر، چلپی ملا، عزیز آفندی۔ ہارٹمن نے سجادہ پر بیٹھنے والوں میں چھبیس ناموں کی فہرست دی ہے جو بظاہر نامکمل ہے، چنانچہ اکاش نے قونیہ میں جن سجادہ نشین سے ملاقات کی تھی وہ اپنے انتالیسویں یا چالیسویں سجادہ نشین ہونے کے بارے میں متذبذب تھے۔

مبتدیوں کو سلسلہ مولویہ میں ایک ہزار ایک (1001) دن تک مولوی خانہ میں آنے والوں کی خدمت گاری تفویض کی جاتی تا کہ کبر نفس دور ہو، پھر انھیں مقررہ لباس دیا جاتا اور ہر ایک کے لیے علحدہ حجرہ مختص کر دیا جاتا اور مجاہدات تعلیم کیے جاتے جس میں وہ برابر مشغول رہتے، پھر یکے بعد دیگرے مراقبہ، سماع اور پائے کوبی کی باری آتی اور ان ذرائع سے وہ تقرب الی اللہ کے حصول میں منہمک ہو جاتے۔

درویشوں کا لباس ایک کلاہ (جسے "سکہ" کہتے تھے)، ایک بغیر آستین کا طویل لبادہ، ایک آستین دار صدری (جسے "دست گل" کہتے تھے)، ایک چوڑا کمر بند (جسے الف لام کہا جاتا تھا) اور ایک آستین دار چوغہ (جسے خرقہ کہتے اور کاندھوں پر ڈالے رہتے تھے) پر مشتمل تھا، چوغہ کا رنگ ارغوانی اور لبادہ یا جبہ کا رنگ سبز ہوتا تھا۔ آلات موسیقی میں بانسری (نے)، ستار، رباب، ڈھول، طنبورہ اور غالباً جھانجھ استعمال

ہوتے۔ قونیہ میں حلقۂ ذکر مہینہ میں دو مرتبہ بعد نماز جمعہ منعقد ہوتا، اور قسطنطنیہ میں تکیوں کی کثرت کے باعث مہینہ میں کئی مرتبہ منعقد ہوتا تاکہ ہر تکیہ کے لوگ شامل ہوسکیں۔

ہندوستان میں حیدر آباد کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ "صاحب المثنوی" اور "مراۃ المثنوی" جیسے شہ پاروں کے مؤلف قاضی تلمذ حسین سلسلہ مولویہ سے وابستہ اور حیدر آباد کے متوطن تھے۔

14.4.2 سلسلہ شاذلیہ

حضرت سید ابوالحسن علی شاذلی 593) تا656ھ) سے منسوب سلسلہ جس کے حقیقی بانی بعض محققین کے نزدیک ابومدین شعیب قدس سرہ تھے جن کے خلیفہ عبدالسلام ابن مشیش قدس سرہ نے حضرت سید ابوالحسن علی شاذلی کی باطنی تربیت فرمائی۔

حضرت ابوالحسن علی شاذلی کی ولادت شاذلہ (ٹیونس کے ایک شہر) میں 593ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ احمد ابن عطاء اللہ اسکندری کے مطابق آپ حضرت حسن بن علی بن ابی طالب کی اولاد میں تھے۔ ابتداء آپ کو کیمیا سازی کا شوق ہوا، آپ نے دعا مانگی تو جواب ملا کیمیا تو تمہارے پیشاب میں ہے، جتنا چاہو سونا بنالو، آپ نے پیشاب فرمایا تو دیکھا کہ جس شئے پر پیشاب فرمایا وہ سونا بن چکی ہے، آپ کے دل میں سونے سے بوجہ نجاست کراہت پیدا ہوگئی، آپ سیاحت پر نکل کھڑے ہوئے۔ تیونس پہنچے جہاں جمعہ کے دن، بتایا جاتا ہے کہ حضرت خضر سے ملاقات ہوئی، پھر آپ نے مشرق کا رخ فرمایا، مختلف شہروں سے گزرتے مکہ معظمہ پہنچے، حج ادا کیا، عراق آئے جہاں ابوالفتح واسطی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بلاد مغرب (شمالی مغربی افریقہ) لوٹ جانے کا اور عبدالسلام ابن مشیش سے ملنے کا مشورہ دیا، آپ مغرب لوٹے، عبدالسلام ابن مشیش کی زیارت فرمائی اور شرف بیعت سے نوازے گئے، پھر مرشد کے حکم پر شاذلہ میں قیام فرمایا اور مرشد کے ارشادات کی تعمیل میں لگ گئے۔ پھر بلاد شرق کا رخ کیا، ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی، ان سے نصائح کی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو، ماسوی کے ذکر سے اپنی زبان کو اور ماسوی کی تماثیل وتصورات سے اپنے قلب کو محفوظ رکھو، اپنے اعضاء کی حفاظت اور فرائض کی ادائیگی تم پر واجب ہے۔ اس کے بعد کچھ دعاؤں کی تلقین کی۔ اپنے سفر کے دوران حضرت ابوالحسن علی شاذلی نے علوم ظاہرہ بھی درجہ کمال میں مختلف اساتذہ سے حاصل کیے۔ مختلف موقعوں پر متشکک وحاسد علماء نے آپ کا امتحان لیا۔ آپ کی کرامات کو شعبدہ بازی قرار دے کر مصر کے بعض سلاطین کو آپ کے خلاف بھڑکایا، چنانچہ انھوں نے آپ کو شہر بدر کردیا، پھر آپ کو غیبی بشارت ملی کہ آزمائش کا دور گذر چکا، اب آسائش کا دور آیا ہے، آپ مصر لوٹے۔ آپ کی مجلس میں اکابر علماء جیسے سلطان العلماء عزالدین بن عبدالسلام، تقی الدین ابن دقیق العید، زکی بن عبدالعظیم منذری، ابن الصلاح، ابن الحاجب، جمال الدین ابن عصفور، نبیہ الدین بن عوف، علامہ ابن عربی کے شاگرد یاسین، قاضی بدر الدین بن جماعتہ وغیرہ شریک ہوتے، اسرار الحق پر آپ کا کلام سنتے اور سر دھنتے۔ ابن دقیق العید نے فرمایا کہ میں نے سید ابوالحسن شاذلی سے بڑا عارف نہیں دیکھا ایک مجلس میں عزالدین بن عبدالسلام، تقی الدین بن دقیق العید، مجدالدین علی بن وہب، محی الدین بن سراقہ، مجدالدین اخمیمی اور حضرت شیخ ابوالحسن علی شاذلی جمع ہوئے "رسالہ قشیریہ" پڑھا جانے لگا اور ان اکابر میں سے ہر ایک نے اپنے طور پر اس کے معانی پر کلام فرمایا۔ حضرت شیخ ابوالحسن خاموشی سے سنتے رہے، پھر سب آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور خواہش کی کہ آپ سے بھی کچھ

سننا چاہتے ہیں۔ شیخ ابوالحسن علی شاذلی نے فرمایا کہ آپ لوگ سادات وقت اور اکابر عصر ہیں، آپ نے تو کلام کر ہی لیا۔ سب نے اصرار کیا کہ ہم آپ سے بھی سننا چاہتے ہیں۔ حضرت شیخ نے کچھ دیر توقف فرمایا پھر اسرار و علوم پر آپ کے مونہہ سے ایک دریا جوش مارتا نکلا۔ سلطان العلماء بے اختیار ہو کر مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے کہ یہ نادر کلام سنو، یہ اللہ کی مراد و منشاء اور مطلوب و معہود الٰہیٰ کے کتنا قریب ہے۔

حضرت ابوالحسن علی شاذلی کے بتائے ہوئے طریق میں اصول خمسہ معروف ہیں۔(1) ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرنا(2) اقوال و افعال میں (ظاہراً اور باطناً) سنت کی پابندی کرنا(3) بلندی و پستی میں خلق سے بے تعلق رہنا(4) چھوٹی بڑی ہر بات میں اللہ سے موافقت رکھنا(5) خوشحالی ہو یا بدحالی (یا غم ہو یا مسرت) اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا۔

ان کے علاوہ سید ابوالحسن علی شاذلی نے تقوی، کتاب و سنت میں بتائے گئے اوامر و نواہی کی پابندی اور مکارم حسنہ سے مزین ہونے کی بھی تلقین فرمائی۔ آپ کی تعلیمات میں کامل استقامت، صدق مع اللہ، حسن معاملہ، عبودیت تامہ، رعایت عامہ، علوہمت، معرفت الہیٰہ، وصول میں پیش آنے والی رکاوٹوں پر عدم وقوف، مجاہدہ، یقین کبیر، ترک ارادہ، ترک تدبیر، تخلق باخلاق اللہ، اتباع سنت، غیر اللہ کی طرف عدم میلان، رضا بقضاء الٰہی، رجوع الی اللہ، توکل علی اللہ، شامل ہیں۔ مواظبت علی الذکر (ذکر کی پابندی) کی بابت فرماتے کہ مدار اعمال یہی ہے، اسی سے وصال ہوتا ہے اور اسی سے کامل درجہ کمال پایا جاتا ہے۔

فرماتے کہ شیخ وہ نہیں جو تجھے تھکا دینے والی چیزوں میں الجھا دے، شیخ تو وہ ہے جو تیری راحت کا خیال کرے۔

فرماتے کہ یہ طریق نہ رہبانیت سے حاصل ہوتا ہے، نہ صرف جو پر اکتفا کرنے سے، نہ خلق الٰہی سے دور غاروں میں قیام سے، یہ اوامر الٰہی پر صبر اور ہدایت الٰہی پر یقین سے حاصل ہوتا ہے۔

ہر مرید کی استعداد و میلانات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی رہنمائی فرماتے، صنعت و حرفت اور تجارت چھوڑنے کے لیے کبھی نہ کہتے، نہ دوسرے مشائخ کی صحبت اختیار کرنے سے منع فرماتے بلکہ فرماتے کہ اگر تم کو کوئی نہر اس نہر سے زیادہ میٹھی ملے تو اس سے اپنا حصہ لے لو، افشاء راز کو البتہ سختی سے ناپسند فرماتے۔

آپ نے بہت سے احزاب و اوراد ترتیب و تلقین فرمائے جن میں سب سے زیادہ شہرت "حزب البحر" کو ہوئی۔ دیگر احزاب کے نام ہیں: (1) حزب الکبیر (2) حزب الآیات (3) حزب الانوار (4) حزب النور (5) حزب الطمس (6) حزب الحمد (7) حزب اللطف (8) حزب الاخفائ (9) حزب النصر (10) حزب البر (11) حزب الکفایہ (12) حزب الشکوی (13) حزب الفلاح (14) حزب الدائرۃ (15) حزب المخفی (16) حزب التوسل (17) الحفیظہ

حضرت سید ابوالحسن علی شاذلی کے خلیفہ حضرت ابوالعباس المرسی (متوفی 686ھ) نے 36 برس اسکندریہ میں سلسلہ شاذلیہ کی تعلیمات کی اشاعت میں گزارے، ان کے مرید حضرت یاقوت عرشی (متوفی 707ھ) اور مرسی اور عرشی کے مرید حضرت تاج الدین ابن عطا اسکندری (متوفی 709ھ و مصنف "لطائف المنن" اور "الحکم") کی کاوشوں سے سلسلہ شاذلیہ مصر، الجزائر اور ٹیونس میں مقبول ہوا،

انیسویں صدی میں سیدی معصوم محمد بن احمد کی کوشش سے سلسلہ کی توسیع ہوئی۔

شاذلیہ سے وابستہ مشاہیر میں ابو العباس مرسی، یاقوت عرشی، ابن عطاء اسکندری، محمد ابن صباغ، محمد وفا، علی بن وفا، جلال الدین سیوطی، عبد الوہاب شعرانی، داؤد بن ابراہیم اسکندری، ابن عباد اور علی متقی الہندی کے نام معروف ہیں:

سلسلہ شاذلیہ کی خصوصیات:

(1) علم وحال اور ہمت ومقال کو جمع کر دیا گیا۔

(2) جذب، مجاہدہ، عنایت، ادب، قرب، تسلیم ورعایت کو شامل کر لیا گیا۔

(3) علم ظاہر وعلم باطن کو سمیٹنے کا اہتمام کیا گیا۔

(4) شریعت وحقیقت کے تمام ممکنہ پہلو جمع کر دیے گئے۔

(5) ایسے سکر و مستی سے محفوظ رکھا گیا جو حدود ادب سے تجاوز کی طرف لے جائے اور ایسے صحو و ہوش سے مبرا رکھا گیا جو صاحبان مغز کو حجابات میں مشغول کر دے۔

(6) حقائق توحید اور اسرار مجاہدات کی طرف رہنمائی کی گئی۔

(7) استغراق یا سوء ظن کے سبب ہونے والے انقباض سے، جو امید کی راحت اور شوق وطلب کی لذت محجوب کر دیتا ہے، اور ایسے انبساط سے جو مقام شرم وحیا سے گرا دیتا اور بے ادبی کی طرف مائل کر دیتا، دور رکھا۔

(8) اس کا وصف امتیاز خالصتاً اللہ عم نوالہ کی رحمت سے اس نقطۂ اعتدال پر جمانا ہے جو ہدایت وکامیابی کے حصول میں توسط وکمال سے عبارت ہے۔

14.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے مندرجہ ذیل نکات سیکھے:

- دسویں صدی عیسوی کے حالات کے خاص پس منظر میں مسلم سماج میں تصوف کے جو مختلف سلسلے وجود میں آئے ان میں سلسلہ قادریہ، سلسلہ رفاعیہ اور سلسلہ چشتیہ کے ساتھ سلسلہ سہروردیہ، سلسلہ نقشبندیہ سلسلہ مولویہ، اور سلسلہ شاذلیہ بھی شامل ہیں۔
- تاتاری حملوں کے بعد صوفی سلسلوں کے بزرگوں نے امت مسلمہ کے زخموں پر مرہم کا کام دیا اور انہیں خدا سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔
- سلسلہ سہروردیہ کے بانی شیخ عبد القاہر ابو نجیب سہروردی ہیں لیکن شیخ شہاب الدین کو اس سلسلہ کا بانی مانا جاتا ہے۔ آداب المریدین اور عوارف المعارف کی کتابیں سہروردی سلسلہ میں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

- سہروردی صوفی بالعموم سلاطین و حکام سے قریبی ربط رکھتے تاکہ مبادی و مسائل دین ان کے ذہن نشین کراتے رہیں، عادل سلطان کا مقام اور اس کی ذمہ داریاں اسے یاد دلاتے رہیں، امانتوں کو ان کے مستحقین تک پہنچانے میں سلاطین کی مدد کریں۔
- سلسلہ نقشبندیہ کے بانی شیخ بہاوالدین محمد نقش بند ہیں۔ ہندوستان میں یہ سلسلہ شیخ خواجہ باقی باللہ لے کر آئے، اور دہلی کو مرکز بنا کر اس سلسلے کی تعلیمات کو عام کیا۔
- خواجہ باقی باللہ کی تربیت میں شیخ احمد سرہندی نے منازل سلوک طئے کیے اور خواجہ باقی باللہ کے بعد سلسلہ نقشبندیہ کو ہندوستان اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں عام کیا۔
- شیخ احمد سرہندی کے تعلیمات خطوط کی شکل میں ہیں اور مکتوبات امام ربانی کے نام سے معروف ہیں اور نقشبندیہ سلسلہ میں یہ مکتوب نہاہت اہم کتاب شمار ہوتی ہے۔
- حضرت بہاء الدین محمد نقشبند سے پہلے یہ سلسلہ طریقہ خواجگان کہلاتا تھا اور حضرت عبد الخالق غجدوانی خلیفہ یوسف ہمدانی کے بتائے آٹھ کلمات (1) ہوش دردم (2) نظر بر قدم (3) سفر در وطن (4) خلوت در انجمن (5) یاد کرد (6) بازگشت (7) نگاہ داشت اور (8) یادداشت، اس کی خصوصیات سے تھے۔ حضرت نقشبند نے ان میں تین کلمات کا اضافہ فرمایا (9) وقوف عددی (10) وقوف زمانی اور (11) وقوف قلبی
- سلسلہ رومیہ مولانا جلال الدین رومی سے منسوب ہے۔ اس سلسلہ میں مبتدیوں کو (1001) دن تک مولوی خانہ میں آنے والوں کی خدمت گاری تفویض کی جاتی تاکہ کبر نفس دور ہو، پھر انھیں مقررہ لباس دیا جاتا اور ہر ایک کے لیے علحدہ حجرہ مختص کردیا جاتا اور مجاہدات تعلیم کیے جاتے جس میں وہ برابر مشغول رہتے، پھر یکے بعد دیگرے مراقبہ، سماع اور پائے کوبی کی باری آتی اور ان ذرائع سے وہ تقرب الی اللہ کے حصول میں منہمک ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک خاص قسم کے رقص کا رواج رہا ہے۔
- سلسلہ شاذلیہ کے بانی شیخ ابو الحسن شاذلی ہیں۔ حضرت ابو الحسن علی شاذلی کے بتائے ہوئے طریق میں اصول خمسہ معروف ہیں۔ (1) ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرنا (2) اقوال و افعال میں (ظاہراً اور باطناً) سنت کی پابندی کرنا (3) بلندی و پستی میں خلق سے بے تعلق رہنا (4) چھوٹی بڑی ہر بات میں اللہ سے موافقت رکھنا (5) خوشحالی ہو یا بدحالی (یا غم ہو یا مسرت) اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا۔

14.6 نمونہ امتحانی سوالات

14.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سلسہ سہروردیہ کے بانی.................................ہیں۔

(a). شیخ ابو حفص شہاب الدین (b). باقی باللہ (c). محمد بہاوالدین (d). ابو نجیب ضیاء الدین

2. آداب المریدین کے.......................... مصنف ہیں۔

(a). ابو نجیب ضیاء الدین (b). شہاب الدین سہر وردی (c). محمد بہاوالدین (d). کوئی نہیں

3. ہندوستان میں سلسلہ سہر وردیا کے مشہور سہر وردی صوفی .... ہیں۔

(a). بہاوالدین زکریا (b). باقی باللہ (c). نظام الدین اولیا (d). سبھی

4. شیخ شہاب الدین سہر وردی کی مشہور تصنیف.......................... ہے۔

(a). آداب المریدین (b). عوارف المعارف (c). مکتوبات ربانی (d). کوئی نہیں

5. .... سلسلے کے بزرگ سلاطین اور حکمراں سے قریبی تعلقات رکھتے ہیں۔

(a). قادریہ (b). چشتیہ (c). سہر وردیہ (d). نقشبندیہ

6. شیخ احمد سرہندی کا تعلق.......................... سلسلہ سے ہے۔

(a). قادریہ (b). چشتیہ (c). سہر وردیہ (d). نقشبندیہ

7. ہندوستان میں سلسلہ نقشبندیہ کے بانی.......................... ہیں۔

(a). خواجہ باقی باللہ (b). شیخ احمد سرہندی (c). شیخ طاہر (d). کوئی نہیں

8. سلسلہ نقشبندیہ کی سب سے اہم کتاب.......................... ہے۔

(a). مکتوبات امام ربانی (b). آداب المریدین (c). رسالہ قشیریہ (d). مکتوبات معصوم

9. سلسلہ نقشبندیہ کے بنیادی افکار کتنے ہیں۔

(a). سات (b). نو (c). گیارہ (d). تیرہ

10. سلسلہ مولویہ.......................... صوفی کی طرف منسوب ہے۔

(a). جلال الدین رومی (b). ابوالحسن شاذلی (c). احمد کبیر الرفاعی (d). شیخ بہاوالدین

14.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سلسلہ سہر وردیہ کی خصوصیات پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
2. سلسلہ نقشبندیہ کی بنیادی تعلیمات پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. مکتوبات امام ربانی پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
4. سلسلہ مولویہ کا تعارف کرایے۔
5. سلسلہ شاذلیہ کی تعلیمات کا ذکر کیجیے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

14.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سلسلہ سہروردیہ کا تعارف کرائیے اور اس کی خدمات بیان کیجیے۔
2. سلسلہ نقشبندیہ پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
3. سلسلہ رومیہ اور سلسلہ شاذلیہ کی تعلیمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

14.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. قصر عارفاں : از احمد علی چشتی (اردو ترجمہ)
2. الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ : از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
3. سیر الاولیاء : از میر خورد (اردو ترجمہ)
4. سیر العارفین : از حامد بن فضل اللہ جمالی (اردو ترجمہ)
5. تذکرہ مشائخ نقشبندیہ : از نور بخش توکلی
6. اخبار الاخیار : از شیخ عبد الحق محدث دہلوی (اردو ترجمہ)
7. گلزار ابرار : از محمد غوثی شطاری (اردو ترجمہ)
8. اردو دائرہ معارف اسلامیہ
9. Encyclopedia of Islam (3rd Edition)
10. Sufi Orders in Islam : J. S. Trimingham
11. A History of Sufism in India : S. A. A. Rizvi

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू युनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 15: تصوف کی مشہور کتابیں (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 کتاب اللمع فی التصوف

15.3 دیگر اہم کتابیں

15.3.1 قوت القلوب

15.3.2 رسالہ قشیریہ

15.3.3 الاربعین

15.3.4 فتوح الغیب

15.3.5 عوارف المعارف

15.3.6 الفتوحات المکیہ

15.4 اکتسابی نتائج

15.5 نمونہ امتحانی سوالات

15.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

گو تاریخ تصوف کا آغاز پہلی اور دوسری صدی ہجری سے ہوتا ہے لیکن تصوف کی کتابوں کی تصنیف و تالیف کے کام کا آغاز چوتھی اور پانچویں صدی ہجری سے پہلے نہیں ہوسکا۔ اس اکائی میں ہم کوشش کریں گے کہ تصوف کی بنیادی اور اہم کتابوں کا تعارف

آپ کو کرادیں۔ ساتھ ہی ہماری کوشش یہ بھی ہوگی کہ ان کتابوں کے موضوعات اور ان کی کچھ تعلیمات کو بھی درج کر دیا جائے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد تصوف اور تاریخ تصوف کے طالب علموں کو تصوف کی مشہور و معروف کتابوں سے متعارف کرانا ہے۔ اس میں ہماری کوشش ہوگی کہ طلبہ مختلف ادوار میں لکھی جانے والی تصوف کی مشہور کتابوں کے بارے میں جان لیں اور ان کے مضامین سے بھی واقفیت حاصل کرلیں۔

15.2 کتاب اللمع فی التصوف

تصوف پر ''کتاب الرعایۃ لحقوق اللہ،، از حارث بن اسد المحاسبی کے بعد لکھی گئی کتب میں غالباً ''کتاب اللمع فی التصوف'' اولین کتاب ہے۔ جس کے مولف ابو نصر سراج الطوسی (المتوفی 378ھ) نے تصوف کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے پیش کیا۔

آپ کا نام عبداللہ بن محمد بن یحییٰ سراج کنیت ابو نصر اور لقب طاؤس الفقراء تھا۔ آپ طوس میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں معروف تھا۔ آپ کے اساتذہ میں جعفر الخلدی ابو بکر محمد بن داؤد الدقی اور احمد بن محمد السائح کے نام ملتے ہیں۔ جن میں ظاہری علوم میں کمال کے ساتھ باطنی علوم میں کمال جمع تھا۔ عبدالرحمن جامی کے بموجب ابو نصر سراج کے شیخ طریقت حضرت ابو محمد عبداللہ بن المرتعش (المتوفی 328ھ) تھے جنھوں نے حضرت جنید بغدادی کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا۔ آپ سے استفادہ کرنے والوں میں ابو الفضل بن حسن سرخسی کا نام سرفہرست ہے۔ اس لیے کہ ابو سعید بن ابی الخیر جیسا یگانہ عصران کا مرید تھا۔

ابو نصر سراج نے صوفیہ کرام کی اتباع میں متعدد سفر کیے جن میں انطاکیہ، بغداد، بصرہ، رملہ، دمشق، طرابلس، مصر، دمیاط، بسطام، تستر اور تبریز کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایک راویت کے مطابق آپ کو سہل بن عبداللہ تستری کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان اسفار میں اکابر علماء، فقہاء، صوفیہ اور مشائخ سے ملاقاتیں کیں اور کسب فیض کیا۔ ایک واقعہ حضرت علی ہجویری (مصنف ''کشف المحجوب'') اور فرید الدین عطار (مصنف تذکرۃ الاولیاء) نے اپنی کتابوں میں شیخ ابو نصر سراج کی بابت نقل کیا ہے جس سے آپ کی باطنی کیفیت کا قدرے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایک دفعہ شیخ ابو نصر سراج رمضان المبارک میں بغداد تشریف لائے اور مسجد شونیزیہ میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے قیام و عبادت کے لیے ایک حجرہ فراہم کیا گیا۔ آپ نے پوراماہ رمضان مسجد میں امامت فرمائی اور تراویح میں پانچ مرتبہ قرآن مجید ختم کیا۔ ہر روز رات کے وقت خادم ایک روٹی آپ کے حجرہ میں رکھ آتا۔ ماہ رمضان ختم ہوا، آپ نے عید کی نماز پڑھائی اور مسجد شونیزیہ سے روانہ ہوگئے۔ آپ کی روانگی کے بعد جب خادم دن میں آپ کے حجرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ماہ رمضان میں پہنچائی گئیں پوری تیس (30) روٹیاں جوں کی توں حجرہ میں رکھی ہیں۔

ابو نصر سراج نے سنہ 378ھ میں سفر آخرت فرمایا اور طوس ہی میں آسودہ خاک ہوئے۔

''کتاب اللمع'' سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں ایسا گنجینہ علم تصوف ہے جس میں ہر موضوع کو قرآنی آیات، احادیث نبویہ

اور اقوال مشائخ سے مدلل بیان کیا گیا ہے۔ خوبصورت اشعار اور نادر حکایات ان پر مستزاد ہیں۔ ہر بات شریعت کی کسوٹی پر پرکھی گئی ہے اور ناقدین تصوف کے اشکالات حل کیے گئے ہیں۔ کتاب میں کل 123 ابواب ہیں جن میں تصوف کا تعارف، محدثین، فقہاء اور صوفیہ کے مخصوص علوم وفنون، توحید، معرفت، احوال و مقامات، قرآن فہمی کے اصول، اتباع اسوہ و اخلاق رسول اللہؐ، اسوہ صحابہ، اصحاب الصفہ، آداب صوفیہ درباب طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، سفر، علم، طعام، لباس، وجد و سماع، ایثار، تحائف، کسب معاش، نکاح، تربیت اولاد، محبت و رفاقت، مسائل تصوف، کرامات، شطحات، حریت و عبودیت اور اغلاط صوفیہ پر مفصل کلام کیا گیا ہے:

"کتاب اللمع،، کے ماخذ میں قرآن مجید و احادیث نبویہ کے علاوہ "اخبار مکہ" از ازرقی "المشاھدات" از عمرو ابن عثمان المکی، "آداب الصوفیہ"، از ابو سعید الخراز، "المناجات"، از جنید بغدادی "الوجد" از ابو سعید ابن الاعرابی "معرفتہ المعارفات" از ابراہیم الخواص، "شرح شطحیات ابی یزید" از جنید بغدادی اور ابو تراب نخشبی کی مؤلفات کا صراحتہ ذکر ملتا ہے۔

"کتاب اللمع فی التصوف" سے چند اقتباسات کی تلخیص ذیل میں درج ہے:

سراج لکھتے ہیں: صوفیہ کرام کے تمام طبقات محدثین وفقہا کے معتقدات سے کامل اتفاق کرتے ہیں اور ان کے علوم وفنون، مطالب و مفاہیم اور طریقوں سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے۔ بشرطیکہ ان میں بدعات کی آمیزش نہ ہو اور خود ان فقہاء و محدثین پر پیروی اصول کا غلبہ ہو۔ وہ صوفیہ جو علمی لحاظ سے فقہاء و محدثین کے درجہ تک نہیں پہنچے شریعت کے مسائل کے حل کے لیے انہی کی طرف رجوع کرتے اور جن مسائل پر ان کا اتفاق ہو اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اختلاف کی صورت میں احسن اولی، احوط اور اکمل پہلو اپناتے ہیں۔ جھوٹ، تاویل، آسائش، شبہات کے درپے نہیں ہوتے۔ فرائض کی ادائیگی، ممنوعات و مشتبہات سے اجتناب، غیر مفید تعلق سے انقطاع، اللہ کے راستہ میں حائل رکاوٹوں سے دوری، قوت لا یموت پر قناعت، اشیاء ضروریہ پر اکتفاء، اخلاق رذیلہ سے کنارہ کشی، اخلاق کریمہ سے آراستگی، نفس امارہ اور ابلیس سے دشمنی، دقائق ریا پر نظر، اخلاص کی تحصیل و تجدید، توجہ الی اللہ، حجابات، اسرار اور معارف و حقائق سے آگاہی، درجات قرب الٰہی، حقیقت توحید و عبدیت، احوال و مقامات اور تسلیم و رضا صوفیہ کرام کی خصوصیات میں سے ہیں جو قرآن وسنت سے باہر نہیں۔

طبقات اہل رضا میں شیخ سراج نے تین طبقے بتائے ہیں (1) پہلا طبقہ اللہ سے راضی رہنے کی کوشش میں مشغول (2) دوسرا طبقہ اللہ کو راضی کرنے میں مشغول اور (3) تیسرا طبقہ رضائے عبد و رضائے الٰہی کی بنیاد محبت و رحمت حق کے حصول میں مشغول۔

15.3 دیگر اہم کتابیں

15.3.1 قوت القلوب

کتاب کا پورا نام "قوت القلوب فی معاملتہ، المحبوب ووصف طریق المرید الی مقام التوحید" ہے اور مصنف ابو طالب محمد بن علی بن عطیتہ الحارثی المکی (المتوفی 386ھ) جو محدث، صوفی اور متکلم تھے اور کلام سے اشتغال کے باعث حنابلہ اور ابو نصر سراج طوسی کی تنقید کا نشانہ بنے۔ ان کی تصانیف میں "قوت القلوب،، کو غیر معمولی شہرت ہوئی، بعد کے صوفیہ کرام نے اہل السنتہ والجماعتہ کے

اصول و قواعد کا اس میں انطباق پایا، قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے مرصع دیکھا تو ہاتھوں ہاتھ لیا حتی کہ امام ابو حامد الغزالی جیسے امام وقت نے اس کے صفحات کے صفحات اپنی معرکہ انگیز تصنیف "احیاء علوم الدین" میں نقل کر دیے جس سے "قوت القلوب" کو علمی حلقوں میں اعتبار و اعتماد کی نظر سے دیکھا جانے لگا، لیکن علامہ ابن الجوزی، علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ذہبی کی تنقید شدید اثر انداز ہوئی اور "قوت القلوب" اکابر صوفیہ کی مخصوص مجالس تک محدود ہو کر رہ گئی۔ باقی یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ فقہ و زہد و تصوف و تفسیر کی بہت سی کتابوں کی طرح "قوت القلوب" میں بھی ضعیف و سقیم احادیث جگہ پا گئی ہیں، اس لیے اس میں مندرج احادیث کو تحقیق بلیغ کے بغیر حدیث کے عنوان سے نقل کرنا درست نہیں۔ "قوت القلوب" کے مطبوعہ نسخہ (1423ھ) میں آیات قرآنیہ کی تخریج تو ملتی ہے لیکن احادیث نبویہ کی نہ تخریج ملتی ہے نہ تحقیق۔

بہر حال "قوت القلوب" میں ابو طالب مکی نے کل 48 فصول باندھی ہیں۔ آغاز معاملات سے متعلق قرآنی آیات سے کیا ہے۔ پھر رات دن کے اوراد، مرید کے اعمال شب و روز، اذکار و ادعیہ بعد نماز فجر، رات دن کے اوراد، فضیلت نماز، بالخصوص نماز تہجد، فضیلت نماز باجماعت، صلوۃ التسبیح، تلاوت قرآن مجید اور اس کے حقوق، غرائب القرآن کی تفسیر، آداب جمعہ، روزہ اور اوصاف روزہ دار، محاسبہ نفس اور وقت کی رعایت، تعریف نفس و جید عارفین، مشاہدۂ اہل مراقبہ، اساس المریدین، مراقبہ المقربین، احوال و مقامات اہل قرب و اہل عبادت و اہل یقین اور اہل غفلت کے حال کی پہچان، خواطر قلب، فضیلت علم اور اوصاف علماء، فضیلت علم معرفت و علم باطن، فرق مابین علماء دنیا و علماء آخرت، فضیلت علم ایمان و یقین، شرح مقامات یقین، کلمہ شہادت، نماز، زکوۃ، صوم رمضان اور حج کے ارکان و آداب و فضائل، اسلام و ایمان، فضائل سنن نبویہ، عقائد و ایمانیات کی تفصیل، ارکان و آداب اسلام، کبیرہ گناہ اور ان کی تفصیل، اخلاص اور آفات سے اس کے بچاؤ کی تدابیر، سنن و آداب طعام، فرائض و فضائل فقر، سفر کے مقاصد و احکام، اوصاف امامت، اخوت ایمانی اور احکام بھائی چارگی، بحث نکاح و تجرد، آداب غسل و دخول حمام، تاجر و صنعت کار کے لیے رہنمایانہ اصول، حلال و حرام کی تفصیل اور مشتبہات سے پرہیز وغیر ذلک۔ ایک سرسری نظر ہی مصنف کے مقصد تصنیف کو جاننے کے لیے کافی ہے۔

چند اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

ابو طالب مکی فرماتے ہیں: نقصان کا سبب غفلت ہے اور غفلت آفات نفس سے پیدا ہوتی ہے۔ نفس کی طبیعت میں حرکت ہے جب کہ اسے حکم سکون کا دیا گیا ہے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے تا کہ نفس مولیٰ کی طرف متوجہ رہے اور قوت اور ماحول سے اعراض کرے۔ قرآن میں فرمایا گیا: "ولا تموتن الا وانتم مسلمون" (اور ہر گز نہ مرنا مگر یہ کہ تم (پختہ) مسلمان رہو) تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی آہ و زاری سے دعا کرو کہ وہ تمہیں دین اسلام پر وفات دے، اور فرمایا "وکان الانسان عجولا" (اور انسان عجلت پسند (جلد باز) ہے) اور فرمایا "اتی امر الله فلا تستعجلوه" (اور اللہ کا حکم آپہنچا پس تم اس میں جلدی نہ کرو)، الغرض اللہ تعالیٰ نے جلد بازی کو نفس انسانی کی صفت بیان فرمایا اور بغرض امتحان جلد بازی چھوڑنے اور صبر و ثبات اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔ اگر سکینہ نازل ہو جو ایمان کو کیفیت کے اعتبار سے زیادہ کرنے والی ہے تو نفس اللہ کے حکم سے حالت سکون میں آجاتا ہے، اور اگر دل غافل ہو تو نفس حرکت میں آتا اور جلد بازی کا شکار ہو جاتا ہے۔ صرف اللہ کے فضل و احسان سے ہی اسے سکون مل سکتا ہے۔

اگر نفس میں تحریک ہو تو امتحان عدل کی غرض سے ہوتا ہے، امتحان کی ابتداء اختلاف نفس سے اور اختلاف نفس کی ابتداء اس کی مخالفت سے ہوتی ہے۔ اس کا مقدمہ ہمت ہے، اس کا دروازہ کان ہے اور اس کا راستہ حدیث نفس اور اس کے تقاضوں پر نظر ہے۔ حدیث نفس، شہوت جگاتی ہے اور شہوت گناہ کی کنجی ہے اور گناہ عذاب نار کا مقام ہے تاوقتیکہ گناہ گار دنیا میں ہی گناہ سے توبہ کرلے اور عقبیٰ (آخرت) میں اللہ کریم کے دامن عفو میں پناہ لے۔

ایک اور مقام پر سہل بن عبداللہ تستری سے نقل فرماتے ہیں: علماء کی تین قسمیں ہیں: عالم باللہ، عالم للہ اور عالم بحکم اللہ اور تشریح فرماتے ہیں کہ عالم باللہ عارف اور اہل یقین سے ہے۔ عالم للہ اخلاص، احوال اور معاملات کا عالم ہے، اور عالم بحکم اللہ حلال و حرام کے احکام کی تفصیل کا عالم ہے۔

آگے سہل بن عبداللہ ہی سے نقل کرتے ہیں کہ طلبہ علم کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جو عمل کے لیے علم طلب کرے، دوسرا وہ جو اختلافی مسائل جاننے کے لیے علم حاصل کرے اور پرہیز گاری کی غرض سے احوط اختیار کرے، تیسرا وہ جو تاویل کا فن جاننے کے لیے علم حاصل کرے اور محرمات کو تاویل کے ذریعہ حلال قرار دے۔

آگے لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ عزوجل متواضع عالم سے محبت کرتا اور متکبر علماء سے بغض رکھتا ہے۔ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو حکمت سے نوازتا ہے۔

15.3.2 رسالہ قشیریہ

رسالہ کا اصل نام 'الرسالۃ القشیریہ فی علم التصوف ہے، مصنف کا اسم گرامی ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری ہے۔ آپ ربیع الاول 376ھ میں خراسان میں پیدا ہوئے۔ ابھی کم عمر تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم ابوالقاسم یمانی سے حاصل کی جو عربی زبان و ادب کے ایک نامور استاد تھے۔ جب ہوش سنبھالا تو علم الحساب سیکھنے نیشاپور چلے آئے تا کہ محکمہ استیفاء میں ملازمت مل جائے۔ نیشاپور ان دنوں علم و علماء اور صوفیا کا ایک اہم مرکز تھا۔ قشیری کا گذر ایک دن شیخ وقت ابوعلید قاق کی مجلس میں ہوا، دقاق کا کلام دل میں اتر گیا، علم حساب پڑھنے اور سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا ارادہ ختم ہو گیا اور قشیری نے راہ تصوف و طریقت اختیار کرلی۔ چونکہ تصوف و طریقت کی بنیاد علم شریعت ہے، ابوعلی دقاق کا ارشاد ہوا کہ علوم شریعت میں کمال حاصل کرو۔ اس ارشاد کی تعمیل میں قشیری نے نحو و صرف و لغت و شعر و ادب کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور کلام میں عبور حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ میں ابو بکر محمد الطوسی، ابو بکر ابن فورک، ابوالحسن بن بشران، ابونعیم اسفرائینی، عبدالقادر بغدادی، حمزہ بن یوسف جرجانی اور ابو اسحٰق ابراہیم اسفرائینی کے نام ملتے ہیں۔ آپ نے فنون حرب، شہسواری اور خوش نویسی میں بھی کمال حاصل کیا۔ اس کے علاوہ آپ کی شخصیت، ظرافت اور مکارم اخلاق فاضلہ سے آراستہ تھی۔ قشیری نے ابوعلی دقاق کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ابوعلی دقاق نے اپنی بیٹی فاطمہ کا عقد قشیری سے کیا، انہی کے بطن سے قشیری کی تمام اولاد ہوئی، ابوعلی دقاق کی وفات کے بعد قشیری نے ابوعبدالرحمن اسلمی کی صحبت اختیار کی تا آنکہ آپ کا شمار مشائخ خراسان میں ہونے لگا۔

قشیری پر ابتلا کا دور بھی آیا جب سلطان طغرل بیگ کا وزیر ابونصر منصور کندری، اشاعرہ اور شوافع کی تذلیل کے درپے ہوا،

سلطانِ طغرل بیگ اگرچہ خود سنی، حنفی، نیک اور عادل تھا اور علما کا احترام اور ان سے محبت رکھتا تھا لیکن وزیر کندری کے بہکاوے میں آ کر اس نے امام الحرمین ابو المعالی جوینی اور ابو القاسم قشیری و دیگر اہم شوافع و اشاعرہ کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ امام الحرمین نے حجاز میں پناہ لی اور قشیری کی اوباشوں کے ذریعہ تذلیل کی گئی اور انہیں گرفتار کر کے قید خانے میں بند کر دیا گیا۔ دو ماہ کی قید کے بعد کسی طرح آزاد کرائے گئے اور کچھ عرصہ بعد نیشاپور سے بغداد چلے آئے۔ جہاں عباسی خلیفہ القائم بامر اللہ نے آپ کا خیر مقدم کیا اور بڑے اعزاز واحترام سے پیش آیا۔ خاص محل کے اندر قشیری کے خطاب کے لیے ایک خصوصی مجلس رکھی جس میں بنفس نفیس خود موجود رہا، قشیری کے خطاب کا اس پر اس قدر اثر ہوا کہ اس نے قشیری کے اعزاز واکرام کے احکام صادر کر دیے۔ جو فتنہ وزیر کندری کی کاوشوں سے 445ھ میں شروع ہوا۔ وہ اس کی عبرتناک موت 450ھ سے ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ قشیری جب بغداد سے نیشاپور واپس آئے تو حالات کے پیش نظر اہل وعیال کے ساتھ طوس چلے گئے اور سلطان طغرل بیگ کی وفات تک وہیں رہے، جب الپ ارسلان نے عنان حکومت سنبھالی اور نظام الملک طوسی کو اپنا وزیر بنایا تو امن وامان قائم ہوا، اشاعرہ و شوافع سے پابندیاں اٹھالی گئیں اور مشاہیر احناف وشوافع اپنے اپنے وطن واپس چلے آئے۔ قشیری بھی حالات ساز گار پا کر نیشاپور لوٹ گئے جہاں ان کی زندگی کے باقی دس سال اطمینان سے گزرے۔ قشیری کی وفات 16 ربیع الآخر بروز یکشنبہ قبل از طلوع آفتاب 465ھ میں ہوئی۔

تذکرہ نگاروں نے قشیری کی طرف تیس (30) تصانیف منسوب کی ہیں جن میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

(1) التفیسر فی علم التفسیر (2) لطائف الإشارات (3) آداب الصوفیۃ

(4) ترتیب السلوک فی طریقۃ اللہ تعالیٰ (5) شکایۃ أھل السنۃ (6) بلغۃ المقاصد فی التصوف

(7) ناسخ الحدیث ومنسوخہ (8) حیاۃ الأرواح (9) الفصول في الأصول

(10) الرسالۃ القشیریۃ فی علم التصوف

رسالہ کا پورا نام الرسالۃ القشیریہ فی علم التصوف ہے۔ اس کی تصنیف کی ابتداء 437ھ میں ہوئی اور 438ھ کے اوائل میں تکمیل ہوئی۔

رسالہ کے مآخذ:

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ مآخذ میں طبقات الصوفیہ از ابو عبد الرحمن سلمی، کتاب اللمع فی التصوف از ابو نصر سراج طوسی، التعرف لمذھب اھل التصوف از ابو بکر محمد بن اسحق البخاری الکلاباذی، حلیۃ الاولیاء از ابو نعیم الاصفہانی اور بہجۃ الاسرار از نامعلوم مصنف شامل تھے۔

رسالہ قشیریہ متعدد بار طبع ہو چکا ہے، کبھی مجرد متن، کبھی عبد المعطی 575ھ کی شرح کے ساتھ، کبھی سید محمد حسینی گیسو دراز چشتیؒ (م 825ھ) کی ناتمام شرح فارسی کے ساتھ (جن کی طویل عربی شرح منتظر تحقیق و طباعت ہے) اور کبھی زکریا انصاری (م 926ھ) کی شرح وسید مصطفی عروسی کے حاشیہ کے ساتھ۔

مطبوعہ متن خلیل المنصور کے حواشی کے ساتھ 1418ھ۔1998ء میں دار الکتب العلمیۃ (بیروت) سے 430 صفحات میں

تقریباً شایان شان شائع ہوا ہے۔ رسالہ کا غالباً پہلا اردو ترجمہ لیاقت جنگ نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ حضرت پیر محمد حسن کا متعدد مرتبہ طبع ہو چکا ہے جس میں تصحیح کا اہتمام کماحقہ نہیں ہو سکا۔

رسالہ میں ابتداء دو فصلیں ہیں جن میں مسائل اصولیہ اور مسائل توحید پر صوفیہ کے عقائد بیان کیے گئے ہیں جن کے بعد باون (52) ابواب ہیں۔ پہلے باب میں مشائخ طریقت مثلاً ابو اسحٰق ابراہیم بن ادہم، ابوالفیض ذوالنون مصری، ابو علی فضیل بن عیاض، معروف کرخی، سری السقطی، حارث المحاسبی، داؤد الطائی، شقیق البلخی، ابویزید بسطامی، سہل بن عبداللہ التستری، حمدون القصار، جنید بغدادی، ابوالحسین النوری، محمد بن علی ترمذی، ابوسعید الخراز، ممشاد دینوری، ابو علی روذباری سمیت تقریباً تیرانوے (93) صوفیا کرام کے حالات زندگی انتہائی اختصار بشمول ان کے اقوال و احوال بالاسناد بیان فرماتے ہیں، اگلے باب میں صوفیہ کے درمیان رائج الفاظ واصطلاحات مثلاً وقت، مقام، حال، قبض وبسط، ہیبت وانس، صحو وسکر، ذوق وشرب، محو واثبات، سر و تجلی، محاضرہ و مکاشفہ و مشاہدہ، شریعت و حقیقت، علم الیقین و عین الیقین و حق الیقین کی عمدہ توضیح کی ہے۔ آگے کے ابواب میں توبہ، مجاہدہ، خلوت وعزلت، تقوی، ورع، زہد، خاموشی، خوف، رجا (امید) حزن، جوع (فاقہ / بھوک) وترک شہوت، خشوع و تواضع، مخالفت نفس اور نفس کے عیوب کا ذکر، حسد، غیبت، قناعت، توکل، شکر، یقین، صبر، مراقبہ، رضا، عبودیہ، ارادہ، استقامت، اخلاص، صدق، حریت (قیود نفسانی و دنیاوی سے آزادی)، ذکر، فتُوّت (جوانمردی)، فراست، خلق، جود وسخا (فیاضی و سخاوت) غیرت، ولایت، دعا، فقر، تصوف، ادب، سفر اور صوفیا کے احکام، صحبت، توحید، موت کے وقت صوفیا کے احوال، معرفت، محبت، شوق، صوفیا کے قلوب کا تحفظ، سماع اور کرامات اولیاء ایک ایک باب باندھ کر اقوال واحوال کے حوالے سے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ رسالہ قشیریہ کا انتہائی وقیع، تحقیقی اور قابل قدر حصہ ہے۔ اس کے بعد کی فصول میں مختلف سوال اٹھا کر (مثلاً ولی کے معنی کیا ہیں؟ کیا ولی معصوم ہوتا ہے؟ کیا رویت باری تعالیٰ اس دنیا میں انسانی آنکھ سے ہو سکتی ہے؟ وغیرہ) ان کے جواب اھل السنت والجماعت کے موقف کے مطابق ہیں، مریدین کے لیے نصیحت میں ایک مستقل باب لکھا ہے اور آفات طریق، آفات مرید، سماع میں مطلوب آداب مرید، فقراء کی خدمت، آداب طریقت اور آداب شریعت کے تحفظ اور مرید کے اوصاف پر مختلف فصول میں موثر اور جامع ہدایات دی ہیں۔

15.3.3 الاربعین

"الاربعین فی اصول التصوف" امام ابو حامد محمد بن محمد بن احمد الغزالی کی تصنیف ہے جس کا موضوع عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہا کی روح تک پہنچنا اور اس کو حاصل کرنا ہے۔ اس طرح "اربعین" تصوف کی ایک مختصر حجم کی جامع تصنیف بن گئی۔

علامہ سمعانی کے بموجب غزالہ طوس (خراسان کے ایک ضلع کا نام) کے ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سنہ 450ھ میں امام غزالی کی پیدائش ہوئی۔ بچپن ہی میں ان کے والد کی وفات ہو گئی۔ انتقال سے پہلے انہوں نے محمد الغزالی اور احمد الغزالی کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے ایک دوست کے سپرد کی جو انہی کی طرح نادار تھے۔ بہر حال امام غزالی نے ابتدائی تعلیم احمد بن محمد راذکانی اور ابو نصر اسمٰعیلی سے حاصل کی، پھر نیشا پور پہونچ کر مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لے لیا جہاں اپنی ذہانت، محنت اور قوت استعداد کے باعث امام الحرمین عبدالملک جوینی کے خاص شاگردوں میں شمار کیے جانے لگے۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو بغداد کا رخ کیا اور وہاں کے اکابر علماء سے استفادہ

کیا۔ امام الحرمین کی وفات کے بعد غزالی نیشاپور سے نکلے اور بقول شبلی نعمانی "اس شان سے نکلے کہ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ نظام الملک طوسی (سلجوقی سلاطین کا علم دوست وزیر) کے دربار میں پہنچے۔ مناظروں، مذاکروں، مباحثوں کی مجلسوں میں شریک ہوئے، اور اپنے حریفوں پر غالب رہے، نظام الملک طوسی جوہر شناس تھا، اس نے امام غزالی کو بغداد میں موجود مدرسہ نظامیہ میں درس کے لیے منتخب کیا، غزالی کی عمر اس وقت 34 برس بتائی جاتی ہے۔ یہاں امام غزالی کی شہرت تیزی سے پھیل گئی۔ اسی زمانے میں فرقہ باطنیہ کے خلاف عباسی خلیفہ مستظہر باللہ کی ایما پر امام غزالی نے "مستظہری" تصنیف کی۔ طبیعت میں جاہ پسندی تھی لیکن ایمان وعلم اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ بلند ترین منصب حاصل کرنے کے بعد امام غزالی کے دل نے خود احتسابی کی طرف توجہ دلائی۔ "المنقذ من الضلال" بقلم خود سرگزشت غزالی ہے جس میں غزالی نے کچھ جگ بیتی اور کچھ آپ بیتی جمع کر دی ہے۔ قلبی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ غزالی نے دربار چھوڑا، منصب چھوڑا، دوست چھوڑے، خاندان چھوڑا، بغداد چھوڑا اور دمشق کا رخ کیا۔ دو سال جامع مسجد اموپہ کے ایک مینارہ میں گمنامی میں قیام کیا، پھر بیت المقدس گئے، وہاں سے حج کی غرض سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا قصد کیا۔ مصر و اسکندریہ بھی پہنچے لیکن ہر جگہ گمنامی کو ترجیح دی، ویرانوں میں چلہ کشی کی، بالآخر گیارہ برس کی جہاں نوردی کے بعد اہل و عیال کی محبت نے وطن کھینچ بلایا اور وہ اہل و عیال کے ساتھ نیشاپور آکر درس و تدریس اور تصنیف تالیف میں لگ گئے۔ آپ کی تصنیفات میں "وسیط"۔ "بسیط"۔ "وجیز"۔ "المنخول"۔ "المستصفی"۔ "معیار العلم"۔ "میزان العمل"۔ "مقاصد الفلاسفتہ"۔ "تہافتہ الفلاسفتہ"۔ "المستظہری"۔ "الجام العوام"۔ "الاقتصاد فی علم الکلام"۔ "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ"۔ "نصیحتہ الملوک"۔ "جواہر القرآن"۔ "الرسالتہ القدسیتہ"۔ "القرطاس المستقیم"۔ "قواعد العقائد"۔ "یاقوت التاویل"... "بدایتہ الہدایتہ"۔ "المقصد الاسنیٰ"۔ "احیاء علوم الدین"۔ "کیمیائے سعادت"۔ "مشکوٰۃ الانوار"۔ "منہاج العابدین"۔ "معارج القدس"۔ "الاربعین" وغیرہ کی بڑی شہرت ہوئی۔

"الاربعین" اعمال ظاہرہ و باطنہ میں دین کی چالیس بنیادوں پر غزالی کے سہل لیکن محققانہ تبصرہ و تجزیے کو اختصار سے سمیٹے ایک ایسا رسالہ ہے جو تصوف کا نام لیے بغیر تصوف کے مضامین قاری کے قلب، ذہن اور روح پر نقش کر دیتا ہے۔ ان میں نماز، زکوۃ، روزہ، حج، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی، طلب حلال، حقوق العباد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اتباع سنت رسولؐ، طہارت قلب ذمائم اخلاق جیسے کثرت اکل و حرص طعام، کثرت کلام، بے قابو غصہ، حسد، بخل، حب جاہ و رعونت، حب دنیا، نخوت و تکبر، اعجاب نفس (خود پسندی) ریاء، فضائل اخلاق جیسے توبہ، انابت، خوف، زہد، صبر، شکر، اخلاص و صدق نیت، توکل، حب الٰہیٰ، رضا بالقضا، فکر موت شامل ہیں۔

غزالی فرماتے ہیں کہ بعض عبادتیں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتی ہیں۔ مثلاً روزہ دار شخص نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کرے، اور بعض نہیں ہو سکتیں مثلاً نماز بھی ہو اور مسلمانوں کے حقوق کی خبر گیری بھی۔ اس لیے مناسب ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں پر مختلف عبادتوں کو تقسیم کرلو، اوقات کے انضباط سے سہولت بھی ہوگی اور مقصود عبادت بھی حاصل ہو جائے گا، یعنی ذکر اللہ سے انس اور جہان فانی سے بیزاری۔ حق تعالیٰ کی محبت معرفت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ معرفت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر وقت حق تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو۔ ساری عبادتیں ذکر الٰہیٰ کے لیے مشروع ہوئیں (گویا انضباط وقت سے عبادت، عبادت سے ذکر، ذکر

سے معرفت اور معرفت سے حب الٰہی کا سلسلہ جڑا ہے)...اگر علم دین پڑھتے پڑھاتے ہو یا کسی جگہ کے حاکم ہو تو دن بھر رعایا کی حفاظت میں مشغول رہنا دوسری عبادتوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ علم دین ہی کے توسط سے احکام الٰہی کی تعظیم حاصل ہوتی ہے اور جو نفع اس تعلیم اور مخلوق کی نگہبانی سے لوگوں کو پہنچتا ہے وہ مقاصد دین سے ہے... ۔

15.3.4 فتوح الغیب

"فتوح الغیب" حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ کے وہ خطابات یا مقالات ہیں جنہیں حضرت شیخ کے صاحبزادہ حضرت شرف الدین عیسٰی علیہ الرحمہ نے جمع و مرتب کیا۔ حضرت شیخ نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور حمد و نعت اور وجہ تالیف کا اضافہ کیا جس سے اس کی شکل ایک مستقل کتاب کی ہو گئی۔ حضرت شیخ کے وصال کے بعد اس میں تکملہ شامل کیا گیا جس میں آپ کی وفات کے وقت کی کیفیت تفصیل سے بیان کی گئی۔

"فتوح الغیب" میں جملہ اٹھتر (78) مقالات ہیں جن میں اللہ رب العزت کی عظمت و کبریائی، رضا بالقضا، اتباع رسول اللہؐ، ابتلاء کی وجوہ، فنا کے فوائد، دنیا کی بے وفائی، خیر و شر، نفس امارہ سے علیحدگی، ترک اختیار، کشف و مشاہدۂ افعال، درجات احکام شرع، دولت کا مقام، ہمت، توانائی اور چستی کی اہمیت، اللہ سبحانہ کی شان رزاقی، وصول الی اللہ کے معنی، عوام و خواص سے اللہ سبحانہ کے معاملات، مشتبہ اشیاء سے پرہیز، شرک و نافرمانی سے اجتناب، مواہب الہیہ، کتاب و سنت کا مقام، انسانوں کی اقسام، مشیت باری تعالیٰ سے موافقت، تقوی، ورع، طلب آخرت، کسب حلال، حسد، ظلم و بخل سے احتراز وغیرہ موضوعات میں شامل ہیں۔

مقالہ 7 میں فرماتے ہیں "شرک صرف بت پرستی ہی نہیں بلکہ خواہشات نفس کی پیروی بھی شرک ہے اور ماسویٰ اللہ عزوجل کو اختیار کرنا بھی شرک ہے"۔

مقالہ 42 میں فرماتے ہیں "نفس کی دو حالتیں ہیں، تیسری کوئی نہیں: حالت عافیت اور حالت بلاء۔ اگر ابتلاء کی حالت میں گرفتار ہو تو بے صبری، شکایت، اعتراض، حق عزوجل پر تہمت، نہ صبر، نہ رضا، نہ موافقت بلکہ بے ادبی، خلق و اسباب میں شرک و کفر کا اظہار ہوتا ہے اور (اس کے برخلاف) اگر عافیت کی حالت ہو تو عافیت کا ضیاع، اکڑنے، اتباع شہوات و لذات، پے درپے خواہشات کی تکمیل کا مطالبہ، نعمتوں کی تحقیر و عیب چینی، غرض یہ کہ مقسوم پر قناعت کے بجائے غیر مقسوم کے پیچھے پڑتا اور اپنے آپ کو مشقت میں ڈال لیتا ہے۔ اللہ کریم نے جو کچھ قسمت میں لکھا ہے اس پر راضی نہیں ہوتا اور ایسی سختیاں، بلائیں اور مشقتیں پیدا کر لیتا ہے جن کی نہ دنیا میں کوئی حد ہے نہ عقبیٰ میں کوئی انتہا، جب بلاء میں گرفتار ہوتا ہے تو نعمت و شہوت و لذت سب بھول جاتا ہے، صرف بلاء سے چھٹکارہ چاہتا ہے۔ اور جب عافیت حاصل ہوتی ہے تو رعونت کی طرف لوٹ جاتا ہے اور عافیت کو ضائع کرتا، اتراتا، اطاعت حق سے اعراض اور نافرمانیوں میں کھو جاتا اور بلاء کے حالات بھول جاتا ہے۔ تب اس سے زیادہ سخت بلاؤں میں اور عقوبات میں جھونک دیا جاتا ہے تاکہ معاصی کبیرہ کے عذاب چکھے، آئندہ ان سے علیحدہ رہنے کا عزم کرے اور گناہوں سے بچتا رہے، اس لیے کہ نعمت و عافیت کے وہ لائق نہیں۔ اس کی حفاظت بلاء اور سختی ہی میں ہے۔ اگر بلا دور ہونے پر وہ حسن ادب اور اطاعت حق کی پابندی کرتا، نعمت پہ شکر بجالاتا اور قسمت پر راضی رہتا تو یہ دنیا و آخرت میں اس کے لیے بہتر ہوتا، نعمت و عافیت میں زیادتی ہوتی، اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے

خوشنودی، خوش حالی، توفیق (طاعات) اور لطف (مسلسل) دیکھتا۔ پس جو شخص دنیا و آخرت میں سلامتی چاہتا ہو اسے صبر و رضا اختیار کرنا چاہیے۔ خلق کے سامنے کسی قسم کی شکایت نہ کرنی چاہیے، اپنی (تمام) ضروریات رب عزوجل کے سامنے پیش کرنی چاہیے۔ اس کی فرمانبرداری اختیار کرنی اور کشایش کا امیدوار رہنا چاہیے، اللہ کے ماسویٰ سب کچھ چھوڑ کر اسی کا ہو رہنا چاہیے کہ وہ اپنے غیر سے بہر صورت بہتر ہے، اس کا نہ دینا بھی بخشش ہے، اس کے عذاب نعمت ہیں اور اس کی بلاء (حقیقتاً) دوا ہے، اور اس کا قول وقوع فعل ہے، اس کے سب کام اچھے اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں، اگرچہ مصالح کا علم اس نے اپنے بندوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ پس بندہ کے لیے بہتر یہی ہے کہ رضا و تسلیم اختیار کرے، عبودیت میں مشغول رہے، اوامر و نواہی کی تعمیل کرے، قضا و قدر کے آگے سر تسلیم خم کر دے اور ربوبیت میں اشتغال سے اجتناب کرے۔

15.3.5 عوارف المعارف

عوارف المعارف کا شمار تصوف کی جامع ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کے مصنف شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد سہروردی (متوفی 632ھ) ہیں۔

شیخ الشیوخ نے متداول علوم کی تحصیل کی جن میں قرآن مجید، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، علم معانی، علم بیان، بدیع، اشتقاق، لغت وغیرہ شامل ہیں۔ کلام کے مطالعہ کے دوران آپ کے مرشد ضیاء الدین ابو النجیب عبد القاہر سہروردی نے محسوس کیا کہ علوم دینیہ سے اشتغال کم ہو رہا ہے۔ وہ آپ کو حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے پاس لے گئے اور ماجرا بیان کیا۔ حضرت شیخ نے شہاب الدین سہروردی کو اپنے قریب بلایا اور مسکراتے ہوئے سینہ پر ہاتھ پھیرا جس کے بعد علم کلام کے مضامین سینہ سے بالکل محو ہو گئے اور آپ کی دلچسپی کلام سے بالکل ختم ہو گئی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد حسب ارشاد مرشد مجاہدہ شروع ہوا لیکن طریقت کی تحصیل میں زیادہ وقت نہ لگا اور جلد ہی آپ کو اجازت مل گئی۔ آپ کی خانقاہ تعمیر ہوئی جس میں جلد ہی ارادت مندوں کا ہجوم ہو گیا۔ آپ نے مریدین کی تربیت کے ساتھ درجہ کمال کی تحصیل کی کوشش ترک نہ کی۔ ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رہا۔ اس کے علاوہ عباسی خلفاء کی طرف سے سفارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خوارزم شاہ کی عباسی خلافت کو ختم کر دینے کی دھمکی پر عباسی خلیفہ کی جانب سے بحیثیت سفیر خوارزم شاہ کے دربار میں پہنچے۔ تفصیل سے اس سے بات کی، بنو عباس کے فضائل بیان کیے تو سلطان نے آپ کو ٹوک دیا اور کہا کہ جو فضائل آپ بیان کر رہے ہیں، موجودہ خلیفہ ان سے عاری ہے۔ لہٰذا میں جلد ہی ان کو معزول کر کے کسی لائق شخص کو تخت خلافت پر بٹھادوں گا۔ حضرت شیخ خوارزم شاہ کے متکبرانہ کلام پر آزردہ ہوئے اور واپس بغداد آ گئے۔ ایک اور مرتبہ سلجوقی سلطان علاء الدین کیقباد کے دربار میں بحیثیت سفیر تشریف لے گئے۔ اس نے دل سے پذیرائی کی، بڑا اعزاز و اکرام کیا اور خلعت دے کر احترام سے رخصت کیا۔ ان سب کے علاوہ حضرت شیخ مشاہیر علماء و صوفیہ کے خیر مقدم میں بھی پیش پیش رہتے اور فقرا کی دلداری اور حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی جاری رہتی۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں "عوارف المعارف"، "رشف النصائح"، "جذب القلوب"، "نغبتہ البیان" اور "اعلام الہدیٰ" کو بڑی شہرت ملی۔

آپ نے اپنے معاصرین میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ابن الفارض جیسے اکابر صوفیہ سے بھی ملاقات کی۔ شیخ اکبر کی بابت آپ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسا دریائے حقائق ہیں جس کا ساحل گم ہے۔

عوارف المعارف میں کل ترسٹھ (63) ابواب ہیں جن کے عناوین کا اجمالی خاکہ ذیل میں درج ہے۔

* تصوف کا مبدا و منشا، تاریخ و تعریف * حسن استماع اور صوفیہ کا اختصاص * علوم صوفیہ کی فضیلت * احوال صوفیہ * ماہیت تصوف * ارباب تصوف کو صوفی کہنے کے اسباب * صوفی، متشبہ اور متصوف کے مابین امتیاز * فرقہ ملامتیہ اور اس کے احوال * صوفیہ سے منسوب غیر صوفی * اقسام مشائخ * خرقہ تصوف کی حقیقت * خانقاہ نشینوں کی فضیلت * ارباب خانقاہ کی خصوصیات * صوفیہ کی ازدواجی زندگی * سماع و آداب سماع * اربعین و چلہ کشی کی بنیاد * ارباب تصوف کے اخلاق * آداب تصوف * معمولات صوفیہ * آداب صحبت واخوت * شرح حال و مقام * مقامات تصوف کے بارے میں مشائخ کے اقوال * احوال صوفیہ * مصطلحات تصوف * ہدایات ونہایات تصوف

عوارف المعارف سے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

حضرت شیخ الشیوخ فرماتے ہیں کہ: حضرت عبد اللہ ابن عباس نے روایت کیا کہ افضل عبادت فقہ دین ہے اور حق سبحانہ و تعالیٰ نے فقہ کو قلب کی صفت قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا "**لهم قلوب لايفقهون بها**" یعنی ان کے دل ایسے ہیں کہ آیات قرآنی نہیں سمجھتے۔ پس جب وہ فقیہ ہوئے تو انہیں علم ہوا اور جب انہیں علم ہوا تو انہوں نے عمل کیا اور جب وہ عامل ہوئے تو معرفت حاصل ہوئی اور جب وہ عارف ہوئے تو ہدایت پائی۔ (باب اول)

شیخ الشیوخ کے نزدیک قلندر وہ ہیں جنھوں نے فرائض دین پر اکتفا کیا اور مباح لذت دنیا سے اپنا حصہ لیا، اور ملامتی وہ ہے جس نے اخفائے عبادات واحوال میں اہتمام کیا یعنی خیر کو ظاہر اور شر کو مخفی نہ کیا۔ حصول اخلاص کی خاطر اور توجہ الی اللہ میں خلل سے بچنے کی غرض سے اپنے عمل اور حال سے خلق کو دور رکھا۔ جن لوگوں کا دعویٰ ہے کہ شریعت عوام کے لیے ہے، چونکہ ان کے ضمائر اللہ تک پہنچ چکے ہیں لہذا ان کے لیے سب کچھ مباح ہے وہ دھوکے میں پڑے جاہل ہیں، ملحد و گمراہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ شریعت حق عبودیت ہے اور حقیقت دراصل حقیقت عبودیت، اور جو شخص اہل حقیقت سے ہو گیا وہ حق عبودیت اور حقیقت عبودیت کا مقید ہو گیا۔ حضرت جنید کے نزدیک ایسے شخص سے جو ترک شریعت کا قائل ہو وہ شخص بہتر ہے جو چور و زناکار ہے۔

شیخ الشیوخ فرماتے ہیں کہ سالکین اور صالحین کی چار قسمیں ہیں (1) سالک محض (2) مجذوب محض (3) سالک مجذوب (4) مجذوب سالک۔ ان میں سالک محض میں چونکہ صفات نفس موجود رہتی ہیں اور حجابات نہیں ہٹائے جاتے لہذا وہ شیخ بنائے جانے کے لائق نہیں۔ مجذوب محض میں حجابات تو ہٹا لیے جاتے ہیں، سلوک نہیں طے ہوتا لہذا وہ بھی شیخ بنائے جانے کا اہل نہیں، شیخ بنائے جانے کے اہل تو وہی ہیں جنھوں نے سلوک بھی طے کر لیا اور حجابات بھی ان کے لیے ہٹا دیے گئے یا پھر وہ جن کے لیے پہلے حجابات ہٹا دیے گئے پھر انہوں نے سلوک طے کر لیا۔ ان دو میں شیخ الشیوخ قسم چہارم یعنی مجذوب سالک کو شیخ بنائے جانے کے لیے سالک مجذوب پر ترجیح دیتے ہیں۔

15.3.6 الفتوحات المکیۃ

"فتوحات مکیۃ" حضرت شیخ محی الدین ابو عبد اللہ محمد بن علی ابن عربی الحاتمی الطائی قدس اللہ روحہ و نور ضریحہ کی وہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جس میں چھ فصلوں اور پانچ سو ساٹھ (560) ابواب میں حضرت مصنف نے معارف 'معاملات، احوال، منازل، منازلات اور مقامات کے ظاہری و باطنی جہتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں نہ صرف شریعت و حقیقت کی رعایت کی گئی بلکہ عام شہرت کے بر خلاف مقام عبدیت اور مقام ربوبیت و الوہیت کا امتیاز بھی رکھا گیا ہے۔ زبان الہامی ہے مگر اسلوب قصداً ایسا اختیار کیا ہے کہ قاری جب تک مکمل کتاب کئی بار نہ پڑھ لے اور اسلوب و اصطلاحات سے مناسبت نہ پیدا کر لے، کتاب کے مضامین مقفل رہیں گے اور نااہل ہمت ہار کر ہاتھ اٹھا لے گا، اگر قاری ضروری اہلیت و ہمت رکھتا ہو اور توفیق الٰہی بھی شامل حال ہو تو ہر بار ایک نیا جہانِ معانی اس پر کھلتا اور اس کے قلب و روح کو عجائبات قدرت سے متعارف کراتا جائے گا۔ احساس عبدیت، مرتبہ احسان، سلوک و تصوف کا حقیقی عرفان، اسرار و حقائق سے مناسبت و مقاربت اور شعور و تعظیم ربوبیت شرائط اہلیت سے ہیں۔ اس عظیم کتاب کے مضامین کی صرف فہرست ہی بڑی تقطیع کے بیس (20) صفحات پر پھیلی ہے۔

چند اقتباسات جلد اول سے ذیل میں درج ہیں (عقائد پر اعتراض کے باعث عقائد ہی نقل کیے گئے ہیں) حضرت شیخ اکبر فرماتے ہیں: یہ طریق جو اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ اس شخص کے لیے ہے جو صاحب ایمان ہو اور نجات کی غرض سے اس راستہ کو اختیار کر رہا ہو بر خلاف ان لوگوں کے جو فکر نجات سے بے پروا اپنے آپ میں گم ہیں، وہ ہیں اور ان کے نفس کے تقاضے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے راستہ پر چلنے والے کے لیے چار وادیاں پیدا کی گئی ہیں (جن کا اسے لحاظ رکھنا ہے): اسباب، دواعی، اخلاق اور حقائق اس پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کا حق، اپنی جان کا حق اور مخلوق کا حق جانے اور ان کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔

1) اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اللہ ہی کی عبادت کرے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے۔

2) اس پر اپنی جان کا یہ حق ہے کہ اپنی سعادت و نجات کے راستہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ اختیار کرے۔ نفس اگر انکار کرے تو اس کی جہالت کا علاج عزم و ہمت سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی رغبت اور اس کے عتاب کا خوف دلائے اور اس کے راستہ کی عظمت کا استحضار کرے، اس سے نفس کا مزاج بدلے گا، اخلاق فاضلہ سے مزین ہو گا اور سعادت و نجات کے راستہ ہی میں اپنی فلاح (کامیابی) دیکھے گا۔

3) مخلوق کا اس پر یہ حق ہے کہ وہ انھیں کسی بھی قسم کی ایذا پہنچانے سے باز رہے الا یہ کہ حدود شرعیہ کے قیام کے لیے سزا دینا پڑے...

جو شخص قرآن مجید پر ایمان لایا، اس نے قرآن کے اللہ کا کلام ہونے کی تصدیق کی۔ چنانچہ وہ بغیر کسی آمیزش و تاویل کے قرآن مجید ہی سے یہ عقیدہ اخذ کرے گا کہ اللہ کے مثل کوئی چیز نہیں اور وہ ہر چیز کو سننے والا، دیکھنے والا ہے، قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ ہو گی، اس روز کچھ چہرے اپنے رب کو دیکھتے شاداں ہوں گے اور کچھ اپنے رب کے دیدار سے محروم و محجوب ہوں گے، آنکھیں اس جہان میں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ تمام آنکھوں کا ادراک رکھتا ہے، ساری کائنات پر اقتدار اسی کا ہے کہ وہ اکیلا ہر چیز پہ

قدرت رکھتا ہے، اللہ کا علم ہر شئی کا احاطہ کیے ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا (جیسے کہ اس کی شان کا حق تھا) وہ تنہا اپنی ذات سے زندہ اور اپنی ذات سے قائم ہے کسی کا محتاج نہیں، اس نے جناب رسالت مآبؐ سے پہلے بھی مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا اوران پر وحی نازل فرمائی اور اسی نے جناب رسالت مآبؐ کو نبوت ورسالت دی۔ بشیر ونذیر اور سراج منیر بنا کر بھیجا۔ آپؐ پر وحی نازل فرمائی اور آپؐ کو خاتم النبیین بنایا، اس نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے تخلیق فرمایا، بالخصوص انسانوں کو اس نے مٹی سے بنایا، مٹی ہی کی طرف ان کو لوٹائے گا اور مٹی ہی سے نکال کر انھیں یوم حشر کھڑا کرے گا۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے حشر ونشر ہوں یا قضا وقدر، جنت وجہنم ہوں یا میزان وحوض وصراط کسی ضروری عقیدہ کا ذکر نہ چھوڑا، چنانچہ فرمایا۔"مافرطنا فی الکتاب من شیء"...اللہ تعالیٰ ہی معبود واحد ہے الوہیت میں جس کا کوئی ثانی نہیں، بیوی اور اولاد سے پاک، بلا شرکت غیرے ہر چیز کا مالک، صانع، اول وآخر ہے، اس کی نظیر پیش کرنے سے عقلیں قاصر ہیں، زمان ومکان کی حد سے بالا عرش وکرسی ولوح وقلم وروح وجسم وزمین وآسمان، سب کا وہ تنہا خالق، سب اس کے محتاج، وہ اکیلا قیوم، ساری کائنات کو عدم سے وجود بخشنے والا، کوئی شئی اس کے علم وارادہ اور قدرت سے باہر نہیں، وہی جبار، وہی قہار، وہی قابض، وہی باسط، اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

15.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مختلف ادوار میں صوفیائے کرام نے تصوف کی تاریخ، شخصیات اور تعلیمات کو منضبط کرنے اور انہیں آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے کتابیں لکھیں۔
- تصوف کی تاریخ، شخصیات اور تعلیمات پر لکھی گئی کتابوں میں ایک طرف تصوف کے اصول وضوابط کو بیان کیا گیا تو دوسری جانب تصوف کے نام پر پھیلائی جانے والی مختلف گمراہیوں سے بھی لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔
- تصوف پر "کتاب الرعایۃ لحقوق اللہ" از حارث بن اسد المحاسبی کے بعد لکھی گئی کتب میں غالباً "کتاب اللمع فی التصوف" اولین کتاب ہے۔ جس کے مولف ابونصر سراج الطوسی (المتوفی 378ھ) نے تصوف کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے پیش کیا۔
- "کتاب اللمع" سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں ایسا گنجینہ علم تصوف ہے جس میں ہر موضوع کو قرآنی آیات، احادیث نبویہ اور اقوال مشائخ سے مدلل بیان کیا گیا ہے۔ خوبصورت اشعار اور نادر حکایات ان پر مستزاد ہیں۔ ہر بات شریعت کی کسوٹی پر پرکھی گئی ہے اور ناقدین تصوف کے اشکالات حل کیے گئے ہیں۔
- "فتوحات مکیہ" حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی وہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جس میں چھ فصلوں اور پانچ سو ساٹھ (560) ابواب میں حضرت مصنف نے معارف 'معاملات، احوال، منازل، منازلات اور مقامات کے ظاہری وباطنی جہتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

- عوارف المعارف کا شمار تصوف کی جامع ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کے مصنف شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد سہروردی ہیں۔
- "فتوح الغیب" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کے وہ خطابات یا مقالات ہیں جنہیں حضرت شیخ کے صاحبزادہ حضرت شرف الدین عیسیٰ نے جمع و مرتب کیا۔ حضرت شیخ نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور حمد و نعت اور وجہ تالیف کا اضافہ کیا جس سے اس کی شکل ایک مستقل کتاب کی ہو گئی۔
- "الاربعین فی اصول التصوف" امام ابو حامد محمد بن محمد بن احمد الغزالی کی تصنیف ہے جس کا موضوع عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہا کی روح تک پہنچنا اور اس کو حاصل کرنا ہے۔ اس طرح "اربعین" تصوف کی ایک مختصر حجم کی جامع تصنیف بن گئی۔

15.5 نمونہ امتحانی سوالات

15.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. "کتاب الرعایۃ لحقوق اللہ" کے مصنف کون ہیں؟

(a). اسد المحاسبی (b). خواجہ نظام الدین (c). نصیر الدین طوسی (d). ابو بکر شبلی

2. ابو نصر سراج الطوسی کس کتاب کے مصنف ہیں؟

(a). کتاب اللمع فی التصوف (b). فوائد الفواد (c). مثنوی مولانا روم (d). فتوح الغیب

3. طبقات اہل رضا میں ابو نصر سراج طوسی نے کتنے طبقات بتاتے ہیں؟

(a). تین (b). پانچ (c). سات (d). نو

4. ابو القاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری کس کے مصنف ہیں؟

(a). آداب الصوفیہ (b). کشف المحجوب (c). عوارف المعارف (d). الاربعین

5. امام غزالی کس کتاب کے مصنف ہیں؟

(a). احیائے علوم الدین (b). آداب الصوفیہ (c). لطائف الاشارات (d). حیاۃ الارواح

6. امام غزالی کہاں پیدا ہوئے؟

(a). طوس (b). دہلی (c). بدایوں (d). بغداد

7. فتوح الغیب میں کل کتنے مقالات ہیں؟

(a). 78 (b). 68 (c). 15 (d). 25

8. شرف الدین عیسیٰ نے کس کتاب کو جمع و مرتب کیا؟

(a). فتوح الغیب (b). فوائد الفواد (c). کشف المحجوب (d). الاربعین

9. شہاب الدین ابو حفص عمر بن سہروردی کس کتاب کے مصنف ہیں؟

(a). عوارف المعارف (b). الاربعین (c). کیمیائے سعادت (d). تذکرۃ الاولیاء

10. فتوحات مکیہ کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a). محی الدین ابن عربی (b). قوت القلوب (c). اخبار مکہ (d). الاربعین

15.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ابو نصر سراج الدین طوسی حالات زندگی کو مختصراً بیان کیجیے۔
2. کتاب اللمع فی التصوف پر بحث کیجیے۔
3. عوارف المعارف پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
4. فتوحات مکیہ پر مضمون لکھیے۔
5. الاربعین پر ایک نوٹ لکھیے۔

15.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. قوت القلوب پر تفصیل سے قلم بند کیجیے۔
2. رسالہ قشیریہ پر مضمون لکھیے۔
3. فتوح الغیب پر تفصیل سے لکھیے۔

15.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تصوف اسلام : از عبد الماجد دریا آبادی
2. تاریخ دعوت و عزیمت : از سید ابو الحسن علی ندوی
3. کتاب اللمع فی التصوف : ابو نصر سراج طوسی
4. قوت القلوب : ابو طالب مکی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 16: تصوف کی مشہور کتابیں (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 کشف المحجوب
16.3 فوائد الفواد
16.4 دیگر اہم کتابیں
16.4.1 مثنوی مولانا روم
16.4.2 مکتوبات امام ربانی
16.5 اکتسابی نتائج
16.6 نمونہ امتحانی سوالات
16.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.7 تجویز کردہ خود اکتسابی مواد

16.0 تمہید

تصوف کی تاریخ بہت پرانی ہے، تصوف کا لفظ روحانیت، ترک دنیاداری اور اللہ سے قربت حاصل کرنے کے مفہوم میں تصور کیا جاتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری تک تصوف مختلف مراحل طے کر کے ایک اہم موضوع کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ صوفیائے کرام ضخیم کتابیں مرتب کر چکے تھے۔ ان کتابوں کی تعلیمات کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں۔ اس اکائی میں ہم لوگ کچھ کتابوں کی تعلیمات اور اس کے موضوعات کے بارے میں جانیں گے۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ تصوف کی مشہور و معروف کتابوں سے آپ کو واقفیت حاصل ہو جائے اور مختلف ادوار میں تصوف پر لکھی جانے والی کتابوں کے بارے میں شناسائی حاصل کر لیں اور صوفیا کے افکار و خیالات کا اندازہ ہو سکے۔ اس اکائی میں کشف المحجوب، فوائد الفواد، مثنوی مولانا روم اور مکتوبات امام ربانی کے بارے میں آگاہی حاصل کریں گے۔

16.2 کشف المحجوب

ہندوستان میں لکھی جانے والی فارسی زبان میں تصوف پر اولین کتاب ''کشف المحجوب'' ہے۔ مصنف کا اسم گرامی سید علی بن سید عثمان ہجویری جلالی (سنہ 400 تا 465 یا 500 ھ) ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بارے میں معاصر تاریخیں خاموش ہیں، البتہ ''کشف المحجوب'' بنظر غائر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ایک جلیل القدر عالم، فقیہ اور صوفی ہیں جنھوں نے تصوف اور اس کے مسائل و نظریات کو نہ صرف پڑھا اور سمجھا ہے بلکہ اپنے علم، تطہیر باطن اور توفیق الٰہی کے ذریعہ اختلاف اقوال کی جڑ تک پہنچے ہیں۔ آپ نے نہ صرف کثرت سے اسفار و سیاحت کی بلکہ ہر مقام پر وہاں کے علماء، فقہاء اور صوفیہ سے مل کر مختلف مسائل کی عقدہ کشائی فرمائی۔ تنہا خراسان میں تین سو (300) مشائخ سے ملے۔ بیعت حضرت ابوالحسن علی ختلی کے دست حق پرست پر کی اور ان کے مقرب ترین اصحاب میں سے ہو گئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف میں تبحر حاصل کیا، عربی اور فارسی زبانوں میں غیر معمولی مقام پیدا کیا۔

اساتذہ و مشائخ میں ابوالعباس اشقانی، ابو جعفر الصیدلانی، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری، ابوالقاسم بن علی گرگانی، ابوالعباس احمد القصاب، ابو عبداللہ محمد بن علی الداستانی، ابو سعید فضل اللہ، ابو احمد ابن احمد، ابو عبداللہ جنیدی، ابو طاہر مکشوف، شیخ احمد بن شیخ خرقانی، ابوالعباس دامغانی، شیخ احمد سرخسی، احمد بخاری سمرقندی سے خاص طور پر متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔

''کشف المحجوب'' کی تصنیف کا ظاہری سبب دراصل آپ کے ہم وطن رفیق ابو سعید ہجویری کا استفسار ہے جو تصوف کی حقیقت اور اس کے رموز و اشارات کو علی ہجویری سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ شیخ علی ہجویری نے جواب کا ارادہ فرمایا تو انکشاف علوم کی فراوانی سے جواب ایک جامع کتاب کی صورت اختیار کر گیا۔ آپ کی بعض تصانیف مثلاً ''منہاج الدین'' (جس میں اصحاب الصفہ کے حالات و مناقب تحریر فرمائے تھے) ایک شخص نے آپ سے حاصل کی اور سرورق بدل کر مصنف کی جگہ اپنا نام لکھ دیا۔ لہٰذا شیخ علی ہجویری اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ کتاب کے متن میں جابجا ان کا نام آتا رہے تاکہ کتاب سرقہ اور بے اعتباری سے محفوظ رہے۔ شیخ نے حتی المقدور تصوف کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

''کشف المحجوب'' کا پہلا باب علم کی ضرورت اور اقسام سے شروع ہوتا ہے، شیخ ہجویری کے نزدیک ظاہر بغیر باطن کے منافقت ہے اور باطن بغیر ظاہر کے گمراہی۔ آپ نے علم شریعت اور علم حقیقت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے، اور ابو بکر دقاق کے اس قول کی تائید کی ہے کہ جس شخص نے صرف علم توحید پر اکتفا کی وہ زندیق (گمراہ) ہے۔

دوسرے باب کا موضوع فقر ہے۔ لکھا ہے کہ ایک فقیر کا ''کمال فقر'' یہ ہے کہ اگر دونوں جہاں (دنیا و آخرت) اس کے

فقر کی ترازو کے پلڑے میں رکھ دیے جائیں تو ان کا وزن ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہو۔ آپ کے نزدیک فقیر جتنا تنگ دست ہو گا اتنا ہی اس پر حال کشادہ ہو گا اور اسرار منکشف ہوں گے۔ بعض صوفیہ کا خیال نقل کیا کہ غنا فقر سے افضل ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ جب کہ فقر کی نسبت اس کی طرف جائز نہیں۔ حضرت ہجویری نے اس سے اختلاف فرمایا اور لکھا کہ حق تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور خلق کی صفات حادث (مخلوق)۔ حق تعالیٰ غنی ہیں اور غنا انہی کے لیے زیبا ہے جب کہ بندہ محتاج ہے۔ حتیٰ کہ حالت غنا میں بھی احتیاج ہی اس کی حقیقی صفت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کسی کو غنی کر دے اور وہ خود کو غنا کے لیے حق تعالیٰ کا محتاج جانے۔

تیسرے باب میں تصوف، صوفی اور اہل تصوف پر محققانہ بحث کی ہے۔ ابوالحسین نوری سے نقل کیا ہے کہ تصوف تمام حظوظ نفسانی کے ترک کرنے کا نام ہے، اور صوفی وہ ہے جو بشریت کی کدورت سے پاک و آزاد ہو گیا ہو۔ حضرت مصری کا قول نقل کیا ہے کہ دل کو مخالفت کی کدورت سے پاک صاف رکھنے کا نام تصوف ہے اور وضاحت فرمائی ہے کہ باطن کو حق تعالیٰ کی مخالفت سے محفوظ رکھو کیونکہ دوستی موافقت کا نام ہے اور موافقت مخالفت کی ضد ہے۔ دوست پر لازم ہے کہ سارے جہاں میں دوست (حق تعالیٰ) کے احکام کی حفاظت کرے۔ جب مطلوب و مراد ایک ہو تو مخالفت کی گنجائش کہاں۔

ابو بکر شبلی کا قول نقل کیا ہے کہ صوفی وہ ہے جو دونوں جہاں میں بجز اللہ کے کچھ نہ دیکھے، اور وضاحت کی ہے کہ بندہ جب غیر اللہ کو نہ دیکھے گا تو اپنی ذات کو بھی نہ دیکھے گا۔ اس لیے اپنی ذات کی نفی اور اثبات سے فارغ ہو جائے گا۔

چوتھے باب میں صوفیہ کے لباس پر تین فصلوں میں بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ تزکیہ نفس و صفائے باطن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے پر فضل و کرم ہے، ورنہ صوف یعنی اون تو چوپایوں کا لباس ہے، اور ایک بزرگ کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ان سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ گدڑی کیوں نہیں پہنتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نفاق کے ڈر سے، کیوں کہ مردان حق کا صرف لباس پہننے سے ان کے معاملات کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں آجاتی۔ مردان حق کا لباس پہننا اور ان کا بوجھ نہ اٹھانا کذب و نفاق ہے۔ علی ہجویری کے نزدیک گدڑی پہننا گویا کفن پہننا ہے جس کے بعد دنیا اور زندگی کی تمام لذتوں اور آسائشوں سے کنارہ کش ہو کر صرف حق تعالیٰ کا ہو کر رہنا پڑتا ہے۔

پانچویں باب میں مرید کی تربیت کے طریقہ اور فقر و صفوۃ کے معانی میں، مشائخ عظام کے مابین اختلاف پر بحث کی ہے۔ تربیت مرید کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مشائخ طریقت ایک سال تو خدمت خلق میں مصروف رکھتے ہیں، دوسرے سال خدمت حق تعالیٰ میں ریاضت و مجاہدہ کراتے ہیں اور تیسرے سال اسے اپنے دل کی حفاظت کرنے کا حکم دیتے ہیں تاکہ تمام ہموم و افکار اور غفلت سے دل کو مضبوط کرے اور پورے حضور قلب سے حق تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو۔

چھٹا باب ملامت پر ہے جس میں خلق کی ملامت کو اللہ کے دوستوں کی غذا قرار دیا ہے۔ ملامتیوں کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

(1) ایک یہ کہ ایک شخص اپنی عبادات و معاملات میں درست ہو پھر بھی خلق اس کو ناحق ملامت کرتی ہو جس کی وہ مطلقاً پروا نہ کرتا ہو۔

(2) دوسری یہ کہ دنیا کی جاہ و حشمت سے کلیتہً مونہہ موڑ کر حق تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جائے اور خلق کو دور رکھنے اور خود کو

حجاب سے بچانے کے لیے قصداً ایسے اعمال کرے جس سے خلق برگشتہ ہو جائے اور بغیر کسی انقطاع کے اپنے مقصود کی طرف متوجہ ہو جائے۔

(3) تیسری وجہ یہ کہ وہ ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہو اور خلق کی ملامت کے ڈر سے باز آنا نفاق و ریاکاری سمجھتا ہو اور اس فاسد خیال کے باعث احکام شریعت پر عمل آوری ترک کر دیتا ہو۔ علی ہجویری کے نزدیک ملامت یہ کی تیسری قسم صریح غلطی پر ہے۔

آگے سات (7) ابواب میں صحابہ کرام، اہل بیت، اصحاب الصفہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ فقہ اور متاخر صوفیہ عظام کا تذکرہ کیا ہے۔

چودھویں باب میں صوفیہ کے بارہ مکاتب بتائے ہیں اور ان کے نظریات پر بحث و تبصرہ کیا ہے۔

(1) پہلا فرقہ محاسبیہ جو حارث محاسبی سے منسوب ہے جن کا موقف تھا کہ رضا مقامات میں سے نہیں بلکہ احوال میں سے ہے۔

(2) دوسرا فرقہ قصاریہ جو ابو صالح حمدون بن قصار سے منسوب ہے جن کا موقف یہ تھا کہ تزکیہ نفس کے لیے خلق کی ملامت ضروری ہے۔

(3) تیسرا فرقہ طیفوریہ جو ابویزید طیفور بن عیسیٰ کی طرف منسوب ہے جن کا موقف یہ تھا کہ سکر (جس میں حق تعالیٰ کی محبت میں سالک مغلوب ہو جاتا ہے) صحو سے افضل ہے۔

(4) چوتھا فرقہ جنیدیہ جو ابوالقاسم جنید بغدادی کی طرف منسوب ہے جن کا موقف یہ تھا کہ صحو (جس میں ادراک و ہوش کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت قلب و روح کو نئی زندگی بخشتی ہے) سکر سے افضل ہے۔

(5) پانچواں فرقہ نوریہ جو ابوالحسین نوری سے منسوب ہے جن کا موقف یہ ہے کہ عزلت گزینی پر صحبت خلق کو فضیلت حاصل ہے تاکہ ایثار و کلفت کا نفس عادی بنے۔

(6) چھٹا فرقہ سہلیہ جو سہل بن عبداللہ تستری سے منسوب ہے جن کی تعلیم کا مقصد مخالفت نفس بذریعہ اجتہاد، جدوجہد، مشقت، مجاہدہ نفس اور ریاضت ہے۔ حضرت ہجویری نے نفس کی دو قسمیں بتائی ہیں (1) لذت و شہوت (2) جاہ طلبی، اور فرمایا کہ لذت و شہوت متعدی نہیں جبکہ جاہ طلبی متعدد مرض ہے جس کا اثر خلق الہیٰ پر بھی پڑتا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ مرض اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب جاہ طلبی خانقاہوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

(7) ساتواں فرقہ حکیمیہ جو حکیم ترمذی کے نام سے منسوب ہے، ولایت اور اقسام اولیاء ان کا موضوع دلچسپی ہے۔

(8) آٹھواں فرقہ فرازیہ جو ابوسعید فراز کی جانب منسوب ہے جنہوں نے فنا و بقاء پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

(9) نواں فرقہ خفیفیہ جو ابوعبداللہ ابن خفیف کی طرف منسوب ہے ان کا خاص موضوع "غیبت و حضور" ہے۔

(10)دسواں فرقہ سیاریہ جو ابوالعباس سیار کی جانب منسوب ہے جنھوں نے جمع و تفرقہ پر دقت نظری سے بحث کی ہے۔

(11)گیارہواں فرقہ حلولیہ جو ابو حلمان دمشقی کی طرف منسوب ہے اور

(12)بارہواں فرقہ حلاجیہ جس کا بانی فارسی بن عیسیٰ کو بتایا ہے۔

آخری دو فرقے حلولیہ و حلاجیہ ہجویری کے نزدیک مردود ہیں۔ ان کے علاوہ ہجویری نے کشف المحجوب میں معرفت، توحید، ایمان، طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، مشاہدہ، آداب سلوک اور مسئلہ سماع پر اپنے خاص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

16.3 فوائد الفواد

فوائد الفواد حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیٰ قدس سرہ کے ملفوظات کا وقیع مجموعہ ہے جسے حضرت خواجہ امیر حسن علاء سجزی نے جمع فرمایا ہے۔

حضرت امیر حسن کی ولادت بدایوں میں سنہ 652ھ میں ہوئی، وہ نسباً سادات اہل بیت سے تھے۔ بچپن ہی میں بدایوں سے دہلی آ گئے، جہاں آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا اور مروجہ نصاب کی تکمیل کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن کے فرزند ولی عہد محمد خاں شہید کی ملازمت اختیار کی، وہ امیر حسن کو دولت دار ملتان لے گیا، پانچ سال شاہزادہ کے ساتھ رہے۔ تاتاری لشکر سے جنگ میں شاہزادہ محمد شہید ہو گیا، امیر حسن بے روزگار ہو گئے، پھر سلطان جلال الدین خلجی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ جلال الدین کے بعد رکن الدین ابراہیم شاہ اول کچھ مدت کے لیے تخت نشین ہوئے پھر علاء الدین خلجی تخت پر بیٹھے اور زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو شعر و شاعری سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے امیر حسن نے فوج کے عملے میں خدمت انجام دینے لگے۔ حالات دن بہ دن خستہ ہوتے چلے گیے آپ نے علاء الدین خلجی کی تعریف میں قصیدہ لکھا لیکن خاطر خواہ قدر دانی نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی ان کی تنخواہ بھی روک دی جاتی غرض مالی طور پر بھی فکر مند رہتے تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء حسب معمول خواجہ قطب صاحبؒ کی مزار پر فاتحہ پڑھ کر واپس آ رہے تھے کہ حوض شمسی پر امیر حسن کا سامنا ہوا اور امیر حسن کی زندگی ہی بدل گئی۔ آپ نے حضرت کے ہاتھ پر بیعت کی اور خانقاہ میں ہمیشہ موجود رہنے لگے۔ خواجہ نظام الدین کے دو لفظوں نے امیر حسن کی زندگی بدل دی اور دنیا و آخرت دونوں سنور گئی۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث اپنی کتاب اخبار الاخیار میں امیر حسن کی سیرت اور حسن اخلاق کے بابت فرماتے ہیں۔ ”انہیں اپنے زمانے کے فضلاء میں خاص مرتبہ اور عزت حاصل تھی اور حضرت نظام الدین کے مریدوں میں شیخ سے قرب اور ان کی خصوصی توجہ سے ممتاز تھے۔ حسن معاملہ، صفائی باطن اور دوسری سب سے اچھی صفات میں یگانہ و یکتا تھے اور تصوف کی خوبیوں سے بھی آراستہ تھے۔“ آپ عربی و فارسی کا بہترین اور راسخ علم رکھتے تھے، ذہین اور لطیف طبیعت کے مالک تھے۔ علم مجلسی سے واقفیت حاصل تھی۔ دربار بادشاہی میں جوانی گذری اور عمر جب پختگی کو پہنچی تو حضرت نظام الدین اولیاء کی قربت حاصل ہوئی۔

حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہیٰ کے ملفوظات پانچ (5) مجلدات میں ”فوائد الفواد“ کے عنوان سے جمع فرمائے، جس میں

3 شعبان 707ھ سے محبوب الہیٰ کی مجالس کے ملفوظ نقل کرنا شروع کیے اور 20 شعبان 722ھ تک مختلف وقفوں کے ساتھ 188 مجالس کے نظامی موتی حضرت شیخ نظام الدین کے اپنے الفاظ بعینہٖ نقل کیے۔ "فوائد الفواد" کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ پورا مجموعہ حضرت شیخ کی نظر سے گذر چکا ہے اور آپ نے اس کی تصویب بھی فرمائی ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے "فوائد الفواد" کے متنوع مضامین سے بعض علوم اور بعض موضوعات کے عناوین کا انتخاب کیا ہے جو ذیل میں درج ہے۔

1- تفسیر	2- حدیث (رسول اللہ ﷺ)	3- فقہ
4- اصول فقہ	5- تاریخ	6- سیرۃ (رسول اللہ ﷺ)
7- سیر الاولیا	8- ملفوظات مشائخ	9- تصوف نظری
10- تصوف عملی	11- اعمال	12- عبادات
13- اوراد (واذکار)	14- آداب مریدین	15- آداب صوفیہ (کرام)
16- تزکیہ نفس	17- اخلاقیات	18- اصطلاحات صوفیہ
19- فلسفہ	20- منطق	21- آداب معاشرت
22- تعبیر رؤیا	23- حکایات مشائخ	24- اصول عقائد
25- ادب و شعر	26- سماع	27- لغت اور فقہ اللغۃ
28- وعظ و تذکیر	29- تمثیلات	30- لطائف

کتب ملفوظات میں "فوائد الفواد" ایک اونچا مقام رکھتی ہے۔ امیر حسن علاء سجزی اپنے مرشد کے وصال کے بعد دولت آباد چلے گئے۔ جہاں تقریباً دس سال دعوت حق کا کام کرتے رہے تاوقت یہ کہ 29 / صفر 738 ھجری بروز جمعہ آپ کا وصال ہو گیا اور دولت آباد ہی میں تدفین ہوئی۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے "فوائد الفواد" کی مقبولیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

> فوائد الفواد ہر دور میں بے حد مقبول رہی اور اسے چشتی نظامی سلسلے کے اولیاء نے ہی نہیں بلکہ دوسرے سلاسل کے درویشوں نے بے دستور العمل سمجھا ہے۔ ہر دور میں فوائد الفواد کی نقل اور کتابت بھی ہوتی رہی ہے اور اس کثرت نقل نے اس کی بعض روایتوں میں معمولی لفظی اختلافات بھی راہ پا گیے ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں پچھلے سات سو برس میں اتنے سیاسی انقلابات آئے ہیں کہ بقول شاعر: چمن اڑ گیے آندھیاں آتے آتے۔ ہمیں اب فوائد الفواد کا بہت قدیم نسخہ نہیں ملتا، جو نسخے دستیاب ہیں ان میں اکثر عہد محمد شاہی کے بعد کے ہیں۔

16.4 دیگر اہم کتابیں

16.4.1 مثنوی مولانا روم

مثنوی مولانا روم کے مؤلف مولانا جلال الدین محمد رومی ہیں جو 6 ربیع الاول 604ھ کو بلخ میں پیدا ہوئے۔ مولانا کی دادی ملکہ جہاں شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں اور مولانا کے والد بہاء الدین ولد کا نسب 8 واسطوں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے۔ مولانا رومی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ چار پانچ سال کی عمر تک سید برہان الدین محقق ترمذی آپ کے اتالیق رہے اور سلطان العلماء بہاء الدین ولد کی وفات کے بعد مولانا رومی کو منازل سلوک اپنی نگرانی ہی میں طے کرائے۔

بادشاہ وقت اور علماء ظاہر کے حسد نے بہاء الدین ولد کو بلخ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ بلخ سے نکلے تو مولانا رومی کی عمر چھ برس کی ہو گی۔ نیشاپور پہنچے تو فرید عطار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی تصنیف ”اسرار نامہ،، رومی کو ہدیہ دیا، نیشاپور سے بغداد، حجاز، شام، زنجان اور لارندہ (جہاں رومی کی شادی بعمر اٹھارہ سال کر دی گئی اور سلطان ولد یہیں پیدا ہوئے) ہوتے ہوئے سلجوقی سلطان علاء الدین کیقباد کی دعوت واصرار پر قونیہ پہنچے۔ یہاں آپ کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ ایک عالی شان مکان اور ضرورت کے تمام سامان مہیا کیے گئے۔ بہاء الدین ولد نے سلسلہ وعظ و تدریس شروع کر دیا، لیکن چند ہی سال بعد سنہ 628ھ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ سید برہان الدین محقق ترمذی کو مرشد کی وفات کی خبر ملی تو وہ قونیہ آ پہنچے، تعزیت و شرکت غم کے علاوہ انہوں نے مولانا رومی کی تعلیم و تربیت کی تکمیل کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ انہی کے حکم پر رومی نے حلب و دمشق کا سفر کیا اور مشہور حافظ، محدث، مورخ، فقیہ، مفتی اور ادیب کمال الدین ابن عدیم اور دیگر اساتذہ سے عربیت، فقہ، تفسیر و معقولات میں درجہ کمال حاصل کیا۔ رومی کے تذکرہ نگار سپہ سالار کے بموجب دمشق میں شیخ اکبر ابن عربی، سعد الدین حموی، عثمان رومی، اور صدر الدین کرمانی اور صدر الدین قونوی سے صحبت رہی۔ واپسی میں اپنے مرشد سید برہان الدین محقق ترمذی سے ملے (جنھوں نے آپ کے علم پر اطمینان کا اظہار کیا) اور قونیہ لوٹ گئے۔ جہاں آپ کے سپرد افتاء کی ذمہ داری کر دی گئی۔

قونیہ ہی میں شمس تبریزی سے ملاقاتیں ہوئیں جس سے رومی کی طبیعت میں جذب و شورش کی کیفیت پیدا ہو گئی، شمس تبریزی کو آپ کے تلامذہ و مریدین نے نفرت و حسد کی نظر سے دیکھا۔ شمس حساس تھے وہ رومی کو چھوڑ کر تبریز یا دمشق چلے گئے۔ رومی بے قرار ہو گئے۔ بمشکل تمام شمس تبریزی واپس آنے پر تیار ہوئے لیکن مخالفین و حاسدین کی سازشوں اور اشتعال انگیزیوں سے ان کا دل ٹوٹ گیا، وہ ایسے گئے کہ پھر نہ لوٹے، رومی ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے کہ عشق الٰہی کی چنگاری کے شعلہ بننے سے پہلے ہی لاپتہ ہو گیا۔ یہ تڑپ بڑھتے بڑھتے رومی کو مدہوشی کی طرف لے گئی۔ رومی نے پہلے صلاح الدین زرکوب اور پھر حسام الدین چلپی کو اپنا ہمدم وہمراز بنالیا اور حسام الدین چلپی ہی کی خواہش پر مثنوی لکھوانی شروع کی۔ بالآخر 672ھ میں رومی نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ حسب وصیت صدر الدین قونوی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھتے لیکن چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ قاضی سراج الدین نے پھر نماز جنازہ پڑھائی۔

Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

"مثنوی مولانا روم" وہ کتاب ہے جس نے رومی کے نام کو حیات جاوداں بخشی۔ حاجی خلیفہ کے مطابق مثنوی میں 2666 اشعار ہیں۔ عام روایت ہے کہ مثنوی کی تکمیل سے پہلے رومی کی زندگی کا ورق پلٹ گیا، لیکن ایسے شواہد بھی محققین نے ڈھونڈ نکالے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رومی نے مثنوی انتقال سے پہلے پوری کر لی تھی۔ واللہ اعلم۔

مطبوعہ "مثنوی" کے چھ دفتر ہیں جو سب کے سب سراپا سوز و ساز آئینہ ہیں۔ عارف رومی کے خیال و احوال، واردات و تاثرات اور مشاہدات و تجربات جب جوش و مستی، ایمان و علم و یقین سے ٹکرائے تو مثنوی کا پیکر سامنے آیا۔ اس میں ایک طرف فلسفہ وعقلیات پر نقد ہے تو دوسری طرف ظاہر پرستی پر بھی تنقید ہے۔ رومی بالخصوص عقل جزوی، عقل کارافزا اور عقل مختصر کے ناقد ہیں اور عقل عقل یا عقل کلی کے وکیل۔ جابجا قاری کو دعوت عشق الہیٰ دی ہے۔ رومی کے نزدیک عشق غیور و خوددار ہے۔ وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جس نے عشق الہیٰ کا مزہ چکھ لیا وہ سب سے بڑا دیوانہ، دو عالم سے بیگانہ، شاہوں کا شاہ، مظلوموں کا مطلوب ہے۔ عاشق بننے میں جو مزہ اور روز افزوں ترقی ہے، وہ معشوق بننے میں نہیں، عشق بظاہر ایک بیماری ہے لیکن جو اسے جھیل جائے اس کا انعام معرفت حقیقی اور حیات ابدی ہے، یہ بیماری ساری بیماریوں کی دوا ہے۔ عشق ایک کشش ہے اور مقناطیسی کشش کہ جس کہ باعث کائنات کے تمام سیارے اپنے اپنے محور پر گھوم رہے ہیں، ایسی کشش جو روح انسانی کو جمادات سے نباتات، نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے پیکر آدم تک کا ارتقا کا سفر طے کرا چکی ہے۔

مثنوی میں مقام انسانیت، جہانِ دل، دعوت عمل اور کلام و تصوف کے متعدد مسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے، انداز البتہ البیلا ہے۔ تزکیہ نفس، تصفیہ باطن اور تہذیب اخلاق کے علاوہ عبادات، معاملات، معاشرت کی حکمتوں پر اس طور سے اشعار لکھے ہیں کہ صاحبان دل کا ہاتھ بے اختیار دل کی طرف اٹھ جاتا ہے۔

دیگر کتب تصوف کی طرح مثنوی پر بھی ضعیف بلکہ موضوع احادیث سے استدلال پر نقد کیا گیا ہے۔

16.4.2 مکتوبات امام ربانی

یہ مجموعہ ہے حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد مخدوم فاروقی سرہندی کے مکتوبات کا جو نقشبندی سلسلہ کے ایک ممتاز صوفی تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی جو مشہور چشتی صابری صوفی شاہ عبد القدوس گنگوہی کے مرید و خلیفہ اور شیخ اکبر ابن عربی کی متنازعہ کتاب "فصوص الحکم" کے درس کے لیے مشہور تھے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی نے قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور عربی ادب کی تحصیل مولانا کمال کشمیری اور مولانا یعقوب کشمیری سے سیالکوٹ میں کی، اور تربیت باطنی اپنے والد شیخ عبد الاحد مخدوم اور شاہ سکندر کیتھلی سے پائی۔ والد ماجد نے سلاسل چشتیہ، سہروردیہ اور کبراویہ میں آپ کو خرقہ خلافت عنایت فرمایا اور سلسلہ قادریہ میں شاہ سکندر کیتھلی نے آپ کو مجاز بیعت فرمایا۔ ظاہری و باطنی علوم کے حصول کے بعد آپ نے آگرہ کا رخ کیا۔ جہاں مغل بادشاہ اکبر اذکار و اشتغال کی نیت سے تعمیر کردہ عبادت خانہ کو مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے مرکز کی شکل میں تبدیل کر چکا تھا، شیخ مبارک ناگوری کے تسوید کردہ محضر کی بنیاد پر خود کے سلطان عادل اور مجتہد اعظم ہونے کا اعلان کروا چکا تھا۔ شیخ مبارک کے بیٹے ابو الفضل اور فیضی اس کے مشیر خاص تھے جن کے زیر اثر دینی مدارس کی مالی مدد سے اس نے ہاتھ کھینچ لیے تھے اور فلسفہ و معقولات کی سرپرستی شروع کر دی

تھی۔ آزادی خیال کے نام پر شعائر اسلام بشمول نبوت وائمہ کرام کا مذاق اڑایا جاتا اور بادشاہ کی روشن خیالی کے نام پر غیر اسلامی مراسم دربار و محل میں جگہ پاتے، روشنیہ تحریک اور مہدوی تحریک جڑ پکڑ چکی تھیں، علماء میں جاہ پسندی اور بعض صوفیہ میں الحادی نظریات راہ پا گئے تھے۔ عوام میں انتشار تھا۔ شریعت و دین ایک بحران سے گذر رہے تھے، ایسے میں حضرت شیخ احمد سرہندی نے حضرت باقی باللہ کے ہاتھ پر نقشبندی سلسلہ میں بیعت فرمائی اور چند ہی ماہ میں سلوک کی از سر نو تکمیل کر کے خرقہ خلافت حاصل کیا اور تجدید دین کے فریضہ کی ادائیگی پر کمر باندھ لی۔ دیکھتے دیکھتے آپ کی شہرت ہندوستان و بیرون ہند پھیل گئی۔ معاصر علماء، فقہاء وصوفیہ اور امراء سے آپ نے خط و کتابت شروع کی اور ان کو اقامت دین اور احیاء کتاب و سنت کی طرف توجہ دلائی، ہند میں اپنے خلفاء کو خاص اسی غرض سے پھیلا دیا، اپنے رسالہ "رد روافض"، یا خواجہ باقی باللہ کو لکھے گئے باطنی حالات نے حاسدین کو بادشاہ وقت جہانگیر کو بھڑکانے کا موقع فراہم کیا، آپ کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا اور بوجوہ گوالیار کے قلعہ میں قید کی سزا دی گئی۔ ابھی سال بھر ہی گذرا تھا کہ جہانگیر نے نیا فرمان آپ کی رہائی کے لیے جاری کیا۔ آپ کے حسب مرتبہ استقبال کیا اور درخواست کی کہ کچھ وقت جہانگیر کے لشکر کے ساتھ ہی گذاریں، آپ نے حکمت الہیٰ جان کر وہ وقت جہانگیر و دیگر اہم امراء کی ذہن سازی میں صرف کیا جن میں خان اعظم مرزا کوکہ، مفتی صدر جہاں، عبدالرحیم خانخاناں، نواب فرید خاں، خان جہاں، قلیچ خاں اور مہابت خاں قابل ذکر ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں "رد روافض"، "معارف لدنیہ"، "مبداء و معاد"، "اثبات النبوۃ"، "رسالہ تہلیلیہ"، "شرح رباعیات حضرت خواجہ باقی باللہ"، "رسالہ حالات خواجگاں نقشبند"، "مکاشفات عینیہ" اور "آداب المریدین" مشہور ہیں لیکن جو شہرت "مکتوبات امام ربانی" کو حاصل ہوئی اور جو فیض ان مکتوبات سے اہل علم وخواص نے اٹھایا اس کی کچھ بات ہی اور ہے۔ آپ نے انتہائی فعال زندگی گزارنے کے بعد 1034ھ میں ملک الموت کو بعمر 63 سال لبیک کہا اور واصل بحق ہوئے۔

"مکتوبات امام ربانی" کے کل تین دفتر ہیں۔ دفتر اول یار محمد بدخشی طالقانی نے جمع کیا ہے اس میں 313 مکتوبات ہیں۔ دفتر دوم عبدالحی حصاری نے جمع کیا اس میں 99 مکتوبات ہیں، اور دفتر سوم محمد ہاشم برہانپوری نے ترتیب دیا، اس میں 124 مکتوبات ہیں۔ یعنی مکتوبات کی مجموعی تعداد 536 ہے۔

دفتر اول کے مکتوب 84 میں لکھتے ہیں: شریعت اور حقیقت ایک دوسرے کا عین ہیں اور حقیقت میں ایک دوسرے سے جدا نہیں، فرق صرف اجمال و تفصیل، کشف و استدلال، غیبت و شہادت اور تعمل و عدم تعمل کا ہے، وہ احکام و علوم جو شریعت روشن کے موافق ظاہر اور معلوم ہوتے ہیں حق الیقین کی حقیقت ثابت ہونے کے بعد یہی احکام و علوم بعینہا تفصیل سے منکشف ہو جاتے ہیں، غیبت سے شہادت میں آجاتے ہیں اور کسب کا تکلف اور عمل کی بناوٹ درمیان سے اٹھ جاتی ہے۔ اور حق الیقین کی حقیقت تک پہنچنے کی علامت اس مقام کے علوم و معارف کا شرعی علوم و معارف کے ساتھ مطابق ہونا ہے... جس کسی سے علم و عمل میں خلاف شریعت صادر ہوا ہے، وہ سکر وقت پر مبنی ہے اور سکر وقت اثناء راہ میں واقع ہوتا ہے۔ منتہیوں کو سب صحو اور ہوشیاری ہے اور وقت ان کا مغلوب ہے اور حال و مقام ان کے کمال کے تابع... کسی شخص نے حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ سے سوال کیا کہ سیر و سلوک سے مقصود کیا ہے تو فرمایا کہ معرفت اجمالی تفصیلی ہو جائے اور استدلالی کشفی ہو جائے۔

دفتر اول کے مکتوب 26 میں فرماتے ہیں: شریعت کے تین جزو ہیں: علم، عمل اور اخلاص۔ جب تک یہ تینوں جزو متحقق نہ ہوں ، شریعت متحقق نہیں ہوتی، جب شریعت حاصل ہوگئی تو گویا حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگئی جو دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں سے بڑھ کر ہے... احوال و مواجید اور علوم و معارف... اصل مقصود نہیں بلکہ وہم و خیالات ہیں جن سے طریقت کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے... اخلاص مقام رضا کو مستلزم ہے، تین قسم کی تجلیوں اور عارفانہ مشاہدات سے گزار کر ہزاروں میں سے کسی ایک کو اخلاص اور مقام رضا تک پہنچاتے ہیں، بے سمجھ احوال و مواجید کو مقصود اصلی سمجھ بیٹھتے ہیں... ہاں مقام اخلاص اور مرتبہ رضا تک پہنچنا احوال و مواجید کے طے کرنے اور ان علوم و معارف کے ثابت ہونے پر منحصر ہے۔

دفتر سوم کے مکتوب 40 میں فرماتے ہیں: وہ طریق جس سے اس فقیر کو مشرف فرمایا ہے ایسا طریق ہے جو جذب و سلوک کا جامع ہے، وہاں تخلیہ اور تجلیہ باہم جمع ہیں اور تصفیہ و تزکیہ ایک دوسرے سے باہم ملے ہوئے ہیں اس مقام میں سیر انفسی و سیر آفاقی شامل ہے، عین تصفیہ میں تزکیہ ہے اور عین تجلیہ میں تخلیہ، جذب سے سلوک حاصل ہوتا ہے جس میں انفس و آفاق شامل ہیں اگرچہ تقدم ذاتی تخلیہ اور جذبہ کے لیے ہے۔

دفتر سوم کے مکتوب 86 میں فرماتے ہیں: خوارق کا ظاہر ہونا نبوت کی شرط ہے ولایت کی شرط نہیں کیونکہ نبوت کا اظہار واجب ہے، ولایت کا اظہار واجب نہیں بلکہ اس کا چھپانا بہتر ہے کیونکہ نبوت میں خلق کی دعوت ہے اور ولایت میں قرب حق، دعوت کا ظاہر ہونا ضروری ہے اور قرب حق کا چھپانا لازمی۔

16.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے مندرجہ ذیل نکات سیکھے:

- اس اکائی میں آپ تصوف پر لکھی گئی کتابوں میں سے بنیادی کتابوں کشف المحجوب، فوائد الفواد، مثنوی مولانا روم اور مکتوبات امام ربانی کا تعارف اس کے مشمولات اور ان میں بہم پہنچائی گئی اصولوں اور تعلیمات سے واقف ہوئے۔
- ہندوستان میں لکھی جانے والی فارسی زبان میں تصوف پر اولین کتاب "کشف المحجوب،، ہے۔ مصنف کا اسم گرامی سید علی بن سید عثمان ہجویری جلالی ہے۔
- فوائد الفواد حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہ کے ملفوظات کا وقیع مجموعہ ہے جسے حضرت خواجہ امیر حسن علاء سجزی نے جمع فرمایا ہے۔
- مثنوی مولانا روم کے مؤلف مولانا جلال الدین محمد رومی ہیں، "مثنوی مولانا روم" وہ کتاب ہے جس نے رومی کے نام کو حیات جاوداں بخشی۔ حاجی خلیفہ کے مطابق مثنوی میں 2666 اشعار ہیں۔ عام روایت ہے کہ مثنوی کی تکمیل سے پہلے رومی کی زندگی کا ورق پلٹ گیا، لیکن ایسے شواہد بھی محققین نے ڈھونڈ نکالے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رومی نے مثنوی انتقال سے پہلے پوری کرلی تھی۔
- مکتوبات امام ربانی حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد مخدوم فاروقی سرہندی کے مکتوبات کا جو نقشبندی سلسلہ کے ایک ممتاز صوفی

تھے۔"مکتوبات امام ربانی" کے کل تین دفتر ہیں۔ دفتر اول یار محمد بدخشی طالقانی نے جمع کیا ہے اس میں 313 مکتوبات ہیں۔ دفتر دوم عبد الحی حصاری نے جمع کیا اس میں 99 مکتوبات ہیں، اور دفتر سوم محمد ہاشم برہانپوری نے ترتیب دیا، اس میں 124 مکتوبات ہیں۔یعنی مکتوبات کی مجموعی تعداد 536 ہے۔

16.6 نمونہ امتحانی سوالات

16.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. کشف المحجوب کے مصنف کون ہیں؟

(a).ابوعبداللہ جنیدی (b).ابوطاہر مکشوف (c).ابوالحسین نوری (d).سید عثمان علی ہجویری

2. عثمان علی ہجویری کس کتاب کے مصنف ہیں؟

(a).فوائد الفواد (b).اسرار نامہ (c).آداب المریدین (d).منہاج الدین

3. فوائد الفواد کو کس نے جمع کیا؟

(a).عثمان علی ہجویری (b).عبد الاحد فاروقی (c).شمس تبریزی (d).امیر حسن علی سجزی

4. اسرار نامہ کے مصنف کون ہیں؟

(a).نظام الدین اولیاء (b).شمس تبریزی (c).جنید بغدادی (d).فرید الدین عطار

5. فصوص الحکم کے مصنف کون ہیں؟

(a).فرید الدین عطار (b).شمس تبریزی (c).امیر حسن (d).محی الدین ابن عربی

6. فوائد الفواد کتنی جلدوں پر مشتمل ہے؟

(a).سات جلد (b).بارہ جلد (c).تین جلد (d).پانچ جلد

7. فرقہ حلولیہ کس کی طرف منسوب ہے؟

(a).ابوحلمان دمشقی (b).حکیم ترمذی (c).ابوسعید فراز (d).جنید بغدادی

8. ابوالحسین نوری کی طرف کون سا فرقہ منسوب ہے؟

(a).طیفوریہ (b).قصاریہ (c).نوریہ (d).فرقہ حلولیہ

9. مولانا جلال الدین رومی کہاں پیدا ہوئے؟

(a).کوفہ (b).بلخ (c).کونیہ (d).دہلی

10. احمد بن عبد الاحد مخدوم فاروقی کس سلسلے سے منسوب کیے جاتے ہیں؟

(a).نقشبندیہ (b).نوریہ (c).قصاریہ (d).حلولیہ

16.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سید عثمان علی ہجویری نے صوفیہ کے کتنے مکاتیب بتائے ہیں؟ بیان کیجیے۔
2. مولانا جلال الدین رومی کی حالت زندگی بیان کیجیے۔
3. مثنوی مولانا روم پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
4. فوائد الفواد پر مضمون لکھیے۔
5. مکتوبات امام ربانی کے دفاتر کی تدوین پر ایک نوٹ لکھیے۔

16.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. کشف المحجوب پر ایک مضمون لکھیے۔
2. سید عثمان علی ہجویری کے بارے میں لکھیے۔
3. مکتوبات امام ربانی پر تفصیل سے لکھیے۔

16.7 تجویز کردہ خود اکتسابی مواد

1. تصوف اسلام	:	از عبد الماجد دریا آبادی
2. تاریخ دعوت وعزیمت	:	از سید ابوالحسن علی ندوی
3. مثنوی مولانا روم	:	جلال الدین محمد رومی
4. کشف المحجوب	:	سید عثمان ہجویری

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 17: ہندوستان کے مشہور صوفیاء کرام (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

17.0 تمہید
17.1 مقاصد
17.2 شیخ علی ہجویریؒ (المتوفی 465 یا 500ھ)
17.3 حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (المتوفی 636 یا 637ھ)
17.4 حضرت شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی الملتانیؒ (المتوفی 666ھ)
17.5 کلیدی الفاظ
17.6 اکتسابی نتائج
17.7 نمونہ امتحانی سوالات
17.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
17.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
17.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
17.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

17.0 تمہید

ہندوستان میں تصوف کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے۔ جس نے برصغیر میں اسلام کی تعلیمات واس کی رسائی کو فروغ دیا ہے۔ صوفیائے کرام کا مقصد ہی تبلیغ واصلاح تھا اور یہ لوگ انسانی دلوں کو فتح کرنے اور محبت کی تلوار سے دشمنوں کو گرویدہ بنانے کا فن جانتے تھے۔ اس اکائی میں آپ کو اہم صوفی شخصیات شیخ علی ہجویری، خواجہ معین الدین اور شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔

17.1 مقاصد

اس اکائی کے مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ آپ شیخ علی ہجویری کی تعلیمات سے آگاہ ہوسکیں اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی تعلیمات کا اہل ہند پر جو اثر ہوا اس کا جائزہ لے سکیں۔ اس کے علاوہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے کارناموں اور ان کی تعلیمات سے استفادہ حاصل کریں۔

17.2 شیخ علی ہجویریؒ (المتوفی 465یا500ھ)

نام ونسب: آپ کا نام علی اور کنیت ابوالحسن تھی۔ سلسلہ نسب یہ ہے علی بن سید عثمان بن سید علی بن سید عبدالرحمن بن سید شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن سید حسن اصغر بن سید زید شہید بن سیدنا حسنؓ بن سیدنا علی مرتضیٰؓ۔

چونکہ ہجویر اور جلاب (جو غزنین کے دو گاؤں ہیں) کو شروع میں آپ کے قیام کا شرف ملا۔ لہذا آپ ہجویری اور جلابی کہلائے۔ سال ولادت سنہ 400ھ بتایا جاتا ہے۔

تعلیم: علم کی تحصیل کی تفصیل کا پتہ نہیں چلتا لیکن اپنی مشہور تصنیف کشف المحجوب میں اپنے اساتذہ کے نام لکھے اور مختصراً ان کا حال بیان کیا ہے۔ نام ذیل میں درج ہیں:

(1) ابوالعباس بن محمد الاشقانی (2) ابو جعفر محمد بن مصباح الصیدلانی (3) ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری
(4) ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی (5) ابوالعباس احمد بن محمد القصاب (6) ابوعبداللہ محمد بن علی داستانی
(7) ابوسعید فضل اللہ بن محمد (8) ابواحمد بن احمد بن حمد (9) ابواحمد مظفر

صفائے باطن کی تربیت ابوالفضل محمد بن حسن ختلی سے پائی جو تفسیر و حدیث کے ایک بڑے عالم تھے اور تصوف میں مذہب جنید (بغدادی) کے پابند، ساٹھ (60) سال گمنامی کی حالت میں لوگوں سے دور رہ کر گزار دیے۔ ظاہری رسوم کی پابندی کی شدت سے مخالفت کرتے، چنانچہ ان کا اپنا لباس ظاہری متصوفین جیسا نہ تھا۔ وہ شیخ ابوالحسن علی حصری کے مرید تھے جو ابو بکر شبلی کے واسطے سے جنید بغدادی سے وابستہ تھے۔

سیاحت: تطہیر قلب و روح کے لیے ابوالحسن علی ہجویری نے کثرت سے سفر کیے۔ شام، عراق، فارس، قہستان، آذربائجان، طبرستان، خوزستان، کرمان، خراسان، ترکستان اور ماوراء النہر کے علاوہ دیگر مقامات کا سفر کیا۔ جہاں گئے وہاں کے علماء اور صوفیہ سے فیض حاصل کیا۔ خاص خراسان میں تقریباً تین سو (300) مشائخ سے ملے۔ ایک گاؤں میں پہنچے تو ایک خانقاہ میں متصوفین کی جماعت نظر آئی، ان کو علی ہجویری بہت حقیر معلوم ہوئے، وہ خود اونچے کوٹھے پر ٹھہرے اور علی ہجویری کو ٹھہرنے کے لیے نیچے ایک کوٹھا دیا، کھانے کے وقت ہجویری کو سوکھی روٹی دی اور خود اچھا کھانا کھایا، کھانے کے بعد ہجویری پر خربوزے کے چھلکے پھینکتے اور طنزیہ فقرے کستے۔ ہجویری لکھتے ہیں

کہ وہ جتنا زیادہ طنز کرتے ہجویری کا دل اتنا ہی خوش ہوتا۔ یہاں تک کہ ذلت اٹھاتے اٹھاتے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی وہ کشف حاصل ہوا جو اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ اس وقت ہجویری کو معلوم ہوا کہ مشائخ اپنے پاس جاہلوں کو کیوں جگہ دیتے ہیں۔

چالیس (40) سال مسلسل سفر میں رہے لیکن نماز باجماعت کبھی ترک نہ ہوئی۔ ہر جمعہ کو کسی قصبہ میں قیام فرماتے تاکہ نماز جمعہ ناغہ نہ ہو۔ اپنے مرشد کی طرح صوفیہ کے ظاہری رسوم سے نفرت تھی، ان کو معصیت وریا اور رسوم کے پابند صوفیہ کی صحبت کو مقام تہمت قرار دیتے اور فرماتے کہ جب کوئی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو مقام تہمت میں کھڑا نہ ہونا چاہیے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ نے ایک نکاح فرمایا تھا لیکن جلد ہی تفریق ہوگئی پھر دوبارہ نکاح نہیں کیا۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ کسی سے ایک سال تک ابتلاء عشق رہا، دین تباہ ہونے سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے اس فتنہ سے ان کو بچالیا۔

سلطان مسعود غزنوی کے دور میں اپنے مرشد کی وفات کے بعد ان کے حکم کے مطابق لاہور تشریف لائے اور تاوقت اخیر یہیں مقیم رہے۔ مدعیان علم سے مذاکرے بھی ہوئے اور رشد وہدایت اور تبلیغ دین میں مصروف بھی رہے۔ سال وفات عام طور پر 465ھ تسلیم کیا جاتا ہے لیکن پروفیسر علم الدین سالک کی تحقیق کے مطابق صحیح سنہ وفات 500ھ ہے۔ غالباً اسی قیام لاہور کے دوران مرجع خلائق بنے۔ چنانچہ مسعود غزنوی کے جانشین ابراہیم غزنوی نے بنظر احترام آپ کا مزار تعمیر کرایا۔

تصانیف: (1) منہاج الدین (2) کتاب الفناء والبقاء (3) اسرار الخرق والمؤنات (4) البیان لاہل العیان
(5) بحر القلوب (6) الرعایہ لحقوق اللہ (7) کشف المحجوب (8) دیوان
(9) ایک کتاب ایمان پر جداگانہ لکھی (10) ایک رسالہ میں حسین ابن منصور حلاج کے کلام کی شرح کی

ان تصانیف میں صرف کشف المحجوب باقی رہ گئی۔ دوسری تصانیف میں منہاج الدین اور دیوان کا دو لوگوں نے سرقہ کرلیا اور اپنے اپنے نام سے ان کو منسوب کر دیا۔ کشف المحجوب کے علاوہ آپ کی دیگر تصانیف کا پتہ نہیں چل سکا۔

علم: علی ہجویری کے نزدیک علم ہی کے ذریعہ ایک سالک مراتب ودرجات کے حصول کے لائق ہوتا ہے اور یہ بھی اس وقت جب وہ اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو۔ علم کی دو قسمیں ہیں۔

(1) علم حق جو تمام موجودات ومعدومات پر محیط ہے اور اس کی کوئی حد وانتہا نہیں

(2) علم خلق جو خلق کی صفت ہے حق تعالیٰ کا عطا کردہ اور محدود ومتناہی

علم حق کے بالمقابل علم خلق بالکل ہیچ ہے۔ علم خلق کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(1) اصولی: ظاہر میں کلمہ شہادت پڑھنا اور باطن میں معرفت کی تحقیق کرنا

(2) فروعی: ظاہر میں لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ اور باطن میں نیت کا خالص رکھنا

فرماتے ہیں کہ ظاہر باطن کے بغیر نفاق ہے اور باطن ظاہر کے بغیر زندقہ (گمراہی)۔ ظاہر شریعت باطن شریعت (یعنی حقیقت)

کے بغیر ناقص وناممکل ہے اور باطن شریعت کا دعویٰ ظاہر شریعت کی پابندی کے بغیر ہویٰ وہوس۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ احکام ومعرفت کے حصول میں مشغول رہے۔

جو شخص علم کو دنیاوی عزت وجاہ کی غرض سے اختیار کرتا ہے درحقیقت وہ عالم کہلانے کا مستحق نہیں کیونکہ دنیاوی عزت وجاہ کی خواہش خود از قبیل جہالت ہے۔

تصوف: فرمایا: کلمہ تصوف باب تفعل سے ہے جس کا خاصہ یہ ہے کہ یہ تکلف فعل کا متقاضی ہو۔ اور یہ اصل کی فرع ہے لغوی حکم اور ظاہری معنی میں اس لفظ کی تعریف کا فرق موجود ہے۔

"الصفا ولاية ولها آية و رواية والتصوف حكاية للصفا بلاشكاية"

صفاولایت کی منزل ہے اور اس کی چند نشانیاں ہیں اور تصوف صفاء کی ایسی حکایت وتعبیر ہے جس میں شکایت نہ ہو۔

علی ہجویری فرماتے ہیں کہ جب بندہ کا دل دنیاوی صفات سے خالی ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیاوی کدورتوں سے بھی پاک وصاف کر دیتا ہے۔ یہ حال صوفی صادق کا ہے۔ صفا کدورت کی ضد ہے اور کدورت بشری صفات میں سے ہے۔ حقیقتاً صوفی وہ ہے جو بشری کدورتوں سے گزر جائے۔ اسی لیے مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ حالت صفا بشری صفات میں نہیں اس لیے کہ بشر تو مٹی کا ایک تودہ ہے اور مٹی کا تودہ کدورت سے خالی نہیں ہوتا۔ بشری حالت میں کدورتوں سے نجات ممکن نہیں اور محض مجاہدوں سے بشریت زائل نہ ہوگی کیونکہ صفت احوال وافعال سے منسوب ہے نہ نام والقاب ہے۔

"صفا" دوستوں کی صفت ہے جو اپنے محبوب حق تعالیٰ جل شانہ کی رضا کی خاطر بشری صفات فنا کرکے حق تعالیٰ کی محبت کی صفت کے ساتھ باقی رہ جاتے ہیں۔ جب بندہ مقامات کی بندشوں اور احوال کی کدورتوں سے نجات پاکر تغیر وتلون کی حدود سے باہر آتا اور صفات محمودہ سے متصف ہوجاتا ہے تو وہ صفا پالیتا ہے، وہ صفا جس کے لیے بلازوال حضور (یعنی کیفیت احسان) اور بلا سبب وجود ضروری ہے اور یہ حقیقت الفاظ وعبارات واشارات سے بلند ہے۔

ہجویری فرماتے ہیں کہ آج جو لوگ طریقت وتصوف کے مدعی نظر آتے ہیں وہ اصول طریقت کے خلاف عمل کرتے اور طریقت کو بدنام کرتے ہیں... اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسے زمانے میں پیدا فرمایا ہے کہ لوگوں نے اپنی خواہشات کا نام شریعت، حب جاہ کا نام عزت، تکبر کا نام علم، ریاکاری کا نام تقویٰ، کینہ چھپانے کا نام حلم، مجادلہ کا نام مناظرہ، محاربہ کا نام عظمت، نفاق کا نام وفاق، آرزو اور تمنا کا نام زہد، ہذیان طبع کا نام معرفت، نفسانیت کا نام محبت، الحاد کا نام فقر، انکار وجود کا نام صفوت، بے دینی وزندقہ کا نام فنا، نبی کریمؐ کی شریعت کو ترک کرنے کا نام اور طریقت اہل دنیا کی آفات کا نام معاملہ رکھ لیا ہے، اسی بنا پر ارباب معانی وعارفان حقیقت نے لوگوں سے کنارہ کشی کرکے گوشہ خلوت میں رہنا پسند کیا۔

17.3 حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (المتوفی 636 یا 637ھ)

نام ونسب: حضرت خواجہ کا نام معین الدین اور دادا کا نام سید حسن اسی سبب حضرت خواجہ کا نام تذکرہ نگار بالعموم معین الدین حسن لکھتے ہیں:

جواہر فریدی میں یہ نسب درج ہے: خواجہ معین الدین بن غیاث الدین بن سید حسن احمد بن سید طاہر بن سید عبد العزیز بن سید ابراہیم بن محمد مہدی بن حسن عسکری بن امام نقی بن امام تقی بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین شہید کربلا بن امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ورضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

آپ کی ولادت سجستان یا سیستان یا سنجر میں غالباً 537ھ میں ہوئی۔ بعض کے نزدیک جب آپ کی عمر پندرہ برس اور بعض کے نزدیک بیس برس کی ہوئی تو آپ کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ترکہ میں آپ کو ایک باغ ملا۔ وہاں ابراہیم قندوری نامی مجذوب سے آپ کی ملاقات ہوئی، انہوں نے کھلی کا ایک ٹکڑا چبا کر آپ کو دیا۔ آپ نے ادب سے وہ لیا اور کھالیا جس کا اثر یہ ہوا کہ دل علائق دنیا سے سرد ہو گیا اور آپ سب کچھ چھوڑ کر بخارا اور سمرقند پہنچے جہاں آپ نے قرآن مجید حفظ فرمایا اور ظاہری علوم کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سمرقند سے نکلے اور نیشاپور کے قصبہ ہران پہنچے جہاں حضرت شیخ عثمان ہرونی سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آپ نے ان کی صحبت اختیار فرمائی اور کچھ ہی عرصہ بعد ان سے شرف بیعت بھی حاصل کی۔ بیعت کے وقت شیخ عثمان ہرونی نے آپ سے تازہ وضو کروایا، دو رکعت نماز پڑھوائی، سورہ بقرہ کی تلاوت کروائی، پھر اکیس (21) بار درود پاک اور ساٹھ (60)) بار تسبیح پڑھنے کے لیے کہا، پھر ایک قینچی اٹھائی اور آپ کے سر کے چند بال کاٹے اور کلاہ چہار ترکی (ترک دنیا، ترک نفس، ترک خواب وخورد اور ترک عقبی کی علامت) اور خرقہ عنایت فرمایا۔

شجرۂ طریقت: (1) خواجہ عثمان ہرونی (2) خواجہ حاجی شریف زندانی (3) خواجہ محمد مودود چشتی (4) خواجہ ابو یوسف چشتی (5) خواجہ ابو محمد چشتی (ہندوستان میں آنے والے سب سے پہلے چشتی صوفی) (6) خواجہ ابو احمد چشتی (7) خواجہ ابو اسحق شامی چشتی (ہرات کے قریب واقع گاؤں چشت کے رہنے والے بزرگ جن سے سلسلۂ چشتیہ نے اپنا نام پایا) (8) خواجہ ممشاد علو دنیوری (9) خواجہ ابو ہبیرۃ امین الدین بصری (10) خواجہ سدید الدین حذیفہ مرعشی (11) حضرت ابراہیم بن ادہم (12) حضرت ابو الفیض فضیل بن عیاض (13) حضرت ابو الفضل عبد الواحد بن زید (14) حضرت حسن بصری (15) حضرت علی ابن ابی طالب (16) حضرت محمد مصطفیؐ۔

اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہرونی کی خدمت میں بیس (20) سال اور بعض کے نزدیک ڈھائی سال گزارے۔ مجاہدے، عبادتیں، اذکار، مراقبے سب حضرت عثمان ہرونی کے ارشاد کے مطابق کرتے رہے، مرشد کے ساتھ سیوستان، دمشق، اوش بغداد، بدخشاں، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھی گئے اور اس شان سے گئے کہ مرشد کا بستر اور دوسرا سامان سفر سر پر رکھا رہا۔

سیوستان میں شیخ صدر الدین محمد سیوستانی سے ملے۔ انہوں نے ایک موقع پر حضرت خواجہ معین الدین سے فرمایا۔ "اے عزیز! جس کو موت آنے والی ہو اور اس کا حریف ملک الموت ہو اس کو سونے، ہنسنے اور خوش رہنے سے کیا مطلب"۔

حرم کعبہ میں خواجہ عثمان ہرونی نے آپ کے حق میں دعائیں کیں جس پر بشارت ملی کہ معین الدین ہمارا دوست ہے، ہم نے اس کو قبول کیا اور (اپنے لیے) چن لیا ہے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں ہندوستان جانے کا حکم ملا۔ خواجہ عثمان ہرونی نے آپ کو خرقہ اجازت فرمایا اور دوبارہ کلاہ چہار ترکی دی، ان کے علاوہ عصا، نعلین چوبی اور سجادہ (مصلی) بھی عنایت فرمائے۔ خواجہ معین الدین کی عمر اس وقت باون (52) سال بتائی جاتی ہے۔ خواجہ عثمان ہرونی آپ سے بے حد محبت فرماتے اور کہتے کہ معین الدین اللہ کا محبوب ہے، اس کی ارادت مندی میرے لیے سامان فخر ہے۔ رخصت کرتے وقت ارشاد فرمایا کہ جو کچھ ہم نے دیا اس کی حفاظت کرنا اور دینا تو کسی امانت دار جوانمردہی کو دینا، ہم نے جو کچھ تم کو بتایا اس پر عمل پیرا رہنا تاکہ روز قیامت شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔

حضرت خواجہ معین الدین بادیدۂ نم اپنے مرشد سے جدا ہوئے تو مختلف صوبوں، شہروں اور دیہاتوں میں مختلف بزرگوں سے فیض حاصل کرتے سنہ 587 ھ کے لگ بھگ ہندوستان پہنچے۔ مقامات میں سنجان، جبل (گیلان) بغداد، ہمدان، تبریز، خرقان، استر آباد، مرد، سبزوار، حصار، بلخ، غزنین کا ذکر ملتا ہے اور بزرگوں میں شیخ نجم الدین کبری، شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی، شیخ ناصرالدین استر آبادی، شیخ ابو سعید تبریزی، شیخ محمود اصفہانی اور شیخ عبدالواحد غزنوی علیہم الرحمتہ کے نام ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ خواجہ بزرگ نے متعدد بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کی۔ مثلاً ہمدان میں شیخ ابو یوسف ہمدانی، خرقان میں شیخ ابوالحسن علی خرقانی، ہرات میں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری اور لاہور میں شیخ علی ہجویری کے مزارات پر مراقبے کیے اور روحانی فیوض حاصل کیے۔ ان ہی اسفار میں بغداد میں حضرت شیخ قطب الدین بختیار اوشی نے امام ابواللیث سمرقندی کی مسجد میں خواجہ بزرگ سے شرف ملاقات حاصل کیا اور شیخ شہاب الدین سہروردی و دیگر بزرگوں کی موجودگی میں بیعت سلوک کی سعادت بھی حاصل فرمائی۔

لاہور سے دہلی پہنچے اور دہلی سے خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کے ہمراہ اجمیر کا رخ کیا۔ اجمیر کے مضافات میں آپ نے قیام فرمایا۔ اس وقت اجمیر رائے پتھورا (پرتھوی راج چوہان) کا دارالسلطنت تھا، اس کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے آدمیوں کو بھیجا اور آپ کو جگہ خالی کرنے کا حکم دیا اور جب خواجہ بزرگ نے حکم نظر انداز کر دیا تو جگہ خالی کرانے کے جو حربے استعمال کر سکتا تھا، اس نے کیا لیکن اپنی مزاحمت اور اپنی کوشش میں ناکام رہا حتی کہ ہندو جوگی جے پال کی قیادت میں اس کے چیلے خواجۂ بزرگ کے خلاف قوتوں کی حمایت کے ساتھ برسرپیکار ہوئے، مغلوب رہے اور انہوں نے جان لیا کہ خواجۂ بزرگ کے ساتھ اللہ واحد و قہار ہے۔ چنانچہ جوگی جے پال رائے خود خواجۂ بزرگ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اپنا نام عبداللہ رکھا، بیعت سلوک کی اور جلد ہی خرقہ اجازت سے بھی نوازا گیا۔ رائے پتھورا کے دیگر ملازمین اور اجمیر کے راجپوتوں میں سے کئی لوگوں نے خواجہ بزرگ کی صحبت میں ایسی تاثیر پائی کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ رائے پتھورا کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھے جسے اس کے تکبر نے اور ہوا دی، دھمکیوں میں اضافہ ہوا، خواجہ بزرگ نے اس پر فرمایا کہ ہم نے پتھورا کو زندہ مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ایسا ہی ہوا، سلطان محمد غوری کے دوسرے حملے میں پرتھوی راج چوہان کو شکست فاش ہوئی اور وہ زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ غوری کی فتح نے اسلام کی اشاعت میں حائل رکاوٹوں کو دور کر دیا۔ خواجہ بزرگ کی تبلیغ سے ایک بھاری تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی۔ خواجہ بزرگ کی شخصیت و تربیت نے ان کا ایمان راسخ کر دیا۔

ازدواجی زندگی: خواجہ بزرگ نے اجمیر کے قیام کے دوران دو نکاح فرمائے۔ ایک عصمت اللہ بی بی سے، دوسرا امتہ اللہ بی بی سے۔ اولاد میں تین صاحبزادوں حضرت سید فخر الدین، حضرت سید ضیاء الدین اور حضرت سید حسام الدین اور ایک صاحبزادی بی بی حافظہ جمال کے نام ملتے ہیں۔

وفات: خواجہ بزرگ نے سنہ 636 یا 637ھ میں 21 رجب یا 6 رجب کو اس دنیائے فانی سے 93 سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ رسول اکرمؐ سے بے انتہا محبت تھی، جب بھی ذکر رسولؐ ہوتا آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ایک مرتبہ فرمایا کہ افسوس اس شخص پر جو روز قیامت رسول اللہؐ سے شرمندہ ہوگا، اس کی جگہ کہاں ہوگی، آپؐ سے شرمندہ ہو کر وہ جائے گا تو کہاں جائے گا، اور ہائے ہائے کہہ کر رو پڑے۔ غالباً اتباع رسول ﷺ ہی کے جذبہ میں رات کو بہت کم سوتے، زیادہ وقت عبادت گزاری میں صرف فرماتے۔

فقر و درویشی کے باوجود خانقاہ میں روزانہ اتنا کھانا پکتا کہ مہمانوں اور مریدین کے علاوہ فقراء و مساکین بھی سیر ہو کر کھاتے۔ پڑوسیوں کا خاص خیال رکھتے۔ سماع کا بھی ذوق تھا۔ محفل سماع میں حب الہیٰ معراج پر پہنچ جاتی۔ اس کثرت سے کشف ہوتا کہ بے اختیار اور کون و مکاں سے بے تعلق ہو جاتے۔

- **ملفوظات**

- اخلاق کی تکمیل: خواجہ بزرگ کے نزدیک اہل تصوف کے لیے ہر قسم کے صوری و باطنی اخلاق و محاسن سے مزین ہونا ضروری ہے۔ صوری اخلاق کی تکمیل تمام اعمال میں شریعت کی پابندی سے ہوتی ہے، جب کوئی کام سالک سے خلاف شریعت نہ سرزد ہوگا تو وہ دوسرے مقام یعنی طریقت میں پہنچے گا اور جب اعمال طریقت میں ثابت قدم رہے گا اور خلاف طریقت کوئی عمل نہ کرے گا تو معرفت کے مقام پر پہنچے گا اور جب معرفت کے تقاضوں کی تکمیل کرے گا توان شاءاللہ حقیقت کا رتبہ پالے گا جس کے بعد وہ جو مانگے گا اسے ملے گا۔
- نماز: خواجہ بزرگ شریعت کے تمام ارکان واجزاء پر عمل کرنے پر زور دیتے۔ بالخصوص نماز کو دین کا ستون فرماتے اور کہتے کہ جب تک یہ ستون قائم رہے گا شریعت کی چھت قائم رہے گی اور جب یہ ستون ہی گر جائے تو گھر بھی گر جائے گا۔ ایک بزرگ سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ انہوں نے خواجہ بزرگ سے کہا کہ جس وقت میں نماز ادا کرتا ہوں تو خوف ہوتا ہے کہ کہیں بھول چوک نہ ہوگئی ہو کہ میری محنت اکارت ہو اور یہی نماز موجب عتاب الہیٰ ثابت ہو۔ ایک بار فرمایا کہ سالک جب نماز پڑھے تو اس طرح پڑھے گویا وہ انوار الہی کا مشاہدہ کر رہا ہو۔
- گناہ کبیرہ: خواجہ بزرگ سالک کے لیے چار گناہوں کو گناہ کبیرہ میں سے گردانتے (1) قبرستان میں ہنسنا (2) قبرستان میں کھانا پینا (3) کسی کی دل آزاری کرنا (4) اللہ جل شانہ کا نام لینا اور جسم پر لرزہ نہ طاری ہونا۔
- مقامات سلوک: فرمایا کہ سلوک میں چودہ (14) مقامات ہیں: (1) توبہ (2) عبادت (3) زہد (4) رضا (5) قناعت (6) مجاہدہ (7) صدق (8) تفکر (9) استرشاد (رشد و ہدایت کی طلب) (10) اصلاح (11) اخلاص (12) معرفت (13) شکر (14) محبت

ان میں توبہ کا مقام حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، عبادت حضرت ادریس، زہد حضرت عیسیٰ، رضا حضرت ایوب، قناعت حضرت یعقوب، مجاہدہ حضرت یونس، صدق حضرت یوسف، تفکر حضرت شعیب، استرشاد حضرت شیث، اصلاح حضرت داؤد، معرفت حضرت خضر، شکر حضرت ابراہیم علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرف اور محبت سید الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ مخصوص ہے۔

- شرائط طریقت: فرمایا کہ اہل طریقت کے لیے دس شرائط ہیں (1) طلب حق (2) طلب مرشد کامل (3) ادب (4) رضا (5) محبت مع ترک فضول (6) تقویٰ (7) شریعت پر استقامت (8) کم کھانا اور کم سونا (9) لوگوں سے کنارہ کش ہونا (10) صوم و صلوٰۃ کا پابند ہونا۔

- لوازم حقیقت: فرمایا کہ اہل حقیقت کے لیے دس اشیاء لازمی ہیں: (1) معرفت میں کمال حاصل کرنا (2) نہ کسی کو رنج پہنچانا اور نہ کسی کی برائی کرنا (3) لوگوں کی دنیا و آخرت درست کرنے کے لیے ہی گفتگو کرنا (4) متواضع ہونا (5) گوشہ نشین ہونا (6) ہر شخص سے محبت کرنا اور اپنے آپ کو حقیر اور کم ترین خلائق جاننا (7) رضا و تسلیم کے ہمہ تن پیکر بننا (8) ہر درد و تکلیف میں صبر و تحمل کرنا (9) قلب و روح میں عجز و نیاز اور سوز و گداز رکھنا (10) قانع اور متوکل علی اللہ ہونا۔

ممتاز خلفاء خواجہ بزرگ: (1) خواجہ قطب الدین بختیار اوشی (دہلی) (2) خواجہ فخر الدین فرزند خواجہ بزرگ (قصبہ سردار) (3) خواجہ حمید الدین سوالی (ناگور) (4) شیخ وجیہہ الدین (ہرات) (5) خواجہ برہان الدین (اجمیر) (6) بی بی حافظہ جمال دختر خواجۂ بزرگ (اجمیر) (7) شیخ محمد ترک نارنولی (دہلی)۔ ان میں خواجہ حمید الدین ناگوری کو شیخ شہاب الدین سہروردی سے اور شیخ محمد ترک نارنولی کو خواجہ عثمان ہرونی سے بھی بیعت و اجازت حاصل تھی۔

17.4 حضرت شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی الملتانیؒ (المتوفی 666ھ)

نام و خاندان: بہاء الدین زکریا نام ابو محمد کنیت اور بہاء الحق بدر المشائخ آپ کے لقب تھے۔ آپ کے جد امجد شاہ ابو بکر کمال الدین قبیلہ قریش اور خانوادہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ مکہ معظمہ سے وہ خوارزم آئے اور وہاں سے ملتان پہنچے جہاں آپ نے سکونت اختیار فرمائی۔ ملتان کے نواح میں ایک قلعہ کوٹ کرور تھا۔ مولانا وجیہہ الدین، حضرت شیخ کے والد، یہیں مقیم تھے اور یہیں حضرت شیخ کی پیدائش سنہ...565 یا سنہ 566ھ میں ہوئی، بعض تذکروں میں سال پیدائش 578ھ بھی بتایا گیا ہے۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد سے اور نصیر الدین بلخی سے حاصل کی، سات (7) سال کی عمر میں قرآن مجید سبع قرأت کے ساتھ حفظ کر لیا۔ بارہ (12) سال کے ہوئے تو والد کا انتقال ہو گیا۔ تحصیل علم کا شوق پہلے عبد الرشید کرمانی کے پاس لے گیا جو ملتان ہی میں مدفون ہیں، پھر آپ خراسان کی طرف چل پڑے۔ یہاں سات (7) سال تک مختلف علماء سے ظاہری و باطنی علوم حاصل کیے، پھر بخارا پہنچے اور آٹھ (8) سال مزید اکتساب علم میں لگے رہے۔ پھر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا عزم سفر کیا، حج کیا اور روضہ اقدس کی زیارت کے لیے

مدینہ منورہ پہنچے۔ محدث وقت کمال الدین محمد یمنی کی صحبت میں پانچ (5) سال رہ کر علم حدیث میں رسوخ حاصل کیا، پھر تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب وباطن کے لیے مجاہدہ کا راستہ اختیار کیا جو ایک نامعلوم مدت تک مدینہ طیبہ اور بیت المقدس میں جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ تحصیل علم کے زمانہ میں آپ نے چار سو چوالیس (444) اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

بیت المقدس سے بغداد پہنچے جہاں شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کے دست اقدس پہ شرف بیعت حاصل کی، وہیں خانقاہ میں آپ کا قیام رہا اور شیخ الشیوخ کی نگرانی میں تربیت باطنی ہوتی رہی، مقامات سلوک تیزی سے طے ہوئے، شیخ الشیوخ نے خرقہ، خلافت واجازت عطا فرمائے، دوسرے مریدوں میں حسد پیدا ہوا اور انہوں نے شیخ الشیوخ سے اظہار بے اطمینانی کیا۔ شیخ الشیوخ نے صفائی سے فرمایا کہ تم لوگ گیلی لکڑیوں کے مانند ہو جن میں آگ مشکل اور دیر سے لگتی ہے اور بہاء الدین زکریا خشک لکڑی کے مانند تھے جس میں آگ جلد اثر کرتی ہے۔ اپنے مریدین پر بہاء الدین زکریا کا مقام واضح کرنے کے لیے سب کو جمع ہونے کا حکم دیا، جب سب جمع ہو گئے تو فرمایا تم سب جاؤ اور خانقاہ کے لیے کچھ لکڑیاں لے آؤ۔ تمام مرید سبز شاخیں توڑ لائے اور بہاء الدین ایک چوب خشک اٹھا لائے۔ تمام مریدین آپ کا مذاق اڑانے لگے۔ آپ خاموش رہے۔ شیخ الشیوخ جب خانقاہ تشریف لائے اور انہوں نے سب کی لائی سبز شاخیں اور بہاء الدین زکریا کی لائی چوب خشک دیکھی تو آپ سے اس بابت استفسار کیا۔ بہاء الدین زکریا نے فرمایا کہ سبز شاخوں کو میں نے ذکر اللہ میں مشغول پایا اس لیے ان کو توڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔ یہ چوب خشک ذکر اللہ سے فارغ ہو چکی تھی لہذا خانقاہ کے لیے میں اسے کاٹ لایا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیخ شہاب الدین قدس سرہ العزیز نے جناب رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا کہ بہاء الدین زکریا کو خرقہ دینے کا حکم دے رہے ہیں۔ جس کی شیخ الشیوخ نے بیدار ہوتے ہی تعمیل فرمائی۔

شجرۂ طریقت:

(1) شیخ بہاء الدین زکریا (2) شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی (3) شیخ ضیاالدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی

(4) شیخ وجیہ الدین سہروردی (5) شیخ ابوعبداللہ (6) شیخ اسود احمد دینوری

(7) شیخ ممشاد علو دینوری (8) خواجہ جنید بغدادی (9) خواجہ سری سقطی

(10) خواجہ معروف کرخی (11) خواجہ داؤد طائی (12) خواجہ حبیب عجمی

(13) حضرت حسن بصری (14) حضرت علی کرم اللہ وجہہ (15) سیدالمرسلین حضرت محمد مصطفیؐ

اپنے مرشد شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے حکم پر آپ ملتان واپس ہونے کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت شیخ جلال الدین تبریزی بھی شیخ الشیوخ سے اجازت لے کر آپ کے ہمراہ ہوئے۔ راستہ میں نیشاپور پہنچے تو وہاں فرید الدین عطار کی شہرت سنی۔ بہاء الدین زکریا تو اپنی عبادت واذکار واشغال میں لگے رہے، جلال الدین تبریزی نے دیگر بزرگوں کے علاوہ فرید الدین عطار کی بھی زیارت کی۔ واپسی پر بہاء الدین زکریا نے پوچھا کہ آج کن کن درویشوں سے ملاقات کی۔ جلال الدین تبریزی نے فرید الدین عطار کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا اور

بتایا کہ مجھ کو دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا کہ کہاں سے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا بغداد سے۔ پوچھا وہاں کون درویش مشغول بحق ہے؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہاء الدین زکریا نے فرمایا اپنے مرشد شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کا نام کیوں نہ لیا۔ جلال الدین تبریزی نے کہا فرید الدین عطار کا رعب میرے دل پر ایسے چھایا کہ میں شیخ الشیوخ کو بھول گیا۔ یہ سن کر بہاء الدین زکریا کو بڑا دکھ اور ملال ہوا۔ وہ رنجیدہ ہو کر جلال الدین تبریزی سے جدا ہوئے اور تنہا ملتان کے لیے نکل پڑے اور جلال الدین تبریزی نے خراسان کا رخ کیا۔

ملتان پہنچے، خانقاہ بنوائی اور طالبان حق کی رہنمائی میں مشغول ہو گئے۔ ملتان کا حکمران ان دنوں ناصر الدین قباچہ تھا جو امور سیاست میں شمس الدین ایلتتمش کو اپنا حریف سمجھتا تھا، ایلتتمش دینداری، تقویٰ، اہل طریقت کی خدمت اور شریعت کی پاسداری کے باعث صوفیہ کرام کا منظور نظر تھا، بہاء الدین زکریا بھی اس سے متاثر تھے یہی حال ملتان کے قاضی مولانا شرف الدین اصفہانی کا تھا۔ ناصر الدین قباچہ نے شمس الدین ایلتتمش کا زور توڑنے کے لیے کچھ منصوبے بنائے، قاضی شرف الدین اصفہانی اور بہاء الدین زکریا کو جب اس کا علم ہوا تو اپنے اپنے طور پر دونوں نے ایلتتمش کو ان منصوبوں کے بارے میں آگاہ کرنے کی غرض سے خط لکھے۔ یہ خط قباچہ کے آدمیوں کے ہاتھ لگے اور انہوں نے ناصر الدین قباچہ کے پاس دونوں خط بھیج دیے۔ قباچہ نے قاضی شرف الدین اصفہانی سے استفسار کیا، انہوں نے خاموشی اختیار کی۔ قباچہ نے جلاد کو حکم دیا اور قاضی صاحب کا سر قلم کر دیا گیا، بہاء الدین زکریا نے متانت اور استقلال سے فرمایا کہ بے شک یہ میرا ہی خط ہے، اسے میں نے حق تعالیٰ کے حکم پر لکھا ہے۔ ناصر الدین قباچہ حضرت شیخ کے جواب سے مرعوب ہوا اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اس نے آپ کو رخصت کیا۔

ملتان میں ایک بار قحط پڑا تو بہاء الدین زکریا نے اپنی خانقاہ سے بڑی بھاری تعداد میں قباچہ کے پاس غلہ بھجوایا، غلہ کے انبار سے نقروی تنکہ کے سات (7) کوزے بھی نکلے۔ آپ کو خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا کہ ہم جانتے تھے، وہ بھی کام میں لے آؤ۔

ایک روز اپنے خادم سے ارشاد فرمایا کہ جاؤ اور ایک صندوقچہ جس میں پانچ ہزار (5000) دینار سرخ رکھے ہیں لے آؤ۔ وہ گیا اور خالی ہاتھ لوٹ آیا اور شیخ کو اطلاع دی کہ وہ صندوقچہ لاپتہ ہے۔ شیخ بہاء الدین کی زبان سے کچھ تامل کے بعد نکلا الحمد للہ۔ تھوڑی دیر بعد خادم دوبارہ گیا اور اطلاع لایا کہ صندوقچہ مل گیا۔ قدرے تامل کے بعد شیخ بہاء الدین کی زبان سے پھر نکلا الحمد للہ۔ خدام حیران ہوئے اور انہوں نے پوچھا کہ صندوقچہ کے گم ہونے کی خبر اور اس کے مل جانے کی اطلاع پر الحمد للہ کہنے میں کیا حکمت تھی۔ ارشاد ہوا کہ فقیروں کے لیے دنیا کا وجود و عدم دونوں برابر ہیں۔ ان کو نہ دنیا کے ملنے پر خوشی ہوتی ہے نہ دنیا کے جانے پر غم۔ پھر تمام دینار حاجت مندوں میں تقسیم کرا دیے ایک روز خانقاہ میں بیٹھے تھے کہ قلندروں کی ایک جماعت پہنچی اور مالی امداد کی درخواست کی۔ شیخ بہاء الدین زکریا نے اس جماعت کے طور طریقوں سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔ جس پر قلندر مشتعل ہو گئے اور اینٹ پتھر پھینکنے لگے۔ شیخ بہاء الدین زکریا نے خانقاہ کا دروازہ بند کروا دیا۔ قلندروں کا اشتعال اور بڑھ گیا اور انہوں نے خانقاہ پر پتھراؤ کر دیا۔ کچھ دیر بعد شیخ بہاء الدین نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ خود باہر نکلے اور قلندروں سے خطاب کرتے ہوئے رعب دار انداز میں فرمایا کہ میں شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کے حکم پر اس جگہ بیٹھا ہوں، خود سے نہیں بیٹھا، قلندر بڑے شرمندہ ہوئے اور آپ سے اپنی گستاخیوں پر معافی مانگی۔

ازدواجی زندگی: شیخ بہاء الدین زکریا نے دو نکاح فرمائے۔ ایک کا نام رشیدہ بانو تھا، جو آپ کی چچازاد بہن تھیں۔ دوسری زوجہ کا نام شہر بانو تھا۔ بی بی رشیدہ بانو سے آپ کو اللہ نے پانچ فرزند عنایت فرمائے (1) صدر الدین عارف (2) علاء الدین محمد (3) قدرۃ الدین محمد (4) شہاب الدین محمد نور اور (5) برہان الدین محمد

بی بی شہر بانو سے آپ کو دو فرزند اور دو دختر عنایت فرمائی گئیں (1) شمس الدین محمد (2) ضیاء الدین محمد (3) نور بی بی اور (4) فاطمہ بی بی۔ بتایا جاتا ہے ان میں نور بی بی کا نکاح حضرت شیخ بہاء الدین زکریا نے اپنے چہیتے خلیفہ فخر الدین ابراہیم سے فرمایا۔

وفات: آپ کے ملفوظات کے مجموعہ خلاصتہ العارفین میں لکھا ہے کہ آپ کی وفات ماہ صفر میں سنہ 666ھ میں ہوئی۔

وفات کے وقت اپنے حجرہ میں شیخ بہاء الدین عبادت میں مشغول تھے ایک نورانی چہرہ والے بزرگ آئے اور صاحبزادہ شیخ صدرالدین کے ہاتھ میں ایک سربمہر لفافہ تھما گئے۔ شیخ صدر الدین وہ لفافہ لے کر شیخ کے حجرہ میں داخل ہوئے۔ نماز ختم ہونے کے بعد انہوں نے وہ لفافہ حضرت شیخ کے ہاتھ میں دیا اور قاصد کو دیکھنے باہر نکلے۔ حضرت شیخ نے خط پڑھا اور جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ ایک غیبی آواز آئی "دوست بدوست رسید" صدر الدین نے آواز سنی تو دوڑے۔ حجرہ میں دیکھا تو آواز حقیقت بن چکی تھی۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں (1) کتاب الاوراد (2) الشروط الاربعین فی جلوس المعتکفین اور (3) رسالۂ شیخ بہاء الدین زکریا کا پتہ چلتا ہے۔

آپ فرماتے تھے کہ بندہ پر واجب ہے کہ سچائی اور اخلاص سے اللہ جل شانہ کی عبادت کرے۔ عبادت و اذکار میں غیر اللہ کی نفی ہو۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اقوال و افعال میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے اور احوال کی درستگی کا اہتمام، غیر ضروری نہ کوئی بات کہے نہ کوئی کام کرے۔ ہر قول و فعل میں پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرے اور اس سے نیک عمل کی توفیق کی دعا مانگے۔

اپنے مرید کو نصیحت فرماتے ہیں کہ ذکر الٰہی کو اپنے اوپر لازمی کر لو۔ ذکر ہی سے محبت پیدا ہوتی اور طالب محبوب تک پہنچتا ہے۔ محبت ایک ایسی آگ ہے جو سارا میل کچیل اور کھوٹ جلاڈالتی ہے۔ جب محبت پختہ ہوتی ہے تو مذکور (اللہ سبحانہ و تعالیٰ) کے مشاہدہ کے ساتھ ذکر ذکرِ حقیقی ہوتا ہے۔ یہی وہ ذکر کثیر ہے جس پر فلاح کا وعدہ کیا گیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیے کہ اپنے روزگار و ذرائع آمدنی کے حلال رکھنے کا اہتمام کرتا رہے۔ ماسویٰ اللہ کو دل سے نکال پھینکے، دنیادار لوگوں کی صحبت کو حرام تصور کرے، اور ہمہ تن حق تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے۔ اگر اس کو ذکر الہیٰ سے انس نہ ہو تو وہ حب الہیٰ کی بو بھی نہ سونگھ سکے گا۔

فرماتے ہیں کہ بدن کی سلامتی کم کھانے میں، روح کی سلامتی ترک گناہ میں اور دین کی سلامتی آقائے دوجہاں حضرت محمد مصطفیؐ پر درود بھیجنے میں ہے۔

خلفاء: (1) شیخ صدر الدین عارف (2) ابوالفتح رکن الدین عالم (3) شیخ عثمان مروندی سروری معروف بہ لعل شہباز قلندر

(4) شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی (5) شیخ حسن افغان   (6) شیخ سید جلال الدین نوری نقوی

(7) امیر حسن بن عالم حسینی سادات

17.5 کلیدی الفاظ

مرشد : رہنما، رہبر، سیدھا راستہ دکھانے والا شخص

خانقاہ : صوفیوں اور درویشوں کی عبادت گاہ

کشف : ظاہر کرنا، کھولنا، اصطلاحاً الہام کے ذریعے پوشیدہ چیزوں کا جاننا یا جس درجے پر پہنچ کر غیب کے اسرار ظاہر ہوں۔

قلندر : خدا رسیدہ، اصطلاحاً وہ شخص جو اس قدر روحانی ترقی کر گیا ہو کہ وہ اپنے وجود اور تعلقات سے بے خبر ہو کر خدا کی یاد میں مشغول رہے۔

17.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ہندوستان صوفی سنتوں کی سرزمین ہے۔ یہاں کے چپے چپے پر صوفیائے کرام کے آثار موجود ہیں۔ ان کی خدمات اور کرامات نے اس خطہ زمین کو ہمیشہ نور اسلام کی کرنوں سے منور رکھا ہے۔
- ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے وجود و بقا میں جتنا بڑا رول صوفی تحریک کا رہا ہے کسی بھی دوسری تحریک کا نہیں رہا۔ یہاں پر آسمان تصوف کی اس وسیع کہکشاں سے کچھ مہ پاروں کے حالات و واقعات اور واردات و تعلیمات کے چند نمونے اکٹھا کر دیئے گئے ہیں۔
- شیخ علی ہجویری چالیس (40) سال مسلسل سفر میں رہے لیکن نماز باجماعت کبھی ترک نہ ہوئی۔ ہر جمعہ کو کسی قصبہ میں قیام فرماتے تاکہ نماز جمعہ ناغہ نہ ہو۔ اپنے مرشد کی طرح صوفیہ کے ظاہری رسوم سے نفرت تھی، ان کو معصیت وریا اور رسوم کے پابند صوفیہ کی صحبت کو مقام تہمت قرار دیتے اور فرماتے کہ جب کوئی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو مقام تہمت میں کھڑا نہ ہونا چاہیے۔
- بہاء الدین زکریا جن کا لقب بہاء الحق بدر المشائخ تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد سے اور نصیر الدین بلخی سے حاصل کی، سات (7) سال کی عمر میں قرآن مجید سبع قرأت کے ساتھ حفظ کر لیا۔ بارہ (12) سال کے ہوئے تو والد کا انتقال ہو گیا۔ تحصیل علم کا شوق پہلے عبدالرشید کرمانی کے پاس لے گیا جو ملتان ہی میں مدفون ہیں، پھر آپ خراسان کی طرف چل پڑے۔ یہاں سات (7) سال تک مختلف علماء سے ظاہری و باطنی علوم حاصل کیے، پھر بخارا پہنچے اور آٹھ (8) سال مزید اکتساب علم میں لگے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ تحصیل علم کے زمانہ میں آپ نے چار سو چوالیس (444) اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

17.7 نمونہ امتحانی سوالات

17.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. شیخ علی ہجویری کی کنیت کیا تھی؟

(a). سہروردی (b). شمس الدین (c). حسام الدین (d). ابوالحسن

2. شیخ علی ہجویری کی وفات کس مقام پر ہوئی؟

(a). آگرہ (b). لکھنو (c). دہلی (d). لاہور

3. خواجہ معین الدین چشتی نے شرائط طریقت کتنے بتائے ہیں؟

(a). 8 (b). 13 (c). 15 (d). 10

4. منہاج الدین کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a). بختیار کاکی (b). شیخ بہاء الدین (c). معین الدین چشتی (d). شیخ علی ہجویری

5. خواجہ معین الدین چشتی نے سلوک کے مقامات بتائے ہیں:

(a). 18 (b). 22 (c). 8 (d). 14

6. بہاء الحق بدر المشائخ کس کا لقب تھا؟

(a). شیخ علی ہجویری (b). عبد القادر جیلانی (c). غزالی (d). بہاء الدین سہروردی

7. کتاب الاوراد کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a). نظام الملک طوسی (b). ابو نصر سراج (c). ابوطالب مکی (d). بہاء الدین سہروردی

8. "بدن کی سلامتی کم کھانے میں، روح کی سلامتی ترک گناہ میں اور دین کی سلامتی آپؐ پر درود بھیجنے میں ہے"۔ کس کا قول ہے۔

(a). نظام الدین اولیاء (b). ابوطالب مکی (c). ابن عربی (d). بہاء الدین سہروردی

9. شیخ صدرالدین عارف کس کے خلیفہ شمار کیے جاتے ہیں؟

(a). نظام الدین اولیاء (b). ابوطالب مکی (c). ابن عربی (d). بہاء الدین سہروردی

10. خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کس کے خلیفہ شمار کیے جاتے ہیں؟

(a). خواجہ معین الدین چشتی (b). ابوطالب مکی (c). ابن عربی (d). بہاء الدین سہروردی

17.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. شیخ علی ہجویری کی تعلیمات کا جائزہ لیجیے۔
2. خواجہ معین الدین چشتی کی تعلیمات کو مختصراً لکھیے۔
3. بہاء الدین زکریا سہروردی کی تعلیمات کو قلم بند کیجیے۔
4. بہاء الدین زکریا سہروردی کی ابتدائی زندگی پر نوٹ لکھیے۔
5. خواجہ معین الدین چشتی کی ابتدائی زندگی کو بیان کیجیے۔

17.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. شیخ علی ہجویری پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. خواجہ معین الدین چشتی پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی پر تفصیل سے قلمبند کیجیے۔

17.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. بزم صوفیہ : از سید صباح الدین عبد الرحمن
2. تاریخ دعوت و عزیمت (جلد سوم و چہارم) : از سید ابوالحسن علی ندوی
3. اخبار الاخیار : از شیخ عبد الحق دہلوی (اردو ترجمہ)
4. گلزار ابرار : از محمد غوثی شطاری (اردو ترجمہ)
5. امداد المشتاق : از اشرف علی تھانوی
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 18: ہندوستان کے مشہور صوفیاء کرام (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

18.0 تمہید
18.1 مقاصد
18.2 حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ (المتوفی 725ھ)
18.3 اس صدی کے دیگر اہم صوفیا کرام
18.3.1 حضرت اخی سراج (المتوفی 758ھ)
18.3.2 حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ (المتوفی 782ھ)
18.3.3 حضرت شیخ عین الدین محمد گنج العلم (المتوفی 795ھ)
18.3.4 محمد غوث گوالیاری شطاری (906-970ھ)
18.4 اکتسابی نتائج
18.5 نمونہ امتحانی سوالات
18.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
18.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
18.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
18.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

18.0 تمہید

اس سے پہلے کی اکائی میں آپ نے کچھ صوفیائے کرام کے بارے میں پڑھا اور ان کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کی۔ اس اکائی میں ہم جانیں گے کہ کیسے صوفیائے کرام نے اپنی تعلیمات سے عوام الناس کے دلوں پر نقش چھوڑے اور معاشرے میں اخوت و محبت اور ہمدردی کا ماحول قائم کیا۔ صوفیائے کرام نے برصغیر میں محبت کا پیغام دے کر انسانوں کے دلوں کو بھید بھاؤ سے صاف کر دیا۔ اس اکائی

میں آپ خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ شرف الدین، شیخ عین الدین اور محمد غوث گوالیاری کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے۔

18.1 مقاصد

اس اس اکائی کا مقصد ہندوستانی صوفی روایت کے مشہور صوفیاء اور ان کی تعلیمات وہدایات سے آپ کو متعارف کرانا ہے۔ اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ ان بزرگوں کی تعلیمات کے اثرات کا جائزہ لے سکیں۔

18.2 حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ (المتوفی 725ھ)

نام والقاب: نام محمد، القاب محبوب الٰہی، سلطان المشائخ، سلطان الاولیاء، سلطان السلاطین، لیکن عوام وخواص میں نظام الدین اولیاء کے نام سے ہی جانے جاتے ہیں۔

نسب: سید محمد بن سید احمد بن سید علی بن سید عبد اللہ بن سید حسن، بن سید علی مشہدی بن سید احمد مشہدی بن سید ابو عبد اللہ بن سید علی اصغر بن سید جعفر ثانی بن امام علی نقی بن امام محمد تقی بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم ابن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی زین العابدین بن سیدنا حسین شہید کربلا بن سیدنا امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

پیدائش: شیخ نظام الدین کا خاندان بخارا سے ہجرت کر کے لاہور آیا، وہاں سے بدایوں پہنچ کر سکونت پذیر ہوا۔ اسی شہر میں ماہ صفر میں 634ھ میں حضرت شیخ نظام الدین پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم: پانچ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، والدہ ماجدہ کی نگرانی میں پرورش پائی جو خود بڑی عابدہ وزاہدہ تھیں۔ شیخ نظام الدین کی ابتدائی تعلیم بدایوں ہی میں ہوئی۔ علاء الدین اصولی کے پاس "مختصر قدوری" ختم کی۔ مزید تعلیم کے لیے والدہ کے ساتھ دہلی آئے اور شمس الدین خوارزمی کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے۔ ذہانت اور محنت نے استاد کے بہت قریب کر دیا۔ شیخ نظام الدین نے ان سے "مقامات حریری" پڑھی اور مولانا کمال الدین زاہد سے "مشارق الانوار"۔ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے مرشد بابا فرید الدین مسعود گنج شکر سے "عوارف المعارف"۔ "لوائح" (حمید الدین ناگوری) تمہید ابو شکور سالمی" پڑھی اور تجوید درست کی۔ دوران طالب علمی بحاث کی حیثیت سے طلبہ میں مشہور ہو گئے۔ حضرت شیخ کے دیگر اساتذہ میں برہان الدین محمود بلخی اور امین الدین محدث تبریزی کے نام ملتے ہیں۔

شیخ نجیب الدین متوکل بابا فرید کے چھوٹے بھائی تھے اور ظاہری وباطنی علوم کے جامع، ان کی صحبت میں بابا فرید کا تذکرہ ہوتے سنا، اشتیاق پیدا ہوا کہ بابا فرید سے ملیں۔ ایک دن اجودھن کے راستے پر ہو لیے۔ بابا فرید نے پہلے ہی روز حلقہ ارادت میں داخل کر لیا اور حکم دیا گیا کہ بجائے زمین کے کھاٹ پر سونے کا انتظام کیا جائے۔ عدول حکمی کی جسارت نہیں کر پائے۔ فرماتے ہیں کہ " بابا فرید سے میں نے "عوارف المعارف" کے پانچ ابواب پڑھے۔ ان کا ایسا بیان ہوتا کہ کسی اور سے ویسا بیان نہ سنا گیا۔ بیان کے موقع پر ایسا ذوق طاری ہوتا کہ سننے والے کی تمنا ہوتی کہ اسی موقع پر موت آجاتی تو خوب ہوتا۔ بابا فرید کی خانقاہ میں تمام درویشوں کی زندگی عسرت، فاقہ اور تنگی میں گذرتی۔ بدر الدین اسحق ایندھن کی لکڑیاں لاتے، جمال الدین ہانسوی جنگل جا کر ویلہ لاتے۔ حسام الدین کاملی پانی بھر بھر کر لاتے اور برتن

دھوتے، حضرت نظام الدین ویلوں کو پکاتے۔

بابا فرید نے شیخ نظام الدین کو نصیحت کی تھی۔ "ہمیشہ مجاہدہ میں مشغول رہنا، بے کار رہنا درست نہیں، طریقت میں روزہ رکھنا نصف راہ ہے اور نماز و حج بقیہ نصف، ان ہی سے راہ طے ہوتی ہے"۔

شیخ نظام الدین نے اس نصیحت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ خلافت کی ذمہ داری دیتے وقت مرشد بزرگ نے چند ہدایتیں دیں:

> شاگردوں کو تعلیم دو، خطا و تصحیف سے بچتے رہو، لغزشوں کی اصلاح اور تحقیق و تنقیح میں پوری کوشش کرو۔ جو کچھ مجھ سے سنا اور یاد رکھا اس کو روایت کی تم کو اجازت ہے۔ خلوت نشین ہو تو ایسی مسجد میں ہو جہاں جماعت سے نماز ہوتی ہو۔ خلوت میں اپنے نفس کو کمزور اور حقیر اور خلق (مخلوق) کو معدوم سمجھو۔ دنیا کی تمام خواہشات کو ترک کر دو۔ خلوت کو ہمہ انواع کی عبادات سے معمور رکھو، جب نفس سخت مجاہدوں سے تھک جائے تو چھوٹے اور ہلکے مجاہدات اختیار کرو۔ نفس پر جب نیند کا غلبہ ہو تو تھوڑی سی نیند لے کر اسے راضی کرلو۔ خلوت سے اپنا پورا حصہ لے چکو تو حکمت کا چشمہ لوگوں کے فیض کے لیے جاری کرو اور جو طالب حق پہنچے اسے نعمت الٰہی سے سرفراز کرو۔

شیخ نظام الدین نے ان ہدایات کو پوری طرح اپنایا۔ شیخ کے حکم پر دہلی آئے تو آبادی کی کثرت کے سبب عبادت و ریاضت اور قرآن مجید کے حفظ کو تازہ کرنے کے لیے کوئی پر سکون جگہ نہ ملی۔ مجبوراً دہلی کے مضافات میں غیاث پور میں آکر مقیم ہوگئے، یہاں کے قیام میں بڑی عسرت اور تنگی کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی کئی دن فاقہ کے گزر جاتے تو اپنی والدہ ماجدہ کا قول ذہن میں گونج جاتا، جب گھر میں کوئی چیز کھانے کی نہ ہوتی تو فرماتیں۔ "بیٹے! آج ہم لوگ اللہ کے مہمان ہیں"۔ شیخ نظام الدین کو اس جملہ سے ایسی لذت ملتی کہ باید و شاید، لیکن فاقہ بہر طور فاقہ ہے۔ ایک بار مسلسل تین روز کا فاقہ ہو گیا۔ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ کھولا تو ایک شخص خشک کھچڑی دے کر چلا گیا۔ شیخ نظام الدین کے بقول بھوک کی شدت میں وہ کھچڑی کھائی تو ایسی لذت ملی کہ پھر کسی کھانے میں وہ لذت نصیب نہ ہوئی۔

سلطان جلال الدین خلجی کو محبوب الٰہی کی عسرت کی خبر ہوئی تو اس نے کہلا بھیجا کہ اگر اجازت ہو تو خدمت گزاروں کے لیے چند گاؤں جاگیر میں نذر کیے جائیں۔ محبوب الٰہی تیار نہ ہوئے کہ میرا اور میرے خدام کا کارساز اللہ تعالیٰ ہے، تو مریدین کی ایک جماعت نے عرض کیا کہ ہم لوگوں کا حال فقر و فاقہ سے انتہائی نازک ہے۔ محبوب الٰہی نے شکایت کی طرف کوئی التفات نہیں کیا اور سوچ لیا کہ سب کے سب مرید ساتھ چھوڑ کر اس وقت چلے بھی جائیں تو مجھے کوئی غم نہ ہوگا۔ پھر دوسرے یاران طریقت کو بلایا تاکہ "**امرھم شوری بینھم**" پر عمل ہو جائے۔ انھوں نے متفقہ طور پر کہا کہ آپ کے یہاں وقت بے وقت ہم روٹی کھا لیتے ہیں لیکن اگر آپ نے گاؤں قبول کر لیے تو ہم آپ کے پاس پانی بھی نہ پئیں گے۔ محبوب الٰہی بہت خوش و محظوظ ہوئے۔

ایک دلق پوش درویش آپ کے پاس پہنچا تو چار دن کا فاقہ آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر گزر چکا تھا۔ پڑوس سے ایک نیک بی بی نے جو شیخ نظام الدین سے بیعت تھیں کچھ آٹا بھیجا، اسے مٹی کی دیگ میں آگ پر چڑھا دیا گیا، درویش کے آنے پر گرم دیگ اپنے ہاتھوں سے

چولھے سے اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ درویش نے کچھ گرم گرم لقمہ مونہہ میں ڈالے، دیگ اٹھا کر زمین پر دے ماری اور بشارت دیتا رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد شیخ نظام الدین کا عسرت و تنگی کا دور جاتا رہا اور بقول حضرت نصیر الدین چراغ دہلی وہ انقلاب آیا کہ دولت کا دریا دروازے کے آگے بہتا، کوئی وقت فتوح (ہدایا) سے خالی نہ گزرتا اگر چہ لینے والوں کی تعداد لانے والوں سے زیادہ ہوتی۔

سلطان معزالدین کیقباد نے ایک محل بنوایا، ایک شہر آباد کیا اور جامع مسجد بھی بنوائی۔ شیخ نظام الدین کو ہجوم سے گھبراہٹ ہونے لگی اور آپ نے غیاث پور سے کسی اور جگہ منتقلی کا ارادہ فرمایا، لیکن ایک روز ایک خوش رو نوجوان آیا اور اس نے کہا کہ رسول اللہؐ کو روز قیامت شرمندہ نہ کرو۔ خلق کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرنا اور مشغول بحق ہو جانا آسان ہے مگر جوانمردی کا تقاضہ یہ ہے کہ خلوت در انجمن حاصل ہو اور ہجوم خلائق کے باوجود مشغولی بحق میں تغیر نہ آنے پائے۔ شیخ نظام الدین نے فوراً ارادہ بدل دیا۔ آخری وقت تک غیاث پور ہی میں مقیم رہے۔

شیخ نظام الدین محبوب الٰہی نے بادشاہوں کی صحبت سے خود کو ہمیشہ دور رکھا۔ سلطان جلال الدین خلجی آپ کی زیارت کا مشتاق تھا، اس نے امیر خسرو کو وسیلہ بنایا، امیر خسرو نے سلطان سے وعدہ کر لیا کہ شیخ نظام الدین کو اطلاع کیے بغیر وہ ایک روز سلطان کو شیخ نظام الدین کی خانقاہ لے جائیں گے۔ مگر پھر امیر خسرو کو خیال آیا کہ اس سے مرشد خفا نہ ہو جائیں، انہوں نے شیخ نظام الدین کو سلطان جلال الدین خلجی کی متوقع آمد کے بارے میں خبر دے دی۔ شیخ نظام الدین اسی وقت شہر چھوڑ کر اجودھن کے لیے روانہ ہو گئے۔ سلطان نے امیر خسرو سے بازپرس کی تو امیر خسرو نے کہا کہ آپ خفا و رنجیدہ ہوتے تو زیادہ سے زیادہ میری جان کو خطرہ تھا لیکن اگر مرشد خفا ہوتے تو میرے ایمان کے جانے کا خطرہ ہو جاتا لہٰذا میں راز کو فاش کرنے پر مجبور تھا۔ سلطان خاموش ہو گیا۔

سلطان علاء الدین خلجی نے کار حکومت سنبھالنے کے بعد ملک کافور کو ورنگل کی مہم پر بھیجا، جب ایک مدت تک کوئی خبر نہ آئی تو سلطان مضطرب ہوا، اس نے قاضی مغیث الدین اور ملک قرابیگ کو شیخ نظام الدین کی خدمت میں بھیجا کہ اس مہم کے متعلق وہ نور باطن سے حقیقت معلوم کر کے سلطان کو خبر کریں۔ شیخ نظام الدین نے بشارت دی کہ اس معرکہ میں فتح کے بعد مزید فتوحات کی توقع ہے۔ اسی روز قاصد ورنگل کی فتح کی خبر لے کر پہنچا، سلطان علاء الدین نے خوش ہو کر پانچ سو (500) اشرفیاں خانقاہ کے لیے بھیج دیں، ایک قلندر شیخ نظام الدین کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ یہ اشرفیاں پہنچیں، انہوں نے کہا کہ ہدایا تو مشترک ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ نظام الدین نے فرمایا یہ زیادہ بہتر ہے کہ ایک ہی شخص یہ ہدیہ لے لے اور تمام اشرفیاں قلندر کے حوالے کر دیں۔

شہزادہ خضر خاں حضرت شیخ نظام الدین کا مرید تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ایک بار امور سلطنت کے متعلق حضرت شیخ سے شہزادے کے توسل سے تحریری مشورہ مانگا۔ حضرت شیخ نظام الدین نے فرمایا کہ فقیروں کو امور سلطنت سے کیا کام۔ میں فقیر ہوں ایک گوشہ میں بیٹھا بادشاہوں اور مسلمانوں کے لیے دعا میں مشغول ہوں۔ اللہ کی زمین کشادہ ہے۔ اگر سلطان کو یہاں میرا قیام پسند نہیں تو کسی دوسری جگہ چلا جاؤں گا۔ سلطان نے حضرت شیخ سے ملاقات کے لیے اصرار کیا تو فرمایا کہ فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں۔ بادشاہ ایک دروازہ سے آئے گا تو وہ دوسرے دروازہ سے باہر نکل جائیں گے۔

ضیاء الدین برنی کے بموجب دہلی اس وقت پاک باطن مشائخ کا مرکز بنا ہوا تھا، ہزاروں بدکاروں نے بدکاری چھوڑ دی، گناہ گاروں نے گناہوں سے توبہ کرلی، بے نمازیوں نے مسجدوں سے رشتہ جوڑ لیا۔ عوام و خواص میں حرص و ہوس کم ہوگئی، ان کی عبادت و ریاضت کی طرف منتقل ہوگئی۔ معاملات میں صفائی اور عادات میں خلوص پیدا ہو گیا۔ مکارم اخلاق سے مزین ہونے کے ارادے مصمم ہوگئے۔ سلطان کے حکم سے تمام نشہ آور اشیا ممنوع ہوگئیں، فسق و فجور کے اسباب قہر و تعزیر سے روک دیے گیے، تاتاریوں (مغلوں) کا فتنہ فرو ہو گیا، باغی قوتیں تباہ ہوگئیں، ذخیرہ اندوزوں پر سزا کا اجراء ہوا تو مہنگائی قابو میں آگئی اور غلہ سلطان کے بتائے نرخ پر ملنے لگا، حکام پر سختی ہوئی تو انصاف عام ہو گیا، تجار پر سختی ہوئی تو غلہ کی ارزانی و فراوانی ہوگئی۔ قحط و وباء کا نشان نہ رہا۔ یہ سب سلطان علاء الدین خلجی کی تدابیر کا اثر تھا۔ تو دوسری طرف شیخ نظام الدین نے بیعت کا دروازہ سب کے لیے کھول رکھا تھا، عام و خاص، غریب و دولت مند، شہزادہ و فقیر، عالم و جاہل، شریف و رذیل، شہری و دیہاتی، آزاد اور غلام، تاجر و سپاہی، مسلم و غیر مسلم سب آپ کی خدمت میں آتے اور حلقہ ارادت مندی میں شامل ہو جاتے۔ ظلم اور گناہوں سے توبہ کرتے اور توبہ ٹوٹ جاتی تو تجدید بیعت کرتے، نماز پنجگانہ کے علاوہ سنن و نوافل کا اہتمام ہوتا، رمضان کے روزوں کے علاوہ ایام بیض اور عشرہ ذی الحجہ کے روزے رکھے جاتے۔ قیام لیل و صوم نہار اپنی بہار پر تھے، طلبہ کی توجہ درسیات کے علاوہ کتب تصوف کی طرف ہوگئی "قوت القلوب"، "رسالہ قشیریہ"، "شرح تعرف"۔ "احیاء علوم الدین"، "کشف المحجوب"، "عوارف المعارف"، "مرصاد العباد"، "مکتوبات عین القضاۃ"، "لوائح"، "لوامع"، "فوائد الفواد" کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے۔ سلوک و تصوف کی کتابیں تلاش کی جانے لگیں، ہر عمامہ میں مسواک اور کنگھی لٹکی نظر آتیں، لوٹے اور چرمی طشت کی مانگ بڑھی تو قیمتیں بھی بڑھ گئیں۔

سلطان علاء الدین خلجی کی موت کے بعد ملک کافور کی مدد سے قطب الدین مبارک خلجی نے خضر خاں اور شادی خاں کو قتل کرا دیا اور خود تخت نشین ہو گیا، اپنے بھائیوں خضر خاں اور شادی خاں کے شیخ نظام الدین کے حلقۂ ارادت مندوں میں شامل ہونے کے باعث حضرت شیخ کے خلاف اس کے دل میں گرہ بیٹھ گئی جو رفتہ رفتہ عداوت میں بدل گئی۔ اس نے خانقاہ میں امراء کی آمد و رفت سختی سے روک دی مگر خانقاہ کی رونق میں کوئی کمی نہ آئی۔ دوری بڑھتی گئی۔ محبوب الٰہی کی مقبولیت نے کڑواہٹ اور بڑھا دی اور سلطان قطب الدین خلجی نے ایک محضر جاری کیا جس کی رو سے ہر قمری مہینہ کی پہلی تاریخ کو حضرت شیخ نظام الدین کو موجود رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن اسی ماہ کی آخری رات وہ خود ایک گڈریے خسرو خاں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا اور خسرو خاں تخت شاہی پر بیٹھ گیا، مشائخ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی غرض سے اس نے صوفیہ کرام کے پاس بڑی بڑی رقوم ہدیہ بھجوائیں، شیخ نظام الدین کے پاس پانچ لاکھ تنکہ پہنچے اور اسی وقت فقراء و مساکین میں تقسیم ہو گئے۔

خسرو خاں کی سرکوبی کے بعد جب غیاث الدین تغلق شاہ نے امور سلطنت سنبھالے تو خسرو خاں نے جن جن لوگوں کو سرکاری خزانہ سے ہدایا بھیجے تھے وہ واپس طلب کیے گیے۔ شیخ نظام الدین کے پاس شاہی فرستادہ پہنچا لیکن حضرت شیخ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ چونکہ سلطان غیاث الدین تغلق بذات خود نیک، دین دار اور شریعت کا پابند تھا۔ فقہاء و علماء ظاہر کا اعزاز بڑھ گیا۔ فقہاء احناف کا سماع کی بابت ایک خاص موقف ہے جس کے لیے ان کے پاس دلائل بھی ہیں، ادھر حضرت شیخ نظام الدین حنفی ہونے کے باوجود سماع سے اشتغال

رکھتے جو علماء ظاہر بین کو بالکل نہ بھاتا۔ قاضی ضیاء الدین سنامی (مولف نصاب الاحتساب) متشرع و متقی محتسب تھے، ان کو جب کبھی خبر ملتی کہ خانقاہ حضرت شیخ میں سماع کی محفل جمی ہے وہ پہنچ جاتے اور سختی سے محفل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت شیخ شریعت کے احترام میں خاموش رہتے۔ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ حضرت شیخ کو خبر ہوئی تو عیادت کے لیے گھر پہنچے، قاضی ضیاء الدین نے اپنی دستار شیخ کے قدموں میں بچھانے کے لیے بھجوائی۔ حضرت شیخ نے خادم کو روک دیا، اس سے استاد کی دستار لی اور اپنے سر پر رکھ لی، فرمایا کہ یہ دستار شریعت ہے، اس کو نظام الدین کیسے پامال کرے گا۔ اندر گئے ضیاء الدین سنامی آنکھیں نہ چار کرسکے، شیخ باہر نکلے کہ خبر ملی ضیاء الدین سنامی چل بسے۔ حضرت شیخ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، کہ ایک حامی شریعت تھا وہ بھی نہ رہا۔

ادھر علماء و فقہاء کے زور دینے پر سلطان غیاث الدین نے ایک محضر مسئلہ سماع کی تحقیق کی غرض سے طلب کیا۔ مشائخ و علماء جمع ہوئے۔ چاشت کے وقت سے زوال آفتاب تک مباحثہ ہوتا رہا۔ جانبین کی طرف سے دلائل پیش کئے گئے۔ علماء کی ایک جماعت نے اصرار کیا کہ سماع کے جواز میں فقہ حنفی کی کوئی روایت ہو تو پیش کی جائے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ وہ ملک کیسے آباد رہے گا جہاں حدیث رسولؐ پر آراء افراد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بالآخر مولانا علم الدین جو شیخ بہاء الدین زکریا کے نواسہ اور ایک جید عالم سمجھے جاتے تھے سامنے آئے اور انہوں نے سماع کی اباحت میں فتویٰ دیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق ان کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے ان کے فتویٰ کو مان لیا اور حضرت شیخ نظام الدین کو اعزاز و اکرام سے رخصت کیا۔

شیخ نظام الدین صائم الدہر رہتے۔ سحری و افطار میں نصف یا ایک روٹی کھا لیتے، کبھی کبھی چاول بھی تناول فرمالیتے، مہمانوں اور محتاجوں کے لیے ہمہ اقسام کے کھانے خانقاہ میں پکتے اور کھائے جاتے۔ لباس ایک ہی تھا، میلا و بوسیدہ ہونے پر دھولیا جاتا، کچھ پیوند لگ جاتے۔ توبہ، استقامت، ایمان، نماز، تلاوت قرآن، دنیا سے دوری، روزوں کی کثرت، مجاہدہ، فقر و فاقہ، صبر و رضا، توکل، علم، جود و سخا، ذکر الٰہی، عشق الٰہی، تقوی، حسن اخلاق، حقوق العباد، عیب پوشی، احکام شریعت کی پابندی، دعوت و تبلیغ وغیرہ کی تلقین سے آپ کے ملفوظات کے مجموعے پر ہیں:

فرمایا کہ درویش اہل عشق ہوتے ہیں اور علماء اہل عقل، جب تک اللہ کریم کی محبت قلب کے غلاف میں داخل نہیں ہوتی گناہ کا صادر ہونا ممکن ہے۔ مگر جب محبت قلب میں سرایت کر جاتی تو پھر گناہ صادر نہیں ہوتا۔

فرمایا کہ سالک میں چار باتوں سے کمال پیدا ہوتا ہے (1) کم کھانا (2) کم بولنا (3) کم سونا اور (4) لوگوں سے میل جول کم رکھنا۔

فرمایا کہ مومن کی دل آزاری کرنا اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچانا ہے۔ حقیقی مومن وہ ہے کہ اگر وہ مشرق میں ہو اور مغرب میں کسی مومن کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو اس کو یہاں درد محسوس ہو۔

فرمایا کہ حقیقی مشائخ وہی لوگ ہیں جن کے ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوں۔

فرمایا کہ سالک کے لیے چار چیزوں سے پرہیز لازمی ہے (1) دنیا خصوصاً صحبت اغیار (2) ماسویٰ اللہ کا ذکر (3) غیر اللہ کی طرف توجہ والتفات (4) دل کا میل۔

فرمایا کہ سماع ایک صوت (آواز) موزوں ہے جس سے قلب میں حرکت ہوتی ہے۔ اگر یہ حرکت یادِ حق کے لیے ہے تو سماع مستحب ہے اور اگر فسادِ نفس کی طرف مائل کرتی ہے تو سماع حرام ہے۔

خلفاء: حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہی کے خلفاء کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ چند مشہور و معروف خلفاء یہ ہیں:

(1) حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی (دہلی) (2) حضرت قطب الدین منور، ہانسوی (ہانسی) (3) حضرت حسام الدین ملتانی (پاک پٹن) (4) حضرت فخر الدین زرادی (دہلی) (5) حضرت برہان الدین غریب (دیوگری / خلد آباد) (6) حضرت منتجب الدین زر بخش (دیوگری / خلد آباد) (7) حضرت اخی سراج الدین (بنگال) (8) امیر حسن علاء سجزی (دیوگری / خلد آباد) (9) حضرت خواجہ حسام الدین (گجرات) (10) حضرت خواجہ سراج (ناگور) (11) حضرت مولانا شمس الدین یحییٰ (دہلی) (12) حضرت خواجہ علی (دہلی) (13) حضرت قوام الدین (اودھ) (14) حضرت سید یوسف حسینی (خلد آباد) (15) حضرت کریم الدین سمرقندی (سنگانوہ) (16) حضرت نجم الدین محبوب (تھانیسر)

وفات: وصال سے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ جناب رسالت مآب ﷺ آپ سے مخاطب ہو کر فرمارہے ہیں "نظام! تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔" بیدار ہوئے تو بے چین ہو گئے۔ وفات سے تقریباً چالیس روز قبل کھانا پینا بالکل ترک کر دیا۔ آنکھوں سے آنسو نکلتے رہتے۔ کوئی اصرار کرتا تو فرماتے کہ جس سے ملنے کے حضرت رسالت مآبؐ مشتاق ہوں اس کو دنیا کے کھانے سے کیا کام۔

18 ربیع الاول سنہ 725 کو بعد نماز فجر آپ اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ نور اللہ مرقدہ و قدس سرہ العزیز۔

ساری عمر تجرد میں گذاری اس لیے کوئی صلبی اولاد نہ چھوڑی۔ معنوی اولاد کا شمار نہیں ہے جو حضرت شیخ کے بتائے ہوئے طریق پر گامزن ہے۔

18.3 اس صدی کے دیگر اہم صوفیا کرام

18.3.1 حضرت اخی سراج (المتوفی 758ھ)

نام و نسب: حضرت سراج الدین عثمان، جن کو حضرت اخی سراج کہا جاتا ہے، عین ابتدائے جوانی میں کہ داڑھی کے بال بھی نکلنا شروع نہ ہوئے تھے، لکھنوتی (بنگال) سے دہلی آکر حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے مرید ہوئے، حضرت سلطان المشائخ نے آپ کو "آئینہ ہند" قرار دیا۔ دن رات اپنے مرشد کے جماعت خانہ میں ایک کونے میں بیٹھے رہتے لیکن آنکھ اور کان حضرت سلطان المشائخ کی طرف لگے رہتے، ہر سال کے اختتام پر اپنی والدہ کی زیارت کے لیے لکھنوتی تشریف لے جاتے اور سلطان المشائخ کی محبت اور جذبہ خدمت دہلی کھینچ لاتے۔ اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ بغیر کسی سامان (سوائے کاغذ اور چند کتابوں) کے وہیں گذارا۔

تعلیم و اجازت: ایک مرتبہ حضرت سلطان المشائخ نے اپنے بعض منتہی مریدوں کو خلافت دینے کا ارادہ فرمایا، اخی سراج کا ذکر بھی آیا تو سلطان المشائخ نے فرمایا کہ اس کام میں سب سے پہلے علم شرط ہے اور اخی سراج علم میں وہ درجہ نہیں رکھتے جو خلافت کے لیے ضروری

ہے۔ حضرت مولانا فخر الدین زرادی نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ (اگر حضرت شیخ اجازت دیں اور اخی سراج آمادہ ہوں تو) وہ ان کو چھ ماہ میں دانشمند بنادیں گے۔ چنانچہ اخی سراج کی تعلیم بڑی عمر میں شروع ہوئی اور انہوں نے میزان، تصریف، قواعد اور مقدمات پڑھے، خاص ان کے لیے مولانا فخر الدین زرادی نے تصریف میں ایک مختصر رسالہ اور ایک مفصل کتاب ''عثمانی،، کے نام سے تصنیف فرمائی۔ مولانا فخر الدین زرادی کے علاوہ اخی سراج نے مولانا رکن الدین اندرپتی سے ''کافیہ''۔ ''مفصل'' (از زمخشری) ''مختصر'' از قدوری اور ''مجمع البحرین'' (از ابن الساعاتی) پڑھیں، قدوری اور مجمع البحرین مسائل فقہ حنفیہ میں جامعیت اور استناد کے لحاظ سے مشہور کتابیں ہیں، مولانا فخر الدین زرادی نے اپنا وعدہ پورا کیا، اخی سراج کے دل میں تحصیل علوم کی آگ لگا دی۔ چنانچہ حضرت سلطان المشائخ سے خلافت نامہ پا کر اسے حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے پاس امانتاً رکھوا دیا اور حضرت سلطان المشائخ کی وفات کے بعد بھی مزید تین سال تک تعلیم پانے میں لگے رہے۔

سلطان محمد بن تغلق نے جب دیوگیر میں دار الحکومت کے قیام کا ارادہ کیا اور لوگوں کو دیوگیر بھیجنا شروع کیا تو اخی سراج حضرت سلطان المشائخ کے کتب خانہ سے مطالعہ کے لیے بعض اہم اور معتبر کتابیں اور حضرت سلطان المشائخ کے دیے گئے کپڑے لے کر لکھنوتی پہنچے اور دعوت دین اور رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع فرمایا، خلق حق اس کثرت سے آپ کی طرف رجوع ہوئی کہ نہ صرف عوام بلکہ علماء اور فرمانروا بھی آپ کے حلقہ مریدین میں شامل ہوگئے۔ آپ نے طویل عمر پائی جس سے لکھنوتی اور آس پاس کے علاقوں کے عوام و خواص نے بھرپور فیض اٹھایا۔

وفات: جب وقت وفات قریب آیا تو آپ نے ایک قبر کھدوائی، سلطان المشائخ کے دیے ہوئے کپڑے اس میں دفن کیے اور وصیت فرمائی کہ مجھے اس قبر کے پائنتی دفن کرنا۔ چنانچہ جب 758ھ میں آپ کی وفات ہوئی تو حسب وصیت آپ کو وہیں دفن فرمایا گیا۔ آپ کے خلفا میں حضرت شیخ علاء الدین اسعد بنگالی نے بڑی شہرت پائی اور سلسلہ چشتیہ سراجیہ کو اس علاقہ میں تیزی سے پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ مشہور درسی کتاب 'ہدایۃ النحو' کی تالیف کا انتساب حضرت اخی سراج ہی کی طرف کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

18.3.2 حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ (المتوفی 782ھ)

ولادت و نسب: نام احمد، لقب شرف الدین، خطاب مخدوم الملک بہاری، خاندان ہاشمی حضرت شیخ شرف الدینؒ کی ولادت 29 شعبان 661ھ کو منیر شریف (ضلع پٹنہ) میں ہوئی۔ سلسلہ نسب یہ ہے: شرف الدین احمد بن یحییٰ بن اسرائیل بن محمد تاج فقیہہ بن ابی بکر بن ابی الفتح بن ابی القاسم بن ابی الصائم بن ابی دہر بن ابی لیث بن ابی سہمہ بن ابی الدین بن ابی سعید (یا ابی مسعود؟) بن ابی ذر بن زبیر ابی العصب بن عبد المطلب بن ہاشم۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی ''مصادر'' اور مفتاح اللغات ''کا تذکرہ ملتا ہے جن میں مفتاح کو آپ نے مکمل طور پر یاد کر لیا تھا۔ سن شعور کو پہنچے تو والد گرامی قدر نے مولانا شرف الدین ابو توامہ کو آپ کی تعلیم کے لیے منتخب فرمایا اور سنار گاؤں بھیج دیا۔ حضرت شیخ نے اپنے محبوب استاد سے، تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ منطق، فلسفہ، ریاضی اور کتب تصوف کی تعلیم بھی پائی۔ ساتھ ہی ریاضت و مجاہدات

بھی کرتے رہے۔ تحصیل علم کے زمانے ہی میں استاد ابو توامہ کی دختر سے آپ کا عقد ہوا۔ اسباق کے مطالعہ میں ایسا انہاک تھا کہ کھانے کے لیے وقت نکالنا دشوار تھا۔ چنانچہ ابو توامہ نے کھانا آپ کے پاس پہنچانے کا نظم کر دیا تھا تا کہ مطالعہ میں خلل نہ پڑے اور وقت ضائع نہ ہو۔ سنار گاؤں کے قیام کے دوران آپ نے گھر سے آئے کسی خط کو نہ کھولا، تا کہ دماغ انتشار سے محفوظ رہے۔ تعلیم کے بعد اس طرف توجہ کی ایک خط سے والد ماجد کی وفات کا علم ہوا۔ والدہ کی یاد آئی اور بے چین ہو کر وطن پہنچے۔ چند ہی روز بعد طلب حق کی آگ بھڑکی اور بے قرار ہو کر مرشد کی تلاش میں وطن سے نکل پڑے، بڑے بھائی جلیل الدین بھی ہمراہ ہوئے۔ دہلی پہنچے تو حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہی کا نام سنا، خدمت میں حاضر ہوئے، کچھ گفتگو ہوئی۔ حضرت شیخ نظام الدین نے جوہر جان لیا اور کہا کہ سیمرغ ہے لیکن ہمارے نصیب میں نہیں۔ پھر ارشاد فرمایا کہ نجیب الدین فردوسی سے ملو، وہ تمہاری ارادت اور تعلیم سلوک کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ دہلی سے پانی پت آئے۔ حضرت شیخ ابو علی مشرف الدین قلندر پانی پتی سے ملاقات کی، لیکن ان کو مغلوب الحال پایا۔ بڑے مایوس ہوئے، بھائی جلیل الدین نے کہا کہ دہلی میں ہی ایک بزرگ نجیب الدین فردوسی (جن کا تذکرہ شیخ نظام الدین کر چکے تھے) رہتے ہیں۔ ان سے بھی مل لو، بادل نخواستہ واپس دہلی پہنچے۔ خواجہ نجیب الدین فردوسی سے ملنے چلے تو حال یہ تھا کہ منہ میں پان دبا ہوا تھا اور کچھ پان رومال میں بندھے ہوئے تھے۔ جب خواجہ نجیب الدین کی قیام گاہ کے قریب پہنچے تو ایک دہشت سی طاری ہوگئی۔ جسم سنسنانے لگا اور بدن پسینہ سے تر ہو گیا۔ تعجب ہوا کہ اتنے مشائخ سے ملاقات کی لیکن یہ کیفیت پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ خواجہ نجیب الدین نے دیکھتے ہی فرمایا کہ منہ میں پان، رومال میں بھی پان کے پتے اور دعویٰ یہ کہ ہم بھی شیخ ہیں۔ آپ نے فوراً پان منہ سے نکالا اور ایک طرف مرعوب و مؤدب بیٹھ گئے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد آپ نے خواجہ نجیب الدین فردوسی سے بیعت کی درخواست کی۔ خواجہ نے فرمایا کہ میں خود برسوں سے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں کہ تم آؤ تو تمہاری امانت تمہارے سپرد کر دوں اور سلسلہ فردوسیہ میں بیعت قبول کی۔ کہا کہ راستہ میں تم کو کوئی خبر ملے تو واپس نہ آنا۔ پھر تحریری نصیحتوں پر مشتمل ایک مضمون آپ کے حوالہ کیا۔ پھر اجازت دے کر رخصت فرمایا۔

شرف بیعت اور حصول اجازت کے بعد حضرت شیخ شرف الدین احمد دہلی سے رخصت ہوئے، راستہ میں مرشد کے وصال کی خبر ملی، چونکہ مرشد کی ہدایت تھی کہ واپس نہ لوٹنا، اس لیے واپس نہ ہوئے، آرہ کے جنگل میں پہنچے کہ مور کی پکار سنی۔ دل میں پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی، ایک ہوک اٹھی، جذب طاری ہوا، گریبان چاک کیا اور جنگل میں غائب ہوگئے۔ بڑے بھائی جلیل الدین نے ہر طرف تلاش کیا لیکن کوئی پتہ نہ چل سکا۔ آرہ اور راجگیر کے جنگلوں میں ایک طویل مدت تک ریاضتوں اور عبادتوں میں مشغول رہے۔ مختلف احوال اس دوران آپ پر گذرتے رہے، آپ مقصود ہی کی جانب متوجہ رہے۔ جب انوار الٰہی سے دل جگمگا اٹھا تو آبادی کا رخ کیا، طالبان حق نے رہنمائی کے لیے آپ کا دامن تھاما اور فیض روحانی سے مستفید ہوئے۔ جمعہ کی نماز کے لیے بہار شریف کی جامع مسجد آنے لگے۔ لوگوں نے اصرار کیا تو بہار شریف ہی کو جائے سکونت بنالیا اور بقول سید صباح الدین عبد الرحمن تقریباً ساٹھ (60) سال تک عوام و خواص کو اپنے سرچشمۂ فیض سے سیراب کرتے رہے۔ سلطان محمد بن تغلق نے جب حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد فردوسی کی درویشی اور بزرگی کی شہرت سنی تو فرمان صادر کیا کہ حضرت مخدوم بہاری کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرائی جائے اور مصارف خانقاہ کے لیے پرگنہ راجگیر ان کے حوالہ کیا جائے۔

اگر مخدوم بہاری قبول نہ کریں تو زبردستی دیا جائے۔ چنانچہ مخدوم الملک کو باکراہ قلب یہ چیزیں قبول کرنی پڑیں۔ خانقاہ کی تعمیر کے بعد سلطان محمد بن تغلق کا بھیجا ہوا سجادہ بلغاری بچھایا گیا اور حضرت مخدوم الملک کو اس پر جلوہ افروز ہونا پڑا۔ حضرت مخدوم !نے فرمایا کہ میں تو اسلام ہی کے لائق نہیں چہ جائے کہ سجادہ کے لائق ہوں۔ مجلس میں موجود ایک درویش نے کہا۔"مخدوم آپ کو خانقاہ اور سجادہ کی وجہ سے کون جانتا ہے۔ آپ کو جو جانتا ہے حق کی وجہ سے جانتا ہے۔ ہم جو آتے ہیں تو آپ کی قوت باطنی کی وجہ سے آتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی برکت سے اسلام ظاہر ہو گا اور اس کو علاقہ میں شوکت حاصل ہو گی"۔ مخدوم نے فرمایا"فقراء کی زبان سے جو نکلتا ہے وہی ہوتا ہے"۔

شیخ حسین معز شمس بلخی کے مطابق ایک لاکھ سے زائد لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ بعض اقوال کے بموجب ان میں کم از کم تین سو(300) افراد واصل بحق اور عارف کامل ہوئے۔ متعدد ہندو فقراء اور برہمن جوگیوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کے واقعات بھی نقل کیے گئے ہیں۔

رشد و ہدایت کے دو طریقے تھے جو آپ نے اختیار کیے، ایک اپنی مجالس میں راست خطاب اور دوسرا مکتوب نگاری، آپ کے ملفوظات ہوں یا مکتوبات اپنی جامعیت، گہرائی اور تاثیر کے لیے آپ کی زندگی ہی میں مشہور ہو چکے تھے اور حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی اور جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت کے مطالعہ میں تھے۔ مکاتیب کے مخاطب، سلاطین امراء بھی ہیں اور علماء، فقہاء و صوفیہ بھی۔

تصانیف: مکاتیب کے مجموعوں میں (1) مکتوبات صدی (2) مکتوبات دو صدی (3) مکتوبات بست و ہشت اور (4) فوائد رکنی ہم تک پہنچ پائے ہیں۔ جب کہ ملفوظات میں (1) معدن المعانی (2) خوان پر نعمت (3) مخ المعانی (4) فوائد عینی (5) گنج لایفنی (6) مونس المریدین (7) راحت القلوب (8) مغز المعانی (9) بحر المعانی (10) تحفہ غیبی معروف ہیں۔ ان میں اکثر مجموعوں کے جامع زین بدر عربی ہیں۔ تصانیف میں (1) ارشاد الطالبین (2) ارشاد السالکین (3) رسالہ مکیہ وذکر فردوسیہ (4) شرح آداب المریدین (5) فوائد المعانی (6) لطائف المدانی (7) عقائد شرفی (8) اوراد کلاں (9) اوراد اوسط (10) اوراد خورد (11) اشارات (12) رسالہ در ہدایت حال (13) مراۃ المحققین (14) رسالۂ اجوبہ (15) وصول الی اللہ۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ملفوظات کے تذکرے میں مکتوبات سہ صدی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ غالباً یہ سبقت قلمی ہے کیونکہ تاحال کسی تذکرہ میں اس نام سے مکتوبات کے مجموعے کا ذکر نہیں ملا۔

اخلاق: فرماتے ہیں، اصل اخلاق یہ ہے جو طریقت میں اہل علم کا شعار بن گیا ہے کہ وہ اپنے احوال میں شریعت کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے اخلاق کو سنت نبوی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور جو شریعت میں محقق نہیں ہوتا اسے طریقت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: شریعت کی پیروی میں جو کوئی جتنا راسخ ہو گا اتنا ہی خوش خلق ہو گا۔ اور جتنا خوش خلق ہو گا بارگاہ حق تعالیٰ میں حق تعالیٰ کو محبوب ہو گا۔ اچھے اخلاق حق تعالیٰ کا تحفہ ہیں۔ پس مومن کے لیے اچھے اخلاق سے بڑھ کر کوئی طریقہ اور کوئی زیب و زینت اچھی نہیں۔ اچھے اخلاق کی حقیقت حق تعالیٰ کے احکام پر عمل آوری اور اس کے رسولؐ کی شریعت کی پیروی کرنا ہے کیونکہ سید کائنات علیہ افضل الصلوٰت والسلام کے تمام افعال و حرکات حق تعالیٰ شانہ، کو پسند رہے ہیں، جو کوئی آپؐ کی پیروی کرے اسے چاہیے کہ اپنی زندگی اسی طرح گذارے جس طرح کہ آپ نے گزاری ہے۔

علوئے ہمت: فرماتے ہیں تو تو کتنا ہی پست سہی، ہمت کو بلند رکھ، بھائی! مردوں کی ہمت کسی بھی چیز سے پست نہیں ہوا کرتی، ان کی ہمت کا بوجھ تو وہ بوجھ ہے کہ اسے آسمان وزمین، عرش و کرسی اور بہشت و دوزخ بھی نہیں اٹھا سکتے... مردان حق کی ہمت ایسی پاک فضا اور ایسے وسیع صحرا کی طالب ہے جس میں خس وخاشاک کا نشان نہیں تاکہ یہ لوگ اس میں پرواز کریں، اور کوئی قضا قضائے ربوبیت سے پاک اور کوئی صحرا، صحرائے وحدانیت، سے وسیع نہیں، مردان حق کی ہمت کعبہ اور بیت المقدس کے گرد نہیں گھومتی، نہ آسمان وزمین کا طواف کرتی ہے۔ سبحان اللہ عزوجل کیا ہی عجیب کام ہے کہ ایک مرد اپنی جگہ بیٹھا رہے پاؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے سر کو زانو پر رکھے ہوئے ہے اور حال یہ ہے کہ اس کا سر ہمت کون ومکاں سے آگے بڑھ گیا ہے، کیا ہی متبرک ہمت ہے کہ تو سوائے پانی اور مٹی (کے اس مرکب یعنی بنی آدم) کے اور کہیں نہ پائے گا۔

شریعت: ایک مکتوب میں فرماتے ہیں "جو شخص شریعت کا تابع نہیں اس کو طریقت سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ملحدین کا مذہب (وموقف) ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر جائز ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب حقیقت منکشف ہوگئی تو شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ حق تعالیٰ کی لعنت ہو اس عقیدہ پر، ظاہر بے باطن نفاق ہے اور باطن بے ظاہر زندقہ (گمراہی)، ظاہر شریعت بے باطن نقص ہے اور ظاہر بے باطن ہوس، ظاہر وباطن ایک دوسرے کے ساتھ ایسے پیوستہ ہیں کہ کوئی ان کو علاحدہ نہیں کرسکتا۔

نبوت وولایت: ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں: باتفاق جملہ مشائخ طریقت رضوان اللہ علیہم اجمعین تمام اوقات واحوال میں اولیاء پیغمبروں کے تابع ہیں اور انبیاء اولیاسے افضل ہیں۔ جو ولایت کی نہایت ہے وہ نبوت کی بدایت (ابتداء) ہے۔ تمام انبیاء ولی ہوتے ہیں لیکن اولیاء میں سے کوئی نبی نہیں ہوتا۔ علماء اہل السنت والجماعت اور اس طریق کے محققین میں اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں، ہاں ملحدین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اولیاء انبیاء سے افضل ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اولیاء تمام اوقات مشغول بحق رہتے ہیں اور انبیاء اکثر اوقات دعوت خلق میں رہتے ہیں پس جو شخص مشغول بحق ہو وہ اس سے جو کبھی کبھی مشغول بحق ہوتا ہو افضل ہوا، ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ مقام ولایت مقام نبوت سے برتر ہے، نبی کو علم وحی ہوتا ہے اور ولی کو علم اسرار... اس کا استنباط انہوں نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ سے کیا... جس کا جواب یہ ہے کہ خضر کو فضیلت جزئی حاصل تھی اور وہ خاص واقعات کا علم لدنی ہے اور حضرت موسیٰؑ کو فضیلت مطلقہ حاصل تھی۔ فضیلت جزئی فضیلت مطلقہ کو منسوخ نہیں کرتی... اس طریق کے پیشوا... اس کو ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کسی کا مرتبہ انبیاء سے بلند یا برابر بھی ہوسکتا ہے۔ یاد رکھو اگر تمام اولیاء کے تمام احوال واعمال اور انفاس وحیات کو نبی کے ایک قدم کے مقابلہ میں تصور کیا جائے تو وہ ہیچ اور معدوم نظر آئیں گے... پس انبیاء کی ایک سانس تمام اولیاء کی تمام زندگی سے افضل ہے اس لیے کہ جب اولیاء نہایت کو پہنچتے ہیں تو مشاہدہ کی خبر دیتے اور حجاب بشریت سے خلاصی پاتے ہیں اگرچہ اس حالت میں بھی بشر ہی رہتے ہیں۔ پیغمبر پہلے قدم ہی میں مقام مشاہدہ پر فائز ہوتے ہیں... بایزید بسطامی سے کسی نے پوچھا کہ انبیاء کے حالات کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا "توبہ! توبہ ہمارا اس عالم میں کوئی دخل نہیں"۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں۔ چشم عبرت کھولو، آدم کی حسرت دیکھو، نوح کی فریاد سنو، ابراہیم کی بے کامی اور یعقوب کی مصیبت

پر کان دھرو، کنویں میں یوسف ماہ رو کو دیکھو، زکریا کے سر پر آرہ، یحییٰ کی گردن پر تلوار ملاحظہ کرو، محمد رسول اللہ ﷺ کی سوزش جگر اور بے تابی دل پر غور کرو اور پڑھو **کل شیئ ھالک الا وجھہ۔**

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں: نظر حق تعالیٰ کی قدرت اور فضل پر رکھنی چاہیے، اگر وہ چاہے ہزار ہزار کلیسا و بت خانہ کو کعبہ اور بیت المقدس بنادے اور ہزار ہزار نافرمانوں اور فاسقوں کو حبیب اللہ و خلیل اللہ کا خطاب دے دے، کوئی علت درمیان میں نہیں ہے۔ اگر چاہے ایک لحظہ میں ہزار ہزار کافر کو مومن اور ہزار ہزار مشرک بت پرست کو موحد کردے اس کے لیے کسی مہلت کی ضرورت نہیں ہے۔

رحمت حق: ایک اور جگہ فرماتے ہیں: میرے بھائی، جب حق تعالیٰ کے دریائے رحمت میں کرامت و مغفرت کی موج اٹھتی ہے تو تمام لغزشیں اور معاصی معدوم و فنا ہو جاتے ہیں اور سب عیب و ہنر بن جاتے ہیں اس لیے کہ لغزش و معصیت حادث اور فانی ہیں اور رحمت حق ازلی ولازوال، حادث وفانی ابدی وازلی کا کیا مقابلہ، اس مشت خاک کا سارا دارومدار رحمت ہی پر ہے۔

وفات: 6 شوال 782ھ کی شب نماز مغرب کے بعد خدام واحباب چارپائی کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے۔ حضرت مخدوم بہاری نے بسم اللہ پڑھی لاالہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین کئی مرتبہ بلند آواز سے پڑھا، کلمہ شہادت پڑھا 'لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھا اور بڑی قوت اور ذوق وشوق سے محمد بمحمد محمد اللھم صلی علی محمد وعلی آل محمد پڑھا، قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی، رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد صلی اللہ علیہ و سلم نبیاً پڑھا۔ امت محمدیہ کے لیے دعا فرمائی "**لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**" آپ کی زبان پر جاری ہوا پھر ایک بار "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کہا اور جان جان آفرین کے سپرد فرمادی۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ نے جو وفات کے بعد پہنچے حسب وصیت مخدوم نماز جنازہ پڑھائی اور قبر میں اتارا۔ خلفاء کی تعداد تین سو تیرہ (313) بتائی گئی ہے۔ بعض ممتاز نام یہ ہیں (1) حضرت مظفر بلخی (2) حضرت حسین نوشہ (3) حضرت مخدوم شعیب (4) حضرت آموں (5) حضرت نصیر الدین سمنانی (6) حضرت شمس الدین مشہدی (7) حضرت مخدوم راستی (8) حضرت قاضی شمس الدین (9) حضرت قاضی صدر الدین (10) حضرت سید علیم الدین گیسو دراز (11) حضرت سید علی ہمدانی۔

18.3.3 حضرت شیخ عین الدین محمد گنج العلم (المتوفی 795ھ)

نام ولقب: نام محمد، لقب عین الدین، کنیت ابوالعون، عرفیت، گنج العلم یا گنج العلوم، آپ کا سلسلہ نسب و سلسلۂ طریقت اپنے والد حضرت شرف الدین محمد متقی جنیدی اور ابو عبد الرحمن سلیمی کے توسط سے حضرت جنید بغدادی تک پہنچتا ہے۔ حضرت شرف الدین محمد جنیدی کا شمار علاء الدین خلجی کے زمانے کے مشاہیر علماء میں تھا۔ حضرت عین الدین سنہ 706ھ میں نو دہلی (کیلو کھڑی) میں پیدا ہوئے، نشوونما دہلی میں ہوئی، سن شعور کو پہنچتے ہی حضرت عین الدین نے بھنوارا (واقع در مضافات برن / بلند شہر) جاکر مولانا قوام الدین جالندھری سے صرف ونحو اور مولانا اسمعیل کانوری (پنجاب) اور مولانا منہاج الدین تمیمی کنوری (آگرہ) سے لغت اور فن خطاطی میں کمال حاصل کیا۔ تجوید جالو (مضافات جودھپور) میں سیکھی، پھر گجرات کا رخ کیا جہاں کے بڑے بڑے علماء آپ کے والد کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ یہاں مختلف علوم کی تحصیل کی تکمیل کے بعد دولت آباد پہنچے اور مولانا شمس الدین دامغانی (حضرت سلطان المشائخ کے ہمدرس)

کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا دامغانی کے علاوہ قاضی افتخار الدین سے اصول فقہ اور حضرت سید علاء الدین جیوری سے ”مفتاح“ اور ”کشاف“، پڑھیں اور انہی کے دست حق پرست پر سلسلۂ سہروردیہ، سلسلۂ جنیدیہ اور سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کی، مرشد عالی مقام کی وفات کے بعد حضرت عین الدین سنہ 758ھ میں سکر (ضلع گلبرگہ) چلے آئے، آپ کے بڑے بھائی شیخ رضی الدین محمد اور بڑی بہن بی بی مسعودہ بھی ہمراہ تھیں، سکر نہ صرف بہمنی سلطنت کا ایک اہم مقام تھا بلکہ حضرت شیخ صوفی سرمست دہلوی (متوفی 670ھ) کا مدفن اور علماء وصوفیہ کا مرکز تھا۔

درس وتربیت: حضرت شیخ عین الدین نے یہاں مجالس تدریس وتربیت کا آغاز کیا اور تقریباً چھتیس (36) سال تک فیض رسانی میں مشغول رہے، کہا جاتا ہے کہ آپ ہی کی وجہ سے سکر کا نام ”عین آباد“ مشہور ہو گیا تھا۔ آخری عمر میں آپ نے بیجاپور منتقل ہونے کا فیصلہ فرمایا اور بیجاپور ہی میں 795ھ میں وصال فرمایا۔

اولاد وخلفاء: بڑے صاحبزادے شیخ محمد جنیدی مفتی عسکر تھے اور صاحبزادیوں میں بی بی رونق اور خوندنان حافظہ وعارفہ مشہور تھیں۔ تلامذہ میں شیخ ضیاء الدین غزنوی، شیخ ابراہیم سنگانی (”ادہم ثانی“) حضرت سید محمد حسینی گیسو درازؒ اور خواجہ حسین شیرازی معروف ہیں اور خلفاء میں شیخ محمد جنیدی اور شیخ عبداللہ غزنوی۔

تصانیف: بعض محققین کے نزدیک آپ نے 125 کتابیں تصنیف کیں اور بعض کے مطابق 132۔ ان کتابوں کے موضوعات (1) تجوید وقرأت (2) تفسیر (3) حدیث (4) فقہ (5) علم الاصول (6) کلام (7) تصوف وسلوک (8) صرف ونحو (9) لغت (10) نسب (11) تاریخ (12) طب (13) حکمت وغیرہ ہیں۔

آپ کی اولاد میں اب کوئی نہیں بچا، آپ کے چچازاد بھائی حضرت سراج الدین کی خانقاہ اور اولاد کچھ عرصہ پہلے تک طالبین حق کی خدمت اور تربیت میں مصروف تھی۔ خانقاہ ہی میں مخطوطات کا ایک عظیم خزانہ بھی تھا جن میں عین ممکن ہے حضرت عین الدین گنج العلم کی تصنیفات بھی شامل رہی ہوں۔

18.3.4 محمد غوث گوالیاری شطاری (906-970ھ)

نام وخاندان: نام محمد، کنیت ابوالمؤید، نسب محمد بن خطیر الدین بن لطیف بن معین الدین قتال بن خطیر الدین بن ابی یزید بن فرید الدین عطار ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ کے پردادا ہندوستان تشریف لائے اور جون پور میں مقیم ہوئے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔

مختصر احوال: حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری کے اپنے بیان کے مطابق وہ سنہ 906ھ میں گوالیار میں پیدا ہوئے، تعلیم کے لیے حضرت شیخ ظہور الدین حاجی کے دامن سے وابستہ ہوئے۔ شیخ محمد غوث اور ان کے آٹھ (8) بھائی سلسلہ شطاریہ میں شیخ حاجی حمید سے بیعت تھے۔ جو حضرت شاہ قاضن کے مرید وخلیفہ تھے۔ حضرت شاہ قاضن خود حضرت شیخ عبداللہ شطار (بانی سلسلہ شطاریہ) کے مرید ومجاز بیعت تھے۔ بیعت کے بعد محمد غوث نے اپنے شیخ کے حکم سے عزلت گزینی اختیار کی۔ چنانچہ چنار کے پہاڑوں میں تیرہ (13) برس مجاہدوں،

ریاضتوں اور اذکار و اشغال میں گزارے۔ پھر گجرات تشریف آوری ہوئی جہاں ان کی ملاقات مشہور عالم شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی سے ہوئی جو ان کے تبحر اور پاک باطنی سے بڑے متاثر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد محمد غوث 966ھ میں آگرہ تشریف لے گئے، جہاں مغل بادشاہ اکبر نے ان کا استقبال کیا اور بڑے اکرام و احترام سے پیش آیا، پھر محمد غوث گوالیار واپس آ گئے اور یہیں 970ھ میں واصل بحق ہوئے۔ مغل بادشاہ ہمایوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ محمد غوث گوالیاری کا معتقد و مرید تھا۔

تصانیف: محمد غوث گوالیاری کی تصانیف میں "جواہر خمسہ"، "کلید مخازن"، "بحر الحیوۃ" اور "معراج نامہ" مشہور ہیں۔ ان میں "جواہر خمسہ" کئی مرتبہ مختلف مطابع سے شائع ہو چکی ہے، لیکن اہمیت و مقبولیت کے باوجود اس کا کوئی محقق نسخہ اب تک طبع نہ ہو سکا، جو ملحقات و تصحیفات سے پاک ہو۔ "بحر الحیوۃ" ابھی تشنہ اشاعت ہے۔ "معراج نامہ" میں بعض کلمات از قبیل شطحیات درج ہیں جن پر علماء گجرات نے حضرت محمد غوث پر نہ صرف کفر بلکہ ارتداد کا فتوی دیا اور بوجہ ارتداد وجوب قتل کی رائے دی، لیکن شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی نے رسالہ کے مطالعہ کے بعد فتوی کی مخالفت کی اور یہ رائے دی کہ چونکہ رسالہ حالت سکر میں لکھا گیا ہے، لہذا مؤلف پر کفر کا فتوی نہیں جاری کیا جاسکتا۔ حالت سکر میں حال کے غلبہ کی وجہ سے ہوش و حواس پر اختیار نہیں رہتا احکام شرعیہ تکلیفیہ کا اس پر اطلاق نہیں ہو سکتا، لہذا وہ معذور شرعی ٹھہرتا ہے۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کی مداخلت کی وجہ سے محمد غوث گوالیاری کی جان ہی نہیں بچی بلکہ وجیہ الدین علوی گجراتی نے ان کے حلقہ مریدین میں شمولیت اختیار کر کے ان کے مقام کی بلندی معاصر علماء کے سامنے واضح کر دی۔

تعلیمات: حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری فرماتے ہیں:

جب انسان حق تعالیٰ کی ظاہری عبادات میں مضبوط اور کامل ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ تصفیہ (صفائی) قلب، جمع خاطر، تزکیہ نفس اور تجلیہ روح کے لیے باطنی ریاضت اختیار کرے اور اپنے مرشد کے ذریعہ چار خطروں کو جو انسان کے باطن میں پیدا ہوتے ہیں پہچانے: (1) خطرۂ شیطانی (2) خطرۂ نفسانی (3) خطرۂ ملکی اور (4) خطرۂ رحمانی۔ جب سالک کو ذکر و شغل کے وقت خطرۂ شیطانی کا اثر معلوم ہو تو اس کو چاہیے کہ فوراً کلمہ تمجید پڑھنا شروع کر دے۔ انشاء اللہ خطرہ دفع ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر خطرہ نفسانی پیش آئے تو کثرت سے استغفار پڑھے اور سات (7) بار سورہ اخلاص۔ خطرہ ملکی کے دفع کرنے کے لیے گیارہ بار یہ دعا پڑھے: "سبحان ذی العزة والعظمة والهيبة، والقدرة، والكبرياء والجبروت"۔ انشاء اللہ خطرہ دور ہو جائے گا۔ اور اگر خطرہ رحمانی محسوس ہو تو کلمہ طیبہ یعنی "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا کثرت سے ذکر کرے، اگر خطرہ جاتا رہے تو وہ خطرۂ روح ہو گا اور اگر زائل نہ ہو تو وہ خطرۂ رحمانی ہی ہے، اس کے ثبات، استحکام اور استقرار کے لیے تین بار اسماء کبیر کا ذکر کرے...

تصوف: فرماتے ہیں کہ اس راہ (یعنی تصوف) کے چلنے والے تین فریق ہیں: اہل شریعت، اہل طریقت اور اہل حقیقت۔ سالک شریعت امر کے مامور ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی ذرہ اذن حق کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ سالک طریقت ظاہر و باطن شریعت کے تابع ہیں اور اعتقاداً فاعل حقیقی کے سوا کسی دوسرے پر نظر نہیں ڈالتے۔ "قل كل من عند الله" پر قائم رہتے ہیں۔ اور سالک حقیقت گمان ہستی سے بے گمان ہیں، ہر وقت تقدیر و تسلیم و رضا پر جمے ہوئے ہیں، پھیرنے والا جس طرف پھیر دیتا ہے پھر جاتے ہیں، شعور بشری سے دور

"کل شئی ھالک الا وجھه" میں گم تفویض پر عامل۔

18.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- خواجہ نظام الدین اولیاء بدایوں میں پیدا ہوئے، بچپن میں ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم بدایوں سے شروع ہوئی اور مزید تعلیم کے لیے دہلی تشریف لائے۔ بادشاہوں کی صحبت سے آپ نے اپنے آپ کو دور رکھا۔ توبہ، استقامت، ایمان، نماز، تلاوت قرآن، دنیا سے دوری، روزوں کی کثرت، مجاہدہ، فقر و فاقہ، صبر و رضا، توکل، علم، جود و سخا، ذکر الٰہی، عشق الٰہی، تقوی، حسن اخلاق، حقوق العباد، عیب پوشی، احکام شریعت کی پابندی، دعوت و تبلیغ وغیرہ کی تلقین سے آپ کے ملفوظات کے مجموعے پر ہیں۔
- محمد غوث گوالیاری شطاری گوالیار میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے لیے حضرت شیخ ظہور الدی حاجی کے دامن سے وابستہ ہوئے۔ مغل بادشاہ ہمایوں محمد غوث گوالیاری کا معتقد و مرید تھا۔ آپ کی تصانیف میں "جواہر خمسہ"، "کلید مخازن"، "بحر الحیوۃ" اور "معراج نامہ" مشہور ہیں۔
- حضرت سراج الدین عثمان کو اخی سراج کہا جاتا ہے، آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے جنھوں نے آپ کو "آئینہ ہند" قرار دیا۔ آپ کے خلفا میں حضرت شیخ علاء الدین اسعد بنگالی نے بڑی شہرت پائی اور سلسلہ چشتیہ سراجیہ کو اس علاقہ میں تیزی سے پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ مشہور درسی کتاب "ہدایۃ النحو" کی تالیف کا انتساب حضرت اخی سراج ہی کی طرف کیا جاتا ہے۔

18.5 نمونہ امتحانی سوالات

18.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سلطان الاولیاء کس کا لقب ہے؟

(a). نجیب الدین (b). بابا فرید (c). جلال الدین (d). نظام الدین اولیاء

2. نظام الدین اولیاء کہاں پیدا ہوئے؟

(a). آگرہ (b). لکھنو (c). مظفر نگر (d). بدایوں

3. نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کس کے خلیفہ شمار کیے جاتے ہیں؟

(a). نظام الدین اولیاء (b). نجم الدین (c). برہان الدین (d). خواجہ حسام الدین

4. شیخ محمد غوث گوالیاری کہاں پیدا ہوئے؟

(a).906ھ (b).811ھ (c).611ھ (d).622ھ

5. معراج نامہ کس کی تصنیف ہے؟

(a). جلال الدین (b). نظام الدین (c). شہاب الدین (d). محمد غوث گوالیاری

18.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. محمد غوث گوالیاری شطاری کی تعلیمات پر روشنی ڈالیے۔
2. اخی سراج پر نوٹ لکھیے۔
3. محمد غوث گوالیاری کی ابتدائی زندگی پر بحث کیجیے۔
4. خواجہ نظام الدین اولیاء کی ابتدائی زندگی پر نوٹ لکھیے۔
5. حضرت شیخ شرف الدین احمد کی ابتدائی زندگی بیان کیجیے۔

18.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. خواجہ نظام الدین اولیاء پر تفصیلی گفتگو کیجیے۔
2. حضرت شیخ شرف الدین پر مضمون لکھیے۔
3. شیخ عین الدین محمد گنج پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

18.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. بزم صوفیہ	:	از سید صباح الدین عبد الرحمن
2. تاریخ دعوت وعزیمت (جلد سوم وچہارم)	:	از سید ابوالحسن علی ندوی
3. اخبار الاخیار	:	از شیخ عبد الحق دہلوی (اردو ترجمہ)
4. گلزار ابرار	:	از محمد غوثی شطاری (اردو ترجمہ)
5. سیرۃ الاشرف	:	از امیر احمد علوی کاکوروی
6. حضرت خواجہ بندہ نواز کا نظام تصوف وسلوک	:	از احمد حسین خاں
7. اردو دائرہ معارف اسلامیہ		

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 19: ہندوستان کے مشہور صوفیائے کرام (حصہ سوم)

اکائی کے اجزا:

19.0 تمہید

19.1 مقاصد

19.2 حضرت خواجہ باقی باللہؒ

19.2.1 علم باطن کی تحصیل

19.2.2 ہندوستان آمد

19.2.3 عادات واخلاق

19.2.4 طرز عمل

19.3 حضرت خواجہ کے ملفوظات

19.3.1 تصرف خواجہ باقی باللہ

19.3.2 بیماری اور وفات

19.4 خواجہ باقی باللہ کے خلفاء

19.4.1 شیخ تاج الدین

19.4.2 خواجہ حسام الدین

19.4.3 شیخ الہ داد

19.4.4 شیخ احمد سرہندی

19.5 کلیدی الفاظ

19.6 اکتسابی نتائج

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

19.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

19.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
19.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
19.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

19.0 تمہید

ہندوستان میں صوفی روایت کا آغاز و ارتقاء کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی داغ بیل عرب تاجر، مجاہدین اور مشائخ کے ذریعہ پڑی۔ بہت سارے صوفیائے و مشائخ صرف داعی اسلام کے مقصد سے ہندوستان میں تشریف لائے ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس اکائی میں ان سبھی کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ اس سے پہلے اکائی میں آپ نے علی ہجویری، معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء اور بہاء الدین زکریا ملتانی کے بارے میں پڑھا۔ اس اکائی میں آپ خواجہ محمد باقی باللہ کے بارے میں پڑھیں گے۔ اس اکائی میں خواجہ باقی باللہ پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

19.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد خواجہ باقی باللہ کی حالات زندگی، ان کی تعلیمات وہدایات سے آپ کو روشناس کرانا ہے اور ساتھ ہی ان کے مشہور خلفاء کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ آپ ان کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔

19.2 حضرت خواجہ باقی باللہؒ

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ 15 جولائی 1564 کو کابل میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام محمد رضی الدین تھا لیکن شہرت زیادہ تر باقی باللہ یا محمد باقی اللہ یا عبد الباقی کے نام سے ملی۔ آپ کے والد قاضی عبد السلام تھے۔ جو فقہ وحدیث میں کمال رکھتے تھے۔

آپ نے ابتدا ہی سے باقی باللہ کی تعلیم پر نظر رکھی۔ آٹھ برس کی عمر میں آپ نے حفظ قرآن مکمل کر لیا اور بہت کم مدت میں نماز وروزے کے مسائل بھی ازبریاد ہوگیے۔ آپ کی ذہانت وفطانت کو لوگ رشک اور تعجب کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد آپ نے عربی تعلیم کی طرف توجہ کی اور مولانا صادق حلوائی کے پاس مزید تعلیم کی غرض سے پہنچے۔ ملا صادق اس وقت کے فاضل اور معروف شاعر تھے۔ ملا صادق سمرقند سے تعلق رکھتے تھے لیکن 1571 میں حج سے واپسی کے بعد آپ نے کابل میں کچھ عرصے قیام کیا اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ کابل میں ہی خواجہ باقی باللہ نے آپ کی شاگردی اختیار کی اور جب ملا صادق حلوائی نے کابل چھوڑ کر ماوراء النہر جانے لگے تو خواجہ باقی باللہ بھی آپ کے ساتھ تشریف لے گیے۔ آپ نے فراغت نہیں حاصل کی تھی کہ علم وفضل کا چرچا تمام علاقے (ماوراء النہر) میں ہو گیا تھا۔ ہر علمی محفلوں میں آپ کا نام تعظیم سے پکارا جانے لگا اور جید علمائے کرام بھی آپ سے علمی مشورہ طلب کرنے

لگے۔ آپ کے علمی مقام کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے دوست واحباب مشکل سے مشکل کتاب اور ہر فن کی پیچیدہ سے پیچیدہ سبق آپ کے پاس لاتے اور اشکالات کا جواب طلب کرتے تو آپ فوراً وضاحت کے ساتھ ان کو سمجھا دیتے۔ اور تھوڑے عرصہ میں ہی اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی مقام حاصل کرلیا۔

19.2.1 علم باطن کی تحصیل

خواجہ باقی باللہ کے اندر علوم متداولہ کی تکمیل سے پہلے ہی تصوف کا ذوق پیدا ہو چکا تھا اس لیے آپ کی توجہ حقیقت و معرفت کی طرف مبذول ہوگئی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی اولیاء وقت کی مجلسوں میں حاضر ہو کر ان سے کمالات باطنی حاصل کرتے تھے۔ آپ نے پہلے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی اور ماوراء النہر اور افغانستان میں جو صوفی شخصیت تھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تزکیہ نفس کی کوشش شروع کی، لیکن خاطر خواہ صفائی قلب اور تسکین میسر نہ آئی۔ پہلے خواجہ عبیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گناہوں سے استغفار کیا۔ پھر شیخ افتخار کی خدمت میں حاضری ہوئی اور اصلاح حال کی کوشش کی۔ شیخ افتخار راضی نہ تھے اس لیے کہ خواجہ باقی باللہ ابھی جوان تھے لیکن باقی باللہ ارادے کے پکے تھے اس لیے ناچاہتے ہوئے بھی سورہ فاتحہ پڑھی اور دعا فرمائی کہ اللہ آپ کو استقامت بخشے۔ پھر آپ امیر عبداللہ بلخی کی خدمت میں پہنچے اور وہاں سے علوم حاصل کیا۔ آپ کی ہمت کی داد دینی پڑے گی کہ بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی دل بے قرار رہتا اور خواہش تھی فیض کے کسی سرچشمے سے محروم نہ رہ جاؤں۔ چنانچہ آپ شہر بشہر اور قریہ ہوتے ہوئے حضرت خواجہ محمد امکنگیؒ کی خدمت میں حاضری دی جہاں باقی باللہ کی طبیعت کو اطمینان حاصل ہوا اور مدارج روحانی میں بلندی پر چڑھنے لگے۔ خواجہ امکنگیؒ نے بھی آپ پر بے انتہا عنایت اور رعایت مبذول فرمائی۔ آپ نے تین دن ورات خلوت میں صحبت رکھی اور مزید فوائد کی اطلاع دے کر فرمایا خدا کے فضل سے تمہارا کام اس سلسلہ عالیہ کے اکابر کی روحانی تربیت سے نہایت خیر واسلوبی کے ساتھ انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اب تم ہندوستان جاؤ اور وہاں اس سلسلہ کی تبلیغ کرو کیونکہ یہ نازک پودا تمہارے ہی ذریعہ سرسبز وشاداب ہوگا اور محنتی طالب علم تمہاری نظر کرم سے پھلے پھولیں گے۔ خواجہ نے یہ ذمہ داری لینے میں ٹال مٹول کیا اور یہ عذر پیش کیا کہ میری خواہش ہے کہ میں خود ابھی آپ کی تعلیم و تلقین کا محتاج ہوں اور چاہتا ہوں کہ چند روز اور آپ کی خدمت میں رہ کر کچھ اور فوائد حاصل کروں۔ مگر خواجہ امکنگیؒ نے آپ کے کسی عذر کو نہیں سنا بلکہ استخارہ کیا اور اس میں آپ کے نام کی ہی تائید ہوئی۔ بادل ناخواستہ آپ کو خواجہ امکنگیؒ کی صحبت چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا۔ اس بات کو جب خواجہ امکنگیؒ کے دوستوں اور پرانے خدمت گاروں نے سنا کہ خواجہ باقی باللہ کو صرف چند روز کی صحبت میں خلافت کاملہ اور اجازت نامہ دیکر ہندوستان جانے کی اجازت دی ہے اور آپ کو وہاں کا امام بنایا ہے تو ان کی غیرت جوش میں آگئی اور اس بات کی چرچا کرنے لگے۔ خواجہ امکنگیؒ کو ان کی ناراضگی کا علم ہوا تو سب کو جمع کیا اور فرمایا کہ ''تمہیں معلوم نہیں ہے یہ جوان کس رتبہ کا آدمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص ہمارے پاس تحصیل تعلیم و تلقین کے لیے نہیں بلکہ احوال حاصلہ کی تصحیح کے لیے آیا تھا''۔

19.2.2 ہندوستان آمد

خواجہ باقی باللہ نے جب سرزمین ہندوستان میں قدم رکھا تو مکمل ایک سال تک لاہور میں رہے اور یہاں پر آپ نے علما و فضلا کو اتنا

متاثر کیا کہ وہ آپ کی محبت کے دلدادہ ہوگیے۔ اس کے بعد طریقہ عالیہ نقشبندیہ کے بزرگوں کی بشارت کے موافق دہلی تشریف لائے۔ اُس وقت دہلی ایسی جگہ تھی جسے دارالاولیا اور بیت الفقراء کا فخر حاصل تھا۔ چنانچہ آپ کی آمد قلعہ فیروزآباد میں ہوئی جو جمنا کے کنارے پورے آب وتاب کے ساتھ واقع تھا۔ نماز کے لیے آپ قلعہ کی مسجد تشریف لاتے تھے۔ اس زمانے میں اکثر اوقات عشاء کی نماز کے بعد آپ مراقبہ کرتے اور مراقبے میں صبح کر دیتے۔ دن بدن آپ کی شہرت دہلی واطراف کے شہروں میں پھیل گئی تو جہاں جہاں طالبان صادق تھے وہ آپ کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ دہلی و ارد گرد کے لوگ، مشائخ وقت خلافت کے باوجود اور سجادہ نشینی کے جاہ و حشمت کو چھوڑ کر نیاز مندی کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ خواجہ باقی باللہ کی ہندوستان میں آمد زندگی کے آخری دنوں میں ہوئی اور بہت کم وقفہ ہی ہندوستان میں گزار پائے تھے کہ مالک حقیقی سے جاملے۔

19.2.3 عادات واخلاق

خواجہ باقی باللہ ہمیشہ عزت اور خلوت نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر آپ کی گوشہ نشینی دنیاوی تعلقات منقطع کرنے والی نہ تھی بلکہ اولیاء وصلحاء کی سی تھی۔ کبھی آپ درویش اور کبھی معمولی شخص سے بھی تخاطب کرتے نظر آتے اور کبھی ضرورت مندوں کی ضرورت پورا کرنے میں سرگرم اور تیار نظر آتے تھے۔ کم سخنی اور خاموشی آپ کا خاص شیوہ تھا، گھنٹوں گردن جھکائے بیٹھے رہتے اور کسی کی طرف نگاہ بھی اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ اگر کوئی شخص سوال کرتا تو ضرورت کے مطابق مختصر لفظوں میں جواب فرماتے لیکن جب تصوف کا علمی مسئلہ کوئی پوچھتا تو اس کا تفصیلی جواب دیتے تاکہ مسئلے کے تمام گوشے اور پہلو اس کے سامنے واضح ہوسکیں۔ علماء اور درویشوں کی حد سے زیادہ تعظیم کرتے تھے اور بسا اوقات ان کے مکان پر بھی جاکر ملاقات کرتے تھے۔ اگر کسی عالم کو پیدل دیکھتے اور خود گھوڑے پر سوار ہوتے تو فوراً گھوڑے سے اتر جاتے اور سلام ومصافحہ میں پیش قدمی کرتے۔ جزوی وکلی مسائل میں اہل علم سے رجوع کرتے۔ عجز وانکساری آپ کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ کی خوبی یہ تھی کہ انکساری کی وجہ سے اپنے مرتبہ اور کمال کا رعب کسی پر نہیں جماتے تھے بلکہ اس کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے۔ طالبین حق جب بیعت کے لیے آتے تو اپنے آپ کو خواجہ باقی باللہ غایت انکساری سے عذر فرمادیتے، لیکن اگر آنے والا صادق ومستقل مزاج ہوتا تو تربیت کی ذمہ داری قبول کرلیتے۔

ایک خراسانی نوجوان بہت دنوں تک خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر مجاورانہ زندگی بسر کرتا رہا اور بختیار کاکی کی روحانیت سے ایک کامل اور مکمل پیر کی گزارش کرتا رہا۔ خراسانی نوجوان کو خواب میں دکھایا گیا کہ ایک نقشبندی بزرگ دہلی پہنچ چکے ہیں تو خراسانی نوجوان خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا سنایا۔ خواجہ باقی باللہ نے یہ سن کر فرمایا کہ میں اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتا آپ کو خواب میں جس بزرگ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کوئی اور شخص ہے۔ غرض جب خواجہ باقی باللہ نے کثرت سے منع کیا تو خراسانی نوجوان اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے دوبارہ خواب دیکھا اور بتایا گیا کہ وہ یہی بزرگ ہے جس کا ہم نے پتہ دیا تھا اور جس کی خدمت میں تو کل پہنچا تھا۔ انکساری وعاجزی کے سبب انہوں نے منع کردیا تھا۔ نوجوان دوبارہ پہنچا اور حلقہ ارادت میں داخل ہوکر ایسی قبولیت حاصل کی کہ مرتے دم تک آپ کے ساتھ رہا۔

ایک بار لاہور میں خشک سالی کے علامتیں ظاہر ہوئیں اور سارے ملک میں سوکھا اور غربت کی گھٹا چھاگئی اس دوران خواجہ باقی باللہ لاہور میں تشریف رکھتے تھے آپ نے جب قحط زدوں کی مصیبت کا سوچا تو خود بھی کھانا پینا چھوڑ دیا اور کچھ دنوں کے بعد خادم نے کھانا پیش کیا تو آپ نے نم آنکھوں سے فرمایا کہ یہ انصاف سے بہت دور ہے کہ ایک شخص پڑوس میں بھوک کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر گزارے اور ہم پیٹ بھر کھانا کھائیں۔ خادم نے جتنا کھانا پیش کیا تھا آپ نے اس کو بھوکوں میں تقسیم کروادیا۔

آپ لاہور سے دہلی تشریف لارہے تھے تو راستے میں بارہا ایسا ہوا کہ آپ ایک میل بھی نہیں چل پاتے تھے کہ کوئی معذور یا پیدل شخص نظر آجاتا تو آپ خود گھوڑے سے اتر جاتے اور اسے سوار کردیتے۔ وہ منزل تک گھوڑے پر اور آپ پیدل چلتے۔ سر پر لنگی ڈال لیتے تاکہ کوئی شخص آپ کو پہچان نہ سکے اور جب منزل قریب ہونے لگتی تو آپ سوار ہوجاتے۔ آپ کی رحمت وشفقت صرف انسانوں تک محدود نہ تھی بلکہ آپ جانوروں کے ساتھ بھی اتنی ہی محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک رات آپ تہجد کے لیے اٹھے تو بلی لحاف پر سوگئی۔ نماز سے فارغ ہوکر جب آپ بستر پر تشریف لائے تو دیکھا کہ لحاف پر بلی سوئی ہوئی ہے تو آپ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ بلی کو جگا کر لحاف اوڑھیں۔ غرض صبح تک آپ یونہی بیٹھے رہے اور جاڑے کی سختی برداشت کرتے رہے۔

خواجہ باقی باللہ بہت سخی وفیاض تھے اور فیاضی کا کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ فیاضی کی نصیحت کیا کرتے تھے اور ہر موقع پر سخاوت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرکے عملاً ایسا کرتے تھے۔ بسا اوقات مخلص امراء مال و دولت آپ کی نذر اس غرض سے کرتے تھے کہ آپ کے صلاح ومشورے سے فقراء میں تقسیم کیا جائے۔ آپ ان رقموں میں اپنی طرف سے مزید اضافہ کرکے مستحقین کو تقسیم کردیتے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک شاہی امیر جو خواجہؒ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے اس نے خدمت میں روپیے بھیجا اور گزارش کی کہ آپ اپنی تجویز سے اسے مستحقین میں تقسیم کردیں۔ آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ خزانے میں جو رقم موجود ہے وہ لے آؤ اور اس رقم کو بھی اس میں شامل کرکے بانٹ دیا۔ اس پر بعض جاہل محتاجوں نے اعتراض جتایا اور کہا کہ ہمیں اتنا نہیں ملا جتنا کہ ہمارا حق تھا۔ آپ کے شاگرد واصحاب نے ان کی زبان درازی روکنے کی کوشش کی تو خواجہؒ نے منع فرمایا اور نہایت ملائمت اور شائستگی سے فرمایا کہ بھائیو جس قدر میں نے تم کو دیا ہے اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے غمگین نہ ہو آئندہ تمہیں زیادہ دیا جائے گا۔

آپ اپنی زندگی فقر وفاقہ میں بسر کرتے تھے اور اس میں ان کو خوشی محسوس ہوتی تھی جس طرح وہ فقر ومسکنت وہ اپنے لیے پسند کرتے تھے اور یہی بات مریدوں کے حق میں بھی پسند کرتے تھے اور جس میں قناعت وتوکل کے اوصاف نمایاں ہوتے تھے ان کو دل سے پسند کرتے تھے۔ کھانے پینے اور کپڑے پہننے میں بھی آپ بہت سادہ مزاج تھے۔ کھانے پینے میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے اگر کہیں سے ہدیہ پہنچتا تو اسے رد نہ کرتے لیکن اپنے مصارف میں لانے سے پرہیز کرتے۔ اپنے خدام کو تاکید کرتے تھے کہ کھانا پکانے والا کھانے پکاتے وقت باوضو رہے۔ غرض آپ تسلیم ورضا کے دریا میں ڈوبے رہتے تھے، نہایت سادگی اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

خواجہ باقی باللہ اپنے مریدین سے فرمادیا کرتے تھے تم لوگوں کی یہ کوششیں رائیگاں جائے گی کیوں کہ تم لوگوں نے میرے ساتھ جو گمان رکھا ہوا ہے یہ سراسر بے نتیجہ ہے میں تم لوگوں کے لیے بہتر سوچتا ہوں کہ تم لوگ دوسری جگہ جاکر کوشش کرو اور مطلوب کی تلاش

وجستجو کرو اور اگر کوئی بہتر رہنما ملے تو مجھے بھی اطلاع دو تاکہ میں بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوں اور زخم دل کا مرہم پاؤں۔

19.2.4 طرزِ عمل

خواجہ باقی باللہ کا بدن سخت محنت کی وجہ سے لاغر اور کمزور تھا مگر منصبی فرائض کے ادائیگی میں ان کی یہ کمزوری کبھی بھی مانع نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ چاق وچوبند اور سرگرم نظر آتے تھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے اور اپنے اوقات کو عبادات کے لیے تقسیم کیے ہوئے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد کمرے میں تشریف لے جاتے اور تھوڑی دیر مراقبہ کرتے لیکن جب بدن میں تھکاوت اور سستی محسوس ہوتی تو دوبارہ وضو کرکے دو رکعت نفل نماز ادا کرکے پھر سے مراقبے میں مشغول ہوجاتے۔ غرض رات کا اکثر وبیشتر حصہ اسی طرح گزرتا اور صبح ہوتے ہی تھوڑی دیر آرام کرلیتے۔ آپ شروع سے قرأت خلف امام پر عمل پیرا تھے اس وجہ سے کہ اس سلسلے میں صحیح حدیث میں کثرت سے روایات حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ ایک زمانے تک آپ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے رہے۔ ایک روز امام ابوحنیفہ کو اپنے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک طرف کھڑے ہوئے اپنی تعریف میں نہایت عمدہ قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ جس مضمون کا یہ حاصل تھا کہ میرے راستے پر ہزاروں اولیاء کبار گزرے ہیں۔ اسی دن سے آپ نے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنی چھوڑ دی۔ آپ شریعت علمائے شریعت کے بے حد احترام کرتے تھے۔ سنت کی اتباع میں آپ ہمیشہ فعال رہتے اور آخری عمر تک اسی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔

شیخ تاج الدین جو خواجہ کے نہایت جلیل القدر اور معزز خلیفہ ہیں وہ بیان کرتے ہیں: "ایک روز میں صف جماعت میں خواجہ کے ہم پہلو تھا اثناء نماز میں آپ پر گریہ وزاری واضحلال کے آثار محسوس ہوئے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو اسی طرح حیران وپریشان حجرے میں جلوہ آراء ہوئے۔ میں بھی دل کڑا کرکے آپ کے عقب میں روانہ ہوا اور حجرے میں پہنچ کر دیکھا تو آپ اسی طرح آہ وبکا میں مصروف ہیں اور حزن واندوہ آپ پر غالب ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے خلاف ادب گستاخانہ عرض کیا کہ حضور اس بے اختیار رونے اور اندوہ اشفتگی کا سبب کیا ہے؟ فرمایا: تاج تو اس کو دریافت نہ کر اور ہم کو اسی درد واندوہ میں چھوڑ دے۔ چونکہ خواجہ کی بے انتہا عنایتوں نے مجھے بہت کچھ دلیر کردیا تھا میں نے باصرار دریافت کیا۔ فرمایا عین نماز میں جسے مومن کی معراج کہتے ہیں میری روح نے مطلب وراء الوراء کی طلب میں عروج کیا اور اس کی جستجو میں کوشش کی۔ مگر جب مقصد پر کامیابی نہیں ہوئی تو حیران وگریان اپنے تئیں قفس قالب میں لاڈالا۔ اس کا یہ گریہ یہ اندوہ اسی حسرت کی وجہ سے تھا"۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ کا گزر ایک گاؤں سے ہوا جس کے باشندے غیر مسلم تھے۔ گاؤں کے لوگ کھیتوں پر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کررہے تھے۔ جیسے ہی ان لوگوں کی نظر آپ کے چہرے انور پر پڑی تو دیکھتے ہی ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اس کو دیکھنے سے ہمیں خدا یاد آتا ہے۔ ایک معمر شخص بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں خواجہ باقی باللہ کی مسجد میں نماز پڑھنے گیا تو دیکھا جماعت کھڑی ہے اور خواجہ بھی اس میں شامل ہے۔ پہلی صف بالکل بھری ہوئی تھی اور اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی شخص کھڑا ہوسکتا۔ جب میں نے غور کیا تو دیکھا کہ خواجہ کے پہلو میں تھوڑی سی جگہ ہے جسے درویشوں نے خواجہ کے ادب واحترام میں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے خواجہ سے کوئی عقیدت نہ تھی تو رعایت ادب میری راہ میں رکاوٹ نہ ثابت ہوئی اور میں ان کے پہلو میں کھڑا ہوگیا۔ کچھ ہی دیر بعد خواجہ

کی عظمت و شکوہ نے میرے دل پر حملہ کیا۔ میں نے اپنے جسم کو سکوڑا اور آپ سے الگ ہونے کی کوشش کی لیکن آپ کے رعب کا اثر کم نہیں ہوا اور میں نے اپنے آپ کو دوران نماز میں بے اختیارانہ پیچھے ہٹایا اور ہٹتے ہوئے یہاں تک پہنچا کہ محسوس ہوا کہ ایک قدم پیچھے ہٹا چبوترے سے نیچے گر پڑتا۔ اس کے بعد سے آپ خواجہ کی خدمت میں دن ورات بسر کرنے لگے۔ کچھ ہی دن گزرنے کے بعد بزرگ اپنی خاص توجہ سے حقیقی مخلصوں کے سلسلے میں داخل ہو گیے۔

19.3 حضرت خواجہ کے ملفوظات

خواجہ باقی باللہ کا تحریری سرمایہ متعدد رسائل، مکاتیب اور منظومات کی شکل میں بہت زیادہ ہیں۔ یہاں صرف آپ کے قلمی تبرکات کو نقل کیا جارہا ہے۔

فرمایا: اگر کوئی سالک مقام معصیت میں پھنسا ہوا ہے یا دنیا کی طرف راغب ہے تو اس کا سبب ان اسباب میں سے کوئی ایک ضرور ہو گا:

1. وہ ضرورت کے مطابق معاش پر اکتفاء نہ کرتا ہو گا
2. یا عوام سے اختلاط رکھتا ہو گا
3. یا اس کے اوقات ذکر حق سبحانہ سے معمور نہیں ہیں
4. یا حق تعالیٰ سے غیر حق تعالیٰ کا طالب ہو گا
5. یا نفس سے مجاہدہ نہ کرتا ہو گا
6. یا اپنی انا پر اور اپنے احوال اور اپنی قوت پر نظر رکھتا ہو گا
7. یا احکام ازلیہ پر سر تسلیم خم نہ کیا ہو گا

فرمایا: توکل یہ نہیں ہے کہ ترک اسباب کرے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائے۔ یہ تو بے ادبی ہے۔ توکل تو یہ ہے کہ تدبیر اختیار کرے لیکن تدبیر پر بھروسہ نہ کرے، سبب کو مثل ایک دروازہ کے جانے جو اللہ تعالیٰ نے مسبب تک پہنچنے کے لیے بنایا ہے۔

فرمایا: توبہ گناہ سے باز آنے کو کہتے ہیں۔ خلق سے قلبی جدائی میں توبہ کا کمال ہے جس کی وجہ سے خدا سے ملنا لازمی ہے۔

فرمایا: زہد یہ ہے کہ انسان نفس کی رغبت کے کاموں سے رک جائے چونکہ رغبت صرف متاع دنیا کے ساتھ ہی وابستہ نہیں ہے اس لیے کمال زہد نامرادی میں ہے کیوں کہ یہ حالت مراد حقیقی سے ملی ہوئی ہے۔

فرمایا: فضول چیزوں سے کنارہ کش ہو جانے، صرف ضروریات زندگی پر اکتفا کرنے، کھانے پینے اور رہنے کی چیزوں سے اسراف سے بچنے کو قناعت کہتے ہیں۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر اکتفا کریں اور اس کی خالص محبت سے آرام پائیں۔

فرمایا: گوشہ نشینی مخلوق کے میل جول سے کنارہ کشی کو کہتے ہیں اس کا کمال یہ ہے کہ خلق کو دیکھنے سے چھٹکارا ہو جائے۔

فرمایا: خدا تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز کی یاد سے دل کے خالی ہو جانے اور ماسوا کو بھول جانے کو ذکر کہتے ہیں۔ اور ذکر کا کمال یہ ہے کہ اپنی یاد بھی باقی نہ رہے۔

فرمایا: نفس کی لذتوں کو ترک کرنے اور اپنی پیاری اور محبوب اشیاء سے باز رہنے کو صبر کہتے ہیں۔

فرمایا: اپنے فعل و قدرت اور اپنے اوصاف و احوال سے جدا ہو کر فیضان الٰہی کے منتظر رہنے اور حق جل ذکرہ کے دریائے محبت میں ڈوب جانے کو مراقبہ کہتے ہیں۔

فرمایا: معرفت کے بہت سارے درجات ہیں اگر راہ طریقت پر چلنے والا حقائق سے حصہ وافر رکھتا ہے تو ٹھیک ورنہ اصل کار شریعت پر قائم رہنا ہے۔

فرمایا: باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے والوں کو کشف مطلقاً درکار نہیں کیونکہ کشف دو قسم کا ہے: ایک دنیوی جو بالکل ہی غیر ضروری ہے، دوسرا اخروی وہ کتاب و سنت میں واضح طور پر خود موجود ہے عمل کے لیے وہی کافی ہے۔ کوئی کشف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

فرمایا: مشائخ کو تربیت و ارشاد پر آمادہ کرنے والی تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ہوتی ہے (1) الہام حق سبحانہ و تعالیٰ (2) حکم مرشد (3) شفقت بر خلق۔ جب مشائخ مخلوق کو گمراہی پر ڈٹا دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ گمراہی عذاب الٰہی میں گرفتاری کا سبب بن سکتی ہے تو عذاب کو دفع کرنے کی فکر میں وعظ و نصیحت اور تعلیم و تعلم کے ذریعہ شریعت کی پابندی کی ترغیب دیتے ہیں۔

فرمایا: اعتقاد درست، رعایت احکام شریعت، اخلاص اور دوام توجہ بجناب حق سبحانہ عظیم ترین نعمت ہے۔ اس نعمت کے برابر کوئی ذوق و وجدان نہیں۔

اہل اللہ کے منکرین کی تردید کرتے ہوئے ایک روز فرمایا: اولیاء کبائر سے محفوظ تو ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی کبیرہ گناہ ان سے ناگاہ سرزد ہو جائے تو ان کے تمام اقوال کو باطل قرار دینا جہالت ہے۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ بحیثیت مجموعی ان کا عمل کیا رہا ہے۔ اگر بوجہ بشریت کوئی بات ان سے غیر شرعی صادر ہو گئی ہو تو ان کو اس میں معذور قرار دینا چاہیے۔

19.3.1 تصرف خواجہ باقی باللہ

خواجہ باقی باللہ کی کرامتوں کے قصے بہت مشہور ہیں۔ آپ تین چار سال سے زیادہ ہدایت اور ارشاد میں مصروف نہیں ہوئے مگر اس قلیل وقفے میں آپ نے ایسا تصرف پایا کہ وقت کے بیشتر مشائخ حضرت کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ سے تلقین پائے۔ آپ اتنے زیادہ مشہور ہو گیے کہ جہاں کوئی طالب خدا تھا وہ آپ کی خدمت میں چلا آیا۔ اس قلیل وقفے میں ہندوستان سمرقند کے مثل ہو گیا اور طریقہ نقشبندیہ جو ہندوستان میں ناپید تھا مکمل طور پر شہرت حاصل کر لی اور پھیل گیا۔ ذیل میں آپ کی کچھ کرامات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

کرامت: ایک روز ایک درویش صاحب حال و کشف نے حضرت خواجہ قدس سرہ سے عرض کیا کہ میں آج کل اپنے کام میں

بندش اور اپنے باطن میں ظلمت دیکھتا ہوں معلوم نہیں کہ کس گناہ کے سبب سے مجھ سے مواخذہ فرمایا گیا ہے۔ حضرت خواجہ قدس سرہ نے اس بارے میں توجہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ لقمہ طعام میں احتیاط ترک ہو گئی ہے اس نے عرض کیا کہ لقمہ وہی ہے جو ہمیشہ سے تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ بخوبی تلاش اور جستجو کرو۔ اس کے سوا اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔ یقیناً اس کے کسی جزو میں فتور واقع ہوا ہے۔ جب اچھی طرح جستجو کی گئی تو معلوم ہوا کہ کھانا پکانے میں جو لکڑی دیگ کے نیچے جلائی جاتی ہے۔ اس میں ہی بے احتیاطی ہو گئی تھی۔

19.3.2 بیماری اور وفات

خواجہؒ صاحب کی عمر جب چالیس کے قریب پہنچی۔ حضرت خواجہ نے اس عمر کو پہنچتے ہی اس رنج سے بھری ہوئی دنیا سے جانے کا خیال دل میں جمالیا۔ اس دوران اگر کسی کی موت کے بارے میں سنتے تو ایک سرد آہ بھر کر فرماتے کہ اچھا ہوا اس نے اس دنیا سے خلاصی پائی۔ منشا یہ تھی کہ وہ اسی ہستی موہوم کے لباس سے بے نیاز ہو اور اس جہان کی زندگانی خیال سے آزاد ہوا۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ آپ اپنی عادت کے مطابق اپنے کشف کو خواب سے تعبیر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ جلد ہی سلسلہٴ نقشبندیہ کے کسی بزرگ کی موت واقع ہونے والی ہے۔ اس واقعے کے بعد یہ خیال آیا کہ دہلی شہر کے اطراف میں کوئی جگہ پسند کر لی جائے اور لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ بند کر دیا جائے اور مرنے کے بعد وہیں تجہیز و تکفین عمل میں آئے۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنے کچھ مخلص دوستوں سے استخارہ کرنے کو فرمایا لیکن جب اس ارادے کی تکمیل کے لیے اجازت ظاہر نہیں ہوئی تو آپ نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔

ایک دن آپ فرماتے ہیں کہ مجھ سے کہا گیا کہ جس مقصد کے لیے تمہیں بھیجا گیا ہے وہ مقصد پورا ہو گیا ہے اس لیے اب سفر کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ جب جمادی الثانی 1012ھ کے وسط میں مرض کا غلبہ بڑھ گیا۔ بیماری کے دوران آپ نے فرمایا کہ حضرت خواجہ احرار (و۔895ھ) کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ فرمارہے ہیں۔ ”پیراہن پہن لو“ اس خواب کا ذکر کرنے کے بعد آپ نے مسکرایا اور فرمایا کہ اگر ہم زندہ رہ گیے تو ایسا ہی کریں گے جیسا کہ خواجہ احرارؒ نے فرمایا ورنہ کفن ہی ہمارا پیراہن ہو گا۔ اسی دوران ایک مخلص اس وقت سفر کرنا چاہ رہا تھا آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا چند روز کوئی کہیں نہ جاؤ کہ اب ہمارے بازار کا آخری دن ہے۔ اس بیماری میں ہونے کے باوجود کچھ خاص لوگوں نے علوم کی باریکیاں پوچھیں تو آپ نے بڑی تحقیق سے کھول کر بیان کیا۔ ایک رات بیماری اس قدر بڑھ گئی کہ نزع کی سی کیفیت ہو گئی بہت دیر یہی عالم رہا جب کچھ فائدہ ہوا تو فرمایا کہ اگر مرنا ایسا ہی ہوتا ہے تو یہ ایک ایسی نعمت ہے کہ اس نعمت سے باہر نکلنا اچھا نہیں۔ بالآخر شنبہ کے دن 25/جمادی الثانی 1012ھ/1603ء کو روح پرواز کر گئی۔ کل مدت حیات کم و بیش 40 برس کی تھی۔ آخری وقت میں آپ اپنے دوستوں کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسا کہ کوئی شخص اپنے دوستوں کو الوداع کہتے ہوئے دیکھتا ہے۔ خدام یا اصحاب آپ کی نظروں کے اشارے دیکھ کر سمجھ گیے اور رونے لگے تو آپ مسکرانے لگتے اور تعجب فرماتے گویا یہ واضح کرنا چاہتے ہوں تسلیم و رضا کے دائرے سے نکل کر رونا دھونا کرتے ہو۔ اسی درمیان ایک صوفی کی زبان سے بے اختیارانہ یہ الفاظ نکلا۔ ”یا الٰہ العالمین“ تو آپ نے جھٹ سے اپنا منہ اس کی طرف کر لیا۔ اس کے بعد آپ کی آنکھ میں آنسو آگیا اور اسی دن کا ایک پہر باقی تھا کہ آپ نے جہر سے اللہ کا ذکر کرنا شروع کر دیا اور اسی طرح اللہ اللہ کرتے کرتے آپ کی روح پرواز کر گئی۔

آپ کی دو شادیاں ہوئیں آپ کے دو لڑکے ہوئے ایک خواجہ عبید اللہ اور دوسرے خواجہ عبد اللہ ہیں۔ دونوں بیویوں کو ایک ایک اولاد ہوئیں۔ دونوں صاحبزادوں کی ذمہ داری آپ نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو دی تھی اور فرمایا کہ ان دونوں بچوں پر توجہ فرمائیں اور دعا بھی فرمائیں۔

19.4 خواجہ باقی باللہ کے خلفاء

خواجہ باقی باللہ کو طریقہ نقشبندیہ سے جڑنے کے بعد ہندوستان میں چار پانچ سال سے زیادہ رہنے کا وقفہ نہیں ملا لیکن اس تھوڑے وقفے میں آپ نے نقشبندیہ کی بنیاد ہندوستان میں مستحکم کر دی تھی اور شیخ احمد سرہندی جیسا مرید ملنے کی وجہ سے اس سلسلے کو اور استحکام ملا۔ آپ کے خلفاء کی ایک طویل فہرست ہے لیکن آپ کے خلفاء میں جن چار اشخاص کو شہرت دوام حاصل ہوئی ان کا ذکر کیا جارہا ہے۔ 1۔ شیخ احمد سرہندی معروف مجدد الف ثانی 2۔ شیخ تاج الدین سنبھلی 3۔ خواجہ حسام الدین 4۔ شیخ خواجہ الہٰ داد وغیرہ۔

19.4.1 شیخ تاج الدین

شیخ تاج الدین (و۔1642ء) کا شمار خواجہ باقی باللہ کے جلیل القدر اصحاب میں ہوتا ہے۔ خواجہ کے آستانے کا شرف حاصل کرنے سے پہلے آپ الہ بخش کی خدمت میں تھے۔ جو آپ پر بہت مہربان اور نظر کرم فرماتے تھے۔ خواجہ باقی باللہ ایام طلب کی شروعات میں مختلف مشائخ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب شیخ اللہ بخش کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ شیخ تاج نے خواجہ صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ آپ شیخ الہٰ بخش کی ارادت حاصل کر لیں لیکن خواجہ صاحب کو استخارہ میں اس کی اجازت نہیں ملی تو انہوں نے دوسری طرف رخ کر لیا لیکن شیخ الہٰ بخش کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ شیخ تاج گرچہ اپنے مرشد کے خلیفہ اور نائب تھے لیکن خواجہ صاحب کی صحبت اور تربیت کی خواہش میں بہت آرزو کے ساتھ پہنچے۔ اس لیے خواجہ کو آپ کی تواضع وانکساری بہت اچھی لگی۔ خواجہ صاحب نے آپ کو نظر عنایت وبرکات آپ کے شامل حال فرما کر اپنی خلوت محفل کا خاص جلیس اور انیس بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ صاحب کی صحبت میں رہنے کا شرف سب سے زیادہ آپ کو حاصل تھا۔ خواجہ صاحب جب کبھی مغلوب الحال ہوتے تو آپ مختلف حکایتوں، لطیفوں کو سنا کر اس دنیا کے شعور میں لے آتے تھے۔ خواجہ باقی باللہ نے آپ کو اکابر نقشبندیہ کی نسبتوں سے مستفیض فرما کر طریقہ وتعلیم کی اجازت دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ سے سب سے پہلے خلافت مجاز آپ ہی نے حاصل کی تھی۔ خواجہ صاحب نے آپ کو خلافت دے کر سنبھل کی جانب رخصت کیا۔ آپ کا انتقال ننانوے (99) برس کی عمر میں مکہ مکرمہ میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

19.4.2 خواجہ حسام الدین

ان کا شمار بھی خواجہ کے جلیل القدر اور اصحاب میں شمار ہوتا ہے۔ آپ قاضی نظام الدین احمد کے صاحبزادے تھے۔ قاضی صاحب کا شمار ملک کے بڑے امراء میں ہوتا تھا۔ خواجہ حسام الدین بھی کچھ عرصے امارت وجاہ کی قید میں گرفتار رہے لیکن ان سب کے باوجود آپ کو اولیائے کرام سے بہت زیادہ عقیدت تھی جس کی وجہ سے آپ فقراء کی صحبت اور خدمت کی طرف مائل ہوئے اور گوشہ نشینی

اختیار کرلی۔ جب آپ خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو صحبت میں رہنے کے بعد گوشہ نشینی کا رجحان اور بڑھ گیا۔ آخر آپ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور خواجہ کا ماوراء النہر سے واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ خواجہ صاحب جب تشریف لائے تو آپ ان کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور نقشبندیہ کے ذکر و مراقبہ کی تعلیم حاصل کی جس نے آپ کو دنیا سے بے نیاز کردیا۔ غرض آپ نے کئی سال تک بہت خلوص و انکساری سے آپ کی خدمت کی اور حضرت خواجہ سے اجازت تعلیم حاصل کی لیکن تفرید و آزادگی کے غلبے کی وجہ سے اس امر پر قائم نہ رہ سکے اور حضرت سے معذرت کرلی اور فرمایا اس معاملے میں مجھے معذور سمجھیں۔ خواجہؒ نے آپ کو ذمہ داری سے سبکدوش کردیا اور سرد آہ بھری پھر فرمایا: "تم نے اچھا کیا اور خود کو خلاصی دے دی"۔ خواجہ کی وفات کے وقت بڑے اصحاب میں سوائے آپ کے کوئی نہ تھا۔ اس وقت آپ نے زیادہ تیمارداری کی اور بہت زیادہ فیض حاصل کیا۔ تجہیز و تکفین کی خدمات بھی آپ نے انجام دی۔ خواجہ حسام الدین کے معمول کے مطابق زبدۃ المقامات میں مولانا کشمی فرماتے ہیں:

> خواجہ حسام الدین کا دستور العمل یہ ہے کہ نماز فجر مسجد فیروز آباد میں ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد تھوڑی دیر مراقبہ کرتے ہیں اور اشراق کی نماز پڑھ کر اپنے پیر بزرگوار کے مزار فائض الانوار کی طرف روانہ ہوتے ہیں جو وہاں سے قریب دو میل کے فاصلے پر شہر سے باہر ہے۔ وہاں دن بھر تلاوت، عبادت اور مراقبہ کرتے ہیں اور ہر روز پندرہ پارے کی تلاوت قرآن مجید کرتے ہیں۔ مشکوۃ المصابیح کے ترجمے سے چند حدیثیں مطالعہ کرتے ہیں اور وہیں عصر کی نماز ادا کرکے اپنے عیال و اطفال کے کاموں کے لیے شہر میں اپنے گھر واپس آتے ہیں۔ اس تنہائی پسندی اور گوشہ نشینی کے باوجود اگر آپ کے گھر کوئی مہمان آجاتا تو آپ خبر ہونے پر اپنے گھر آجاتے اور اپنے معمولات کم کرکے مہمان کی دل جوئی کرتے اور اس سے اچھی طرح پیش آتے۔

19.4.3 شیخ الہ داد

آپ کا شمار بھی خواجہ صاحب کے خاص احباب میں شمار ہوتا ہے۔ خواجہ باقی باللہ جب لاہور سے ماوراء النہر جارہے تھے تو آپ خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہیں پر آپ نے عنایت خاص حاصل کی اور طریقہ ذکر و مراقبہ حضرت سے سیکھا۔ لیکن ماوراء النہر کے سفر کے دوران آپ کو خواجہ صاحب کی معیت نہ حاصل ہو سکی لیکن خواجہ باقی باللہ نے اپنے ایک مخلصین کی جماعت ان کے پاس چھوڑ رکھی تھی۔ خواجہ باقی باللہ جب سفر سے واپس ہوئے تو شیخ الہٰ داد نے بڑے خلوص اور عجز و انکسار کے ساتھ خدمت گزاری کی۔ خانقاہ کے منتظم ہونے کی وجہ سے مسافروں کے کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست کرنا آپ ہی کے ذمہ تھا۔ ان مصروفیات کے باوجود بھی آپ ذکر الٰہی سے غافل نہ ہوتے بلکہ پیر کی خاص توجہ کے باعث آپ اعلیٰ درجے پر پہنچے۔ اگر کوئی شخص خواجہ حسام الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر سلسلے کے ذکر و مراقبہ کی گزارش کرتا تو آپ اسے شیخ الہٰ داد کی خدمت میں روانہ کردیتے۔

19.4.4 شیخ احمد سرہندی

شیخ احمد سرہندی مغل بادشاہ اکبر کے دور میں 1564 سرہند میں ولادت ہوئی۔ نام احمد تھا، لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات۔

والد محترم عبد الاحد جو بڑے عالم اور بزرگ تھے ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی۔ آپ بہت صلاحیت مند تھے۔ شیخ احمد سرہندی کے خیالات وفکر کو پروان چڑھانے میں ان کے والد محترم کی صحبت اور ابتدائی ماحول تھا لیکن ان کی صلاحیت کو جلا تب ملی جب وہ خواجہ باقی باللہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے آپ نے کافی عرصہ اپنے والد محترم کے ساتھ گزارا اور ان کی خدمت و درس میں ساتھ رہتے تھے۔ غرض شیخ احمد سرہندی کو سلسلہ چشتیہ کو فروغ دینے کی ذمہ داری بھی اپنے والد سے ملی ہوئی تھی اور چشتیہ اور قادریہ سلسلے میں ان کے مرید بھی تھے۔ جب آپ دہلی پہنچے تو آپ کے ایک دوست مولانا حسن کشمیری جو خواجہ باقی باللہ کے قریبی تھے انہوں نے فرمایا سلسلہ نقشبندیہ کے ایک بزرگ اس علاقے میں تشریف فرماہیں جن سے ملنے کے بعد طلب کرنے والے اس کی ایک نظر سے پالیتے ہیں۔ خواجہ باقی باللہ سے جب آپ کی ملاقات ہوئی تو خواجہ نے آپ پر نظر کرم فرمائی اور آنے کا مقصد پوچھا اور شیخ احمد نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ خواجہ باقی باللہ کی بلند نظر نے آپ کو پہچان لیا تھا اور آپ نے اپنی خانقاہ میں رہنے کی گزارش کی اور کچھ ہی دنوں بعد خواجہ کے تصرف اور کشش کے آثار ظاہر ہوئے اور خواجہ کے اخذ کرنے کا طریقہ شیخ احمد سرہندی پر غالب آگیا تو آپ نے بیعت کی درخواست کی جسے خواجہ نے فوراً قبول کرلیا۔ خواجہ نے خلوت میں لے جاکر ذکر قلبی کی تلقین کی اور دل کے ذکر کی طرف رہنمائی کی۔ خواجہ کی خدمت میں رہتے ہوئے دن بہ دن بلندی پر پہنچتے گیے۔ دو تین مہینے میں ہی خواجہ کی تربیت اور برکت سے آپ رفیع المرتبت مقام پر پہنچ گیے۔ خواجہ باقی باللہ نے آپ کو اپنے وطن سرہند میں اجازت کاملہ کا خلعت پہنا کر رخصت کیا اور ساتھ ہی ایک جماعت کو آپ کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ آپ کی خدمت کر سکیں۔

شیخ احمد سرہندی جب آخری بار خواجہ باقی باللہ سے ملاقات کی غرض سے نکلے تو خواجہ نے بہت دور نکل کر پیادہ پا آپ کا استقبال کیا اور بڑی بشارتیں دیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے حلقے کا صدر بنایا اور مریدوں سے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ ہو۔ جب آپ جانے لگے تو خواجہ نے فرمایا: "اب ضعف بہت معلوم ہوتا ہے، امید حیات بہت کم ہے، اور اپنے دونوں صاحبزادوں خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبد اللہ جو اس وقت شیر خوار تھے اپنے سامنے آپ سے توجہ دلائی اور فرمایا کی ان کی ماؤں کو بھی غائبانہ توجہ دیجیے، چناں چہ آپ نے توجہ دی اور توجہ کا اثر بھی اسی وقت ظاہر ہوا۔

آپ کو سلسلہ نقشبندیہ کی سربراہی کا شرف حاصل رہا اور آخری عمر تک اپنے آپ کو دعوت وارشاد کے لیے وقف کر دیا۔ سرہند میں 1034ھ / 1624ء میں 62 سال کی عمر میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گیے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مضامین تاریخ اور مشائخ کے تذکروں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بہت سے شیخ اور بزرگ سرزمین ہندوستان میں جلوہ افروز ہوئے اور ان لوگوں نے پوری کوشش کی کہ اس سلسلے کو رواج دیا جائے جو مسافرانہ حالت میں ہے۔ لیکن خواجہ باقی باللہ کے مختصر دور میں جو عروج نقشبندیہ کو حاصل ہوا وہ نقشبندیہ اکابروں کی برسوں کی کوشش سے بہت زیادہ تھی۔ آپ نے ہندوستان کے ہر گوشے میں طریقہ نقشبندیہ کی فضیلت کو پہنچایا۔

19.5 کلیدی الفاظ

خلوت نشینی	:	گوشہ گیری، تنہائی پسندی
جلوہ افروز	:	تشریف لانا، ظاہر ہونا
ازبر	:	زبانی یاد رکھنا
مراقبہ	:	دھیان، تصور (مراقبہ سے عبادت میں توجہ، خشوع و خضوع اور یکسوئی پیدا کی جاتی ہے)
مجاورانہ	:	خادم درگاہ، عبادت گاہوں اور متبرک مقامات پر خدمت کرنے والا
پیچیدہ	:	دقت طلب، مشکل، غیر واضح

19.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- خلاصہ کلام یہ ہے کہ مضامین تاریخ اور مشائخ کے تذکروں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بہت سے شیخ اور بزرگ سرزمین ہندوستان میں جلوہ افروز ہوئے اور ان لوگوں نے پوری کوشش کی کہ اس سلسلے کو رواج دیا جائے جو مسافرانہ حالت میں ہے۔ لیکن خواجہ باقی باللہ کے مختصر دور میں جو عروج نقشبندیہ کو حاصل ہوا وہ نقشبندیہ اکابروں کی برسوں کی کوشش سے بہت زیادہ تھی۔
- حضرت خواجہ باقی باللہ 5 ذی الحجہ 971ھ / 15 جولائی 1564 کو کابل میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام محمد رضی الدین تھا لیکن شہرت زیادہ تر باقی باللہ یا محمد باقی اللہ یا عبد الباقی کے نام سے ملی۔ آپ کے والد قاضی عبد السلام تھے۔
- خواجہ باقی باللہ نے جب سرزمین ہندوستان میں قدم رکھا تو مکمل ایک سال تک لاہور میں رہے اور یہاں پر آپ نے علما و فضلا کو اتنا متاثر کیا کہ وہ آپ کی محبت کے دلدادہ ہو گئے۔ اس کے بعد طریقہ عالیہ نقشبندیہ کے بزرگوں کی بشارت کے موافق دہلی تشریف لائے۔
- خواجہ باقی باللہ بہت سخی و فیاض تھے اور فیاضی کا کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ فیاضی کی نصیحت کیا کرتے تھے اور ہر موقع پر سخاوت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرکے عملاً ایسا کرتے تھے۔
- خواجہ باقی باللہ کی کرامتوں میں سے بہت بڑی کرامت یہ ہے کہ آپ تین چار سال سے زیادہ ہدایت اور ارشاد میں مصروف نہیں ہوئے مگر اس قلیل وقفے میں آپ نے ایسا تصرف پایا کہ وقت کے بیشتر مشائخ حضرت کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ سے تلقین پائے۔
- آپ کے خلفاء کی ایک طویل فہرست ہے لیکن آپ کے خلفاء میں جن چار شخص کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ 1۔ شیخ احمد سرہندی

معروف مجدد الف ثانی 2۔ شیخ تاج الدین سنبھلی 3۔ خواجہ حسام الدین 4- شیخ الہٰ داد وغیرہ۔

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

19.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. حضرت خواجہ باقی باللہ کہاں پیدا ہوئے؟

(a). کابل (b). لاہور (c). دہلی (d). آگرہ

2. خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں کہاں قدم رکھا؟

(a). لاہور (b). آگرہ (c). بنارس (d). اجمیر

3. خواجہ عبداللہ رشتے میں خواجہ باقی باللہ کے کیا تھے؟

(a). بیٹے (b). بھتیجے (c). چچا (d). بھائی

4. شیخ احمد سرہندی کا خواجہ باقی باللہ سے رشتہ بتائیں۔

(a). بھائی (b). خلیفہ (c). استاذ (d). والد

5. خواجہ نظام الدین بدخشی کے بیٹے کا نام بتائیں۔

(a). خواجہ حسام الدین (b). احمد سرہندی (c). شیخ تاج الدین (d). نظام الدین

6. خواجہ حسام الدین کی وفات کب ہوئی؟

(a). 1143ھ (b). 1043ھ (c). 1435ھ (d). 843ھ

7. خواجہ باقی باللہ کی وفات کب ہوئی؟

(a). 912ھ (b). 1012ھ (c). 1112ھ (d). 1412ھ

8. شیخ احمد سرہندی کی پیدائش کب ہوئی؟

(a). 1564ء (b). 1645ء (c). 1463ء (d). 1857ء

9. شیخ احمد سرہندی کی وفات کتنے سال کی عمر ہوئی؟

(a). 67سال (b). 62سال (c). 99سال (d). 55سال

10. شیخ الہٰ داد کن کے خلیفہ تھے؟

(a). خواجہ نظام الدین (b). خواجہ باقی باللہ (c). خواجہ معین الدین (d). تمام غلط

19.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. خواجہ باقی باللہ کی ہندوستان آمد کا واقعہ بیان کیجیے۔
2. خواجہ باقی باللہ کے طرز عمل پر گفتگو کیجیے۔
3. شیخ حسام الدین کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
4. خواجہ باقی باللہ کی بیماری اور وفات کے بارے میں لکھیے۔
5. شیخ تاج الدین پر مختصراً نوٹ لکھیے۔

19.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. خواجہ باقی باللہ کے ملفوظات پر ایک طویل نوٹ لکھیے۔
2. خواجہ باقی باللہ کی حالات زندگی پر تفصیلی بحث کیجیے۔
3. خواجہ باقی کے خلفاء کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

19.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. باقیات باقی	:	ڈاکٹر غلام مصطفی خاں
2. حضرت القدس	:	علامہ بدرالدین سرہندی
3. کلیات باقی باللہ	:	مولانا ابوالحسن زید فاروقی
4. تذکرہ خواجہ باقی باللہ	:	مولانا نسیم احمد امروہی
5. زبدۃ المقامات	:	خواجہ محمد ہاشم کشمی

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 20: علم کلام کا تعارف اور آغاز

اکائی کے اجزا:

20.0 تمہید
20.1 مقاصد
20.2 علم کلام ایک تعارف
20.3 علم کلام کی تعریف
20.4 علم کلام کی وجہ تسمیہ
20.5 علم کلام: آغاز وارتقاء
20.6 اختلاف کا معنی ومفہوم
20.6.1 اختلاف کی نوعیت
20.7 اسلام میں فکری واعتقادی اختلاف
20.7.1 اختلاف کے اسباب
20.7.2 عمومی اسباب
20.7.3 اسلام میں اختلاف عقائد کے اسباب
20.7.4 اسلام میں فرقہ بندی یا فرقوں کا آغاز
20.7.5 اعتقادی اختلاف کے بعض بنیادی اصول
20.8 اکتسابی نتائج
20.9 کلیدی الفاظ
20.10 نمونہ امتحانی سوالات
20.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
20.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

20.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

20.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

20.0 تمہید

بعض چیزیں انسان کو بہت زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ مذہب اور مذہبی عقائد کا تعلق بھی انہیں چیزوں سے ہے۔ جو چیز اس کو جتنی زیادہ عزیز ہوتی ہے اس کی حفاظت اور بقا پر وہ اتنی ہی زیادہ توجہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہب خاص طور پر مذہبی عقائد کے معاملے میں ہمیشہ سے بہت زیادہ حساس رہا ہے۔ خواہ اس کا تعلق دنیا کے کسی بھی خطے اور علاقے سے ہو۔ مذہب اور مذہبی عقائد کے سلسلے میں مسلمانوں کا معاملہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں کو ایک علیٰحدہ شناخت مذہب ہی عطا کرتا ہے، ان کی قومیت میں مذہب کا عنصر شامل ہوتا ہے اور سچی بات یہی ہے کہ مسلم قوم کی تعمیر میں علاقے، نسل، آبادی اور ملک سے زیادہ کلیدی رول مذہب کا ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے مذہب اور مذہبی عقائد کے تحفظ پر ہمیشہ خاص توجہ دی، اس کے لیے انہوں نے موقع پڑنے پر قوت کا استعمال بھی کیا اور جہاں تک ممکن ہوا عقل و دانش کو بھی کام میں لائے۔

اسلام وہ مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں دونوں کو بار بار عقل و خرد کے استعمال کی دعوت دیتا ہے۔ مذہب اسلام کی مقدس ترین کتاب قرآن مجید میں بڑی تعداد میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں مالک حقیقی نے انسان کو عقل استعمال کرنے، کائنات پر غور و فکر کرنے اور خود اپنے وجود پر غور و خوض کرنے کی بار بار دعوت دی ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور سے ہی اور اپنے دور عروج میں عقل کا جس طرح استعمال کیا، دنیا کی کم قوموں نے کیا ہوگا۔ یہ بھی سچ ہے کہ عرب کے سادہ مزاج سماج میں جہاں کہ اول اول حضرت محمدؐ نے اسلام کی تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کیں، عقلی موشگافیوں کا گزر کم تھا۔ اس لیے اسلام کے دور اول میں ہمیں ایسی مثالیں نہیں ملیں گی جن میں بال کی کھال نکالنے کی کوشش کی گئی ہو۔ البتہ اس سادہ مزاج عرب سماج کو بھی قرآن مجید میں بار بار غور و فکر کی دعوت دی گئی اور انہوں نے اپنی ذہنی سطح پر قرآن مجید کی اس دعوت کو قبول بھی کیا۔ عباسی دور میں جب کہ اسلام نہ صرف یہ کہ جزیرہ نمائے عرب سے کافی دور تک پھیل چکا تھا بلکہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی بن چکا تھا، اس کا سابقہ اس زمانے کی مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے ماننے والوں سے پڑا جو اس وقت کی متمدن دنیا کہلاتی تھی۔ چونکہ اسلام نے لوگوں کی فکر پر تالہ لگانے کی کوشش کبھی نہیں کی اور عباسی دور میں تو فکری آزادی کے نام پر لوگوں کو کچھ زیادہ ہی ڈھیل مل گئی تھی۔ لہٰذا اس زمانے میں اسلامی عقائد پر مختلف جہتوں سے ایسے تنقیدی حملے ہوئے اور اس طرح کی نکتہ چینیاں سامنے آئیں کہ ضعیف العقیدہ لوگوں کے اعتقاد کی چولیں ہل گئیں۔ بہر حال اسی فکری آزادی اور غور و تدبر پر ابھارے جانے کے نتیجے میں خود مسلمانوں نے بھی بہت جلد وہ تمام علوم حاصل کر لیے جن کی بنیاد پر اسلام اور اس کے عقائد کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ خاص طور پر فلسفہ کے میدان میں انہوں نے ایسی مہارت حاصل کی کہ جن لوگوں سے انہوں

نے یہ علم حاصل کیا تھا، انہیں کے خلاف اس علم کو استعمال کرنے کے اہل بن گئے۔ عقائد کے دفاع کے لیے مسلمانوں کی اس ساری تگ ودو کے نتیجے میں جو علم وجود میں آیا اسے دنیا آج 'علم کلام' کے نام سے جانتی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو علم کلام کی جیسی ضرورت عباسی دور میں تھی آج بھی ہے۔ کیوں کہ ہر زمانے میں مختلف جہتوں سے اسلامی عقائد وعبادات پر اسی طرح عقلی اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں جیسے کہ پہلے کے زمانے میں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ البتہ وقت اور حالات کے مطابق طرز بیان وادا میں فرق پہلے بھی آتا رہا ہے اور آئندہ بھی آتا رہے گا۔

20.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اسلامی عقلی علوم میں سے ایک علم کلام کے بارے میں آپ کو بنیادی اور ضروری معلومات فراہم کرنا ہے تاکہ طلبہ علم کلام کے تعارف کے ساتھ اس کی تاریخ اور ارتقاء سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ اسی طرح یہ بات بھی آپ کے ذہن نشین ہو جائے کہ وہ کون سے حالات تھے جن میں علم کلام وجود میں آیا، اس کا نام علم کلام کیوں پڑا اور وہ کون سے مخصوص مسائل ہیں جن پر علم کلام میں بحث کی جاتی ہے۔ اس طرح توقع کی جانی چاہئے کہ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ کے اندر علم کلام کے تعارف و تاریخ کے ساتھ علم کلام کے بنیادی مسائل سے بھی واقفیت پیدا ہو جائے گی۔

20.2 علم کلام ایک تعارف

علم کلام کو انگریزی زبان میں Scholastic Theology/ Scholasticism کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی عقائد پر عقلی یعنی علمی و منطقی انداز میں بحث و گفتگو کی جائے۔ علماء نے مذہب سے متعلق علم کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے:

1۔ الہام یا وحی　　2۔ علم کلام　　3۔ فلسفہ

الہام یا وحی

الہام کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے کسی انسان (رسول یا نبی) کو علم دیا جائے اور وہ اسے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔

علم کلام

علم کلام سے مراد مذہبی علم کا وہ شعبہ ہے جس میں مذہب کی الہامی تعلیمات (یعنی عقائد) کو عقل کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو مذہب پر یقین نہیں رکھتے یا مذہب کو مانتے اور تسلیم تو کرتے ہیں لیکن اس کے یا اس کے عقائد کے بارے میں مختلف قسم کے عقلی سوالات کرتے رہتے ہیں، ان کو ان کے ذہن و عقل کے مطابق عقلی دلائل (دلیلوں) کے ذریعے مطمئن کیا جائے۔

فلسفہ

علم کلام کی طرح فلسفے میں بھی عقلی اصطلاحوں اور دلیلوں سے بحث کی جاتی ہے اور مذہبی عقائد کو عقلی انداز میں لوگوں کو سمجھانے

کی کوشش کی جاتی ہے۔ البتہ فلسفہ اور علم کلام میں فرق یہ ہے کہ علم کلام میں الہامی علم (یعنی وحی کی تعلیمات) کو مقدس اور یقینی مانا جاتا ہے جب کہ فلسفے میں کسی بھی چیز کو اس طرح کا تقدس حاصل نہیں ہوتا۔ اور مذہبی عقائد کا ہر طرح کے تعصبات و تجربات سے اوپر اٹھ کر بالکل آزادانہ مطالعہ کیا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم کلام کے تحت جب ہم الہامی تعلیمات یا وحی وغیرہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والے عقائد کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان پر بحث کرتے ہیں تو جب بھی کہیں پر عقل اور وحی کے درمیان ٹکراؤ اور تصادم کی صورت پیدا ہوتی ہے تو اس صورت میں ایک متکلم کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ وحی کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متکلمین یا علمائے علم کلام کے نزدیک وحی انسان کے خالق و مالک حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ علم ہے اور اس حیثیت سے وحی حصول علم کا سب سے معتبر اور یقینی ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی فلسفے کے تحت مذہبی عقائد کا مطالعہ کرتا یا ان پر غور و فکر اور بحث کرتا ہے تو عقل اور مذہبی تعلیمات (وحی) میں تصادم اور ٹکراؤ کی صورت میں ایک فلسفی کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جو دلائل اس کی عقل میں آتے ہیں انہیں ترجیح دیتا ہے۔ کیوں کہ فلسفہ کے علماء کے خیال میں علم کا زیادہ معتبر اور یقینی ذریعہ انسانی عقل ہے۔ علم کلام اور فلسفے کو جب ہم اس طور پر دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ دونوں ہی علوم میں مذہبی عقائد و تعلیمات پر عقل کی روشنی میں غور و خوض اور بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ البتہ دونوں کا موضوع ایک ہونے کے باوجود علم کلام میں وحی کو اور فلسفے میں عقل کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علم فلسفہ کو مشرف بہ اسلام کرلینے کا نام علم کلام ہے۔

جس طرح علماء نے مذہبی علم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اس طرح مذہبی (اسلامی) تعلیمات کو بھی انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی: 1۔ عقائد 2۔ اخلاق 3۔ احکام (فقہ)

1۔ عقائد: عقائد سے مراد وہ مسائل اور معارف ہیں جن کا جاننا اور ان پر ایمان رکھنا واجب ہے۔ جیسے توحید، اللہ تعالیٰ کی صفات، نبوت اور اس طرح کے دوسرے مسائل۔

2۔ اخلاق: یعنی وہ آداب و اصول جو روحانی صفات، اور معنوی خصلتوں کے لحاظ سے انسان کو زندگی کے طور طریقے سکھاتے ہیں۔ جیسے عدالت، تقوی، شجاعت، حکمت، استقامت، وفا، صداقت اور امانت وغیرہ۔

3۔ احکام: یعنی انسان کے افعال و اعمال سے متعلق مسائل کہ کون سا کام کس طرح انجام دینا چاہیے۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ۔

جس علم میں عقائد بیان کیے جاتے ہیں اسے 'علم کلام' کہتے ہیں۔ جس علم میں اخلاقیات سے بحث کی جاتی ہے اسے 'علم اخلاق' کہتے ہیں اور احکام سے متعلق علم کو 'علم فقہ' کا نام دیا جاتا ہے۔

یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جب تک اسلام عرب علاقوں تک محدود رہا، اس کے مذہبی عقائد اور اعتقادات پر زیادہ بحث و مباحثہ نہیں شروع ہوا تھا اور نہ ہی ہر معاملے میں بال کی کھال نکالی جاتی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ عربوں کی ذہنی تشکیل عرب کے صحرائی ماحول میں ہوئی تھی اور اس ماحول کا اثر یہ تھا کہ ان کے اذہان بہت ہی سادہ اور فطری انداز میں سوچتے تھے۔ عرب زیادہ چوں چرا کرنے کے

بجائے عمل پر زیادہ زور دیتے تھے۔ عربوں کی یہ صورت حال عہد رسالت مآبؐ اور حضرات خلفائے راشدین کے دور تک برقرار رہی۔ بنوامیہ کے اقتدار کا ابتدائی زمانہ بھی ہمیں دقیق قسم کی فلسفیانہ بحثوں سے خالی نظر آتا ہے۔ گو کہ اس وقت تک عالم اسلام کی سرحدیں کافی وسعت اختیار کر چکی تھیں اور ایرانی، یونانی اور قبطی وغیرہ قوموں کے اثرات اسلام کے ماننے والوں میں سرایت کرنے لگے تھے۔ لیکن چونکہ عہد بنوامیہ میں عربیت کا غلبہ اور اثر قائم رہا اس لیے ان خیالات کو زیادہ بال و پر نکالنے کے مواقع ہاتھ نہیں آئے۔ البتہ اموی حکومت کے خاتمے کے بعد مسلم سماج کا مزاج بدلا' اور خاص طور پر ایرانیوں کا اثر و رسوخ نہ صرف حکومتی کاموں میں بلکہ سماجی امور میں بھی حد سے زیادہ بڑھا' تو ایرانی افکار و خیالات نے مسلمانوں کے مذہبی امور کو بھی متاثر کرنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ بنو عباس کے بیشتر حکمرانوں نے مذہبی معاملات میں آزادی کی روش اختیار کی۔ اس کی وجہ سے دوسری قوموں سے تعلق رکھنے والوں کو یہ موقع ملا کہ وہ اسلام کے مذہبی عقائد کو نشانہ بنائیں۔ اسی دوران ایک اہم کام یہ بھی ہوا کہ ایرانی، یونانی اور قبطی اقوام سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی معتدبہ تعداد مختلف وجوہ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی' اور چونکہ ان کے مزاج میں پہلے سے ہی اپنے مخصوص کلچر کے سبب مذہبی عقائد پر تنقید داخل تھی اس لیے انہوں نے یا ان کے زیر اثر آنے والے مسلمانوں نے اسلام کے مذہبی عقائد کے بارے میں نکتہ آفرینیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب عباسی دور میں اسلامی سماج پر عربوں کی گرفت کمزور ہوئی، دارالخلافہ عراق میں منتقل ہو گیا اور علم کی عمومی ترویج کی نتیجے میں بڑے پیمانے پر یونانی و دیگر زبانوں سے علوم و فنون عربی زبان میں منتقل ہوئے تو اس دوران وہ علوم بھی کثرت سے عربی زبان میں منتقل ہو گئے جن کا تعلق خالص دینی اور مذہبی عقائد کی بحثوں سے تھا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات، قضا و قدر، جزا و سزا، جبر و قدر اور ارادہ و اختیار کے مسائل وغیرہ۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ گو اسلامی علم کلام کی بنیادی چیزیں کتاب و سنت اور عہد صحابہ کرامؓ میں ملتی ہیں لیکن اس کا باقاعدہ آغاز عباسی دور میں ہوا۔

عباسی دور ہی وہ زمانہ ہے جب اسلامی دنیا کے بڑے بڑے مراکز عرب علاقوں سے ہٹ کر عجمی علاقوں سے قریب مثلاً عراق، یا غیر عرب علاقوں میں منتقل ہوئے۔ اسلام کی بڑے پیمانے پر وسعت اور غیر عرب اقوام میں اس کی مقبولیت کے سبب مسلمانوں کا اختلاط عجمی قوموں سے ہوا یا جب انہوں نے خود اسلام کو قبول کر لیا تو ان کی جانب سے اسلام اور اس کے بنیادی عقائد پر مختلف طرح کے سوالات اٹھائے جانے لگے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عباسی دور میں عام لوگوں کو کافی مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اسلامی عقائد پر ہونے والے ان حملوں کے بعد شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ عقل کی بنیاد پر اسلامی عقائد پر جو سوالات قائم کیے جاتے یا اٹھائے جاتے ہیں ان کا جواب بھی عقلی انداز میں ہی دیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کے اندر علماء اور دانش وروں کا ایک ایسا گروہ وجود میں آیا جس نے نہ صرف یہ کہ فلسفہ و منطق (جیسے عقلی علوم) کے رائج علوم حاصل کیے' بلکہ خود کو اس طرح آراستہ کیا کہ اسلامی عقائد اور احکامات کو منطقی اور عقلی اسلوب میں لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ بنو عباس کی علمی سرپرستی کی وجہ سے مسلمانوں میں اس رجحان کو بہت زیادہ فروغ ملا' اور مسلمانوں کے اندر فلسفے کی ایک نئی شکل پروان چڑھی' جس کے تحت وجود میں آنے والے لٹریچر کو آگے چل کر 'علم کلام' کا نام دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے اس میدان میں سبقت حاصل کی وہ بلاشبہ معتزلہ کا گروہ تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں متکلمین اسلام میں السابقون الاولون کا

درجہ حاصل ہے۔

اس موقعہ پر ایک بات جو اچھی طرح ذہن نشین رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ قدیم علم کلام یونانی فلسفیوں کی قیاسی منطق پر قائم تھا، یعنی یہ کہ ایک قیاسی مفروضے کو پہلے تسلیم کر لیا جاتا تھا اور پھر اس پر دلیل قائم کی جاتی تھی۔ اسی طرح قدیم زمانے میں بہت ساری باتوں کو مسلمہ حقائق کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ انہی فرضی مسلمات پر بات آگے بڑھتی تھی اور اسے قیاسی منطق کا نام دیا جاتا تھا۔ گو کہ اب اس طرح کی قیاسی منطق کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور موجودہ دور تجرباتی منطق کا ہے۔ اس لیے کئی بار بڑے ہی زور و شور کے ساتھ یہ بات کہی جاتی ہے کہ چونکہ موجودہ دور سائنسی تجربات کا ہے اس لیے جو بات براہ راست تجربے اور مشاہدے میں آئے اور ان کے ذریعے انسان کو اس کا علم حاصل ہو، حقیقی معنوں میں علم وہی ہے۔ اس بنیاد پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اب ایک جدید اور سائنٹفک علم کلام وجود میں لانے کی ضرورت ہے اور قیاسی منطق کے بجائے سائنٹفک منطق کو استعمال کیا جانا چاہیے۔ بلاشبہ جدید ترقیات نے انسانی علم میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے اور موجودہ دور کو explosion of knowledge کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ لیکن مذکورہ خیال پورے طور پر اس لیے صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا کہ آج کے سائنسی تجربات کے ذریعے حاصل ہونے والا علم بھی یقینی نہیں ہے اور روزانہ کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ سائنس خود اپنے تجربات کو، جو کسی وقت حتمی اور یقینی باور کیے جاتے تھے، جھٹلاتی رہتی ہے۔ اس لیے وقت کے ساتھ یہ تو کہا جائے گا کہ ایک ایسا علم کلام وجود میں آئے جو اس وقت کے حالات اور مذاق کے موافق اور مطابق ہو۔ نہ سلف کے بنیادی اصولوں سے رشتہ توڑ لیا جائے اور نہ ہی ایسا ہو کہ وہی لکیریں ہم بھی پیٹتے رہ جائیں بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک توازن قائم ہونا چاہیے اور وہ اس طرح کہ قدیم علم کلام کی کارآمد چیزیں لے کر انہیں جدید ضروریات اور تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا جائے۔ ہمارا جدید علم کلام جو وجود میں آیا ہے اس میں دو طرح کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

(1)۔ ایک تو یہ کہ بعض لوگوں نے متاخرین اشاعرہ کے فرسودہ اور دور از کار رفتہ مسائل اور دلائل تک ہی خود کو محدود رکھا ہے۔

(2)۔ دوسرے کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے جدید مغربی تحقیقات اور خیالات کو ہی معیار حق بنالیا ہے اور پھر ان کے مطابق قرآن و سنت کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ جدید متکلمین اسلام میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جنہوں نے قدیم و جدید کے درمیان توازن قائم رکھنے کی کوشش کی ہو اور خود بھی کسی قسم کا اجتہاد کیا ہو۔

20.3 علم کلام کی تعریف

ماہرین نے علم کلام کی بہت ساری تعریفیں کی ہیں، جن میں چند مشہور یہ ہیں:

1۔ علم کلام وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان کو یہ قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ دلیل و حجت قائم کر کے اور شکوک و شبہات کا ازالہ کر کے دینی عقائد کا اثبات کرے۔ اور اس علم کا موضوع اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہیں۔ (صاحب کشف الظنون)

2۔ علم کلام وہ علم ہے جس کے ذریعے عقلی دلائل سے ایمانی عقائد پر حجت قائم کی جاتی ہے۔ اور جو لوگ اعتقادات میں اہل سنت اسلاف سے روگردانی کر جاتے ہیں ان باطل نظریات رکھنے والوں کی تردید کی جاتی ہے اور ان ایمانی عقائد کا مرکزی نقطہ توحید ہے۔

3۔ علم کلام حقیقت میں جس چیز کا نام ہے وہ عقائد کا اثبات ہے اور علم کلام کی تاریخ میں یہی چیز جان سخن ہے۔(شاہ ولی اللہ)

4۔ علم کلام وہ علم ہے جو اسلام کے اصول دین کے بارے میں بحث سے گفتگو کرتا ہے۔یعنی یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ کون سی چیز اصول دین سے تعلق رکھتی ہے، اسے کس دلیل سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور اس کے سلسلے میں جو شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں، ان کا کیا جواب ہے؟

ان تعریفوں کا خلاصہ یہ نکلتا ہے:

الف: دینی عقائد (اصول دین) کو عقلی دلیلوں کی روشنی میں پیش کرنا

ب: دینی عقائد کے بارے میں پیدا ہونے والے شک وشبہ اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا

جس طرح علم حدیث کے عالم اور ماہر کو محدث، فقہ کے عالم وماہر کو فقیہ اور تفسیر کے عالم وماہر کو مفسر کہتے ہیں۔اسی طرح علم کلام کے جان کار اور اس میں مہارت رکھنے والے کو متکلم کہتے ہیں۔

20.4 علم کلام کی وجہ تسمیہ

علم کلام کا نام 'علم کلام' کیوں رکھا گیا؟ اس سلسلے میں اس علم کے ماہرین ومتکلمین کی رائیں مختلف ہیں۔

1۔ چونکہ عقائد کے سلسلے میں پیدا ہونے والا پہلا اختلاف کلام الٰہی کی نسبت سے پیدا ہوا۔اس لیے اس کا نام علم کلام پڑا

2۔ علم کلام کو اس نام سے یاد کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ اپنے حامل کی قوت بیان واستدلال میں اضافہ کرتا ہے

3۔ چونکہ اس علم کے ماہرین اپنی بات کا آغاز "الکلام فی کذا" سے کرتے ہیں۔لہٰذا اس کا نام یہی کلام رکھ دیا گیا

4۔ چونکہ علم کلام ان مباحث کے سلسلے میں بحث وگفتگو کرتا ہے جن کے بارے میں کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق سکوت یا خاموشی ہی بہتر ہے، اس لیے اسے علم کلام کا نام دیا گیا۔

5۔ چونکہ علم کلام علم فلسفہ کے مقابلے میں ایجاد ہوا، اس لیے علم فلسفہ کی ایک شاخ علم منطق کا جو نام تھا وہی نام اس علم کا بھی رکھا گیا۔کیونکہ کلام ومنطق دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

20.5 علم کلام: آغاز وارتقاء

علم کلام کا آغاز کب ہوا اور کب اس نے مسلمانوں کے اندر رواج پانا شروع کیا اس سلسلے میں کوئی بھی بات قطعی اور یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔البتہ یہ بات مسلم ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف آخر میں جبر واختیار، قضاوقدر اور عدل جیسے کچھ کلامی مسائل مسلمانوں کے درمیان بحث وگفتگو کا موضوع بن چکے تھے۔اور اس طرح کی بحثوں کی شاید سب سے پہلی درس گاہ حضرت خواجہ حسن بصری (وفات 110ھ) کی علمی مجالس تھیں۔پہلی صدی ہجری کے نصف دوم کے دوران ہی معبد جہنی اور غیلان دمشقی جیسی شخصیتیں مسلمانوں کے

درمیان گزری ہیں جنہوں نے انسان کی آزادی و اختیار کی شدت سے حمایت کی۔ اسی طرح ان کے مقابلے میں کچھ لوگوں نے عقیدئہ جبر (انسان مجبور محض ہے) کی وکالت کی۔ اختلافات کا یہی سلسلہ آگے چل کر الہیات، طبیعیات، اجتماعیات اور انسان و معاد سے مربوط دیگر مسائل تک پہنچ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے خلیفہ مہدی (مشہور عباسی حکمراں ہارون رشید کا باپ) نے علماء اسلام کو بلا کر یہ حکم دیا کہ مختلف حلقوں کی جانب سے مذہب اسلام اور اس کے عقائد کے بارے میں جو شکوک و شبہات وارد کیے جاتے ہیں ان کے جواب میں کتابیں لکھی جائیں۔ البتہ اس وقت تک اس علم کا نام نہ تو علم کلام پڑا تھا نہ ہی اس نے باضابطہ ایک فن کی شکل اختیار کی تھی۔ زیادہ صحیح روایات کے مطابق عباسی خلیفہ مامون رشید کے زمانے میں معتزلہ کے گروہ نے اس علم (علم کلام) کی فلسفیانہ بنیادوں پر تدوین کی اور ان ہی لوگوں نے اس کا نام علم کلام رکھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ گو علم کلام کی کچھ ابتدائی چیزیں پہلے سے مسلم معاشرہ میں موجود تھیں لیکن علم کلام کا مستقل ایک فن کی حیثیت سے نشو و نما دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران اس وقت ہوا جب کہ مختلف تاریخی، سیاسی اور اجتماعی اسباب کے تحت اعتقادی مسائل پر خالص علمی و عقلی انداز میں بحث و مباحثے کا آغاز ہوا، اور اس موضوع پر کثرت سے کتابیں اور رسالے لکھے گئے۔

تاہم بعض علماء کے نزدیک علم کلام کی داغ بیل عہد عباسی سے بہت پہلے عہد رسالت مآبؐ میں پڑ چکی تھی۔ اور اسلامی اصولوں اور عقائد کے بارے میں استدلالی بحث و گفتگو کا آغاز خود قرآن مجید سے ہوا۔ اس نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اگر علم کلام کو سادہ طور پر مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق اثبات عقیدہ کے معنی میں لیا جائے تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ علم کلام کا آغاز قرآن مجید کے نزول کے ساتھ ہی حضور نبی پاکؐ کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ کیونکہ قرآن مجید نے جن بنیادی عقائد کی طرف دعوت دی۔ مثلاً خدا کا وجود، وحدانیت، رسالت، حیات بعد الموت وغیرہ (وہ سب علم کلام کے مباحث کا حصہ ہیں)، ایک طرف ان کے حق میں انسانی فطرت، مظاہر کائنات اور تاریخی واقعات سے نہایت واضح اور معقول دلائل فراہم کیے۔ اور دوسری طرف ان کے خلاف مشرکین نے جو اعتراضات کیے ان کو بھی رد کیا۔ ساتھ ہی قرآن مجید میں رسولؐ اللہ اور آپؐ کے اصحاب کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ احسن طریقے پر بحث و مباحثہ کریں۔ (سورہ نمل 120)۔ اس نقطہ نظر کے مطابق علم کلام کو یہ نام خواہ کسی بھی زمانے میں دیا گیا ہو اس کی اساسیات قرآن مجید میں پہلے سے موجود تھیں اور ان سے کام بھی لیا جاتا تھا۔

بعد کے ادوار میں جب علوم کی باقاعدہ تدوین کا کام شروع ہوا تو اعتقادی امور میں قرآن مجید کے دلائل، رسولؐ اللہ کے ارشادات صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال کو بھی جمع کیا گیا۔ انہیں چیزوں کے ساتھ جب عباسی دور میں یونانی فلسفہ و منطق اور دوسری قوموں مثلاً قبطی، ایرانی اور ہندوستانی کے الٰہیاتی نظریات بھی ان میں شامل ہو گئے تو وہ مخصوص فن وجود میں آیا جو علم کلام کے نام سے مشہور ہوا۔ عباسی دور سے پہلے عقائد کے علم کو "فقہ اکبر" کے نام سے جانا جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں اسلامی شریعت کے احکام و مسائل کے علم کو فقہ اصغر کہا جاتا تھا۔ البتہ اس علم کو علم کلام کے نام سے شہرت عباسی دور میں حاصل ہوئی۔ اس طرح جب علم کلام کی درجہ بندی عمل میں آئی تو مذکورہ نقطہ نظر کے حامل علماء نے علم کلام کے ارتقائی مراحل کو چار بڑے ادوار میں تقسیم کیا اور اس کا آغاز عہد رسالت مآبؐ و صحابہ کرامؓ سے

کیا۔ دوسرے نقطہ نظر کے حاملین اسے تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور پہلے دور کو اس میں شامل نہیں کرتے۔

20.6 اختلاف کا معنی و مفہوم

اختلاف کو یہاں جس معنی میں استعمال کیا جارہا ہے اس کے لیے انگریزی لفظ dissent زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ اختلاف لوگوں کی سوچ اور رویے کے اس اختلاف یا الگ ہونے کو کہتے ہیں جو انہیں گروہ بندی، باہمی نزاع اور جھگڑے تک لے جائے۔ اسلامی فکر اور اس کے شرعی و تاریخی حوالوں کے تناظر میں جب ہم بات کرتے ہیں' اور اس دوران جب ہم اختلاف کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس وقت اس سے ہماری مراد وہ فکری اور اعتقادی اختلاف ہوتا ہے جس نے اسلامی امت یا ملت اسلامی میں مختلف فکری و اعتقادی فرقوں اور مسلکوں کو جنم دیا۔ اسلام کی فکری تاریخ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اول مسلمانوں کے اندر جو اختلافات پیدا ہوئے ان کی مختلف نوعیتیں تھیں۔ اور ان کے اعتبار سے مختلف فرقے اور گروہ وجود میں آئے۔

20.6.1 اختلاف کی نوعیت

جیسا کہ پہلے عرض ہوا مسلمانوں میں اول اول اختلاف پیدا ہونے کی بنیادیں اور وجوہات الگ الگ تھیں۔ لہذا ان اختلافات کے نتیجے میں جو گروپ اور فرقے وجود میں آئے وہ بھی مختلف نوعیت کے تھے۔ علماء اسلام نے دور اول کے مسلمانوں میں ان اختلافات کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ان کی بنیاد پر مسلم سماج کے اندر تین طرح کی گروپ بندیوں کی نشان دہی کی ہے۔

مسلم سماج کے اندر سب سے پہلے جو اختلافات پیدا ہوئے ان کی نوعیت خالص سیاسی تھی۔ مثلاً خلافت کا مسئلہ 'لہذا اس قسم کے اختلافات کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو فرقے وجود میں آئے انہیں سیاسی فرقوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ 'شیعہ' اور 'خوارج' کو مسلم سماج کے اولین سیاسی فرقوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چوں کہ سیاسی اختلاف ہمیشہ نہیں رہ سکتا اس لیے ان فرقوں کو استحکام عطا کرنے کے لئے بعد میں ان کے لئے اعتقادی یا مذہبی بنیادیں فراہم کی گئیں۔

مسلم سماج کے اندر اختلاف کی دوسری قسم فکری بنیادوں پر وجود میں آئی۔ اور اس کی وجہ سے ان کے اندر مختلف قسم کے اعتقادی مسائل اور جھگڑے پیدا ہوئے۔ مثلاً خدا کی صفات، قضا و قدر اور جزا و سزا کے مسائل۔ ان اختلافات کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو فرقے وجود میں آئے۔ ان کو عقیدے میں اختلاف پر مبنی فرقوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مسلم سماج کے اندر جو تیسرا اختلاف پیدا ہوا وہ عملی مسائل سے متعلق تھا۔ مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ کے مسائل۔ ان مسائل میں مسلمانوں کے اندر اختلاف پیدا ہونے کے سبب جو گروپ وجود میں آئے انہیں ہم فقہی مسالک کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ (فقہی مسالک سے متعلق بحث الگ اکائیوں میں آپ نے پڑھی ہے)۔

یہاں ایک وضاحت جو انتہائی ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کے اندر دور اول میں اور بعد کے ادوار میں بھی جو بھی اختلافات پیدا ہوئے خواہ ان کی نوعیت سیاسی رہی ہو، فکری یا اعتقادی رہی ہو یا فقہی رہی ہو، ان میں کبھی بھی اسلام کے بنیادی عقائد کو چیلنج

نہیں کیا گیا۔ یا اگر کسی دور میں کچھ لوگوں نے کسی بنیادی عقیدے کو چیلنج کیا تو پھر وہ مسلم سماج کا حصہ نہیں رہے۔ آج کی دنیا میں یا اب سے پہلے بھی مسلمانوں کے جتنے بھی گروپ پائے جاتے ہیں' خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے اور علاقے میں رہتے ہوں' ان میں اسلام کے بنیادی عقائد یعنی (1) توحید (2) رسالت اور (3) آخرت پر کسی بھی قسم کا کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ جو بھی اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی حیثیت اور نوعیت جزوی اختلافات کی ہے۔ اور ان کی بنیاد پر کبھی بھی مسلمانوں کے کسی بھی گروہ کو خارج از اسلام نہیں قرار دیا گیا۔

20.7 اسلام میں فکری و اعتقادی اختلاف

اسلام کی دعوت و تبلیغ کا جو کام پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، اس کا آغاز عرب کے علاقہ اور سماج میں ہوا تھا۔ لہذا عربوں کے جس سماج میں ابتداءً اسلام کی دعوت پھیلی وہ نہ صرف عرب کے صحرا کی طرح سادہ اور صاف تھا بلکہ اس میں بے جا قسم کی نکتہ آفرینیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ لوگ اللہ اور اس کے آخری رسولؐ کی ہر بات پر صرف نظری اعتبار سے آمنا و صدقنا (ہم ایمان لائے اور ہم نے تصدیق کی) کہنے والے ہی نہیں تھے بلکہ فی الواقع اس پر عمل پیرا بھی تھے۔ اس لیے جب تک اسلام کی دعوت اور اس کے ماننے والے جزیرہ نمائے عرب تک محدود رہے اس وقت تک مسلمانوں میں افکار و عقائد کے مسائل پیدا نہیں ہوئے۔ کیوں کہ عربوں کا مزاج تخیل پرست نہ ہو کر عملی قسم کا تھا۔ وہ عقائد کی بحثوں اور جھگڑوں میں پڑنے کے بجائے اور ان میں قیل و قال کرنے کے بجائے اسلام کے عملی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے عملی مسائل (نماز، روزہ وغیرہ) سے متعلق تحقیق وجستجو کا کام صحابہ کرامؓ کے دور میں ہی شروع ہو گیا تھا اور ایک عملی فقہ وجود میں آگئی تھی جسے ہمارے علماء نے فقہ صحابہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں فکری و اعتقادی مسائل نے اس وقت سر اٹھانا شروع کیا جب اسلام کی دعوت جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر باہر کی دنیا میں کافی دور تک پھیل گئی اور اسلام اور مسلمانوں کا واسطہ ان لوگوں سے پڑا جو اس وقت کی مہذب اقوام کہلاتی تھیں یعنی ایرانی، رومی اور قبطی وغیرہ۔ منطق و فلسفے کے اثرات کے تحت ان قوموں کے اندر پہلے سے ہی بال کی کھال نکالنے کا مزاج پایا جاتا تھا۔ جب ان کا واسطہ مسلمانوں سے پڑا یا ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا یا ان کے بہت سارے علوم اور کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں تو مسلمانوں کے اندر بھی اعتقادی مسائل پر گفتگو ہونے لگی۔

20.7.1 اختلاف کے اسباب

فکری و اعتقادی اختلاف کی وجوہات مختلف اور متعدد ہو سکتی ہیں۔ ان میں کچھ وجوہات ایسی ہوتی ہیں جو کسی بھی اختلاف کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ ان کو ہم عمومی وجوہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

20.7.2 عمومی اسباب

1۔ ہر انسان کا فہم و ادراک یکساں نہیں ہوتا، دوسری طرف عقائد کے مسائل بہت ہی مشکل، پیچیدہ اور دقت طلب ہوتے ہیں،

اس لیے جب ان کی تفہیم و تشریح کا موقع آتا ہے تو لوگوں کی رائیں ان مسائل کی پیچیدگی اور دقّت کی وجہ سے الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ کبھی اس کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ لوگ ایک ہی مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کوئی ایک پہلو کو نمایاں کرتا ہے تو کوئی دوسرے پہلو کو، اس طرح بھی لوگوں کے درمیان اختلاف رائے ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اس لیے بھی لوگوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھ نہیں پاتے۔

2۔ ہر انسان کا مزاج بھی مختلف ہوتا ہے لہٰذا وہ خود کو اپنے مزاج اور جذبات و خواہشات سے الگ نہیں کر پاتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جس مسئلے پر بھی غور فکر کرتا ہے اپنے نفسیاتی جذبات و خواہشات کے دائرے میں محدود رہ کر کرتا ہے۔ لہٰذا انسانی مزاج کا اختلاف اور اس کی پسند و ناپسند کا اختلاف بھی، اختلاف کا سبب بنتا ہے۔

3۔ ہر شخص اپنے مخصوص علمی مسلک و منہج کے مطابق غور و فکر کرتا ہے اور پھر اسی تناظر میں مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا غور و فکر کا موضوع ایک اور یکساں ہونے کے باوجود لوگوں کے علمی مسلک و منہج یا میلان و رجحان میں اختلاف ہونے کے سبب اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

4۔ اختلاف کا ایک اہم سبب لوگوں کے اندر پائی جانے والی تقلید اور عصبیت ہوتی ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے تعصبات اور ذہنی تحفظات سے اوپر اٹھ کر یا ان کے حصار سے باہر نکل کر غور و فکر پر خود کو آمادہ نہیں کر پاتا۔ اور چوں کہ لوگوں کے تعصبات و ذہنی تحفظات مختلف ہوتے ہیں اس لیے ان کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

5۔ ہر انسان کی ذہنی سطح یکساں نہیں ہوتی۔ لوگ تہذیب و تمدن اور علم و فن میں پائے جانے والے اختلافات کے سبب علمی و تہذیبی اعتبار سے مختلف سطحوں پر ہوتے ہیں اور پھر انہیں سطحوں پر رہتے ہوئے مختلف مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔ لوگوں کی ذہنی سطح میں پایا جانے والا یہ اختلاف بھی ان کے درمیان اختلاف پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔

6۔ اختلاف کی ایک اہم وجہ لوگوں کے مفادات کا مختلف ہونا بھی ہے۔ خاص طور پر بعض لوگ اپنے سیاسی مفادات کے حصول کے لئے یا محض اپنی سیاسی وابستگی کے سبب بعض افکار و خیالات پر اصرار کرتے ہیں۔ جب کہ کچھ دوسرے لوگ بعض دوسرے سیاسی مفادات کے حصول کے لئے یا بعض دوسری سیاسی وابستگیوں کے سبب ان سے اختلاف کرتے ہیں۔

یہ اسباب عمومی نوعیت کے ہیں اور کسی بھی اختلاف کی جڑ میں کارفرما نظر آسکتے ہیں۔ اسی طرح بعض اسباب وہ ہوتے ہیں جو مخصوص حالات، تاریخی عوامل اور تقاضوں کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام میں فکری اختلاف کے پیدا ہونے میں اگر ایک طرف یہ عمومی اسباب کارفرما تھے تو دوسری طرف بعض اسباب وہ بھی تھے جو اس وقت کے سیاسی، سماجی اور مذہبی ماحول کی دین تھے۔ ذیل میں اسلام میں اختلاف کے ان مخصوص اسباب کو بیان کیا جاتا ہے۔

20.7.3 اسلام میں اختلاف عقائد کے اسباب

اسلام میں اختلاف عقائد کے مختلف اسباب ہیں۔ البتہ اسلامی عقائد میں اختلاف کے آغاز کے حوالے سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کے اندر عقائد کے اختلاف کی بنیاد عجمی یا غیر عرب اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے ربط و تعلق، ان کے قبول اسلام اور ان کی فلسفیانہ کتابوں کے تراجم کی وجہ سے پڑی۔ ذیل میں ہم ان اسباب کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

1۔ مسلمانوں کے درمیان اختلاف عقائد کا پہلا سبب عجمی (غیر عرب) اقوام کے ساتھ ان کا میل جول اور ربط و تعلق بنا۔ کیونکہ اس وقت یونانی، ایرانی اور قبطی وغیرہ وہ قومیں تھیں جن کے مزاج اور مذاق میں ہی عقائد کے بارے میں نئے نئے نکتے نکالنا شامل تھا۔ وہ ہر چیز میں بال کی کھال نکالنے کی ماہر تھیں۔ لہذا جب ان کے علاقے مسلمانوں نے فتح کیے اور ان کے ساتھ بود و باش اختیار کی تو ان کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر بھی مختلف اعتقادی مسائل پر بحث و گفتگو کا آغاز ہوا۔

2۔ مسلمانوں کے درمیان عقائد کے حوالے سے اختلاف پیدا ہونے کا دوسرا سبب عجمی اقوام کا دائرہ اسلام میں داخل ہونا (یا اسلام قبول کرنا) تھا۔ کیوں کہ جو نئے لوگ اسلام کے حلقے میں شامل ہو رہے تھے ان کا تعلق صرف نئے ممالک اور علاقوں سے ہی نہیں تھا بلکہ ان کی اپنی تہذیبیں اور عقائد بھی تھے جن پر وہ پہلے سے عمل پیرا تھے۔ اور جو ایک دوسرے سے الگ الگ بھی تھے۔ یہ لوگ جب مسلمان ہوئے اور انہوں نے جب اسلامی عقائد کی تشریح شروع کی تو پہلے سے وہ جن مذہبی عقائد کو مانتے آئے تھے۔ ان کی وہی مذہبی تشریحات اسلامی عقائد کی تشریح پر غالب آئیں۔ اس طرح ایک ہی عقیدے کی مختلف تشریحات وجود پذیر ہوئیں۔ مثال کے طور پر خدا کے تصور کو لیجئے۔ کچھ مذہبی تشریحات میں خدا کا تصور تقریباً ایک عام انسان جیسا ہے جو انسانی جسم کی طرح مجسم ہے۔ جو بیمار بھی ہوتا ہے، غصہ ہوتا ہے اور اپنے پیغمبروں سے لڑ بھی جاتا ہے اور فرشتے اس کی عیادت کو آتے ہیں۔ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں نے جب اسلام قبول کیا تو انہوں نے اسلامی تصور الہ کو بھی اپنے سابقہ مذہبی تناظر میں دیکھا اور ان کو قرآن مجید کی وہ آیات زیادہ راس آئیں یا ان کو انہوں نے اپنے میلان خاطر سے زیادہ قریب پایا جن میں اللہ تعالی کے لیے ہاتھ، منہ وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان تشریحات کے نتیجے میں خدا کے بارے میں ایک ایسا عقیدہ سامنے آیا جو 'تجسیم' سے زیادہ قریب تھا۔ اس کے برعکس بعض مذاہب وہ بھی ہیں جن میں خدا کی 'تنزیہہ' کا تصور اس قدر غالب ہے کہ اس کا تصور بھی محال ہے۔ ان مذاہب کے لوگوں نے جب اسلام قبول کیا اور اسلامی تصور الہ کی تشریح کی تو قرآن مجید کی وہ آیات ان کے سابقہ مذہبی میلان سے زیادہ قریب نظر آئیں جن میں خدا کو ہر طرح کی انسانی صفات سے بالاتر قرار دیا گیا ہے۔ (لیس کمثلہ شیئی) ان کی تشریحات کی روشنی میں مسلمانوں کے اندر خدا کے بارے میں ایک ایسا عقیدہ وجود میں آیا جو تمام طرح کی صفات سے پاک ہے۔

3۔ مسلمانوں کے اندر اختلاف کا تیسرا سبب وہ مسائل بنے جن کی کئی تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر جبر و قدر کے مسئلے کو لیا جاسکتا ہے۔ جب ہم اس مسئلے پر غور کرتے ہیں تو ایک طرف ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ انسان اپنے افعال اور کاموں میں آزاد اور مختار ہے۔ اپنی مرضی اور ارادے سے جو چاہے عمل کر سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف جب اسی مسئلے پر مزید گہرائی کے ساتھ غور کرتے ہیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ افعال تو کجا انسان اپنے ارادے میں بھی بااختیار و خود مختار نہیں ہے۔ اس طرح ایک ہی مسئلے میں ایک ہی شخص غور و فکر کے مختلف مراحل میں جب مختلف رائیں قائم کر سکتا ہے تو ایک سماجی گروہ کے اندر اس مسئلے کے بارے میں اختلاف رائے کا پیدا ہونا بالکل فطری اور لازمی امر ہے۔

4۔ مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا چوتھا سبب اس وقت کے انسانی سماج کی طبیعتوں اور فطرت کا اختلاف بنا کیوں کہ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر انسان کی ذہنی سطح یکساں نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب کئی لوگ ایک ہی چیز کے بارے میں اپنی اپنی سطح پر غور کرتے ہیں اور اس کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں تو لازمی طور پر ان کی ذہنی سطح کی طرح ان کی رایوں میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عام اور سادہ سی زندگی گزارنے والے آدمی اور ایک فلسفی کو لے سکتے ہیں۔ عام آدمی جب خدا کے بارے میں غور کرتا ہے تو اس کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ وہ بہت بڑا حکمراں اور مالک ہے۔ کامل اختیار اس کے ہاتھ میں ہے، وہ جو چاہے کرے۔ اس کے کسی کام اور فیصلے میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہے، وہ چاہے تو گنہ گاروں کو بخش دے اور چاہے تو نیکو کاروں کو سزا دے۔ وہ چاہے تو دن کو رات میں بدل دے، آگ کی گرمی کو سرد کر دے، ہر چیز میں اسی کی مرضی ہے، ہمارا کوئی اختیار اور ارادہ نہیں، یعنی عام آدمی کو خدا کے ہر کام میں مصلحت سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ ہر عمل اور کام کی علت تلاش نہیں کرتا۔ وہ اشیاء کے خواص و تاثیر کے چکروں میں نہیں پڑتا وغیرہ۔ لیکن اس عام آدمی کے مقابلے میں ایک فلسفی جب خدا کے بارے میں سوچتا ہے تو وہ خدا کی تمام باتوں کو مبنی بر مصلحت پاتا ہے، اسے ایک ذرہ بھی حکمت سے خالی نظر نہیں آتا۔ وہ ہر چیز میں ایک نظم پاتا ہے اور نظام عالم اسی کے تحت چلتا ہے، اسے ہر چیز میں کچھ خواص اور تاثیر ملتی ہے جو اس کے خیال میں اس سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ خدا کے بارے میں خیالات اور سوچ کے ان دو دھاروں نے مسلمانوں کے اندر دو فرقے پیدا کر دیے۔ پہلا اشاعرہ اور دوسرا معتزلہ۔ جس میں اول الذکر عام مسلمانوں کی اور دوسرا فرقہ فلسفیانہ ذہنوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

5۔ مسلمانوں کے درمیان اعتقادی اختلاف پیدا ہونے کا پانچواں سبب عقل اور نقل کی بحث تھی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے انسانی طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بات بات پر بال کی کھال نہیں نکالتے بلکہ جو کچھ اپنے بزرگوں اور قابل اعتماد لوگوں سے سن لیتے ہیں بلا چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ جب کہ کچھ دوسرے لوگ ہوتے ہیں جو ہر بات میں اپنی عقل استعمال کرتے ہیں۔ اور کیوں اور کیسے جیسے سوالات اٹھاتے ہیں۔ یعنی جب تک بات ان کی عقل اور سمجھ میں نہ آئے تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ ان دونوں طرح کے لوگوں سے مسلمانوں کا دور اول بھی خالی نہیں تھا اور ان میں ان بنیادوں پر اختلافات موجود تھے۔ مثال کے طور پر ایک صحابی رسولؐ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "زندوں کے رونے دھونے سے مردوں پر عذاب ہوتا ہے۔" یہ حدیث جب حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کی جاتی ہے تو وہ کہتی ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا' کیوں کہ خود اللہ تعالی کا فرمان ہے لاتزر وازرۃ وزر اخری، (کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) یعنی ایک کے گناہ کا دوسرے سے مواخذہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں پر ایک صحابی رسول نے ایک روایت کو بغیر کسی حجت کے نقل کر دیا۔ لیکن دوسرے نے عقل استعمال کی اور اس بنیاد پر کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا' اور فرمایا ممکن ہے ان سے اس سلسلے میں سہو ہوا ہو۔

6۔ مسلمانوں کے درمیان اعتقادی اختلاف کا چھٹا سبب علماء کے درمیان معاشرتوں کا فرق تھا۔ بظاہر علماء کے دو طبقے محدثین و فقہا

اور متکلمین ایک ہی سماج میں رہتے تھے لیکن دونوں کی معاشرت میں بہت زیادہ فرق تھا۔ محدثین اور فقہا کا دوسری اقوام اور دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ ربط وضبط بہت کم رہتا تھا اور علمی مسائل پر بات چیت تو ہوتی ہی نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ محدثین وفقہا اپنے مخصوص سماجی تناظر میں غیر مذہب کے ماننے والوں سے میل جول کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ ان کو اپنے علمی کاموں یعنی احادیث کی تلاش وجستجو، تحقیق وتفحص اور نقل وروایت سے کسی اور کام کے لئے فرصت ہی نہیں ملتی تھی، نتیجہ یہ تھا کہ ان تک دوسرے مذاہب کے لوگوں کی باتیں اور اعتراض عام طور پر پہنچتے ہی نہیں تھے۔ ان کا تعلق صرف اپنے ہم مذہب معتقدین سے رہتا تھا اور وہ ان سے جو کچھ بھی فرمادیتے تھے لوگ مان لیتے تھے۔ اگر کبھی کسی نے دوسروں کے اعتراضات کی روشنی میں کچھ سوالات اٹھائے بھی تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا تھا کہ الکیف مجہول والسؤال بدعة (کیفیت معلوم نہیں اور اس سلسلے میں سوال بدعت ہے۔) معتقدین اس جواب کو آسانی سے قبول کرلیتے تھے اس لیے محدثین وفقہا کو دوسروں کے عقلی وعلمی اعتراضات کو دور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن ان کے برخلاف سماج کے طبقہ علماء میں متکلمین کا گروہ بھی تھا جس کے روابط دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ بھی تھے۔ متکلمین اور خاص طور پر معتزلہ ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ میل جول رکھتے تھے بلکہ مختلف مسائل پر ان کے ساتھ بحث ومناظرہ بھی کرتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے کہ علمی بحث ومباحثے میں 'السؤال بدعة' والا جواب کافی نہ تھا بلکہ وہاں تو فریق مخالف تک علمی وعقلی انداز میں اپنی بات پہنچانی اور اس سے تسلیم کروانی تھی۔ لہٰذا یہ لوگ دوسرے مذہب والوں کے ساتھ انہیں کی سطح پر بحث کرتے تھے اور اسلام کی برتری عقلی طور پر ثابت کرتے تھے۔ (گو کئی بار اس سلسلے میں ان سے غلطیاں بھی ہوتی تھیں) لہٰذا محدثین وفقہا اور متکلمین کی معاشرتوں کے فرق نے بھی مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کیے۔

دور اول کے مسلم سماج کے اندر مسلمانوں کے درمیان اعتقادی اختلافات پیدا ہونے کے مذکورہ بالا عمومی اور خاص اسباب گرچہ پوری طرح پہلے سے ہی موجود تھے اور ان کے وقوع پذیر ہونے کے لیے زمین بھی اچھی طرح تیار تھی لیکن ان کا آغاز اصلاً سیاست سے ہوا۔ یعنی سیاسی ضرورتوں کے تحت سماج کے اندر اعتقادی اختلافات کو ہوا دی گئی۔ مثال کے طور پر بنو امیہ کے حکمرانوں نے اپنی حکومت کو جواز اور استحکام عطا کرنے کے لئے جبری عقائد کو فروغ دیا 'یعنی آمنا بالقدر خیرہ و شرہ (مطلب جو کچھ اچھا یا برا ہوتا ہے اللہ کی مرضی اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے)۔ اس کے ذریعہ انہوں نے عام شکایت کرنے والوں کی زبان بند کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسی عقیدے کے فروغ کی کوشش کے نتیجے میں 'قدریہ عقائد' وجود میں آئے اور ان کو بھی فروغ ملا جن کے تحت انسان کو ہر عمل میں خود مختار قرار دیا گیا۔

20.7.4 اسلام میں فرقہ بندی یا فرقوں کا آغاز

اس حقیقت واقعہ سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ دنیا میں جو بھی انسان آتا ہے سوچنے اور سمجھنے کی کچھ مخصوص مگر الگ الگ صلاحیتیں اور خصوصیتیں لے کر آتا ہے۔ تہذیب وتمدن اور علوم وفنون میں ترقی اور تنزل کی وجہ سے انسان کی ذہنی سطح کے ساتھ ساتھ اس کی صلاحیتوں میں بھی کمی بیشی واقع ہوتی رہتی ہے۔ ایک ہی چیز کو دیکھ کر یا اس پر غور وفکر کر کے ایک آدمی ایک نتیجے پر پہنچتا ہے اور دوسرا آدمی دوسرے نتیجے پر۔ یہ سب صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسانی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ انسانوں کے درمیان صلاحیتوں کے سلسلے

میں پایا جانے والا یہ فرق اور تفاوت مذہب اور عقائد کے ان کے فہم وادراک پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے تمام مذاہب اور عقائد کے ساتھ ایسا ہوا اور ہوتا رہا ہے۔ اس لیے اگر اسلام کے ساتھ بھی اس کے فہم وادراک کے معاملے میں انسانی صلاحیتوں کے مطابق مختلف معاملات میں لوگوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے اندر اللہ کے رسولؐ کی زندگی اور موجودگی میں مذہبی یا دیگر معاملات میں اختلافات رونما نہیں ہوئے تو اس کی بنیادی وجہ ان کے درمیان اللہ کے رسولؐ کی موجودگی تھی۔ کیوں کہ کسی بھی معاملے میں جب کوئی مسئلہ لوگوں کو درپیش ہوتا یا ان کے درمیان رایوں کا اختلاف ابھر کر سامنے آتا تو وہ اللہ کے رسولؐ کی جناب میں حاضر ہوتے اور آپؐ سے اس مسئلے کا حل دریافت کر لیتے۔ رسول چوں کہ براہ راست خدا کی نگرانی میں ہوتا ہے اور اس کی بتائی ہوئی ہدایت کے مطابق ہی عمل کرتا ہے اس لیے مذہب و شریعت کے ہر معاملے میں اس کی بات قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ امت اسلامی کی خاص بات آج بھی یہی ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد جن کے بارے میں قرآن وسنت کا واضح اور محکم فیصلہ موجود ہے، ان میں کبھی اور کسی بھی زمانے میں کسی طرح کا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ مسلمانوں کے درمیان رسول اللہؐ کے بعد اور بعد کے ادوار میں جو بھی اختلافات پیدا ہوئے' وہ ان ہدایات کو سمجھنے کو لے کر ہوئے یا ان کی حیثیت جزوی اور فروعی مسائل کی تھی۔ مثال کے طور پر ایک اختلاف اس بات کو لے کر ہے کہ نبیؐ نے اپنی زندگی میں کسی کو اپنا جانشین اور خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے اندر جس بات کو لے کر سب سے پہلے اختلاف سامنے آیا وہ آپؐ کی جانشینی کا مسئلہ تھا اور اس اختلاف کی نوعیت سیاسی اختلاف کی تھی۔ جانشینی کے مسئلے پر نبیؐ کے اصحاب تین مختلف رایوں میں منقسم تھے۔ اور سب اپنی رائے کی پشت پر کوئی دلیل رکھتے تھے۔ مثلاً پہلی رائے انصار مدینہ کی تھی جو یہ رائے رکھتے تھے کہ نبیؐ کے جانشین اور خلیفہ کا انتخاب ان کے درمیان سے ہونا چاہیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ اسلام کے راستے میں انصار مدینہ کی قربانیاں بہت زیادہ ہیں، وہی ہیں جنھوں نے آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو مدینہ (اپنے شہر) میں پناہ دی اور ہر طرح سے ان کی حمایت اور تعاون کیا اور یہ ان کا شہر ہی ہے جو اب اسلامی ریاست کا مرکز ہے، اس لیے اللہ کے رسولؐ کی جانشینی اور نیابت و خلافت کے سب سے زیادہ حق دار وہ یعنی انصار مدینہ ہیں۔ اللہ کے رسولؐ کے بعد آپؐ کی جانشینی کے معاملے میں کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ آپؐ کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ آپ کی خلافت و جانشینی کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔ ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ حضرت علیؓ آپؐ سے خاندان اور رشتہ داری کی نسبت سے سب سے زیادہ قریب ہیں اس لیے خلافت و نیابت رسولؐ کا سب سے زیادہ حق ان کو پہنچتا ہے۔ مسلمانوں میں رسولؐ کی جانشینی کے معاملے میں تیسری رائے یہ تھی کہ خلیفہ کا انتخاب قریش میں سے ہو اس لیے کہ ان کی قیادت وسیادت پر جزیرہ نمائے عرب کے تمام قبائل پہلے سے ہی متفق تھے۔

کسی بھی سماج یا معاشرے کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ہمارے ذہن و دماغ میں اچھی طرح صاف اور پوری طرح واضح رہنی چاہیے کہ ہر معاشرہ انسانی معاشرہ ہوتا ہے اور اس میں مختلف سطح اور صلاحیتوں کے لوگ رہتے اور بستے ہیں۔ کسی بھی اچھے اور بہتر سماج کی نشانی یہ ہے کہ اس میں خیر اور بھلائی کا پہلو غالب رہتا ہے' جب کہ ایک برے سماج کے اندر شر اور برائی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مدینے کے اسلامی سماج جس کی تشکیل رسالت مآبؐ نے کی تھی، کی عظمت اور خصوصیت یہی ہے کہ اس میں ہر طرف خیر ہی خیر کا چرچا تھا اور جب

"الائمه من قریش"(سربراہ قبیلہ قریش سے ہوں گے) کی حدیث لوگوں کے سامنے آگئی تو ہمیں انصار مدینہ کا وہ نمونہ بھی ملتا ہے کہ انہوں نے خود کو ہمیشہ کے لئے خلافت کی دعوے داری سے الگ کر لیا۔ اور حضرت علیؓ اور ان کے حامیوں نے بھی حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرلی اور تینوں خلفاء کے ساتھ انہوں نے تعاون کیا۔ حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ فاروق کی جانشینی اور خلافت پر سارے مسلمانوں کا اتفاق رہا۔ حضرت عثمانؓ کا ابتدائی دور بھی پورے طور پر پر امن و پر سکون رہا۔ لیکن ان کے آخری دور تک جاتے جاتے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر طرح طرح کے اختلافات سر اٹھانے لگے 'اور پہلی مرتبہ مسلم سماج کسی مسئلے پر (جو کہ سیاسی تھا) اختلاف و انتشار کا شکار ہوا۔ مسلم سماج کے اندر شروع ہونے والی اس گروہ بندی کی پشت پر بعض عوامل اور اسباب کارفرما تھے جن میں سے کچھ عمومی اور خاص اسباب کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ یہاں پر ہم بعض ان عوامل اور اسباب کا جائزہ لیں گے جو براہ راست مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے پہلے اختلاف سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی نوعیت سیاسی تھی، بعض سماجی قسم کے تھے اور بعض مذہبی حیثیت کے حامل تھے۔

عرب کے سماج کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک قبائلی سماج تھا جس میں مختلف قبیلوں اور خاندانوں کے درمیان بالادستی کے حصول کے لئے کش مکش کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ مکہ میں قریش کے قبیلے میں بنو ہاشم اور بنو امیہ دو بااثر خاندان تھے جن میں سیاسی بالادستی کو لے کر اختلافات اور جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ نبی عربیؐ کی ذات اور ان کے لائے ہوئے دین اسلام کی برکت اور کرامت یہ تھی کہ ان کی وجہ سے قریش کے خاندانوں میں پائی جانے والی مستقل چپقلش ایک عرصے کے لیے دب گئی۔ البتہ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی اور بعض معاملات ایسے سامنے آئے کہ ان تعصبات نے ایک بار پھر سر اٹھایا اور اس کی بنیاد پر اس زمانے کا مسلم معاشرہ اختلاف و انتشار کا اس طرح شکار ہوا کہ آج تک اس کا شیرازہ متحد نہیں ہو سکا۔ خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ پر یہ الزام لگا کہ انہوں نے اپنے اہل خاندان پر بے جا عنایتیں کی ہیں، انہیں بڑے بڑے سرکاری عہدے اور منصب دیے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ نتیجے میں ان کی مظلومانہ شہادت کا المناک واقعہ رونما ہوا۔ حرم نبویؐ کا تقدس پامال ہوا۔ حضرت عثمانؓ کا خوں بہا لینے اور قاتلین عثمانؓ کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے تحریک چلی۔ مسلمان اختلاف کا ایسا شکار ہوئے کہ بات ٹکراؤ اور تصادم تک جا پہنچی اور اسلامی تاریخ میں پہلی بار مسلمانوں کا خون خود مسلمانوں کی تلوار سے بہا۔

نبیؐ کے بعد کے دور میں مسلمانوں کے اندر جو اختلافات پیدا ہوئے ان کے صرف سیاسی عوامل ہی نہیں تھے۔ بہت سے سماجی عوامل نے بھی ان اختلافات کو ہوا دینے میں اپنا رول ادا کیا۔ یہ حقیقت سبھی کو معلوم ہے کہ عرب کے زیادہ تر قبائل نے نبیؐ کے آخری چند برسوں میں اسلام قبول کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بار ان قبائل کی جاہلی عصبیتیں جاگ اٹھتی تھیں اور سماجی طور پر بہت سارے مسائل پیدا کر دیتی تھیں۔ یہاں پر اس سلسلے میں شاید ایک مثال دینا کافی ہوگا 'اور وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب فتوحات کا سلسلہ بڑھا اور بڑے بڑے علاقے مسلمانوں نے فتح کر لیے تو حضرت عمرؓ کے سامنے ان مفتوحہ زمینوں کی تقسیم اور ملکیت کا معاملہ پیش آیا۔ انہوں نے اکابر صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ایک سوچی سمجھی اسکیم اور حکمت عملی کے تحت ان زمینوں کو ان کے اصل (سابقہ) مالکوں کے پاس ہی رہنے دیا جس

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
Estd. 1998

کے بدلے میں وہ لوگ اسلامی ریاست کو خراج اور ٹیکس دیتے تھے۔ زمینوں کے ٹیکس سے حاصل ہونے والی یہی آمدنی تھی جس نے حضرت عمرؓ کے لیے ایک حقیقی فلاحی ریاست کے قیام کی راہیں ہموار کیں۔ اس کے نتیجے میں حضرت عمرؓ نے جب نظام وظائف قائم کیا تو وظائف کی درجہ بندی کے لئے انہوں نے اسلام میں تقدم اور سبقت کو معیار بنایا۔ مسلمانوں کی فوج کے اندر اس وقت تک بڑی تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو بعد میں ایمان لائے تھے۔ لہذا فطری طور پر ان لوگوں کے اندر اس سوچ نے فروغ پانا شروع کیا کہ محاذوں پر تو اوروں کی طرح ہم بھی لڑائی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن وظائف سب کو یکساں نہیں ملتے۔ حضرت عمرؓ چوں کہ ایک کامیاب منتظم اور ایڈمنسٹریٹر تھے اس لیے ان کے زمانہ خلافت میں تو اس رجحان کو سر اٹھانے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانے میں دیگر عناصر کے ساتھ مل کر انتظامیہ سے جڑے ہوئے ایک طبقہ نے بھی اختلافات کو بڑھانے میں اہم رول ادا کیا جو مسلم معاشرے کے اندر مزید اختلاف و انتشار کا سبب بنا۔

مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں ہی عجم (غیر عرب علاقوں) تک پہنچ چکا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ فتوحات اپنے عروج اور انتہا کو پہنچ گئیں، اس زمانے کی دو بڑی عالمی طاقتوں روم اور ایران کو مسلمانوں نے فتح کر لیا اور ان کے علاقے اسلامی ریاست کا حصہ بن گئے۔ یہ دونوں قومیں اس وقت تک تہذیب و تمدن اور علوم وفنون کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ ترقی یافتہ تھیں بلکہ عام طور پر دنیا کے بڑے حصے میں صرف انہیں کا سکہ چلتا تھا۔ جنگ کے میدان میں تو انہوں نے مسلمانوں کے آگے سپر ڈال دی لیکن جنگ کے بعد کے حالات میں علوم وفنون کے میدان میں اپنی بالا دستی کے سبب انہوں نے مسلمان ذہنوں کو متاثر کرنا شروع کیا، ان قوموں کے اندر فلسفیانہ افکار، منطق اور مذہبی افکار و عقائد پر بحث و مباحثہ عام تھا اور ان میں بڑی دقت نظری اور باریک بینی سے کام لیا جاتا تھا۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب مختلف اسباب کے تحت اسلام ان اقوام میں پھیلنا شروع ہوا تو ان مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں کا واسطہ ایسی قوموں سے پڑا جو عربوں کی طرح سادہ ذہن ومزاج کی حامل نہ تھیں بلکہ فلسفیانہ بحثوں اور منطقی موشگافیوں کے سبب یہ لوگ بات بے بات میں بال کی کھال نکالنے میں بے نظیر مہارت رکھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کے حالات میں جب مسلمانوں میں فرقہ بندی کا آغاز ہوا تو فرقہ بندی کو مذہبی اور فلسفیانہ بنیاد فراہم کرنے میں عجمی اثرات نے سب سے اہم اور نمایاں رول ادا کیا۔ یہ اثرات تین سطح پر تھے۔ (1) عجمیوں کے ساتھ عام مسلمانوں کا میل جول، (2) دیگر اہل مذاہب کا قبول اسلام اور (3) فلسفیانہ کتب کے تراجم۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں مسلمانوں کے جن فرقوں کا آغاز خالص سیاسی بنیادوں پر ہوا تھا آگے چل کر وہ یا تو مذہبی فرقہ بندی کا شکار ہو گئے یا پھر اس کی بنیاد بنے۔

20.7.5 اعتقادی اختلاف کے بعض بنیادی اصول

مسلمانوں کے اندر سیاسی بنیاد پر جس فرقہ بندی کا آغاز ہوا تھا بنو امیہ کے دور میں اور پھر بنو عباس کی خلافت کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے اس نے باقاعدہ مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ اموی حکمرانوں نے اپنی سیاسی ضرورت کے تحت صرف جبر و قدر کے مسئلے کو فروغ دیا تھا لیکن جب ایک بار فکر و نظر کی گاڑی چل پڑی تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ بنو امیہ کی حکومت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے اندر خلق قرآن، تنزیہہ و تشبیہہ اور صفات باری تعالی وغیرہ کی بحثیں شروع ہو گئی تھیں۔ اور اس طرح ان بنیادوں پر مختلف

فرقے وجود میں آنے لگے جو بظاہر تو تعداد میں بہت زیادہ نہ تھے لیکن ان کے درمیان اختلاف کی جو اصولی بنیادیں تھیں وہ علامہ شہرستانی کے مطابق 4 ہیں: جنھیں علامہ شبلی نے اپنی کتاب 'علم الکلام' میں نقل کیا ہے:

"علامہ شہرستانی نے اختلاف کے چار اصول بیان کیے ہیں (1) صفات الٰہی کا اثبات و نفی، (2) قدر و جبر، (3) عقائد و اعمال، (4) عقل و نقل"۔

علامہ شبلی نعمانی نے ان اصولوں کی جو تشریح کی ہے یہاں ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

- صفات الٰہی کا اثبات و نفی

پہلا اختلاف اس طرح پیدا ہوا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالی کے لیے کچھ ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو کہ جسمانیات کے لیے مخصوص ہیں، مثلاً اللہ تعالی عرش پر متمکن ہے (بیٹھا ہوا ہے)، قیامت کے دن وہ فرشتوں کے جھرمٹ میں آئے گا۔ اللہ تعالی کے ہاتھ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے حقیقی معنی مراد لیے جائیں یا مجازی؟ اس سوال نے مسلمانوں کے اندر دو مختلف فرقے پیدا کر دیے۔ جو لوگ حقیقی معنی پر اصرار کرتے ہیں ان میں 'محدثین' اور 'اشاعرہ' ہیں۔ انہیں میں کچھ لوگ اس حد تک بڑھ گئے کہ خدا کی تجسیم کے قائل ہو گئے۔ اور مجسمہ و مشبہہ کہلائے جو اللہ تعالی کے ہاتھ پاؤں تک مانتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کے مجازی معنی مراد لینے پر اصرار کیا وہ 'معتزلہ' ہیں جن کا دوسرا نام منکرین صفات ہے۔

- قدر و جبر

دوسرا اختلاف اس طرح پیدا ہوا کہ انسان اپنے افعال میں آزاد و خود مختار ہے یا نہیں؟ انسان کے افعال کو اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک بھی چیز انسان کے اختیار میں نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کا ارادہ اور خواہش بھی اختیاری نہیں ہوتا۔ لیکن یہیں پر مشکل یہ بھی پیش آتی ہے کہ اگر ہم اپنے افعال میں مجبور ہیں تو پھر یہ جزا اور سزا کا معاملہ کیا ہے؟ حالاں کہ یہی جزا و سزا کا تصور کسی بھی مذہب کی جان ہوتا ہے اور جب یہ ختم ہو جائے تو پھر مذہب بے معنی ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں دونوں قسم کی آیتیں موجود ہیں۔ بعض میں صاف صراحت ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے، اللہ تعالٰی اس سے کراتا ہے مثلاً: **قل کل من عنداللہ** (کہہ دو کہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے)۔ جب کہ بعض آیات کا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنے افعال کا آپ ذمہ دار ہے' مثلاً: **ما اصابک من سیئۃ فمن نفسک**۔ (جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہاری جانب سے ہے) ان دونوں طرح کی قرآنی آیات کی موجودگی میں جبر و قدر کے مسئلے پر مسلمانوں میں دو رائیں قائم ہو گئیں۔ جو لوگ زیادہ آزاد تھے انہوں نے صاف صاف جبر کو مانا یعنی انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے، اور جبریہ کہلائے۔ جو لوگ جبر کے لفظ سے جھجکتے تھے انہوں نے کسب اور ارادہ کا پردہ رکھا اور یہ پردہ بھی ابوالحسن اشعری نے ایجاد کیا ورنہ قدماء اس کا نام بھی نہیں لیتے۔ اس کے برخلاف معتزلہ نے یہ رائے قائم کی کہ انسان اپنے تمام اعمال میں آزاد اور بالکل خود مختار ہے، البتہ یہ اختیار اس کو خدا نے دیا ہے، اس لیے خدا کے اختیار مطلق میں فرق نہیں آتا۔

- عقائد و اعمال

تیسرا اختلاف اس بنا پر تھا کہ ایمان کی حقیقت میں اعمال بھی داخل ہیں یا نہیں؟ چونکہ اکثر حدیثوں میں حیا(شرم)وغیرہ کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ "انه من الایمان" (یعنی یہ چیزیں ایمان کا حصہ ہیں)۔اس لیے محدثین نے اس سے یہ سمجھا کہ ایمان کی حقیقت میں اعمال بھی داخل ہیں۔ لیکن اہل نظر (اہل الرائے) نے جن میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سب کے سرخیل تھے، اس سے اختلاف کیا اور اعتقاد و عمل میں تفریق کی۔ محدثین نے ان لوگوں کو مرجئہ (یعنی وہ لوگ جو عمل کو مؤخر کرتے ہیں) کہا، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ کو بھی بہت سے محدثین نے مرجئہ کے نام سے ہی یاد کیا ہے۔

- عقل و نقل

اختلاف کا چوتھا اصول ہی درحقیقت وہ اصل الاصول ہے جو صحیح معنوں میں اختلاف کہا جا سکتا ہے اور جہاں اہل ظاہر اور ارباب نظر کی حدیں بالکل الگ الگ اور علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ اس اختلاف کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کہیں پر اور کسی معاملے میں عقل اور نقل میں ٹکراؤ اور تصادم ہوتا ہے تو ترجیح کس کو دی جانی چاہیئے؟ یا عقل اور نقل کی حدود کیا ہیں؟ اس معاملے میں تمام اشاعرہ نقل کو ترجیح دیتے ہیں اور 'معتزلہ' وغیرہ عقل کو ترجیح دیتے ہیں۔

عقل و نقل میں ترجیح سے متعلق اس اصول کی بنیاد پر قائم ہونے والے بعض اصولی عقائد یہ ہیں:

(1) اشاعرہ کے نزدیک کوئی بھی چیز اپنے آپ میں اچھی یا بری نہیں۔ شارع جس چیز کو اچھی کہہ دیتا ہے اچھی ہو جاتی ہے اور جس چیز کو بری کہتا ہے بری ہو جاتی ہے۔

معتزلہ کے نزدیک ہر چیز پہلے سے ہی اچھی یا بری ہے۔ شارع اسی چیز کو اچھی کہتا ہے جو فی نفسہ (اپنے آپ میں) اچھی تھی، اور اسی چیز کو بری کہتا ہے جو پہلے سے بری تھی۔

(2) اشاعرہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ محالات (یعنی وہ چیزیں جو ناممکنات میں ہیں) کا حکم دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ معتزلہ و حنفیہ (احناف) کے نزدیک اللہ تعالیٰ کسی محال چیز (جس کا ہونا ناممکن ہو) کا حکم نہیں دے سکتا۔

(3) اشاعرہ کے نزدیک خدا کے لیے ضروری نہیں کہ وہ عدل اور انصاف کرے۔

معتزلہ کے نزدیک خدا کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

(4) اشاعرہ کے نزدیک خدا عبادت کے عوض میں (بدلے میں) عذاب دے سکتا ہے اور گناہ کے بدلے میں انعام۔ اور اگر وہ ایسا کرے تو یہ ناانصافی نہیں ہے۔

معتزلہ کے نزدیک خدا کبھی ایسا نہیں کر سکتا اور اگر ایسا کرے تو یہ ظلم اور ناانصافی ہے، جس سے ذات الٰہی پاک ہے۔

انسانی طبیعتوں کے مد نظر ان اختلافات کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، بلکہ ایسا ہونا بڑی حد تک فطری ہے۔ البتہ ان کی بنیاد پر

کفر و ایمان کی حد فاصل نہیں قائم کی جانی چاہئے۔

20.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علم کلام میں مذہب کی الہامی تعلیمات (عقائد) کو عقلی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا ہے اور جو لوگ مذہب پر یقین نہیں رکھتے یا مذہب کے بارے میں ان کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں انہیں ان کی عقل کے مطابق دلائل فراہم کر کے مطمئن کیا جاتا ہے۔
- اس علم کے حصول کے بعد آدمی کے اندر یہ قدرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دلیل دے کر اور شکوک و شبہات کا ازالہ کر کے مذہبی عقائد کو ثابت کر سکے۔
- علم کلام خالص اسلامی علم ہے جو مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوا، مسلم سماج کے اندر ہی پروان چڑھا اور مسلمانوں میں ہی اسے فروغ حاصل ہوا۔
- دیگر اسلامی علوم کی طرح گو کہ علم کلام کی بھی باضابطہ تدوین بعد کے ادوار میں عمل میں آئی اور عباسی دور میں یہ اپنے عروج و کمال کو پہنچا، لیکن اس علم کی بنیادی اور اساسی باتیں قرآن مجید میں نہ صرف یہ کہ پہلے سے موجود تھیں بلکہ صحابہ کرامؓ اثبات عقائد میں ان دلیلوں سے کام بھی لیتے تھے۔
- علم کلام اپنے آغاز کے بعد ارتقاء کے مختلف مراحل سے گزرا، اس کی ابتدائی تدوین میں اگر معتزلہ پیش پیش تھے تو اشاعرہ نے اسے یونانی اثرات سے پاک کیا۔

20.9 کلیدی الفاظ

تحزّبات	:	گروہ بندی
السابقون الاولون	:	سب سے پہلے اٹھنے والے لوگ
تعرض	:	زیر بحث لانا

20.10 نمونہ امتحانی سوالات

20.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. علم کلام کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔

Ideology.(d)   Scholasticism.(c)   Commentator.(b)   Jurispurudence.(a)

2. جس علم میں عقائد بیان کیے جاتے ہیں اسے۔۔۔۔ کہتے ہیں۔

(a). علم کلام (b). فکر (c). فلسفہ (d). علم تنقید

3. علامہ شہرستانی نے اختلاف کے کتنے اصول بیان کیے ہیں؟

(a). دو (b). دس (c). چار (d). سات

4. قرآن کو مخلوق کس فرقے نے تسلیم کیا؟

(a). معتزلہ (b). قدریہ (c). جبریہ (d). اشاعرہ

5. اعتقاد و عمل میں تفریق کس گروہ نے کی؟

(a). اہل عقل (b). اہل رائے (c). اہل نظر (d). تمام صحیح

20.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. علم کلام کی تعریف کے ساتھ اس کی وجہ تسمیہ بیان کیجیے۔
2. علم کلام کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالیے۔
3. اختلاف کے معنی و مفہوم پر بحث کیجیے۔
4. اسلام میں اختلاف عقائد کے اسباب بیان کیجیے۔
5. اسلام میں فکری و اعتقادی اختلاف پر ایک نوٹ لکھیے۔

20.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. علم کلام کے تعارف پر تفصیل سے لکھیے۔
2. اسلام میں فرقہ بندی اور فرقوں کے آغاز پر روشنی ڈالیے۔
3. اعتقادی اختلاف کے بنیادی اصول پر مضمون قلم بند کیجیے۔

20.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ مذاہب اسلامیہ : شیخ ابوزہرہ
2. مذاہب اسلامیہ : خواجہ عباد اللہ اختر
3. مطالعہ تقابل ادیان : پروفیسر عبدالحی انور
4. علم الکلام : علامہ شبلی نعمانی

اکائی 21: علم کلام کا ارتقا

اکائی کے اجزا:

21.0 تمہید
21.1 مقاصد
21.2 علم کلام کے تاریخی ادوار
21.2.1 علم کلام کا دور اول
21.2.2 علم کلام کا دور ثانی
21.2.3 علم کلام کا دور ثالث
21.2.4 علم کلام کا دور رابع
21.3 اکتسابی نتائج
21.4 کلیدی الفاظ
21.5 نمونہ امتحانی سوالات
21.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
21.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
21.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
21.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

21.0 تمہید

اختلاف ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اختلافات کے نتیجے میں برپا ہونے والی گروپ بندیوں سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اختلاف صرف سیاسی ہی نہیں ہوتا بلکہ فکر و نظر کا اختلاف سیاسی اختلاف سے زیادہ اہم اور پائدار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی وجوہ سے وجود میں آنے والے گروپ اپنے وجود کو باقی و برقرار رکھنے کے لئے بہت جلد افکار و نظریات کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اختلاف کی اسلامی تاریخ میں بھی ایسا ہی ہوا، اختلاف کا آغاز گو ابتداء میں سیاسی نوعیت کا تھا لیکن بہت جلد اس میں افکار و عقائد کے مسائل داخل ہو گئے اور سیاسی گروہ بندیوں نے اعتقادی شکل اختیار کر لی۔

21.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی افکار و عقائد کے تاریخی ارتقاء اور اس کے نتیجے میں وجود میں آنے والے فرقوں کی تاریخ و نظریات کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

21.2 علم کلام کے تاریخی ادوار

1۔ عہد رسالت مآب و صحابہ کرامؓ کے دور سے مشہور تابعی حضرت حسن بصریؒ (متوفی 110ھ) کے زمانے تک

2۔ عہد عباسی میں معتزلی فکر کی ابتدا سے اس کے زوال (275ھ) کے زمانے تک

3۔ امام ابوالحسن اشعری (270یا260ھ۔324ھ) سے امام غزالی (متوفی 505ھ) کے زمانے تک

4۔ امام غزالی سے دور جدید تک

21.2.1 علم کلام کا دور اول

عہد رسالت مآبؐ میں اللہ کے رسول کی ذات ہی تمام مسائل کا حل تھی، جو بات بھی صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں کھٹکتی وہ آکر اللہ کے رسولؐ سے اسے دریافت کر لیا کرتے تھے۔ اسی طرح مخالفین اسلام کی جانب سے جو سوالات اٹھائے جاتے ان کا جواب بھی وحی کی صورت میں سامنے آجاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں اس طرح کی علمی وفنی بحث نہیں ہوتی تھی جیسی کہ بعد کے ادوار میں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے مزاج میں علمی بحث ومباحثہ نہیں بلکہ یقین کا حصول شامل تھا۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان عقائد سے متعلق موضوعات پر قرآن مجید کے سادہ اور فطری انداز میں مذاکرہ ہوا کرتا تھا۔ اس مذاکرے کا مقصد مناظرہ بازی یا معلومات میں اضافہ نہیں بلکہ اپنے ایمان ویقین کو مزید پختہ کرنا اور اس کو مسلسل زندہ و تازہ رکھنا ہوتا تھا۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانے تک عقائد کا لفظ بھی اصطلاح نہیں بنا تھا اور اس کی جگہ عام طور پر ایمان کا لفظ بولا جاتا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کے زمانے تک علم العقائد کا نام اصلاً علم الایمان تھا۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ کی مظلومانہ شہادت کے واقعے کے بعد مسلم سماج کے اندر جو سیاسی بحران پیدا ہوا اور جس طرح مسلم معاشرہ اختلاف وانتشار سے دوچار ہوا، اس کے نتیجے میں بعض (نئے) اعتقادی مسائل پر بحث کا آغاز تو ضرور ہوا لیکن اس وقت بھی عام طور پر مسلم معاشرے پر صحابہ کرام کا سادہ مزاج ہی غالب رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دور صحابہؓ کا علم الکلام سادہ طور پر انہیں باتوں کی نصیحت اور تلقین کے ارد گرد گھومتا رہا جن کا براہ راست یا بالواسطہ تذکرہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ صحابہ کرام کے دور کو ہمارے علماء نے عموماً سلف کا زمانہ کہا ہے اور اسے خیر القرون سے تعبیر کیا ہے۔ اس لیے اس دوران مسلم سماج کے اندر اعتقادی اور ایمانی مسائل پر جو مذاکرات (حصول یقین کے مقصد سے) ہوئے انہیں ہم سلفی علم کلام کا نام دے سکتے ہیں۔

21.2.1.1. جبریہ

مسلمانوں میں فلسفیانہ افکار و خیالات کے رواج پانے کے نتیجے میں جن مسائل پر بحث و مباحثے کا آغاز ہوا، ان میں ایک اہم مسئلہ جبر و اختیار کا مسئلہ تھا۔یعنی انسان اپنے افعال میں بالکل مجبور ہے یا پھر اسے کسی بھی کام کے کرنے کا پورا اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ اس اعتقادی اختلاف اور جھگڑے کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان دو فرقے وجود میں آئے۔ ایک فرقہ 'جبریہ' کہلایا جو انسان کو اپنے افعال میں مجبور محض مانتا تھا(یعنی انسان اپنی مرضی اور ارادے سے کچھ نہیں کرتا)دوسرا فرقہ 'قدریہ' کہلایا جو یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے اور کوئی بھی کام کرنے کے لیے پوری طرح آزاد اور خود مختار ہے۔

جبریہ فرقہ کب وجود میں آیا اس بارے میں کوئی بھی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی اور نہ ہی یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس فرقے کا بانی کون تھا؟ کیونکہ اس طرح کے فرقے وقت کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں اور ایک ارتقائی عمل سے گزر کر اپنی مخصوص شکل و صورت اختیار کرتے ہیں۔ البتہ اسلامی تاریخ کے مطالعے اور مختلف قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر جبر کے عقیدے کی بنیادیں دور اول میں ہی پڑ گئی تھیں اور صحابہ کرامؓ کے دور میں ہی اس طرح کا عقیدہ رکھنے والے لوگ وجود میں آ گئے تھے۔ چنانچہ مؤرخین نے اس سلسلے میں مشہور صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن عباس کا ایک خط نقل کیا ہے جو انہوں نے شام کے جبریہ کو جبر کے عقائد سے باز رکھنے کے لیے لکھا تھا:

> اما بعد، تم دوسروں کو تقوی کا حکم دیتے ہو حالانکہ صاحب تقویٰ تمہاری وجہ سے گمراہ ہو گئے اور گنہگار تمہاری وجہ سے رونما ہوئے۔ اے اولاد منافقین اور اے ظالموں کی پشت پناہی کرنے والو: تمہارے دم سے بدکاری کی مسجدیں آباد ہیں، تم سب خدا پر جھوٹ باندھنے والے ہو۔ اور اپنے جرم اعلانیہ اس پر تھوپ دیتے ہو۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے اس خط سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اموی دور کے اوائل میں جب کہ خاصی تعداد میں صحابہ کرامؓ موجود تھے جبری عقائد پھیلنے پھولنے شروع ہو گئے تھے۔ اور اموی دور کے آخر تک پہنچتے پہنچتے جبریہ نے باضابطہ ایک فرقے کی صورت اختیار کر لی تھی جس کا اندازہ مشہور تابعی حضرت حسن بصریؒ کے ایک خط سے ہوتا ہے جسے انہوں نے بصرہ کے جبریہ کے نام لکھا تھا:

> جو شخص خدا اور اس کی قضا و قدر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے۔ جو اپنے گناہوں کا بوجھ خدا پر ڈال دے وہ بھی کافر ہے۔ خدا کی اطاعت مجبوری کی وجہ سے نہیں کی جاتی اور نہ کسی سے مغلوب ہو کر اس کی نافرمانی کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ مالک حقیقی نے مالک بنا دیا ہے اور جو قدرت ان میں پائی جاتی ہے وہ اس کی ودیعت کردہ ہے۔ اگر نیک اعمال انجام دیں تو ان کے افعال میں مداخلت نہیں کرتا اور اگر معصیت کا ارتکاب کریں تو وہ ان کے افعال میں مخل ہو سکتا ہے اگر اس کی مشیت کا تقاضا ہو۔ جب وہ کچھ نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا نے چھوڑ دیا ہے۔ اگر خدا مخلوقات کو اطاعت پر مجبور کر دیتا تو ثواب کو ساقط کر دیا ہوتا۔ اور اگر جبراً گناہوں پر مجبور کرتا تو سزا کو موقوف کر دیتا۔ اور اگر بیکار چھوڑ دیتا تو اس کی عدم قدرت کی دلیل ہوتی۔ بلکہ مخلوقات کے بارے میں اس کی خاص حیثیت ہے جسے اس نے ان سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ نیک اعمال کریں تو یہ خدا کا احسان ہے اور اگر وہ معصیت کا شیوہ

اختیار کریں تو اس کی حجت ان پر تمام ہو جاتی ہے۔

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دور اول میں ہی جبری افکار و عقائد وجود میں آ گئے تھے جن کی تردید حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ کو کرنی پڑی۔

جبریہ کے افکار و عقائد:

صحابہ کرام کے زمانے سے ہی مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا تھا جو حوادث کو انسانی ارادے کے تابع نہیں مانتا تھا بلکہ اس کا کہنا تھا کہ حوادث اللہ تعالی کی جانب سے پہلے سے ہی اٹل ہو چکے ہیں۔ اور چوں کہ ہر چیز اللہ کے حکم کے تابع ہے اس لئے کوئی بھی چیز یا کام انسان کے ارادے سے بدل نہیں سکتا۔ اللہ چوں کہ مستقبل کی ہر چیز سے آگاہ ہے اس لئے آئندہ جو حادثات بھی ہونے والے ہیں وہ پہلے سے اٹل ہیں۔

جبری عقائد کی رو سے بندوں کے افعال ان کے اپنے ارادوں کے تابع نہیں ہیں بلکہ خواہی نہ خواہی وہ اللہ کے ارادے سے وابستہ ہیں۔ یعنی بندوں سے جن افعال کا بھی صدور ہوتا ہے وہ سچ مچ اللہ کے افعال ہوتے ہیں۔ بندوں کی طرف ان کی نسبت مجازاً کر دی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ زید مر گیا یا سورج طلوع ہوا۔ حالاں کہ زید کو اللہ نے مارا ہے اور سورج کو اللہ نے طلوع کیا ہے۔

جبری عقائد کے ماننے والے دو گروپوں میں تقسیم ہیں۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے، اس کے نزدیک انسان اور جمادات وغیرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ انسان کے کسی بھی کام میں اس کے ارادے اور نیت کا دخل نہیں ہوتا۔ یہ فرقہ جبریہ خالصہ کہلاتا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا نمائندہ جہم بن صفوان تھا۔ جہم بن صفوان کے بارے میں آتا ہے کہ اصلاً خراسان کا باشندہ تھا۔ اس کی دعوت کا مرکز بھی خراسان کا علاقہ تھا۔ اس سے اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ جبری عقائد کی تشکیل میں زرتشتی اور مانوی مذہبی روایتوں کا رول بہت اہم تھا۔ کیوں کہ ان کے یہاں پہلے سے ہی اس طرح کے عقائد موجود تھے۔

جبریہ کا دوسرا فرقہ جبریہ متوسطہ کہلاتا ہے۔ اس فرقے کے لوگ یہ عقیدہ تو رکھتے ہیں کہ بندے کے اندر قدرت ہے لیکن یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اس کے اندر کی یہ قدرت اس کے فعل و عمل میں بھی تصرف کر سکتی ہے۔

اس سلسلے میں اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے اختیاری اور غیر اختیاری سارے افعال اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو ارادے اور اختیار کی جزوی قوت عطا کی ہے جسے وہ کسی بھی کام کے کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی جزوی اختیار اور ارادے کے سبب انسان اپنے افعال پر جزا یا سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

21.2.1.2. قدریہ

جبریہ کی طرح قدریہ فرقہ بھی اموی دور کے آغاز میں ہی تشکیل پانا شروع ہو گیا تھا کیوں کہ قضا اور قدر کا مسئلہ صحابہ کے زمانے میں ہی بحث کا موضوع بننے لگا تھا۔ ایک طرف جبریہ عقائد کے ماننے والے لوگ تھے جو انسان کو ہر طرح مجبور محض باور کرتے تھے تو دوسری

طرف قدریہ تھے جو انسان کے عمل کی کھلی آزادی پر یقین رکھتے تھے یعنی یہ کہ انسان ہر کام اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے اور خدا کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ چوں کہ ارادہ واختیار کی آزادی کے معاملے میں معتزلہ (جن کا ذکر آگے آئے گا) بھی قدریہ سے ایک حد تک اتفاق رکھتے ہیں۔ اس لئے بعض لوگوں نے معتزلہ کے لئے بھی قدریہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ لیکن ایسا کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ قدریہ معتزلہ سے الگ ایک فرقہ تھا۔ اور ایک عرصہ تک یہ مستقل حیثیت میں قائم وبر قرار بھی رہا ہے۔

قدریہ کو قدریہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ خدا سے تقدیر کی نفی کرتے ہیں اور اسے بندے (انسان) کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہر چیز انسان کے ارادے وقدرت کے تابع ہے۔ گویا انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔

قدریہ فرقہ بھی جبریہ فرقہ کے پہلو بہ پہلو اموی دور میں ہی ایک مستقل فرقے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس فرقہ کا اصل الاصول یہ تھا کہ انسان کو اپنے افعال پر قدرت حاصل ہے۔ اور وہ اس میں پوری طرح آزاد و با اختیار ہے۔ بلکہ ایک قدم اس سے بھی آگے بڑھ کر اس فرقے کے ماننے والے لوگ سرے سے ہی خدا کی تقدیر کا انکار کر دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اللہ کو کسی معاملے یا حادثے کا علم (نعوذ باللہ) اسی وقت ہوتا ہے جب وہ معاملہ یا حادثہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس طرح قدریہ کا فرقہ گویا جبریہ کے خلاف ردعمل کی ایک تحریک تھی جو ان لوگوں کے خلاف وجود میں آئی جو تقدیر (جبر) پر تکیہ کر کے بیٹھ رہے تھے اور اس کو انہوں نے عملی اور خدا کی نافرمانی کا ذریعہ بنالیا تھا۔

جبریہ کی طرح ہی قدریہ کے بھی وجود میں آنے کی یقینی تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی نہ ہی یقین کے ساتھ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے کس شخص نے قدری عقائد کی طرف لوگوں کو کب اور کہاں بلایا؟ بہر حال اتنا طے ہے کہ یہ فرقہ بھی اس وقت وجود میں آیا جب یونانی فلسفے اور ایرانی افکار کے زیر اثر مسلمانوں کے اندر الہیات کے مسائل کے بارے میں سوالات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے قدری عقائد کی جانب لوگوں کو بلایا اور لوگوں کے اندر ان کی تبلیغ کی، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ بصرہ (عراق) اور دمشق (شام) کے رہنے والے عیسائی تھے جو یا تو مسلمان ہوگئے تھے یا مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہوگئے تھے۔ اسی سے یہ بات بھی پتہ چلتی ہے کہ جبر وقدر کے مسائل مسلمانوں میں دوسرے مذاہب سے آئے ہیں۔ جبر کا عقیدہ زرتشتیت یا یہودیت سے اور قدر کا عقیدہ عیسائیت سے۔

قدریہ فرقہ کے اولین مبلغین میں معبد جہنی اور غیلان دمشقی کے نام لیے جاتے ہیں۔ معبد جہنی نے قدری عقائد عراق میں پھیلائے جہاں بصرہ کا شہر اس کا مرکز تھا۔ غیلان دمشقی نے دمشق کو اپنا مرکز بنایا اور اس کے آس پاس کے شامی علاقوں میں قدری عقائد کی تبلیغ کی۔ غیلان دمشقی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا ہم عصر تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ایک مناظرے کے بعد اس نے قدری عقائد سے توبہ کرلی تھی۔ لیکن عمر بن عبد العزیز کی وفات کے بعد اس نے ایک بار پھر قدری عقائد کی دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا جس کے نتیجے میں ہشام کے زمانے میں اسے قتل کر دیا گیا۔ قدری عقائد کا دوسرا بڑا داعی اور مبلغ معبد جہنی حجاج بن یوسف کے ہاتھوں قتل ہوا۔

معبد جہنی اور غیلان دمشقی کے قتل کے بعد بھی قدری عقائد باقی رہے۔ اور انہوں نے آنے والی صدیوں میں مسلمانوں کے

دوسرے فرقوں کو بھی متاثر کیا۔ خاص طور پر معتزلہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب انہیں عباسی دور (مامون و معتصم وغیرہ کے زمانے میں) میں عروج حاصل ہوا تو قدری عقائد کے ماننے والے ان میں پوری طرح سے گھل مل گئے۔

21.2.2 علم کلام کا دور ثانی

علم کلام کے ارتقاء کا دوسرا مرحلہ یا دور فرقہ معتزلہ کے ظہور کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ (بعض علماء علم کلام نے اسی دور کو پہلے دور کا نام دیا ہے)۔ اس سلسلے کے سب سے اہم واقعات میں واصل بن عطا (متوفی 131ھ 748ء) اور عمرو بن عبید (متوفی 142ھ 759ء) کے ذریعے بعض اعتقادی مسائل کا اٹھایا جانا ہے۔ مثال کے طور پر ان لوگوں نے حضرت حسن بصریؒ کی علمی مجلس (یا درس گاہ) میں گناہ کبیرہ کے مرتکب کے دائرہ اسلام میں رہنے یا دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے سلسلے میں سوال کیا اور ان کے جواب سے مطمئن نہ ہو کر (جو سلفی منہاج کے مطابق تھا) ان سے اختلاف کا راستہ اختیار کیا اور سلف کے طریقے سے ہٹ کر اس سلسلے میں ایک نیا نقطہ نظر اپنایا اور پیش کیا۔ مسلم دنیا میں یہ وہ زمانہ ہے جب بنو امیہ کا سیاسی اقتدار اور دبدبہ بہت کم ہو گیا تھا۔ عباسیوں کی کوششوں سے اسلامی یا مسلم سماج میں غیر عرب عناصر کا اثر و رسوخ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ یہ غیر عرب عناصر بالعموم یہودی، نصرانی اور مجوسی مذہبوں کے ماننے والے تھے اور گو کہ ان لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا لیکن ان کے فکر و عمل دونوں پر ان کے سابقہ مذاہب کا اثر بدستور قائم اور باقی تھا۔ (یہ اس وجہ سے بالکل فطری معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت و صحابہ کرامؓ کے زمانے کی طرح اب مسلم سماج کے اندر ان لوگوں کی تعلیم و تربیت کا وہ نظم باقی نہ رہا تھا جو ان کے فکر و عمل کی ژولیدگی کو دور کر کے انہیں صحیح اسلامی سانچے میں ڈھال سکتا۔) پھر جب عباسیوں کو اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے انہی غیر عرب عناصر کو بڑے بڑے سیاسی عہدے اور ذمّہ داریاں سونپ دیں جو کہ بہر حال صحیح اسلامی تربیت کے ابھی ضرورت مند تھے۔ (شاید یہ عباسی حکمرانوں کی مجبوری بھی تھی)۔

اسی کے ساتھ اس دوران ایک اہم کام یہ ہوا کہ اسی زمانے میں یونان، مصر، ایران اور ہندوستان کے بیشتر فلسفیانہ علوم اور ان کے مذہبی افکار و نظریات ایک طرف عربی زبان میں ترجموں کے ذریعے اور دوسری طرف ان قوموں کے ساتھ روزانہ کے میل ملاپ کے ذریعے مسلم سماج میں پھیلنا شروع ہوئے، جس کے فطری نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے اندر بھی اسلامی عقائد اور تعلیمات کے بارے میں نئے نئے سوالات پیدا ہونے لگے۔ ان سوالات کا جائزہ جب اس زمانے کے فکری اور تاریخی تناظر میں لیا جاتا ہے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً یہ سارے سوالات یہودی، نصرانی اور مجوسی ذہنوں اور ماحول کی پیداوار تھے۔ چونکہ اس زمانے کے بیشتر علماء اسلام اپنے مخصوص علمی اور فکری ڈھانچے میں اس طرح کے سوالات سے عام طور پر تعرض نہیں کرتے تھے یا ان کا مثبت یا منفی جواب دینے کو بالعموم بدعت خیال کرتے تھے۔ اس لیے علماء کا عمومی رویہ ان مسائل اور سوالات پر خاموشی کا رہا۔ ایک طرف علماء کا یہ رجحان اور رویہ تھا تو دوسری طرف معتزلہ کا گروہ تھا جس کی تشکیل کے عمل کا آغاز عہد اموی کے اواخر میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ معتزلہ کے گروہ نے خود اپنے حصار میں سمٹنے کے بجائے اسلامی عقائد پر وارد کیے جانے والے سوالات اور اعتراضات کے چیلنج کو نہ صرف یہ کہ قبول کیا بلکہ ان سوالات اور اعتراضات کا جواب انہی عقل بنیادوں پر دینے کی اپنی سی کوشش کی جن پر کہ وہ کیے جاتے تھے۔ معتزلہ کے گروہ نے خود کو عقلی و منطقی علوم سے آراستہ

کر کے عقل و منطق کی روشنی میں ہی اس طرح کے ہر سوال کا جواب دینے کی جرأت مندانہ کوشش کی جو اسلامی عقائد پر وارد ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں جو نام سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے وہ مشہور معتزلی عالم ابو الہذیل علاف (131-235ھ) کا ہے۔ اس نے علم کلام میں سب سے پہلی کتاب لکھی۔ بعض علماء علم کلام (علامہ شبلی) نے ابو الہذیل علاف کو ہی صحیح معنوں میں علم کلام کا بانی قرار دیا ہے۔ اس نے علم کلام پر چھوٹی بڑی تقریباً ساٹھ کتابیں لکھیں، اور مختلف مذاہب کے ماننے والے علماء کے ساتھ کامیاب مناظرے بھی کیے۔ اس مرحلے میں معتزلہ کے گروہ نے علم کلام کی نہ صرف یہ کہ باضابطہ تدوین کی بلکہ مسلم دنیا میں اس کی ترویج و اشاعت میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ چونکہ معتزلہ کو عباسی خلفاء کی سیاسی سرپرستی بھی حاصل تھی اور ان کی وجہ سے اس زمانے کے وزراء اور امراء بھی ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کا فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ یہاں تک کہ مامون، معتصم اور واثق جیسے خلفائے عباسیہ کے زمانے میں معتزلہ کا جادو اس طرح سر چڑھ کر بولنے لگا کہ انہوں نے اپنے افکار و خیالات کو ان لوگوں پر بھی مسلط کرنے کی کوشش کی جو کہ ان سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے مخالفین کی زبان بندی کے لیے سیاسی رسوخ اور اقتدار کا ناجائز استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ تیسری صدی ہجری کے نصف اول تک معتزلہ کا زور قائم رہا۔ اس دوران ان لوگوں نے خلفاء اور امراء کی سرپرستی میں اسلام کے تمام بنیادی عقائد کی عقلی تشریح و تاویل کر ڈالی۔ اور سیاسی سرپرستی کا فائدہ اٹھا کر اپنے نظریات اور خیالات کو عام لوگوں پر زبردستی اور قوت کے زور پر تھوپنے کی بھی کوشش کی۔

.21.2.2.1 معتزلہ

مسلمانوں کے دور اول میں اختلاف کی کوئی بھی شکل ہو، اس کے تانے بانے کہیں نہ کہیں سے ہو کر ان نظری و فکری اختلافات سے جا ملتے ہیں جو صحابہ کرامؓ کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ ان کے بعد مسلمانوں میں نظریاتی اختلاف کا سلسلہ یونانی علوم خاص طور پر فلسفہ الٰہیات کے عربی تراجم سے جاملتا ہے جو ایک ابھرتی ہوئی مسلم ملت میں تیزی کے ساتھ فروغ پا رہے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کے درمیان نظریاتی اختلافات کو ہوا دینے میں ان نو مسلموں اور غیر مسلموں کا رول بھی اہم رہا ہے جو اپنی مذہبی روایات کے امین تھے۔ اور کچھ اسباب کے تحت مسلمان ہو گئے تھے یا مسلم علاقوں میں رہنے پر مجبور تھے اور ان سے مسلمانوں کا میل جول اور ربط ہوتا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو مسلمانوں کے اندر فکری و نظریاتی اختلاف کے فروغ پانے کے درج ذیل تین اہم اسباب تھے۔

(1) صحابہ کے نظری و فکری اختلافات

(2) یونانی علوم کا عربی زبان میں ترجمہ

(3) غیر مسلموں سے مسلمانوں کا ربط و تعلق

اعتزال یا فرقہ معتزلہ کا آغاز پہلی صدی ہجری میں اموی دور حکومت میں ہوا۔ اس کے وجود میں آنے کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت حسنؓ نے امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبرداری اختیار کر لی تو مسلمانوں میں ایک طبقہ (جو حضرت حسن کی خلافت کا حامی تھا) ایسا پیدا ہوا جس نے مسلمانوں کے سیاسی امور میں دلچسپی لینا چھوڑ دی اور خود کو مذہبی امور اور عقائد تک محدود کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ نظریہ اعتزال یا معتزلہ کا آغاز انہیں لوگوں سے ہوتا ہے۔

فرقہ معتزلہ کے وجود میں آنے کی ایک دوسری وجہ بھی بیان کی جاتی ہے (جو زیادہ مشہور ہے)۔ وہ یہ کہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں جب کہ مرتکب کبیرہ کے کفر و اسلام کا مسئلہ خوارج اور مرجئہ کے عقائد کی وجہ سے بحث کا خاص موضوع بنا ہوا تھا۔ مشہور تابعی حضرت حسن بصری کی مجلس درس میں واصل بن عطا نامی ایک شخص نے ان سے یہ سوال پوچھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان رہتا ہے یا کافر ہو جاتا ہے؟ قبل اس کے حضرت حسن بصری اس کا کوئی جواب دیتے اس نے اپنی رائے ظاہر کر دی کہ ایسا شخص نہ کافر ہے نہ مومن۔ بلکہ ایک درمیانی منزل میں رہتا ہے۔ اس نے اپنی رائے ظاہر کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ حضرت حسن بصری کے شاگردوں میں اس کی تبلیغ بھی کرنے لگا۔ اس پر حسن بصری نے کہا ہذا الرجل اعتزل عنا (یہ شخص ہم سے الگ ہو گیا) اسی نسبت سے اس فرقے کا نام معتزلہ پڑا۔

معتزلہ کا نام معتزلہ پڑنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ یہ نام ان متقی اور پارسا لوگوں کو دیا گیا جو بڑے عابد و زاہد ہوتے تھے اور دنیاوی لذتوں سے کنارہ کش رہتے تھے۔ لیکن یہ وجہ تسمیہ قرین قیاس اس لیے نہیں کہ سبھی معتزلہ ایسے نہ تھے۔ بہر حال معتزلہ نے کبھی اس نام سے برأت کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ جس نام کو اپنے لیے یہ لوگ زیادہ پسند کرتے تھے وہ تھا 'اہل العدل والتوحید'۔

☆ معتزلہ کا تاریخی ارتقاء

معتزلہ فرقے کا آغاز یا تو پہلی صدی ہجری کے اواخر یا دوسری صدی کے اوائل میں ہوا۔ دوسری صدی ہجری میں اس فرقے کو مسلمانوں میں سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا اور اس کے اصول عقائد کی تشکیل عمل میں آئی۔ مشہور عباسی خلفاء مامون، معتصم اور واثق نے اس فرقے کی سرکاری سرپرستی کی اور اسے بام عروج تک پہنچا دیا۔ معتزلہ کی دو بڑی شاخیں ہوئی ہیں:

1۔ بصری معتزلہ

معتزلہ کی یہ شاخ زیادہ قدیم ہے اور اعتزال کے اصول و فروع اسی نے تشکیل دیے۔ اس کے سربرآوردہ لوگوں میں اہم نام واصل بن عطا (متوفی 131ھ 748ء) عمرو بن عبید (متوفی 142ھ 758ء)، نظام، جاحظ اور الجبائی کے ہیں۔

2۔ بغدادی معتزلہ

معتزلہ کی اس شاخ نے بصری معتزلہ کی پیروی کی۔ اس کے علم برداروں میں بشر بن المعتمر، احمد بن ابی داؤد ابو موسیٰ المردار، ثمامہ بن الاشرس اور ابو الحسن خیاط کے نام شامل ہیں۔

صحابہ کرام کے درمیان اختلافات خاص طور پر جمل و صفین کی جنگوں کے سبب مسلمانوں کے اندر سیاسی و گروہی کے ساتھ ساتھ نظری اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات کے نتیجے میں مسلمانوں میں یہ تشویش پیدا ہونا فطری امر تھا کہ کون حق پر ہے اور کون نہیں؟ اسی طرح یونانی علوم کے ترجمے اور اشاعت نے تقدیر کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اسی طرح اس دوران اور بھی بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ یہ وہ حالات تھے جن میں عقیدہ اعتزال کا آغاز ہوا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ایک پرجوش مذہبی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ ایک طرف اس کا مقصد یہ تھا کہ اس زمانے تک وجود میں آنے والے شکوک و شبہات کے مقابلے میں ایک عقلی موقف اختیار کیا جائے اور

پھر اس عقلی موقف کی روشنی میں اسلام کا دفاع کیا جائے اور اسلام پر عائد ہونے والے اعتراض کا جواب دیا جائے۔ معتزلہ کے موقف کا یہ پہلو بجائے خود تو صحیح تھا لیکن اس کے ساتھ مشکل اس وقت پیش آئی جب دین و دانش کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی صورت میں بظاہر دونوں میں کہیں پر تضاد نظر آیا۔ ایسے میں معتزلہ نے عقلی پیمانے سے دین کے محکم اصولوں کو جانچنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ اکثر فکری گمراہی کی صورت میں برآمد ہوا۔ معتزلہ کے تاریخی سفر کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا جب ایک طویل عرصے کے لیے انہیں عباسی خلفاء کی سرپرستی حاصل رہی۔ نتیجے کے طور پر اس تحریک نے زیادہ شدت اختیار کی اور مخالفین کے خلاف طاقت کا استعمال بھی ہوا۔ البتہ معتزلہ کی تحریک کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اس کی جاری کردہ فکری و نظریاتی بحثوں کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر علم کلام (جس کا ذکر آگے آئے گا) کو فروغ حاصل ہوا اور عالم اسلام میں بڑے بڑے متکلم (اشعری، ماتریدی، غزالی) پیدا ہوئے۔ اس طرح اس تحریک کے نتیجے میں ہی مسلم معاشرہ الکندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد جیسے بڑے فلسفی پیدا کرنے کا اہل ہو سکا۔

معتزلہ کے فرقے نے جن حالات میں جنم لیا اس میں ایک طرف یونانی علوم و معارف نے بہت سے طبیعی اور مابعد طبیعی مسائل پیدا کر دئے تھے تو دوسری طرف ثنویت، دہریت اور عیسائیت کا چرچا تھا۔ معتزلہ نے اگر ایک طرف یونانی فکر کی موشگافیوں سے بحث کی تو دوسری جانب ثنویت، دہریت اور عیسائیت سے اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا بھی ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ عقلیت کے زور پر مسائل کو حل کرنے کی معتزلہ کی کوشش کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوئے اور جن کے سبب مسلم معاشرہ شدید فکری اختلاف سے دوچار ہوا ان میں اہم یہ تھے:

1۔ صفات باری تعالیٰ

صفات باری تعالی کی حقیقت یعنی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ کچھ اور ازلی حقیقتوں کو تسلیم کرنا، لہذا خدا کی ذات کو ہر صفت سے عاری قرار دیا جائے۔

2۔ خلق قرآن کا مسئلہ

معتزلہ نے قرآن کو مخلوق اس لیے مانا کہ مخلوق نہ ماننے کی صورت میں عیسائیوں کے اس عقیدے کی تائید ہوتی تھی کہ کلام جسم کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ ہیں، اور چونکہ کلام اللہ کی صفت ہے (مخلوق نہیں) اس لیے عیسیٰ خدا ہیں۔

3۔ حریت ارادہ واختیار

یعنی یہ کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں آزاد ہے۔ اس لیے معتزلہ نے خلق اعمال کی اصطلاح استعمال کی اور خدا کی ذات کی تنزیہہ میں اس درجہ آگے نکل گئے کہ وہ محض ایک علامت ہے۔ امور دنیا سے اسے کچھ مطلب نہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے دور کے حالات اور تقاضوں کے مطابق ہونے کے باوجود معتزلہ کی تحریک بہت جلد زوال پذیر کیوں ہو گئی؟ علماء نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں۔

1۔ معتزلہ نے اپنے مسلک کو جو عقلی اور متکلمانہ تھا، طاقت کے زور سے منوانا چاہا اور اپنے مخالفین کو تشدد اور قید و بند کا نشانہ بنایا۔

2۔ ایک اختلاف جو تعبیر و تشریح تک محدود تھا، اسے انہوں نے کفر و اسلام اور شرک و توحید کا اختلاف سمجھ لیا۔

3۔ دلائل دینے میں انہوں نے قرآن و سنت کی نصوص پر عقلی دلائل کو زیادہ اہمیت اور ترجیح دی۔

4۔ وہ مسائل جن پر صرف خاص لوگ ہی غور و فکر کر سکتے تھے، انہیں معتزلہ نے عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔

5۔ انہوں نے حدیث اور فقہ کا مذاق اڑایا اور ان کے حجت ہونے سے انکار کیا۔

6۔ رویت باری تعالیٰ، جنت و دوزخ اور ملائکہ وغیرہ کے بارے میں اہل سنت کے عقائد کی مخالفت کی۔

7۔ کردار و عمل میں یہ لوگ اپنے مخالفین سے کمتر تھے۔ یہ لوگ دربار شاہی سے وابستہ رہے جبکہ ان کے مخالفین محدثین اور فقہانے عوام کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنائی۔

8۔ اہل سنت نے اپنے مسلک کا دفاع ان لوگوں سے زیادہ بہتر انداز میں کیا۔

☆ **معتزلہ کے عقائد**

معتزلہ کے بنیادی عقائد پانچ ہیں اور انہیں اصول خمسہ بھی کہا جاتا ہے۔

1۔ توحید

معتزلہ فرقے کا سب سے اہم عقیدہ توحید ہے۔ اس عقیدے کے مطابق خدا ایک ہے، اس کے جیسی کوئی دوسری چیز ہو ہی نہیں سکتی "لیس کمثلہ شئی"۔ اللہ کا نہ کوئی جسم ہے، نہ اس کی کوئی سمت ہے اور نہ کوئی چیز اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اس میں کوئی ایسی صفت نہیں پائی جا سکتی جو مخلوق میں پائی جاتی ہو اور حادث و فانی ہو۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔ خدا کی ذات کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتی۔ صرف اسی کی ذات قدیم ہے۔ اس کا کوئی معین و مددگار نہیں۔ توحید کے اس عقیدے کے نتیجے میں ہی معتزلہ قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں کیونکہ اس طرح خدا کا جسم اور اس کی سمت متعین ہوتی ہے۔

2۔ عدل

عدل کے عقیدے سے معتزلہ کی مراد یہ ہے کہ خدا عادل ہے وہ کسی شخص پر یا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اور عدل کے تقاضے کے تحت ہی اللہ نے بندوں کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے کیونکہ اللہ اگر بندوں کو ارادہ و اختیار کی آزادی نہ دیتا تو پھر بندوں کی آزمائش اور امتحان ہی نہیں ہو پاتا۔ اور پھر جزا اور سزا بھی بے معنی ہو کر رہ جاتے۔ معتزلہ اس عقیدے کو مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ کسی کام سے عاجز نہیں ہے اگر اس نے بندوں کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے تو اپنی قدرت سے دی ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو اسے سلب کر لے۔ معتزلہ اپنے اس عقیدے سے جبریہ کے اس عقیدے کی تردید کرنا چاہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال میں مختار نہیں۔ ان کے خیال میں بندہ اگر مختار نہیں ہو گا تو پھر جزا و سزا کا تصور ہی بے معنی ہے۔

3۔ وعدووعید

یعنی اللہ تعالیٰ نے جن اچھے کاموں پر ثواب کا وعدہ کیا ہے اور جن برے کاموں پر عذاب کی دھمکی دی ہے وہ ہر حال میں پوری ہوگی۔ یعنی جو نیک کام کرے گا اسے اس کا اچھا بدلہ ملے گا، اسی طرح جو برے کام کرے گا اسے برائی کی سزا بھی ضرور ملے گی۔ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ توبہ اگر خلوص کے ساتھ ہو تو وہ قبول ہوتی ہے۔ کیوں کہ اللہ نے اس کا وعدہ کیا ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ مرجئہ کے اس عقیدے کی تردید کی جائے کہ ایمان کی موجودگی میں گناہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے اطاعت وعبادت کا کوئی فائدہ نہیں۔

4۔ کفرواسلام کی درمیانہ منزل

اصطلاح میں اسے "منزلہ بین المنزلتین" کہتے ہیں۔ معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھے ہیں۔ اور جن سے روکا ہے وہ برے ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان نام ہے اچھے کاموں کا۔ کوئی مومن کوئی غلط کام نہیں کرسکتا۔ اسی طرح اگر کوئی فاسق ہے تو وہ اچھے کام نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اسے مومن نہ کہا جائے۔ البتہ اسے سرے سے کافر بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ وہ کلمہ شہادت کا قائل ہے۔ اور کچھ دوسرے اچھے کام بھی کرتا ہے۔ البتہ گناہ کبیرہ کا مرتکب اگر توبہ کئے بغیر مرجائے تو ہمیشہ کے لئے دوزخی ہوگا۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق آخرت میں دو ہی گروپ ہوں گے۔ ایک جنت میں دوسرا جہنم میں۔ ان کے مطابق کلمہ گو دوزخیوں کے ساتھ یہ رعایت ہوسکتی ہے کہ انہیں کافروں کے مقابلہ ایک درجہ اوپر رکھا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک درمیانی درجہ مان لیا جائے۔ معتزلہ کے مطابق مرتکب کبیرہ کو ذمیوں اور کافروں سے الگ کرنے کے لئے مسلم کہا جاسکتا ہے۔

5۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

معتزلہ کا پانچواں اصول اچھائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے۔ اس سے معتزلہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سب مومنوں پر واجب اور فرض ہے۔ اس اصول پر انتہاپسندانہ عمل نے ہی معتزلہ میں طاقت اور تشدد کے استعمال کے رجحان کو فروغ دیا۔ کیوں کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے خودساختہ تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عباسی دور میں الحاد وزندقہ کے ساتھ ساتھ فقہاو محدثین کے خلاف بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور دلیل وحجت کے ساتھ ساتھ طاقت اور تلوار بھی استعمال کی۔

یہ معتزلہ کے پانچ متفقہ اصول ہیں، جنہیں وہ "اصول خمسہ "کا نام دیتے ہیں۔ اور انہیں تسلیم کئے بغیر کوئی شخص معتزلی کہلانے کا حق دار نہیں بنتا۔

21.2.3 علم کلام کا دور ثالث

عباسی خلیفہ متوکل کے زمانے میں معتزلہ کا گروہ سرکاری سرپرستی سے محروم ہوگیا اور نتیجے میں اس کا زور بھی ٹوٹنے لگا۔ اپنے مخصوص ذہنی اور فکری تناظر میں معتزلہ نے یہ کارنامہ تو ضرور انجام دیا کہ اس وقت اسلامی عقائد اور تعلیمات پر اٹھائے جانے والے

سوالات و اعتراضات کا جواب اسی عقلی انداز میں دینے کی کوشش کی جس انداز میں کہ وہ وار دکیے جاتے تھے۔ البتہ دفاع اسلام یا حمایت اسلام کی ان کی اس کوشش میں ایک کمی یہ تھی کہ انہوں نے عقل کے استعمال میں بے احتیاطی سے کام لیا۔ اور ایک بار جب عقل کا گھوڑا دوڑا دیا تو پھر اس کے راستے میں جو کچھ آیا اس کی بالکل پر وانہیں کی۔ یہاں تک کہ اپنے عقلی فیصلوں اور نتائج کو صحیح اور درست ثابت کرنے کے لیے وحی کی بے جا تاویل و تشریح سے بھی گریز نہیں کیا۔ جب تک ان کا زور قائم رہا صحیح فکر رکھنے والے علماء اسلام یا تو قید و بند اور تشدد کا نشانہ بنتے رہے یا پھر انہوں نے اقتدار کے خوف سے اپنی زبانیں بند رکھیں اور خاموش رہے۔

جب سرکاری سرپرستی سے محرومی کے سبب ان کا زور ٹوٹا تو وہ علماء جو اب تک حکومت کے ڈر اور خوف کی وجہ سے خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے، معتزلہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے ان کی تردید میں اپنا موقف ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا یہاں سے علم کلام کے ایک نئے دور، تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں علم کلام معتزلہ کی نری عقلیت پرستی کے دام سے نکل کر ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوا جس میں عقل کا استعمال تو تھا لیکن عقل و نقل کے تصادم اور ٹکراؤ کی صورت میں نقل کو ترجیح حاصل تھی۔ اس مرحلے میں مسلم علم کلام کی جن لوگوں نے سب سے بہتر انداز میں نمائندگی کی ان میں ابو الحسن علی ابن اسماعیل اشعریؒ (م 324ھ) اور ابو منصور محمد ماتریدیؒ (م 333ھ) کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ابو الحسن اشعریؒ کا تعلق خود بھی پہلے معتزلہ کے گروہ سے تھا۔ اور وہ معتزلہ کے اماموں میں شمار ہوتے تھے۔ بعد میں انہوں نے معتزلی عقائد سے توبہ کر لی اور سلف صالحین کا مسلک اختیار کر لیا۔ اگر غور کیا جائے اور زیادہ صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو مسلم علم کلام کی اصلی تشکیل امام ابو الحسن اشعریؒ سے ہی شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ معتزلہ کا گروہ عقل اور وحی کے ٹکراؤ کی صورت میں عقل کو ترجیح دیتا تھا اور اس کے مطابق ہی وحی الٰہی کی تعبیر و تشریح بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا اور معتزلہ کا یہ موقف بہر حال فلسفیوں سے زیادہ قریب تھا۔ امام ابو الحسن اشعری کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علم کلام کے بنیادی مسائل، خدا کی ذات، صفات، جبر و قدر، کلام الٰہی، نبوت و رسالت اور امامت وغیرہ کی نئے سرے سے تشریح کی اور اس سلسلے میں عقل و نقل کے درمیان اعتدال و توازن برتنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس طرح امام ابو الحسن اشعریؒ کے ذریعے ایک نیا علم کلام وجود میں آیا جو فکری سطح پر اہل سنت کے عقائد کی زیادہ صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ ان کی اسی اولیت کی وجہ سے امام اشعری کو متکلمین اسلام کا امام کہا جاتا ہے۔ امام ابو الحسن اشعری نے اسلامی عقائد کی تشریح کرتے وقت سلف کے طریقے کو نظر انداز نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ کہ علم کلام جسے معتزلہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود مسلم سماج کے اندر اعتبار حاصل نہیں ہو سکا تھا امام ابو الحسن اشعری کی تشریحات کے بعد علم کلام کو عام مسلم سماج میں اچھی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ اور دیگر علوم کی طرح اسے بھی علوم اسلامی کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ اور باقاعدہ طور پر اس علم کو مسلم دنیا کے مدارس میں پڑھایا جانے لگا۔ علم کلام کی تاریخ میں امام ابو الحسن اشعری کے شاگردوں اور ان کے مکتب فکر کے حاملین کو ''اشاعرہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ امام ابو الحسن اشعری سے امام غزالی کے درمیان جتنے بھی متکلمین مسلمانوں کے اندر گزرے ہیں انہیں متقدمین کہا جاتا ہے۔

21.2.4 علم کلام کا دور رابع

پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں امام محمد الغزالیؒ سے علم کلام ایک نئے دور میں داخل ہوتا ہے جسے ہم علم کلام کے چوتھے دور سے

تعبیر کر سکتے۔ امام محمد الغزالی اور ان کے بعد کے متکلمین اسلام کو متاخرین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ امام ابوالحسن اشعریؒ اور ان کے زمانے اور فوراً بعد متکلمین نے معتزلہ کی نری عقلیت پسندی سے تو علم کلام کو پاک کر دیا تھا اور عقل و نقل کے ٹکراؤ اور تصادم کی صورت میں نقل کو ترجیح دینے کی روایت کو بھی فروغ دیا تھا۔ البتہ وہ بہت سارے یونانی اصول جس کو معتزلہ نے بعینہٖ تسلیم کر لیا تھا۔ (وہ متقدمین کے زمانے میں بھی باقی رہے اور ان لوگوں نے ان اصولوں کی جانچ پڑتال اور رد کی ضرورت محسوس نہیں کی، مثال کے طور پر یونانیوں کا بنایا ہوا اصول کہ دلیل اگر غلط ثابت ہو جائے تو نتیجے کے طور پر وہ بات بھی غلط ہو جائے گی جس کے لیے کہ وہ دلیل دی گئی ہے) مسلمانوں میں امام غزالیؒ شاید پہلے متکلم ہیں جنہوں نے اس طرح کے اصولوں پر کھل کر تنقید کی اور اسے ثابت کیا کہ دلیل کے غلط ثابت ہو جانے سے مدلول (جس پر کہ دلیل دی گئی ہے) غلط نہیں ہو جاتا۔ امام غزالیؒ کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے علم کلام کو فلسفے کی بے جا آمیزش سے پاک کیا اور عقائد کے سلسلے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا ازالہ قرآن کے فطری انداز میں کرنے کی کوشش کی جو خود ان کے اپنے قول کے مطابق صحابہ کرام اور تابعین عظام کے دور میں رائج تھا۔ اس طرح امام غزالی نے علم کلام کو ایک نیا رخ دیا جو جدید دور کے آغاز تک جاری رہا جب کہ یورپ کے صنعتی انقلاب اور سائنس کی ترقی کے نتیجے میں علم کلام قیاسی منطق کے دور سے نکل کر تجرباتی منطق کے دور میں داخل ہوا۔ چوتھے دور کے متکلمین میں آخری بڑا اور نمایاں نام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ہے۔ شاہ صاحب کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عقائد کے اثبات کے علاوہ احکام کے اسرار بھی بیان کیے جو ان سے پہلے کسی دوسرے متکلم نے نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' اس کا شاہ کار ہے۔

دور جدید کے متکلمین میں سید جمال الدین افغانیؒ، سر سید احمد خانؒ، رشید رضاؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، محمد عبدہ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ناموں کو شامل کیا جاتا ہے جنہوں نے کہ اپنے زمانے اور حالات کے مطابق اسلامی عقائد اور تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

21.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مسلم سماج کے اندر جس انتشار و خلفشار کی بنیاد حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت اور اس کے بعد کے حالات میں پڑی اس کے نتیجہ میں اور اس کے ساتھ ہی دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ میل جول اور ان کی کتابوں کے عربی زبان میں ترجموں کے سبب مسلمانوں کے اندر سیاسی و اعتقادی مسائل ہی نہیں پیدا ہوئے بلکہ ان کی بنیاد پر مختلف فرقے بھی وجود میں آئے۔
- جو فرقے پیدا ہوئے ان میں جبریہ اور قدریہ جیسے خالص اعتقادی فرقے بھی تھے جو انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی جیسے مسئلے کی وجہ سے وجود میں آئے۔
- اسلام نے اپنے ماننے والوں کو غور و تدبر پر جس طرح ابھارا ہے اور آزادی فکر و عمل کی جو شمع روشن کی ہے، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر معتزلہ جیسا کلامی فرقہ بھی وجود میں آیا جس نے بہت سارے معاملات میں ٹھوکریں کھانے کے باوجود عقل

ودانش کے استعمال کی ایسی بنیاد رکھی کہ فکر اسلامی کی تشکیل کی کوئی بھی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔

21.4 کلیدی الفاظ

اشتباہ	:	مشتبہ ہو جانا
حدوث عالم	:	دنیا کا پیدا کیا جانا
آثار	:	اثر کی جمع حدیث کی ایک نوع / صحابہ کے اقوال
سم قاتل	:	ہلاک کر دینے والا زہر
الوہیت	:	خدا ماننا

21.5 نمونہ امتحانی سوالات

21.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جبریہ فرقہ کا سب سے بڑا نمائندہ کون ہیں؟

(a). واصل بن عطا　(b). ابوالحسن اشعری　(c). غیلان دمشقی　(d). جہم بن صفوان

2. قدریہ فرقہ کے اولین مبلغین کون ہیں؟

(a). حسن بصری　(b). جہم بن صفوان　(c). واصل بن عطا　(d). معبد جہنی

3. قدریہ مبلغ غیلان دمشقی نے کس جگہ کو اپنا مرکز بنایا؟

(a). مکہ　(b). مصر　(c). مدینہ　(d). دمشق

4. معبد جہنی کس کے ہاتھوں قتل ہوا؟

(a). امیر معاویہ　(b). عبداللہ بن زبیر　(c). یزید بن معاویہ　(d). حجاج بن یوسف

5. واصل بن عطا کی وفات کب ہوئی؟

(a). 50ھ　(b). 120ھ　(c). 231ھ　(d). 131ھ

6. علم کلام میں سب سے پہلے کس نے کتاب لکھی؟

(a). حسن بصری　(b). رابعہ بصری　(c). علامہ شبلی نعمانی　(d). ابوالہذیل علاف

7. واصل بن عطا کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟

(a). جعفری (b). جبریہ (c). قدریہ (d). معتزلہ

8. اصول خمسہ کا عقیدہ کس کا ہے؟

(a). معتزلہ (b). جبریہ (c). قدریہ (d). اشاعرہ

9. کس کا تعلق معتزلہ سے تھا لیکن بعد میں سلف صالحین کا مسلک اختیار کیا؟

(a). معبد جہنی (b). ابوالہذیل علاف (c). واصل بن عطا (d). ابوالحسن اشعری

10. امام ابوالحسن اشعری کے مکتب فکر کے حاملین کو کس نام سے یاد کیا جاتا ہے؟

(a). معتزلہ (b). قدریہ (c). جبریہ (d). اشاعرہ

21.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جبریہ کے افکار وعقائد پر مضمون لکھیے۔
2. قدریہ کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔
3. معتزلہ کے تاریخی ارتقا پر بحث کیجیے۔
4. معتزلہ کے اصول خمسہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. علم کلام کے چوتھے دور پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

21.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. تاریخ علم کلام کے پہلے اور دوسرے دور پر روشنی ڈالیے۔
2. تاریخ علم کلام کے تیسرے دور کو قلم بند کیجیے۔
3. معتزلہ وجبریہ کے افکار وعقائد کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

21.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ مذاہب اسلامیہ : شیخ ابوزہرہ
2. مذاہب اسلامیہ : خواجہ عباداللہ اختر
3. مطالعہ تقابل ادیان : پروفیسر عبدالحی انور
4. علم الکلام : علامہ شبلی نعمانی

اکائی 22: مشہور متکلمین (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

22.0 تمہید

22.1 مقاصد

22.2 ابوالحسن اشعری

22.2.1 حالات زندگی

22.2.2 علمی خدمات

22.2.3 علم کلام

22.2.4 اشعری عقائد و نظریات

22.3 ابو منصور ماتریدی

22.3.1 حالات زندگی

22.3.2 علم کلام

22.3.3 ماتریدیہ عقائد و نظریات

22.4 اکتسابی نتائج

22.5 نمونہ امتحانی سوالات

22.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

22.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

22.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

22.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

22.0 تمہید

تیسری صدی ہجری اسلامی دنیا میں علوم وفنون کے ارتقاء کا زمانہ ہے، خاص کر یونانی علوم منطق و فلسفہ کا مسلمانوں میں کافی زور تھا۔ حتیٰ کی اسلامی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے بھی ان کا استعمال کیا جانے لگا۔ اس کا ایک منفی اثر یہ ہوا کہ اعتزالی فکر پروان چڑھنے لگی۔ گو کہ اسلام نے فطرت سے ہم آہنگ نہایت ہی آسان اور سادہ عقیدہ پیش کیا ہے، جس میں قیامت تک بنی نوع انسانی کے لئے نجات پوشیدہ ہے، لیکن معتزلہ نے فلسفیانہ خیالات سے متاثر ہو کر ان عقائد کے سلسلے میں بھی غلط نظریات اور تصورات کی تشریح و تعبیر شروع کر دی تھی۔ اس فکر کی مخالفت کے نتیجے میں بہت سے محدثین وفقہاء کو عباسی عہد میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ جس کی وجہ سے لوگ معتزلہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔

ان حالات میں اسلامی عقائد کو ثابت کرنے، اعتراضات کا جواب دینے اور معتزلہ کے افکار و نظریات کی مخالفت میں بہت سے فقہاء، محدثین اور علماء میدان عمل میں آئے وہ متکلمین کہلائے۔ ان میں دو شخصیات نے اسلامی دنیا پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے اور بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ایک ابو الحسن اشعری اور دوسرے ابو منصور ماتریدی ہیں۔ یہ دونوں باہمی ضمنی فکری اختلاف کے باوجود معتزلہ کے خلاف بر سر پیکار ہوئے۔ ان دونوں مکتبۂ فکر کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ محض اعتقادی مسائل کی توضیح و تشریح کی حد تک ہیں۔ اسی لیے پوری اسلامی دنیا میں ان دونوں کے بیان کردہ عقائد اہل سنت والجماعت کے متفقہ عقائد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس اکائی میں ان دونوں متکلمین کا تعارف، خدمات اور ان کے ذریعہ قائم کردہ مکتبۂ فکر اشاعرہ اور ماتریدی کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

22.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ متکلمین اسلام ابو الحسن اشعری اور ابو منصور ماتریدی کی شخصیت، علم کلام میں ان کی خدمات اور اشعری و ماتریدیہ مکتب فکر کے عقائد و نظریات سے واقف ہوں گے نیز اس اکائی کا مقصد یہ بھی ہے کہ آپ عقیدہ سے متعلق اہل سنت والجماعت کے صحیح اور درست اسلامی نظریہ کو سمجھ سکیں گے۔

22.2 ابو الحسن اشعری

22.2.1 حالات زندگی

آپ کا نام ابو الحسن علی بن اسماعیل اشعری ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی رسولؐ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ملتا ہے۔ آپ کی ولادت عراق کے شہر بصرہ میں 873ء میں ہوئی اور 935ء میں بغداد میں وفات پائی۔ ابو الحسن اشعری نے بصرہ کے مشہور معتزلی عالم ابو علی جبائی سے تعلیم حاصل کی جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے۔ اشعری ان کی پرورش میں رہے۔ کیونکہ آپ کی والدہ نے آپ کے والد کے انتقال کے بعد جبائی سے نکاح کر لیا تھا۔ جبائی نے ابو الحسن اشعری کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور

آپ کا شمار جبائی کے ذہین شاگردوں میں ہونے لگا۔ آپ کا شمار شروع میں بصرہ کے اکابرین معتزلہ میں ہوتا تھا۔ اور حاضر جوابی اور مناظرے و مجادلے کی خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اپنی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ اپنے استاد جبائی کی جانب سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔ جس سے ان کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ یقیناََ بعد میں ابوالحسن اشعری ہی اپنے استاد ابو علی جبائی کے جانشین ہوتے اور معتزلی فکر کے سب سے بڑے نمائندہ شمار کئے جاتے۔ لیکن آپ معتزلہ فکر سے فیض یافتہ ہونے کے باوجود بعد میں اس کے سب سے بڑے مخالف کے طور پر ابھر کر سامنے آئے اور محدثین وفقہاء کے افکار و نظریات کے ہمنوا ہو گئے۔

ابوالحسن اشعری کا معتزلی فکر سے تائب ہونے کی کئی روایات بیان کی جاتی ہیں: کہا جاتا ہے کہ ایک دن رسول اکرمؐ نے خواب میں انہیں ہدایت فرمائی کہ وہ معتزلی عقائد کو چھوڑ کر اہل سنت والجماعت کے عقائد و نظریات کو اختیار کر لیں کیونکہ یہی درست ہیں۔ اس خواب کے بعد ابوالحسن اشعری نے معتزلی عقائد سے توبہ کر کے باقاعدہ بصرہ کی جامع مسجد میں جا کر معتزلی عقائد سے علیحدہ ہونے اور اہل سنت کے عقائد کو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد انہوں نے اپنی پوری زندگی اہل سنت کے عقائد کی تشریح و تائید اور معتزلی عقائد کی تردید و مخالفت کے لئے وقف کر دی۔ اس کے بعد آپ نے بصرہ چھوڑ کر دارالخلافہ بغداد میں سکونت اختیار کر لی اور وہاں حدیث اور فقہ میں دسترس حاصل کر کے معتزلی عقائد کی تردید اور اہل سنت کے عقائد و نظریات کی تائید میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔

ابوالحسن اشعری کا معتزلی عقائد سے تائب ہو کر اہل سنت کے عقائد کو اختیار کرنے کے سلسلے میں ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ابوالحسن اشعری اور ان کے استاد ابو علی جبائی کے درمیان ایک مناظرہ ہوا۔ مناظرہ کا موضوع یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ سے اصلح کا صدور واجب ہے۔ مناظرہ کی تفصیل یہ ہے:

اشعری: مومن، کافر اور نابالغ بچے کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟ کیونکہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر وہ عمل واجب ہے جو بندوں کے لئے اصلح ہو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ پر عادل ہونے کا تقاضا پورا ہو سکے۔

جبائی: مومن جنت میں داخل ہو گا اور اس میں ہمیشہ رہے گا۔ کافر جہنم میں سزا پائے گا اور بچہ عذاب سے نجات پائے گا اس کا درجہ درمیانی ہو گا۔

اشعری: جب بچے کا انتقال عالم طفولیت میں ہو جائے اور وہ جنت میں جانا چاہے تو کیا یہ ممکن ہے یا نہیں؟

جبائی: یہ ممکن نہیں کیوں کہ بچے سے کہا جا سکتا ہے کہ مومن نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے مگر تم میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

اشعری: اس کے جواب میں بچہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر میں زندہ رہتا تو مومن کی طرح نیک اعمال کرتا مگر مجھے یہ موقع ہی نہیں ملا۔

جبائی: اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے معلوم تھا کہ اگر تمہاری زندگی زیادہ ہوتی تو تم میری نافرمانی کرتے اور

تمھیں اس کی سزا ملتی۔ لہٰذا میں نے تمہاری مصلحت کی خاطر تمھیں زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہنے دیا اور بلوغت تک پہنچنے سے پہلے ہی تمھیں موت دے دی۔

اشعری: یہ سن کر کافر کہہ سکتا ہے کہ اے خدا تو میرے حال سے بھی واقف تھا۔ پھر تو نے میری مصلحت کے پیش نظر مجھے کیوں نہ موت دے دی۔ یہ سن کر جبائی خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

اس سے ابوالحسن اشعری کے دل میں معتزلی افکار و عقائد کے سلسلے میں کشمکش پیدا ہو گئی اور چالیس دنوں تک گھر میں گوشہ نشین ہو کر معتزلہ اور اہل سنت کے عقائد پر غور کرتے رہے اور ان کے دلائل کا موازنہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انہیں اس بات پر شرح صدر ہو گیا کہ اہل سنت والجماعت حق پر ہیں لہٰذا وہ بصرہ کی جامع مسجد میں آئے اور منبر پر بیٹھ کر لوگوں سے مخاطب ہو کر اعلان کیا کہ:

"اے لوگو! جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہے اور جو نہیں جانتا میں اسے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں فلاں بن فلاں ہوں۔ میرا عقیدہ یہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتا۔ میں نے غلط کیا۔ اب میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور معتزلہ کی تردید کرتا ہوں۔ اب میں معتزلہ کی مخالفت و رسوائی کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔" اس طرح چالیس برس تک امام اشعری معتزلی عقائد کے حامی رہنے کے بعد مسئلہ تقدیر کے بارے میں معتزلہ کے مخالف ہو گیے اور پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی۔

22.2.2 علمی خدمات

اس کے بعد امام ابوالحسن اشعری کی زندگی کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اب وہ اہل سنت کے عقائد و نظریات کے سب سے بڑے موید و مبلغ اور معتزلی عقائد کے ناقد و مخالف کے طور پر مشہور ہوئے۔ اشعری چونکہ فقہ میں شافعی مسلک پر عمل پیرا تھے اس لئے اس مسلک کے لوگوں میں بھی آپ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ علماء کی ایک بڑی تعداد نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ ان میں چند مشہور نام یہ ہیں۔ ابو سہل صعلوکی، ابو بکر قفال، ابوزید مروزی، زاہر بن احمد، حافظ ابو بکر جرجانی، ابوالحسن باہلی، ابو عبداللہ طائی، شیخ ابو محمد طبری، بندار بن حسن صوفی اور ابوزید مروزی وغیرہ۔ بعد میں ان شاگردوں نے اپنے استاد کے افکار و نظریات کو آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ اشعری مکتب فکر کو آگے بڑھانے اور پوری دنیا میں اس کو قبول عام دلانے میں جن شخصیتوں کا اہم کردار ہے وہ دراصل امام اشعری کے شاگردوں کے شاگرد اور بعد کی نسلوں کے علماء ہیں جیسے ابو بکر باقلانی، ابو اسحاق اسفرائی اور ابو بکر بن فورک اور اس کے بعد اہم نام امام الحرمین علامہ جوینی، شیخ الاسلام امام غزالی اور امام فخر الدین رازی کے ہیں۔ جنہوں نے اشعری افکار و نظریات کی تائید و حمایت میں بہت کچھ تصنیف کیا اور اشعری مکتبۂ فکر کو استدلال کی بلندی عطا کی۔

امام ابوالحسن اشعری کا شمار اپنے عہد کے بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پوری زندگی علم کی تحصیل و ترویج میں گزاری اور اپنے پیچھے بہت قیمتی علمی سرمایا چھوڑا ہے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔ ان میں سے اکثر کتابیں علم کلام کے موضوع پر ہیں جو ان کا خاص میدان تھا۔ البتہ بعض کتابیں دوسرے علوم سے متعلق بھی ہیں، مثلاً کتاب الاجتہاد، کتاب القیاس اور خبر الواحد وغیرہ۔ مگر افسو

س امام اشعری کی اکثر تصنیفات موجود نہیں ہیں۔ حتیٰ کی ان کی تیس جلدوں پر مشتمل معرکۃ الآراء تفسیر بھی ناپید ہے۔ اگر آج یہ تفسیر دستیاب ہوتی تو قرآنی آیات کی روشنی میں عقائد کے استدلال کا ایک قیمتی سرمایہ اہل سنت کے پاس موجود ہوتا۔ اشعری کی علمی خدمات کا اعتراف ان کے معاصرین نے بھی فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے۔ شیخ ابوالحسن باہلی کہتے تھے کہ میری حیثیت ابوالحسن اشعری کے سامنے ایسی ہی ہے جیسے سمندر کے مقابلے پانی کا قطرہ ہو۔ ابوبکر ابن طیب سے کسی نے کہا کہ آپ کا کلام ابوالحسن اشعری کے کلام سے زیادہ افضل اور واضح ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ابوالحسن اشعری کے کلام کو سمجھ لینا میرے لئے فضیلت کا باعث ہے۔ ابوالحسن اشعری کی علمی شخصیت سے علماء و عوام کے ساتھ سلاطین و امراء بھی متاثر و مرعوب تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سلجوقی سلطان ملک شاہ نے عید کے چاند کی منادی کرادی۔ حالانکہ جب امام اشعری کو معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ میرے نزدیک چاند کی رویت شرعی بنیادوں سے ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے فتویٰ دیا کہ کل عید نہیں منائی جائے گی بلکہ رمضان کا روزہ رکھا جائے گا۔ ملک شاہ سلجوق کو جب اس فتویٰ کا علم ہوا تو اس نے اپنا اعلان واپس لے لیا اور امام اشعری کے فتویٰ کے مطابق روزہ رکھنے کا اعلان جاری کیا۔ آپ عالم، خطیب، مناظر اور مصنف ہونے کے ساتھ زہد و تقویٰ اور پرہیز گاری میں بھی ممتاز تھے۔ امام اشعری نے امام ابوالحسن ہروی کی خدمت میں بیس سال گذارے ان کا کہنا ہے کہ میں نے اشعری سے زیادہ کسی کو متقی، باحیا، دنیوی امور میں شرمیلا اور اخروی امور میں مستعد و پھرتیلا نہیں دیکھا۔ ابوالحسن ہروی مزید کہتے ہیں کہ امام ابوالحسن اشعری نے سالوں عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی ہے۔

22.2.3 علم کلام

امام ابوالحسن اشعری نے علم کلام کے موضوع پر گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے اسلامی عقائد کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا اور یہ بتایا کہ قرآن و سنت عقل و فطرت سے مخالف نہیں ہے۔ آپ نے معتزلہ اور حنابلہ کے درمیان تطبیق کر کے اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ اشعری کے زمانے تک علم کلام میں فلسفہ شامل نہیں تھا۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہل سنت والجماعت کے عقائد کو ثابت کرنے کے لئے علم کلام سے کام لیا۔ ان کے ذریعہ مرتب کیا گیا علم کلام اس قدر مقبول ہوا کہ وہ ان کی پہچان بن گیا۔ علم کلام کو شریعت اور عقلی دلائل سے مدون کرنے کا عظیم الشان کارنامہ انہی کا ہے اور اس علم کو عقلی و نقلی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر بندھتا ہے۔ اسی وجہ سے علم کلام کے بانی قرار دیے گئے۔ علم کلام کے میدان میں آپ کی بیش قیمت خدمات کی وجہ سے بعض علماء مثلاً ابوبکر اسماعیل نے انہیں مجددین میں شمار کیا ہے۔ علم کلام کے موضوع پر امام اشعری کی بعض اہم کتابوں کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

1۔ ابوالحسن اشعری کی علم کلام کے موضوع پر سب سے مشہور کتاب "مقالات الاسلامیین" ہے یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے: پہلے حصے میں امام اشعری نے اسلامی فرقوں اور اہل سنت کے عمومی افکار و عقائد بیان کئے ہیں اور ان کی توضیح و تشریح کی ہے۔ دوسرے حصے میں آپ نے علم کلام کے مشکل مسائل سے بحث کی ہے نیز معتزلہ کے مذہبی عقائد و فلسفیانہ عقائد و نظریات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ کتاب کے تیسرے حصے میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں اختلافات کا تذکرہ ہے ساتھ ہی قرآن کے برحق ہونے کے سلسلے میں مختلف فرقوں کے اقوال بغیر کسی نقد و تنقید کے بیان کئے ہیں لیکن ساتھ میں محدثین کا عقیدہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہی ان کا بھی

عقیدہ ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مقالات الاسلامیین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف متکلم ہی نہ تھے، بلکہ علم عقائد کے ایک بلند پایہ اور محتاط مورخ بھی تھے۔ انہوں نے اس کتاب میں معتزلہ اور دوسرے فرقوں کے جو اقوال و مذاہب نقل کئے ہیں۔ ان میں بڑی احتیاط و دیانت داری سے کام لیا ہے۔ اور خود ان فرقوں کی کتابوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔"

2۔ آپ کی دوسری کتاب "الابانہ عن اصول الدیانہ" ہے۔ اس میں ابو الحسن اشعری نے اہل سنت کے اعتقادی موقف کی وضاحت پیش کی ہے۔ مگر افسوس اس وقت یہ اصل کتاب موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں تحریف و ترمیم کر کے غلط طریقے سے امام اشعری کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ امام جوینی نے اپنی کتاب "الوافی بالوافیات" میں لکھا ہے کہ مجسمہ نے الابانہ نام کی ایک کتاب لکھ کر امام اشعری کی طرف منسوب کر دی۔

3۔ امام اشعری کی ایک اہم کتاب "اللمع فی الرد علی اہل الزیغ والبدع" ہے۔ یہ ایک فرضی مگر علمی مذاکرے پر مبنی تصنیف ہے۔ جس میں ایک خیالی فریق اور امام اشعری کے درمیان مختلف کلامی موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں امام اشعری کا انداز بیان اس قدر عالمانہ و محققانہ ہے اور مباحث میں ایسی گہرائی و گیرائی ہے کہ مخالفین کو اس میں تحریف و ترمیم کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ اس کتاب کے محقق ڈاکٹر حمود غرابہ کا بیان ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والے کو امام اشعری کی کامیابی کا اندازہ ہو گا اور یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی شہرت یونہی نہیں ہو گئی اور یہ بات بھی سمجھ جائیں گئے کہ ان کے کلام کی قبولیت کی وجہ کیا ہے۔

22.2.4 اشعری عقائد و نظریات

تدوین وارتقاء کے لحاظ سے مذہب اشعری کو دو عہد میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور خود امام ابوالحسن اشعری سے شروع ہوتا ہے جس میں انہوں نے اپنی مشہور کلامی تصانیف مثلاً مقالات الاسلامیین، الابانہ عن اصول الدیانہ اور اللمع فی الرد علیٰ اہل الزیغ والبدع میں اپنے نظریات و عقائد کی وضاحت کی ہے۔ یہ دور ابو بکر باقلانی کی کتاب التمہید تک دراز ہے۔ اس دور میں مذہب اشعری کو محدثین، فقہاء اور صوفیاء و علماء میں قبول عام حاصل ہوا۔

دوسرا دور ابن فورک اصفہانی سے شروع ہوتا ہے جو مشہور کتاب التاویل کے مصنف ہیں اور عبد الکریم شہرستانی پر ختم ہوتا ہے جن کی نہایۃ الاقدام اور الملل والنحل علم کلام پر اہم ترین کتابیں ہیں۔

معتزلہ کے فلسفیانہ عقائد کی وجہ سے اسلامی عقائد میں جو غلط افکار و نظریات رائج ہو گئے تھے امام ابوالحسن اشعری نے ان کی اصلاح کی۔ چونکہ امام اشعری کا تعلق پہلے معتزلہ سے تھا اور معتزلی عقائد سے تائب ہو کر اہل سنت والجماعت کے موقف کو اختیار کیا تھا۔ اسلئے معتزلی عقائد سے بخوبی واقف تھے اور انہی کے طریقے سے ان کی دلیلوں کو رد کیا۔ اور ان مسائل کے سلسلے میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا جن میں ارباب نقل و عقل کے درمیان اختلاف تھا۔

وہ مسائل جن میں امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کے عقائد کی مخالفت کی ہے درج ذیل ہیں:

1۔ توحید باری تعالیٰ کے سلسلے میں نہ تو انہوں نے معتزلہ کا عقیدہ اختیار کیا جو اللہ تعالیٰ کے تعلق سے صفات کے منکر ہیں اور نہ حشویہ کی فکر کی حمایت کی جنہوں نے صفات باری تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیا ہے۔ بلکہ ایک بیچ کا موقف اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں لیکن نہ وہ عین ہیں اور نہ ان کا غیر اور نہ وہ مخلوق کے مشابہ ہیں جس سے تجسیم کا شبہ ہو۔

2۔ صفات باری تعالیٰ کے تعلق سے امام اشعری کا عقیدہ یہ ہے کہ سات صفات اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ ہیں۔ وہ یہ ہیں علم، قدرت، ارادہ، سمع ،بصر، کلام آور تکوین یہ صفات ازلی وابدی ہیں۔ اس کے علاوہ جو صفات ہیں وہ صفات فعلیہ ہیں جیسے استواء علی العرش۔ اللہ کا نزول وغیرہ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے کہ جب چاہے وہ انہیں انجام دے یا نہ دے۔ جبکہ اس کے بر عکس معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات اس کی ذات کا لازمی حصہ ہیں وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتیں یعنی اللہ تعالیٰ کی صرف ذات ہے صفات نہیں ہیں۔

3۔ معتزلہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننے کے بجائے اس کو مخلوق سمجھتے ہیں۔ اشعری کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید بھی اللہ تعالیٰ کی صفت کلام ہے۔ اسلئے کلام اللہ بھی ازلی اورابدی ہے اور قرآن مجید اللہ کی مخلوق نہیں ہے۔

4۔ معتزلہ رویت باری تعالیٰ کے قائل نہیں ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہیں جا سکتا نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ کیونکہ اس سے اللہ کے جسم ہونے کا گمان ہوتا ہے اور جسم محدود ہوتا ہے۔ ابوالحسن اشعری کا عقیدہ یہ ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ یہ اللہ کا مومنین سے وعدہ ہے۔ البتہ کسی کو دیکھے جانے کیلئے جسم کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ آخرت میں اس کی صورت و کیفیت کیا ہو گی یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔

5۔ معتزلہ نے عدل کا نظریہ اختیار کیا جس میں انسان کو خود اپنے افعال کا خالق تسلیم کیا گیا ہے۔ یعنی بندہ جو کچھ کرتا ہے اپنے اختیار اور آزادی سے کرتا ہے۔ امام ابوالحسن اشعری کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے اور ہر چیز اللہ کے ارادے و قدرت میں ہے۔ البتہ بندوں کو ''کسب'' کا اختیار دیا گیا ہے اور جو جس بات کو اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ انسان کے اندر اس کے عمل کی قوت پیدا کر دیتے ہیں اور آخرت میں کسب کی بنیاد پر انسان کو عذاب وثواب دیا جائے گا۔

6۔ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر بلکہ کفر واسلام کے درمیانی درجہ میں رہتا ہے۔ امام ابوالحسن اشعری کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن تو رہتا ہے لیکن اپنے گناہوں کی پاداش میں وہ جہنم کے عذاب کا مستحق ہو سکتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ چاہیں تو اس کو عذاب دیں اور چاہیں تو معاف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ پر عذاب دینا لازم نہیں ہے۔ اشعری نے یہ بھی فرمایا کہ ایمان دل سے اقرار کرنے کا نام ہے اور اعمال ایمان کا رکن ہیں لیکن یہ ایمان کا حصہ نہیں ہیں۔ اعمال کے ترک سے انسان گناہ گار تو ہو گا لیکن ایمان سے خارج نہیں ہو گا اور نہ ہمیشہ کیلئے جہنمی ہو گا۔

7۔ معتزلہ آخرت کے متعلق بہت سی حالتوں اور کیفیتوں کے تعلق سے مثلاً پل صراط، میزان اور نبیؐ کی شفاعت وغیرہ۔ وہ یا تو ان کے سرے سے منکر ہیں یا پھر ان کی عقلی توضیح و تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن امام ابوالحسن اشعری ان تمام احوال و کیفیات کے قائل ہیں اور نبی

کریمؐ کی شفاعت کو تسلیم کرتے ہیں۔

8۔ معتزلہ معجزات کے بھی قائل نہیں ہیں اور قرآن مجید میں جن معجزات کا تذکرہ ہے وہ ان کی تاویل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی علت پیدا ہو جائے تو اس کے معلول کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ مثلاً پانی ہے تو ضروری ہے کہ وہ ڈبوئے یا آگ ہے تو لازمی ہے کہ وہ جلائے۔ امام اشعری کا استدلال یہ ہے کہ یہ بات درست ہے کہ علت و معلول ایک دوسرے کے ساتھ موجود ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کسی خاص موقع پر وہ علت و معلول کے تعلق کو ختم کر دیں۔

اشاعرہ کے وہ عقائد جن سے معتزلہ کو اختلاف ہے۔ وہ یہ ہیں:

1۔ اشعری کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو کسی جرم کے بغیر سزا دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ایسا کرتے نہیں ہیں۔ معتزلہ اس کے خلاف ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کہ عدل کے خلاف ہے۔

2۔ اللہ جو چاہیں اپنے بندوں کے ساتھ کریں۔ اللہ پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ وہی کریں جو بندوں کے لئے اصلح ہو تا ہے۔ معتزلہ کا موقف اس کے برعکس ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کو جاننا اور اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرنا بندوں پر اس کے حکم اور شریعت کی رو سے واجب ہے نہ کی عقل کی رو سے واجب ہے جبکہ معتزلہ کے نزدیک عقل کی رو سے بھی اللہ تعالیٰ کو پہچاننا واجب ہے۔

4۔ اشاعرہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ بات جائز ہے کہ وہ بندوں کو ایسے کام کا مکلف بنائے جو اس کی قوت سے باہر ہو۔ معتزلہ کا نظریہ اس کے بر خلاف ہے۔ البتہ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر کام کا مکلف نہیں بناتے ہیں۔

5۔ اشعری کا ماننا ہے کہ زندگی کے لئے جسم یا کسی خاص شکل کا ہونا ضروری نہیں ہے جیسے آگ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ زندگی، عقل اور قوت گویائی پیدا کر سکتے ہیں۔ جبکہ معتزلہ اس کے بر خلاف کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے۔ وغیرہ۔

22.3 ابو منصور ماتریدی

22.3.1 حالات زندگی

امام ابو منصور ماتریدی کا اصل نام محمد بن محمد بن محمود ہے۔ آپ ماوراء النہر میں سمرقند کے ایک مقام ماتریدیہ میں پیدا ہوئے۔ اس نسبت سے ماتریدی کہلائے اور یہ مکتبۂ فکر بھی آپ کے نام کی طرف منسوب ہے۔ آپ کے ابتدائی زندگی کے حالات اور سن ولادت یقینی طور پر معلوم نہیں ہیں لیکن محققین نے ان کی سن ولادت قیاس کر کے 853ء بتائی ہے۔ البتہ ان کی وفات 944ء میں سمرقند میں ہوئی۔ آپ نے اپنے عہد کے بڑے علماء احناف سے علم فقہ و علم کلام کی تعلیم حاصل کی۔ ان میں چند اہم نام یہ ہیں: شیخ نصیر بن یحیٰ البلخی، ابو نصر العیاضی، ابو بکر احمد جوزجانی، محمد بن مقاتل رازی وغیرہ۔ ماتریدی دو واسطوں سے قاضی ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد تھے۔

ابو منصور ماتریدی کا تعلق فقہ حنفی سے تھا اور اصول دین میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ماتریدی کو جن آثار و نتائج تک رسائی حاصل ہوئی وہ کسی حد تک امام ابو حنیفہؒ کے افکار و نظریات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ آپ عقائدی مسائل میں تقریباً 22 مرتبہ مناظرہ کے لیے بصرہ گئے کیونکہ ان دنوں وہاں احناف اور شوافع کے درمیان علم فقہ و اصول فقہ کے موضوع پر مجادلہ و مناظرہ کا بازار گرم تھا۔

علم کلام اور اصول فقہ میں آپ کی اہم تصانیف ہیں۔ ان میں چند کتابوں کے نام یہ ہیں: بیان وھم المعتزلہ، تاویلات اہل السنۃ، الدرر فی اصول الدین، عقیدۃ الماتریدیہ، کتاب التوحید و اثبات الصفات، کتاب الجدل، ماخذ الشرائع فی اصول الفقہ اور کتاب مقالات فی الکلام وغیرہ۔ علامہ کوثری اپنی کتاب اشارات المرام کے مقدمہ میں ابو منصور ماتریدی کے متعلق لکھتے ہیں:

> بلاد ماوراء النہر بدعات کی آلودگی سے پاک و صاف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دلوں پر بلا شرکت غیرے حدیث نبویؐ کا سکہ جاری تھا۔ احادیث و آثار کا یہ سلسلہ سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا۔ تا آنکہ ماوراء النہر کے امام السنت ابو منصور ماتریدی جن کو امام ہدایت کے لقب سے پکارا جاتا تھا منظر عام پر آئے۔ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مسائل و دلائل کی تحقیق کی نذر کر دیا اور اپنی گراں بہا تصانیف میں عقل و مذہب دونوں کو پیش نظر رکھا۔

22.3.2 علم کلام

اگرچہ امام ابو منصور ماتریدی کو علم کلام میں وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو امام ابوالحسن اشعری کو حاصل ہے۔ حالانکہ فقہ حنفی کے علماء کے کلامی مسائل وہی ہیں جو اشاعرہ کے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے امام ابو منصور ماتریدی کی علم کلام میں شہرت نہ ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حنفی علماء نے علم کلام اور اس سے متعلق موضوعات پر بہت کم توجہ دی ہے۔ اس کے برعکس علم کلام پر اہم تصانیف زیادہ تر شوافع علماء کی ہیں اور ان کا تعلق اکثر اشاعرہ سے تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس طرح کے شاگرد اور متبعین امام ابوالحسن اشعری کو ملے اس طرح کے شاگرد امام ابو منصور ماتریدی کو نہ مل سکے جو ان کے مسلک کو وسعت دیتے اور ان کی مقبولیت کو علم کلام میں عام کرتے۔ بہرحال ابو منصور ماتریدی نے بہت سے کلامی مسائل میں ابوالحسن اشعری سے اختلاف کیا اور علم کلام میں اپنا ایک الگ موقف اختیار کیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اہل سنت والجماعت کے طریقے سے انحراف نہیں کیا اور امام ابوالحسن اشعری کی طرح سلف سے اپنے رشتہ کو استوار رکھا۔

ماتریدیہ کے عقائد عقل و نقل دونوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ انہوں نے عقائد کی جو تشریح و توضیح کی ہے وہ قرآن و حدیث سے مخالف بھی نہیں ہیں اور عقل سے ہم آہنگ بھی ہیں۔ اس لئے اکثر علماء کا خیال ہے کہ ابو منصور ماتریدی کے نظریات اہل سنت والجماعت میں سب سے زیادہ اسلامی شریعت کے مطابق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشاعرہ کے بعد یہ مسلم دنیا میں سب سے بڑا اعتقادی مذہب ہے خاص کر خلافت عثمانیہ کے اس کو اختیار کر لینے کی وجہ سے اسے ایک نئی قوت حاصل ہو گئی تھی۔

22.3.3 ماتریدیہ عقائد و نظریات

اشعری اور ماتریدی دونوں ہی چوں کہ معتزلہ ہی کے مخالف تھے۔ اس لیے اکثر علماء کا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ شیخ محمد عبدہ اپنی کتاب العقائد العقدیہ میں لکھتے ہیں کہ

"ماتریدیہ اور اشاعرہ کا باہمی اختلاف دس مسائل سے متجاوز نہیں اور وہ بھی صرف نزاع لفظی کی حد تک ہے"۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ علم کلام کے ماہرین نے ان مسائل کی تعداد 3 سے لیکر 50 تک بیان کی ہے۔ جن میں امام ماتریدی اور امام اشعری کے درمیان اختلاف ہے۔ شبلی نعمانی کے مطابق جن مسائل میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

1۔ اشاعرہ کا کہنا ہے کہ شرع کی بنیاد پر ہی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا اور اس پر ایمان لانا واجب ہے جبکہ ماتریدیہ کے نزدیک عقل کی بناء پر بھی ایمان لانا واجب ہے۔

2۔ ماتریدیہ کے یہاں ایمان میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی حالانکہ اشاعرہ ایمان میں کمی وزیادتی کو مانتے ہیں۔

3۔ ماتریدیہ کہتے ہیں کہ اللہ کا وہ کلام نہیں سنا جاتا جو قدیم ہے بلکہ وہ عبارت سنی جاتی ہے جو اس کلام قدیم کی ترجمان ہے۔ جبکہ اشاعرہ کے نزدیک بعینہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنا جاتا ہے۔

4۔ ماتریدیہ کے نزدیک زندگی سے ناامیدی کی حالت میں بھی توبہ قبول ہوتی ہے جبکہ اشاعرہ کے نزدیک حالت یاس کی توبہ قبول نہیں ہوتی ہے۔

5۔ ماتریدیہ کے نزدیک کافروں کو ترک اعمال پر عذاب نہیں ہوگا بلکہ انہیں صرف کفر کا عذاب دیا جائے گا۔ جبکہ اشاعرہ کفر کے علاوہ ترک اعمال کے سبب مزید عذاب دیے جانے کے قائل ہیں۔

6۔ ماتریدیہ کے نزدیک انبیاء کرام کبائر وصغائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ جبکہ اشاعرہ کا کہنا ہے کہ انبیاء سے کبائر کا ارتکاب نہیں ہوتا لیکن صغائر کا ارتکاب ہوسکتا ہے۔

7۔ ماتریدیہ کے یہاں اللہ تعالیٰ کے تمام کام حکمت ومصلحت پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ اشاعرہ کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔

8۔ ماتریدیہ کے نزدیک اشیاء کا حسن وقبیح یعنی اچھا یا برا ہونے کا ادراک عقل کے ذریعے ممکن ہے جبکہ اشاعرہ کا کہنا ہے کہ اشیاء کا حسن وقبیح جاننے میں اعتبار صرف شریعت کا ہے عقل کا اعتبار نہیں ہے۔

9۔ ماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ازلی اور قدیم ہیں جبکہ اشاعرہ کا کہنا ہے کہ صرف صفات ذاتیہ قدیم ہیں جو آٹھ ہیں باقی صفات فعلیہ ازلی وابدی نہیں ہیں۔

10۔ ماتریدیہ کہتے ہیں کہ تقلیدی طور پر ایمان لانا معتبر ہے۔ اشاعرہ کے نزدیک دلیل کے ذریعے شعوری طور پر ایمان لانے کا ہی

صرف اعتبار ہو گا۔

11۔ماتریدیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ ووعید کے خلاف نہیں کرتے اگرچہ یہ اس کی قدرت میں ہے جبکہ اشاعرہ کا ماننا ہے کہ اللہ تعالیٰ کر سکتے ہیں۔

12۔ماتریدیہ کا موقف یہ ہے کہ خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں ٹھہراتا۔اشاعرہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ طاقت سے زیادہ بندوں کو مکلف بنا سکتے ہیں۔

13۔اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے تو اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں اس پر دونوں کا اتفاق ہے۔لیکن پھر وہ شخص تائب ہو جائے تو اس کے متعلق ماتریدیہ کی رائے یہ ہے کہ اس کے اعمال واپس آجائیں گے اور اس کو ان کا اجر ملے گا،جبکہ اشاعرہ کی رائے اس کے برعکس ہے۔

وہ مسائل جن میں ماتریدیہ کا نظریہ معتزلہ سے مختلف ہے۔وہ یہ ہیں:

1۔معتزلہ کے نزدیک ایمان تصدیق،اقرار اور عمل کا مجموعہ ہے۔ماتریدیہ کے نزدیک اصل ایمان دل سے تصدیق کرنا ہے۔

2۔معتزلہ کے نزدیک گناہِ کبیرہ کا مرتکب دنیا میں کفر و ایمان کے درمیانی درجہ میں ہے اور آخرت میں اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جبکہ ماتریدیہ کے نزدیک وہ مومن ہے۔

3۔معتزلہ کے نزدیک ایمان میں کمی وزیادتی ہوتی ہے جبکہ ماتریدیہ کا کہنا ہے کہ ایمان میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی۔

4۔معتزلہ کا کہنا ہے کہ مقلد کے ایمان کا اعتبار نہیں ہو گا جبکہ ماتریدیہ کے نزدیک مقلد کے ایمان کا اعتبار ہو گا البتہ دلیل سے نہ سمجھنا اس کی غلطی ہے۔

5۔معتزلہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے منکر ہیں جبکہ ماتریدیہ اللہ تعالیٰ کی 8 صفات ذاتیہ کو ثابت کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں:علم، حیات،قدرت،ارادہ،سمع،بصر،کلام اور تکوین۔

6۔معتزلہ کہتے ہیں کہ عقائد کو جاننے کا ذریعہ عقل ہے۔اشاعرہ کہتے ہیں کہ نقل ہے۔جبکہ ماتریدیہ نے درمیانی موقف اختیار کیا۔وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور رسالت و نبوت کی معرفت عقل سے ہے اور آخرت کی تفصیلات کو جاننے کا ذریعہ نقل ہے۔

7۔معتزلہ کے نزدیک بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ماتریدیہ کا کہنا ہے کہ افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور بندہ کو کسب کی صلاحیت دی گئی ہے۔

8۔معتزلہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے قائل نہیں ہیں نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ماتریدیہ آخرت میں رویت باری تعالیٰ کے قائل ہیں۔

9۔معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید ازلی نہیں ہے،مخلوق ہے۔جبکہ ماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کلام نفسی ازلی وابدی ہے اور غیر مخلوق ہے۔

10۔ معتزلہ کا کہنا ہے کہ حقیقت میں جنت و جہنم ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ قیامت میں پیدا کئے جائیں گے۔ ماتریدیہ کے نزدیک دونوں پیدا ہو چکے ہیں۔

11۔ معتزلہ عذاب قبر، میزان، پل صراط اور شفاعت کے قائل نہیں ہیں جبکہ ماتریدیہ ان سب کے قائل ہیں۔

ماتریدیہ جن امور میں معتزلہ کی موافقت کرتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

1۔ اشیاء کے حسن و قبیح کو معلوم کرنے کا ذریعہ عقل بھی ہے البتہ معتزلہ کے نزدیک عقل کافی ہے جبکہ ماتریدیہ عقل کو حکم الٰہی کے تابع بتاتے ہیں۔

2۔ اللہ تعالیٰ بندوں کو ان چیزوں کا مکلف نہیں بناتا جو اس کی طاقت میں نہ ہوں۔

3۔ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حکمت و علت پر مبنی ہوتا ہے۔

4۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا اور ایمان لانا عقل کے ذریعہ واجب ہے خواہ شارع کی نص اس تک نہ پہنچے۔

5۔ عقائد میں تنہا خبر واحد کا اعتبار نہیں ہے۔ وغیرہ۔

22.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اشعری مکتب فکر کے بانی امام ابو الحسن اشعری اور ماتریدیہ مکتب فکر کے بانی ابو منصور ماتریدی ہیں۔
- اشعری مکتب فکر میں بعد میں ابو بکر باقلانی، ابو اسحاق اسفرائی، ابو بکر بن فورک، علامہ جوینی اور امام ابو محمد غزالی جیسے عظیم متکلمین پیدا ہوئے جنھوں نے اس مکتب فکر کو نئی بلندی عطا کی۔
- امام ابو الحسن اشعری اور امام ابو منصور ماتریدی نے اپنی کتابوں میں جن عقائدی مسائل کا ذکر کیا ہے وہ اہل سنت والجماعت کے متفقہ عقائد و نظریات ہیں۔
- اشاعرہ اور ماتریدیہ دونوں ہی مکاتب فکر نے اعتقادی مسائل میں اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کیا ہے۔
- اشاعرہ نے قرآن اور سنت کی روشنی میں وہ کلامی مسائل بیان کئے ہیں جن میں معتزلہ سے اختلاف تھا۔
- ماتریدی مکتب فکر نے عقل و نقل سے ہم آہنگ اسلامی عقائد کی ایسی تشریح و تعبیر کی ہے جو کتاب و سنت کے مطابق بھی ہے اور عقل سے متصادم بھی نہیں۔
- اشعری اور ماتریدی کے درمیان مختلف فیہ مسائل بہت کم ہیں بلکہ ماتریدی کا مذہب معتزلہ اور اشعری کے درمیان ہے۔
- امام ابو الحسن اشعری نے علم کلام میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ علم کلام کو شریعت اور عقلی دلائل سے ہم آہنگ کرنے کا عظیم الشان کارنامہ انہی کا ہے۔

- ابو منصور ماتریدی نے کئی کلامی مسائل میں امام اشعری سے اختلاف کیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اہل سنت والجماعت کے طریقے سے انحراف نہیں کیا ہے۔

22.5 نمونہ امتحانی سوالات

22.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. کس علم میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے بحث کی جاتی ہے؟

(a).علم منطق (b).علم فقہ (c).علم کلام (d).علم نحو

2. ان میں سے کس حکومت کے خلفاء نے ماتریدی مذہب اختیار کر لیا تھا؟

(a).خلافت راشدہ (b).خلافت بنو امیہ (c).خلافت عباسیہ (d).خلافت عثمانیہ

3. ان میں سے کون سا فرقہ صفات باری تعالیٰ کا منکر ہے؟

(a).معتزلہ (b).اشاعرہ (c).ماتریدیہ (d).حنابلہ

4. ماتریدیہ فرقہ کے نزدیک گناہ کبیرہ کے مرتکب کی کیا حیثیت ہے؟

(a).مومن (b).درمیانی درجہ میں ہے (c).مشرک (d).کافر

5. مقالات الاسلامیین کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(a).امام ابو منصور ماتریدی (b).امام ابوالحسن اشعری (c).امام رازی (d).امام غزالی

6. ”ایمان میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی ہے“ اس نظریہ کے قائل کون ہیں؟

(a).اشاعرہ (b).معتزلہ (c).خوارج (d).ماتریدیہ

7. ابو علی جبائی معتزلی کی پرورش میں کون رہا؟

(a).ابو بکر احمد جوزجانی (b).ابو منصور ماتریدی (c).ابوالحسن اشعری (d).ابو بکر باقلانی

8. ابو منصور ماتریدی کا تعلق کس فقہی مسلک سے تھا؟

(a).مالکی (b).حنفی (c).شافعی (d).حنبلی

9. ”کتاب التوحید واثبات الصفات“ کے مصنف کا نام بتائے؟

(a).امام غزالی (b).علامہ جوینی (c).امام رازی (d).ابو منصور ماتریدی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

10. قرآن مجید کو مخلوق کون سا فرقہ مانتا ہے؟

(a). خوارج (b). معتزلہ (c). اشاعرہ (d). ماتریدیہ

22.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ماتریدی مکتب فکر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
2. علم کلام میں ابوالحسن اشعری کی خدمات بیان کیجیے۔
3. ان مسائل کو بیان کیجیے جن میں ماتریدیہ اور معتزلہ کے درمیان اختلاف ہے۔
4. اشعری مکتب فکر کا جامع تعارف کرایے۔
5. ان مسائل کا ذکر کیجیے جن میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان اختلاف ہے۔

22.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. امام ابوالحسن اشعری کی حیات وخدمات پر ایک مضمون لکھیے۔
2. ماتریدی مکتب فکر پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. اشعری مکتب فکر کے بنیادی عقائد اور نظریات بیان کیجیے۔

22.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. الابانہ عن اصول الدیانہ : امام ابوالحسن اشعری
2. مقالات اسلامیین : امام ابوالحسن اشعری
3. کتاب التوحید : امام ابو منصور ماتریدی
4. التمہید : علامہ باقلانی
5. العقیدۃ الطحاوی : امام ابوجعفر طحاوی
6. تاریخ المذاہب الاسلامیہ : شیخ محمد ابوزہرہ، ترجمہ: غلام احمد حریری
7. الکلام : علامہ شبلی نعمانی
8. علم الکلام : علامہ شبلی نعمانی

اکائی 23: مشہور متکلمین (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

23.0 تمہید

23.1 مقاصد

23.2 ذاتی احوال

23.3 شخصیت اور کارنامے

23.4 علم کلام میں غزالی کا حصہ

23.5 غزالی کا کلامی تصنیفات

23.5.1 الجامع العوام عن علم الکلام

23.5.2 المنقذ من الضلال

23.5.3 تھافت الفلاسفۃ

23.5.4 فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ

23.5.5 الاقتصاد فی الاعتقاد

23.6 کلامی روایت پر غزالی کے اثرات

23.7 غزالی کے کلام وافکار و نظریات

23.7.1 علم کلام کی حقیقت غزالی کی نظر میں

23.7.2 علم کلام کا مقصد امام غزالی کی نظر میں

23.7.3 علم کلام کا حکم

23.7.4 نص کی تاویل اور اس کا حکم

23.7.5 عقل و نقل میں تطبیق کا مسئلہ

23.7.6 غزالی کا نظریہ علم

23.7.7 کلامی مسائل میں تکفیر کا مسئلہ
23.8 اکتسابی نتائج
23.9 نمونہ امتحانی سوالات
23.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
23.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
23.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
23.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

23.0 تمہید

اس اکائی میں متکلم کی حیثیت سے امام ابو حامد الغزالی کی شخصیت اور ان کے افکار و خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ غزالی کی نظر میں علم کلام کی کیا اہمیت ہے؟ انہوں نے علم کلام سے متعلق کیا خدمات انجام دیں۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ اسلامی فکر کو عقلی اعتراضات کا نشانہ بنایا جارہا تھا اور اس تعلق سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، انہوں نے کس طرح علم کلام کے تناظر میں اسلامی فکر کی عقلی اساس کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ معتزلہ اور فلاسفہ کی فکر کی رد میں انہوں نے کیا کلامی اصول و ضوابط مرتب کیے اور علم کلام سے متعلق کون سی کتابیں لکھیں؟ ان کے مشمولات اور امتیازات کیا ہیں؟ یہ اور اس قبیل کے اہم موضوعات اور پہلوؤں پر اس اکائی میں بحث کی گئی ہے۔

23.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد علم کلام کے حوالے سے امام غزالی کی خدمات کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں ان کا کیا حصہ ہے؟ علم کلام کے اشعری مکتب فکر میں غزالی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے افکار نے اسلامی فکر خصوصا اس کے اس حصے پر، جس کا تعلق علم کلام اور دین کے عقلی مباحث سے ہے؛ گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس اکائی کا مقصد یہ بھی ہے کہ ایک متکلم کی حیثیت سے ان کی خدمات اور ان کی فکر و شخصیت کے تمام اہم اور ضروری پہلوؤں کا جائزہ سامنے آجائے۔ اس حوالے سے پیدا ہونے والے مختلف سوالات ہیں جیسے عقل و نقل کے درمیان علم کلام کے حوالے سے ان کی کوششوں کی نوعیت کیا ہے؟ وہ کیا عقلی چیلنجز تھے جن کا انہوں نے اپنی کلامی تصنیفات کے ذریعے جواب دینے کی کوشش کی؟ اس تعلق سے ان کی جو تصنیفات ہیں، ان کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس اکائی کا مقصد ہے اس نوع کے ضروری سوالات کا جواب سامنے آجائے۔

23.2 ذاتی احوال

غزالی کا نام محمد اور کنیت ابو حامد ہے۔ اس لحاظ سے وہ ابو حامد الغزالی سے معروف ہیں۔ ایران کے شہر "طوس" میں 1058ء میں پیدا ہوئے اور 1111ء میں ان کی وفات ہوئی۔ فقہ کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں شیخ احمد بن محمد الراذکانی سے حاصل کی پھر "جرجان" کا قصد کیا اور وہاں ابو نصر الاسماعیلی کے حلقۂ درس سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد علم کے مزید حصول کے لئے "نیشاپور" کا رخ کیا جہاں امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی (م 1085ء) سے تلمذ حاصل کیا اور ان کی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ امام الحرمین نے انہیں بحر زخار کے لقب سے نوازا تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 28 سال تھی۔ اس درمیان انہوں نے فقہ، اصول فقہ، منطق، جدل و مناظرہ وغیرہ میں کمال حاصل کیا اور ان کی شہرت کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ خاص طور پر علمی و فکری موضوعات پر معاصر علماء کے ساتھ بحث و مباحثے میں ان کی بے نظیر صلاحیت نے ایک بڑے حلقۂ فکر کو متاثر کیا۔ چنانچہ ان کی علمی عظمت و عبقریت کا اعتراف کرتے ہوئے سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی نے انہیں مدرسہ نظامیہ بغداد میں تدریس کی پیش کش کی، جسے غزالی نے قبول کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چونتیس سال تھی۔

مدرسہ نظامیہ میں غزالی نے چار سال تعلیم و تدریس اور افتاء کی خدمات انجام دیں۔ ان کے درس اور علمی نشستوں میں وقت کے بڑے بڑے اصحاب علم و دانش شریک ہونے لگے اور ان کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی۔ اس اثنا میں غزالی کے اندر شدت کے ساتھ یہ احساس ابھرنے لگا کہ ان کی یہ عزت و شہرت ان کی روحانی زندگی کے لیے نقصان دہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسہ نظامیہ سے استعفیٰ دے دیا اور گیارہ سال شام، فلسطین، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں جاہ و شہرت سے دور رہ کر خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے۔ غزالی نے اس کی روداد اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں لکھی ہے۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک مدرسہ نظامیہ میں تدریس کی خدمات انجام دینے کے بعد وہ اپنے وطن طوس لوٹ گئے اور وہیں اپنی خانقاہ قائم کر کے تدریس و عبادت اور تصنیف و تالیف میں اپنی زندگی گزار دی۔ 1111ء میں طوس میں ہی ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

23.3 شخصیت اور کارنامے

غزالی کی علمی و فکری خدمات اور کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں جب کہ اسلامی فکر کو مختلف چیلنجوں کا سامنا تھا۔ باطنیوں کی شورشوں نے عالم اسلام کے مراکز میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مسلم فرقوں کی کثرت سے اسلامی اجتماعیت پارہ پارہ ہو رہی تھی اور فکر اسلامی کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ مختلف مسلم جماعتوں: اشاعرہ، معتزلہ، حنابلہ، شیعہ، اہل سنت ایک دوسرے کی تکفیر میں مشغول تھیں۔ سیاسی قوت کمزور ہونے کی وجہ سے سماجی تانا بانا کمزور ہو رہا تھا اور لوگوں کی اخلاقی حالت زوال کا شکار ہو رہی تھی۔ ایسے ماحول میں غزالی نے اپنی اصلاحی کوششوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے کتاب "احیاء علوم الدین" لکھی جس میں انہوں نے عوام الناس کی اخلاقی خرابیوں اور ان کی اصلاح پر تفصیلی بحث کی۔ باطنیوں کی اسلام مخالف سرگرمیوں کا پردہ فاش کرنے کے لئے انہوں نے "فضائح الباطنية" لکھی۔ تکفیر میں غلو و افراط کی صورتحال پر بند باندھنے کے لئے "فیصل التفرقه بین الاسلام و الزندقة" قلم بند کی۔

تاہم ان کے علمی و فکری کارناموں کی وہ جہت جس سے انہیں زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور وہ ایک طرح سے ان کی شخصیت کا عنوان بن گئی، اسلامی فلسفہ اور علم کلام میں ان کے بے نظیر کارنامے ہیں۔ فکر اسلامی کے ڈھانچے کی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر حفاظت کے لیے انہوں نے ایک طرف یونانی فلسفے کو رد کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کی تو دوسری طرف علم کلام کی تشکیل کو اپنی فکری کاوشوں کا خصوصی عنوان بنایا۔ چنانچہ فلسفہ کے موضوع پر ان کی تحریر کردہ دو کتابیں ہیں: "مقاصد الفلاسفه" اور "تهافت الفلاسفه" ان کے کام کا اہم حوالہ ہیں۔ خاص طور پر موخر الذکر کتاب کو اس حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے یونانی فلسفے کی طرف سے اسلامی فکر کو درپیش چیلنجوں کا جواب دینے میں اہم رول ادا کیا۔ علم کلام پر انہوں نے متعدد کتابیں قلم بند کیں جیسے "الجام العوام عن علم الكلام"، "الاقتصاد في الإعتقاد" اور "قواعد العقائد" وغیرہ۔ اس حوالے سے ان کے کام کی ایک اہم نوعیت یہ ہے کہ انہوں نے مذہب اور عقل کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "جواہر القرآن"، "قانون التآويل"، "القسطاس المستقيم" جیسی کتابیں خصوصیت کے ساتھ اس ضمن میں آتی ہیں۔

غزالی تاریخ اسلامی کی ان چند اہم شخصیات میں سے ایک ہیں جنہیں بجا طور پر اپنے دور کا مجدد شمار کیا جاتا ہے۔ غزالی کی شخصیت کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک قاموسی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی عبقری شخصیت کے اندر متنوع صلاحیتیں اس طرح جمع ہو گئی تھیں جن کا اجتماع ایک شخصیت کے اندر کم ہی نظر آتا ہے۔ اعلی درجے کی ذہانت و فطانت کے ساتھ ان کا ذہن تقلید کی بندشوں اور گروہی عصبیتوں سے آزاد تھا۔ وہ مجتہدانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اس لیے انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس میں فکر کی جدت اور تازگی نظر آتی ہے۔ جامعیت کے علاوہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اعتدال اور لچک ہے۔ انہوں نے اسلامی روایت کے علاوہ غیر اسلامی روایت سے استفادہ کرنے میں کسی تامل سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فکر میں مختلف ذوق ورجحان رکھنے والے مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی دانش ورطبقات کے لئے کشش پائی جاتی ہے۔

اسلامی تاریخ کی چند ان اہم شخصیات جنہوں نے اسلامی فکر و ثقافت پر انمٹ اور سنہرے نقوش چھوڑے ہیں، ان میں غزالی سرفہرست ہیں۔ اسلامی فکر پر غزالی کے اثرات اتنے وسیع ہیں کہ نو صدیاں گزر جانے کے باوجود نہ صرف یہ کہ غزالی کی فکر کی اہمیت ومعقولیت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ مزید اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں کہ امام غزالی سے قبل امام الحرمین الجوینی، قاضی ابو بکر باقلانی اور ابوالحسن اشعری جیسی عظیم شخصیات پیدا ہوئیں جن کی فکر و شخصیت کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے لیکن ان کا دائرہ خواص تک محدود تھا لیکن غزالی کی عظمت کا اہم راز یہ ہے کہ ان کا دائرہ اثر عوام وخواص بلکہ پوری امت مسلمہ ہے۔ اس کی وجہ علامہ قرضاوی کی نگاہ میں ان کا اخلاص وللہیت ہے۔

23.4 علم کلام میں غزالی کا حصہ

غزالی کی شخصیت مختلف صفات کا مجموعہ ہے لیکن ایک متکلم کی حیثیت سے انہیں امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ غزالی نے علم کلام کو

اہل سنت والجماعت کے ایک معتدل منہج پر استوار کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ علم کلام کے میدان میں ان کی خدمات اور کارناموں کا صحیح اندازہ اس عہد اور ماحول کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے جس میں غزالی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ یہ عہد مختلف حیثیتوں سے نہایت نازک صورتحال سے گزر رہا تھا۔ اسلام کی سیاسی قوت کمزور ہو چکی تھی۔ دوسری طرف یونانی فلسفے اور مختلف ادیان و مذاہب کے نظریات کے پھیلنے کے نتیجے میں مختلف اطراف سے اسلام اور اسلامی فکر کو اعتراضات و تنقیدات کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ اسلام کے عقائد و نظریات عقل کے مطابق نہیں ہیں۔

ان اعتراضات سے اسلامی فکر کے دفاع میں بعض اسلامی جماعتوں نے، جن میں معتزلہ پیش پیش تھے، اسلامی نظریات وعقائد کی بے جا اور باطل تاویلات کا سہارا لیا۔ انہی جماعتوں میں باطنیہ اور فلاسفہ جیسی جماعتیں سامنے آئیں، جنھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ قرآن و حدیث کی نصوص کے جو ظاہری معنی نظر آتے ہیں، وہ سرے سے مراد نہیں ہیں بلکہ ان کے باطنی معنیٰ مراد ہیں۔ اس شور اور ہنگامے میں اشاعرہ اور حنابلہ جیسی اہل سنت سے تعلق رکھنے والی جماعتیں تھیں جو بجائے خود اپنے نظریات میں غلو اور انتہا پسندی کا شکار اور ایک دوسرے کی تکفیر میں مبتلا تھیں۔ ایسے ماحول میں غزالی سامنے آئے اور انہوں نے خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر کلامی نظریات کو منضبط کرنے اور اس حوالے سے اسلامی فکر کو اعتدال کی شاہراہ پر آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے فلاسفہ اور باطنیہ کے ان افکار کا زور توڑ دیا جن کا اثر اسلامی الٰہیاتی فکر پر پڑ رہا تھا۔ انہوں نے حقیقت اعلی تک رسائی کے لیے وجدان پر زور دیا اور تصوف کو اس کا عملی وسیلہ ٹھہرایا۔ غزالی خود اشعری تھے لیکن متعدد معاملات میں انہوں نے اشاعرہ سے اختلاف کیا۔ خاص طور پر ان معاملات میں جن میں اشاعرہ نے عقل کی اہمیت کو کم کر دیا ہے اور دوسرے اسلامی فرقوں کے تعلق سے ان کے رویے میں تنگی اور عصبیت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غزالی نے علم کلام کی ایک معتدل شاہراہ قائم کی۔ انہوں نے علم کلام کے پورے ڈھانچے میں اصلاحات کیں اور اس تعلق سے نئے مسائل کا اضافہ کیا۔ علم کلام پر فلسفے کی جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی۔ مولانا علی میاں ندوی نے "تاریخ دعوت و عزیمت" میں بجا طور پر لکھا ہے کہ غزالی کے وقت تک: "فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا اور متکلمین اسلام صفائی کے وکیل تھے۔ فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا تھا اور علم کلام سپر بننے کی کوشش کرتا تھا۔۔۔۔ پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعانہ تھا۔ غزالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا"۔ اور گویا اس طرح علم کلام کو خود اعتمادی کے ساتھ باطل نظریات سے مقابلہ آرائی کا موقع ملا۔

23.5 غزالی کا کلامی تصنیفات

علم کلام اور اس سے تعلق رکھنے والے موضوعات پر غزالی نے متعدد اہم کتابیں تصنیف کیں جن میں سے چند اہم کتب و رسائل کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

23.5.1 الجام العوام عن علم الکلام

اس کتاب میں غزالی نے بنیادی کلامی مسائل کے حوالے سے سلف کے مسلک کو غلو و افراط سے پاک کر کے واضح کرنے کی کوشش

کی ہے جن میں سب سے اہم مسئلہ خدا کی صفات کا ہے۔ انہوں نے مسلک سلف کے مطابق خدا کی ہر قسم کی تشبیہ و تجسیم سے تنزیہ کی ہے۔ اسی طرح ایمان و تصدیق کے مسئلے پر کلام کیا ہے۔ نصوص کی تاویل کے اصول و احکام پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کن امور میں تاویل جائز ہے یا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے کہ علم کلام میں مشغول ہونا کن لوگوں کے لئے جائز ہے اور کن لوگوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ جو لوگ علم کلام میں مشغول ہونے کو ناجائز تصور کرتے ہیں، ان کا بھی جواب دیا ہے اور غیر ضروری کلامی مباحث سے منع کیا ہے اور عام لوگوں کو علم کلام میں مشغول ہونے کو حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب علم کلام پر بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

23.5.2 المنقذ من الضلال

اس کتاب میں غزالی نے اپنے تلاش حق کی داستان لکھی ہے۔ چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ پہلے انہوں نے تمام فرقوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور تقلید کی زنجیر سے آزاد ہو گئے جس کی بنا پر حقائق اشیاء کی معرفت کے بارے میں وہ شکوک وشبہات میں گرفتار ہو گئے اور انہیں محسوس ہوا کہ اشیا سے متعلق یقینی علم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر کس طرح انہیں اس سے نجات حاصل ہوئی، اس کو انہوں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے طالبین حق کو چار فرقوں میں تقسیم کیا ہے: متکلمین، فلاسفہ، باطنیہ، صوفیہ۔ پھر ہر فرقے اور اس کے منہج فکر پر تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے اور تمام کی کمزوریوں اور خامیوں کو واضح کرتے ہوئے صوفیہ کے طریقے کو تمام طریقوں میں سب سے بہتر طریقہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے علوم کی چھ اقسام: ریاضی، منطق، طبیعیات، الٰہیات، سیاست اور اخلاق میں تقسیم کی ہے اور ان کے احکام واضح کیے ہیں۔

23.5.3 تھافت الفلاسفۃ

یہ کتاب مسلم فلاسفہ کے ان نظریات کے رد میں لکھی گئی ہے جن کا تعلق اسلامی الٰہیات سے ہے۔ غزالی نے اس موقف کو مدلل کرکے پیش کیا ہے کہ یونانی فلسفے کو معیار بنا کر جس طرح مسلم فلاسفہ جیسے ابو نصر فارابی، ابو علی سینا وغیرہ نے اسلامی الٰہیات کی تشکیل اور اس کی تشریح و ترجمانی کی ہے، وہ نہ صرف اس لحاظ سے غلط ہے کہ وہ نصوص قرآن و سنت کے منافی ہیں بلکہ خود یونانی فلسفہ اس باب میں اتنا ناقص، کمزور اور تضادات سے پر ہے کہ اس کی بنیاد پر یہ دعوی کرنا ممکن نہیں ہے۔ غزالی نے فلاسفہ کے لئے عقلی اور استدلالی منہج کو اختیار کرتے ہوئے ان کے اصول و نظریات کا رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ فلسفے کا دائرہ الہیات نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق علم غیب کے امور و معاملات سے ہے جن کو وحی سے قطع نظر کرکے صرف اپنی کوششوں سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ فلاسفہ کے جن نظریات کا اس میں رد کیا گیا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں: یہ دنیا ازل سے قائم نہیں ہے اور نہ ابد تک رہے گی بلکہ ایک دن فنا ہو جائے گی۔ خدا کو جزئیات کا علم نہیں ہے۔ آسمان ایک ذی نفس حیوان ہے اور خود اپنے ارادے سے متحرک ہے۔ خرق عادت یا معجزات ممکن نہیں ہے۔ حشر و نشر اور جنت و جہنم کا تصور مجازی ہے، حقیقی نہیں ہے۔

23.5.4 فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ

یہ کتاب کفر اور ایمان کے درمیان حد فاصل کی تحدید اور وضاحت کے لیے لکھی گئی ہے۔ فلسفہ وعلم کلام کے تناظر میں جو کلامی فرقے پیدا ہوئے، ان میں سے متعدد فرقوں کے درمیان تکفیر کی فضا پیدا ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔ غزالی نے اس کتاب میں ان تمام بنیادی نظریات اور اصولوں سے بحث کی ہے جن کی بنیاد پر کسی کو کافر اور اسلام سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کفر اس وقت تک متحقق نہیں ہوتا جب تک شارع کی تکذیب لازم نہ آئے اور شارع کی تکذیب کے لازم آنے کی صورت بہت کم ہے۔

انہوں نے ایمان کے تین بنیادی اصول بیان کیے ہیں: ۱- اللہ پر ایمان ۲- رسول پر ایمان ۳- یوم آخر یعنی حشر ونشر پر ایمان۔ ان کے علاوہ ان کے نزدیک دوسری چیزیں فروعات کی قبیل سے ہیں۔ اور اُن کے انکار سے تکفیر لازم نہیں آتی، الاّ یہ کہ اصول دین میں سے کسی ایسی اصل کا انکار کیا جائے جو رسول اللہؐ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو۔ اسی طرح ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ان تین امور کی بنیاد تکفیر لازم آتی ہے: ۱- صانع عالم کے وجود وصفات اور نبوت کے انکار کا اعتقاد رکھنا۔ ۲- وہ چیز جو ایک شخص کو خدا کی ذات وصفات کے اقرار سے روک دے اور اس سے ایسا تناقض لازم آتا ہو جو ان کے انکار کو ہی مستلزم ہو۔ ۳- تیسرے ایسا عمل جو کسی کافر سے ہی صادر ہو۔ جیسے آگ کی پرستش یا بت کو سجدہ کرنا یا بعض رسولوں کا انکار یا زنا اور شراب کو حلال سمجھنا یعنی تواتر سے ثابت شدہ ضروریات کا انکار کرنا۔

23.5.5 الاقتصاد فی الاعتقاد

علم کلام میں غزالی کی یہ کتاب نہایت اہمیت کی حامل ہے اور علم کلام کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کے موضوعات میں ان تمام ضروری مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے جو اہل سنت اور غیر اہلسنت فرقوں کے درمیان وجہ نزاع بنے ہوئے ہیں لیکن اہل سنت کے فرقوں میں سے خاص طور پر اشاعرہ کے فکری منہج ومسلک کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے جس سے خود غزالی تعلق رکھتے تھے۔ کتاب کے اہم مباحث یہ ہیں: وجود خداوندی اور اس کا قدیم ہونا، خدا کا دیدار ممکن ہے۔ خدا جوہر ہے، عرض نہیں ہے۔ صفات خداوندی کی حقیقت، اشیا کے حسن یا قبح کی بحث، نبوت کا اثبات وغیرہ۔

23.6 کلامی روایت پر غزالی کے اثرات

اسلامی کلامی روایت پر غزالی کی فکر کے غیر معمولی اثرات قائم ہوئے جو بہت وسیع بھی تھے اور دیرپا بھی۔ اہل سنت والجماعت کے کلامی دائرے میں غور کیا جائے تو کلامی فکر پر ابوالحسن اشعری کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہیں کہ اولاً انہوں نے ہی اہل سنت والجماعت کی کلامی فکر کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ انہیں اشعری مکتب فکر کے بانی کی بھی حیثیت حاصل ہے تاہم اشعری مکتب فکر کی اپنی کمزوریاں تھیں جن کو مخالفین اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس میں نقل کے ساتھ عقل کی رعایت کماحقہ ملحوظ نہیں رکھی گئی تھی اس لئے خود اہل سنت سے نسبت رکھنے والوں کے ذہنی تشفی کا سامان اس میں موجود نہیں تھا۔

غزالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کلامی فکر کے ڈھانچے اور اس کے مشتملات کو متعدد سطحوں پر نئے اسلوب و انداز میں استوار کیا اور یہی عقلی اسلوب اور استدلالی منہج خاص طور پر سنی کلامی فکر کی شناخت بن گئی۔ چنانچہ غزالی کے بعد جن شخصیات نے کلامی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا، انہوں نے اپنی کلامی تصنیفات میں غزالی کے ہی استدلالی منہاج کی پیروی کی جیسے فخر الدین رازی، ناصر الدین بیضاوی، عضد الدین ایجی وغیرہ۔ امام غزالی کو بجا طور پر حجۃ الاسلام کے لقب سے نوازا گیا ہے۔

غزالی کی کتابوں کو اساسی مراجع کی حیثیت سے علماء نے اختیار کیا۔ ان کی شروحات لکھیں اور ان کے مباحث کو اپنی کتابوں میں شامل کیا۔ غزالی کی کلامی فکر کے اثرات صرف سنی مکاتب فکر تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ غیر سنی مکاتب فکر کے لیے بھی استفادے کا سامان بنے۔ خاص طور پر الہیاتی مسائل کے حوالے سے فلسفہ کے رد و ابطال کا جو استدلالی منہج غزالی نے وضع کیا، اس کے اثرات مجموعی طور پر پوری اسلامی فکر پر مرتب ہوئے۔ شبلی لکھتے ہیں:

"آج تقریباً تمام دنیا میں الہیات، نبوات، اور معاد کے متعلق مسلمانوں کے جو معتقدات اور مسلمات ہیں، وہی ہیں جو امام صاحب کے مقرر کردہ عقائد ہیں۔۔۔ علم کلام کی جس قدر مشہور تصنیفات ہیں سب امام صاحب کے ہی (مرتب کردہ) عقائد کے گویا شروح و حاشیے ہیں"۔

23.7 غزالی کے کلام و افکار و نظریات

23.7.1 علم کلام کی حقیقت غزالی کی نظر میں

غزالی کی نظر میں علم کلام کو تمام علوم پر فوقیت حاصل ہے۔ "المستصفی" میں انہوں نے علم کی دو قسمیں کی ہیں: عقلی اور دینی۔ پھر عقلی اور دینی کی تقسیم کلی اور جزئی سے کی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ: علوم دینیہ میں سے علم کلی علم کلام ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے علوم جیسے فقہ، اصول فقہ اور حدیث و تفسیر علوم جزئیہ ہیں۔ اس کی وجہ ان کی نظر میں یہ ہے کہ متکلم عمومی طور پر تمام اشیا یعنی موجودات پر نگاہ ڈالتا ہے۔

غزالی لکھتے ہیں کہ علم کلام علوم تفسیر و حدیث کی اساس اور اپنے مرتبے میں اعلی علم (العلم الآعلی) کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ تمام علوم دینیہ کے اصول و مبادی کو ثابت کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کی مراد خدا کے وجود، توحید و رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد و ایمانیات کا اثبات ہے کہ ان کے تسلیم کرنے کے بعد ہی انسان شریعت اور احکام شریعت کا مکلف بنتا ہے۔ ان سے انکار کرنے والوں کے لیے شریعت کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔ علم کی انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کی ہے: علم کی پہلی قسم چھلکے جب کہ دوسری قسم ان کی نظر میں علوم کے مغز کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلی قسم میں عربی قواعد اور تجوید وغیرہ کے علوم آتے ہیں جب کہ دوسری قسم میں علوم قرآن و حدیث آتے ہیں اور علم کلام بھی اس زمرے میں شامل ہے۔

23.7.2 علم کلام کا مقصد امام غزالی کی نظر میں

علم کلام کا مقصد غزالی کی نظر میں گمراہیوں، بدعات وخرافات اور دین سے متعلق پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ کرنا ہے۔ ”المنقذ من الضلال“ میں لکھتے ہیں: ”علم کلام کا مقصد اہل سنت والجماعت کے عقائد کا تحفظ اور اہل بدعت کی فساد انگیزیوں سے ان کو محفوظ رکھنا ہے“۔ (مجموعہ رسائل الامام الغزالی، ص، 540) اس کے ذریعہ غزالی نے ان لوگوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو علم کلام کے ناقد رہے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ علم کلام تمام تر فتنوں اور گمراہیوں کی جڑ ہے۔ چناں چہ امام شافعی کا قول ہے کہ: ”یہ ایسا علم ہے کہ اگر آپ اس میں حق کو پالیں تو اس کا آپ کو کوئی اجر نہیں ملے گا اور اگر غلطی کے مرتکب ہوں تو کفر تک پہنچ جائیں گے“۔

اسی طرح امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ جس نے علم کلام سیکھا وہ زندیق ہو گیا۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ علم کلام دین میں غیر ضروری بحث ومباحثے اور شکوک وشبہات کا دروازہ کھولتا ہے۔ جس سے وہ لوگ جو دینی علوم سے گہری واقفیت نہیں رکھتے، دین پر طعن واعتراض کرنے لگتے ہیں اور اس سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ سعد الدین تفتازانی ”شرح عقائد نسفی“ میں لکھتے ہیں:

انما يحمل هذا ا لطعن والمنع على القاصد لافساد عقائد المسلمين والخائض فيما لا يفتقر اليه من غوامض المتفلسفين۔ یعنی ”اسلاف کرام نے علم کلام کی جو مذمت کی ہے اس کا تعلق ایسے شخص سے ہے جو علم کلام میں مشغول ہو کر مسلمانوں کے عقائد کو خراب کرنے پر آمادہ ہو اور فلسفیوں کے پیدا کردہ ایسے غیر واضح اور مبہم بحثوں میں کودتا ہو جن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

23.7.3 علم کلام کا حکم

غزالی علم کلام کو اعلی ترین علم تصور کرنے کے باوجود اسے دین کے بنیادی دینی علوم: قرآن وحدیث کی طرح نہیں سمجھتے۔ ان کی نظر میں علوم قرآن وسنت بلا تفریق تمام لوگوں کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی حیثیت غذا کی ہے جو تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے اور ان کا نفع عام ہے جب کہ علم کلام کی حیثیت دوا کی ہے جس کے ذریعہ فکری امراض کے شکار لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ علوم قرآن وسنت کے برعکس یہ علم بڑی تعداد میں لوگوں کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ (أدلة القرآن مثل الغذاء ينتفع بها كل انسان وادلة المتكلمين مثل الدواء ينتفع بها آحاد الناس و تستضر بها الأكثرون۔

اس لیے وہ تمام لوگوں کو اس میں غور وفکر کی اجازت نہیں دیتے۔ فیصل التفرقہ میں لکھتے ہیں کہ: ”اس کی اجازت صرف دو طرح کے لوگوں کے لیے ہے: ایک وہ جس کو دین میں شک وشبہے کی بیماری لاحق ہو گئی ہو۔ اور دوسرے وہ جو عقلی کمال کو پہنچا ہوا ہو اور اسی کے ساتھ دین میں رسوخ ومہارت رکھتا ہو۔ اور اس علم کو سیکھ کر دین میں شکوک وشبہات کے مرض کا شکار لوگوں کے علاج کا خواہاں ہو۔ نیز اس کے ذریعے وہ اہل بدعت کی زبان کو خاموش کرنے اور عقائد اسلام کی حفاظت کا خواہاں ہو“۔ اس معنی میں یہ علم ان کے نزدیک فرض کفایہ میں سے ہے۔ لیکن ضرورت پڑنے پر واجب بن جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس نکتے کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ پہلے تو اس علم میں غور وفکر کرنا بدعت کے قبیل سے تھا لیکن اب اس کا حکم بدل گیا ہے۔ اس لیے کہ اب ایسی بدعات پیدا ہو گئی ہیں جنھوں نے قرآن وسنت کے

تقاضوں سے لوگوں کے ذہن کو پھیر دیا ہے اور ایسی جماعت سامنے آگئی ہے جس نے دین میں شبہات پیدا کرنے میں اپنا پورا زور صرف کر دیا ہے ایسے میں اب یہ ممانعت باقی نہیں رہی بلکہ اس کے بجائے اس کا سیکھنا ضروری ہو گیا۔

23.7.4 نص کی تاویل اور اس کا حکم

تاویل کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: خبر کے معنی کو ظاہری معنی سے پھیر کر بیان کرنا(بیان معنى الخبر بعد إزالته عن ظاهره۔ تاویل سے مراد ایسی نص کی تاویل ہے جو سننے یا پڑھنے والوں کو شریعت یا عقل سے متصادم نظر آتی ہو۔ وہ عوام کو تاویل کا حق نہیں دیتے۔ بلکہ اسے ان کے لیے حرام تصور کرتے ہیں اور ایسے شخص کی کوشش سے تعبیر کرتے ہیں جو تیراکی نہ جانتا ہو اور غوطہ زنی کے لیے سمندر میں چھلانگ لگادے۔ اسی طرح وہ اسے بھی جائز قرار نہیں دیتے کہ کوئی عالم عوام کے لیے نص کی تاویل کر کے اس کے پوشیدہ معانی کو ان پر کھولنے کی کوشش کرے۔ یہ عمل ان کی نگاہ میں ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا کسی ایسے شخص کو اپنے ساتھ لے کر سمندر میں کود جانا ہے جو تیرنے کے فن سے آشنا نہ ہو۔ کیوں کہ خطرہ یہی ہے کہ وہ شخص ڈوب کر ہلاک و تباہ ہو جائے گا۔ تاویل کے حوالے سے ان کا ایک موقف یہ ہے کہ دین و شریعت کے بعض معانی وہ ہیں جن کا اظہار عوام کے سامنے کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ کم فہمی کی وجہ سے ان کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ رسول اللہ ؐ کا ارشاد ہے کہ ہم انبیا کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے ان کی عقل کی سطح اور معیار کے مطابق گفتگو کریں۔(نحن معاشر الأنبياء أمرنا أن نتكلم الناس على قدر عقولهم)۔ اسی طرح غزالی فرماتے ہیں کہ چوں کہ کلام عرب میں ایک لفظ کے متعدد معانی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس تعلق سے بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر کسی ایک تاویل سے بات عقل و نقل کے مطابق ہو جائے تو پھر مزید تاویلات کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

23.7.5 عقل و نقل میں تطبیق کا مسئلہ

عقل و نقل میں تطبیق علم کلام کا بنیادی اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اس تعلق سے مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں جن میں سے متعدد رجحانات افراط و تفریط پر مشتمل ہیں۔ غزالی کی فکر اس حوالے سے نہایت اعتدال پر مبنی ہے۔ چنانچہ "قانون التاویل" میں انہوں نے اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل و نقل کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے حوالے سے پانچ رجحانات پائے جاتے ہیں۔ پہلا رجحان یہ ہے کہ عقل و نقل میں سے نقل اصل ہے۔ عقل سے قطع نظر کرتے ہوئے اصل اعتبار صرف نقل اور نص کا کرنا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا رجحان ساری اہمیت عقل کو دیتا ہے اور نقل کو زیادہ اہمیت دینے کا قائل نہیں ہے۔ تیسرے رجحان کے مطابق معقول اصل اور منقول اس کے تابع ہے۔ چوتھا رجحان اس کے برعکس یہ ہے کہ منقول اصل اور معقول اس کے تابع ہے۔ غزالی کے مطابق یہ تمام رجحانات افراط و تفریط کے شکار ہیں۔ اس باب میں اعتدال پر قائم پانچواں فریق ہے جو معقول و منقول دونوں کو اصل قرار دے کر دونوں کے درمیان تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنے اور ان کے درمیان تعارض اور ٹکراؤ کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح غزالی عقل اور نقل دونوں کو ضروری اور مناسب اہمیت دینے کے قائل نظر آتے ہیں۔"قانون التأويل" میں وہ کہتے ہیں کہ عقل کی تکذیب نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ عقل سے ہی شریعت کا اثبات ہوتا ہے۔ اسی سے جھوٹے اور سچے، نبی اور نبوت کے مدعی کے درمیان فرق

کیا جاسکتا ہے۔ البتہ تمام حقائق کا علم عقل کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ اس کی اپنی ایک حد ہے جس سے آگے وہ وحی کی رہنمائی کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔

23.7.6 غزالی کا نظریہ علم

علم کی مختلف تعریفات کی گئی ہیں۔ سب سے مشہور تعریف یہ ہے کہ: علم عقل کے پاس کسی چیز کی حاصل ہونے والی صورت کا نام ہے۔ (الصورة الحاصلة من الشيء عند العقل) غزالی کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے: ایسا کامل اعتقاد جس میں کوئی شک اور تردد نہ ہو اور وہ واقعے کے مطابق ہو۔ فلسفے اور علم کلام میں یہ بحث رہی ہے کہ صحیح اور واقعی علم کا حصول کس حد تک ممکن ہے یا ممکن نہیں ہے؟ اہل شک جس میں فرقہ سوفسطائیہ سرفہرست ہے، کا موقف یہ رہا ہے کہ علم کا حصول ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک کسی شے کا حقیقی وجود نہیں ہے اور اگر بالفرض موجود ہے تو اس کی معرفت یا علم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر معرفت بھی ممکن ہے تو اس معرفت کو دوسروں تک نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح گویا علم کا اپنی حقیقی شکل میں پایا اور برتا جانا ممکن نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل یقین کا موقف یہ ہے کہ: "شے کی معرفت اور علم کا حصول ممکن اور یقینی ہے" اور یہی غزالی کا موقف ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ علم کے وسائل کیا ہیں تو اس سے متعلق مختلف نظریات پائے جاتے ہیں: ایک نظریہ یہ ہے کہ شے کی مکمل معرفت کا ذریعہ عقل ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شے کی مکمل معرفت کا ذریعہ تجربہ ہے۔ جب کہ تیسرا نظریہ اس بات کا قائل ہے کہ شے کی مکمل معرفت کا ذریعہ وجدان (intuition) ہے۔ غزالی عقل اور تجربے کو علم کا ذریعہ تسلیم کرتے ہوئے سب سے زیادہ اہمیت وجدان کو دیتے ہیں۔ غزالی کے نظریہ علم کا ایک نہایت اہم پہلو ان کا منہج شک (method of doubt) ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "شک حق کی طرف پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ جو شک نہیں کرتا وہ اشیا میں غور و فکر کا حق ادا نہیں کرتا اور جو غور و فکر کا حق ادا نہیں کرتا اسے بصیرت حاصل نہیں ہوتی اور جسے بصیرت حاصل نہیں ہوتی وہ اندھیرے اور گمراہی میں پڑا رہ جاتا ہے"۔ (المنقذ من الضلال) یہ واضح رہنا چاہیے کہ غزالی جس شک کی بات کرتے ہیں وہ فلسفیانہ شک ہے جس کا تعلق اشیاء اور موجودات کے وجود کے اثبات سے ہے۔ اس کا تعلق دینی حقائق سے نہیں ہے۔

23.7.7 کلامی مسائل میں تکفیر کا مسئلہ

کلامی مباحث کی گہما گہمی کے نتیجے میں ایک بڑا مسئلہ کلامی فرقوں کی طرف سے ایک دوسرے کی تکفیر کی شکل میں سامنے آیا۔ غزالی نے اس حوالے سے ایک معتدل فکری منہج پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے خاص طور پر اپنی دو کتابوں: "فیصل التفرقه بين الإسلام والزندقة" اور "الإقتصاد في الإعتقاد" میں تفصیل کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے۔ اس تعلق سے انہوں نے اہم اصول یہ بیان کیا ہے کہ تکفیر کا ماخذ عقل نہیں ہے بلکہ شرع ہے۔ اگر کوئی شخص ضروریات عقلی کا انکار کرتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے مخالف عقل بات کہی۔ لیکن اس بنیاد پر اس کی تکفیر و تفسیق نہیں کی جاسکتی۔ اس اصول کے ذریعے وہ یونانی فلسفے اور علم کلام کی بنیاد پر کفر و ایمان کے باب میں اٹھائے گئے سوالات اور مباحث کا رد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں معتزلہ و اشاعرہ اسی طرح دیگر کلامی

فرقوں کے کلامی اصول و نظریات کی بنیاد پر ثابت ہونے والے عقلیاتی حقائق کے منکرین یا ناواقف افراد کی تکفیر کرنا اصولی طور پر غلط ہے اور شریعت سے اس کے حق میں کوئی دلیل فراہم نہیں کی جاسکتی۔ کیوں کہ عہد نبوی و عہد صحابہ میں دائرہ ایمان میں داخل ہونے والوں کا ذہن اس طرح کے عقلی مسائل ومباحث سے بالکل خالی تھا۔

"فيصل التفرقة" میں لکھتے ہیں: "اگر کوئی کفر کی وہ تعریف کرے جو اشاعرہ، معتزلہ یا حنابلہ کے خلاف ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا شخص سادہ لوح اور احمق ہے اور تقلید کے پھندے میں گرفتار ہو چکا ہے"۔ اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "اگر تم انصاف سے کام لو تو تمہیں یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جو شخص حق کو کسی ایک صاحب فکر و نظر پر موقوف رکھتا ہے تو ایسا شخص کفر اور فکری تضاد سے زیادہ قریب ہے"۔(إن أنصفت علمت أنّ من جعل الحق وقفا على واحد من النظّار بعينه فهو إلى الكفر والتناقض أقرب)۔

23.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- غزالی کی پیدائش طوس، ایران میں 1058 میں اور وفات 1111 میں ہوئی۔ وہ ایک غریب اور کم زور گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ چناں چہ ان کی تعلیم ان کے والد کے دوست کے گھر ہوئی جن کو امام غزالی کے والد نے بچے کی تعلیم وتربیت کی وصیت کی تھی۔
- غزالی نے احمد بن محمد الراذکانی، ابونصر الاسماعیلی اور امام الحرمین ابو المعالی الجوینی وغیرہ اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد مدرسہ نظامیہ میں چار سال تعلیم و تدریس اور افتاء کی خدمات انجام دیں۔ پھر مدرسہ نظامیہ سے استعفیٰ دے دیا اور گیارہ سال تک شام، فلسطین، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں جاہ و شہرت سے دور رہ کر خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے۔ پھر واپس آکر تصنیف و تالیف میں زندگی بھر مشغول رہے۔
- غزالی نے اسلامی فکر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اسلامی الٰہیات پر یونانی فلسفے کے اثرات کو زائل کرنے میں سب سے اہم کارنامہ غزالی نے انجام دیا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی کتاب "احیاء علوم الدین" کو اسلامی اخلاق کا انسائیکلوپیڈیا تصور کیا جاتا ہے۔
- غزالی کی نظر میں علم کلام کو تمام علوم پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ ان کی نظر میں یہ ہے کہ متکلم عمومی طور پر تمام اشیاء یعنی موجودات پر نگاہ ڈالتا ہے۔ دین کے بنیادی عقائد کا اثبات اسی کے ذریعے ہوتا ہے۔

- علم کلام کا مقصد غزالی کے بقول اہل سنت والجماعت کے عقائد کا تحفظ اور اہل بدعت کی فساد انگیزیوں سے ان کو محفوظ رکھنا ہے۔ تاہم ان کی نظر میں علوم قرآن وسنت کی حیثیت غذا کی ہے جو تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے اور ان کا نفع عام ہے جب کہ علم کلام کی حیثیت دوا کی ہے جس کے ذریعہ فکری امراض کے شکار لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔
- علم کلام میں غزالی کا کارنامہ امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اس کی اصلاح کی۔ اس میں نئے مسائل وموضوعات کا اضافہ کیا۔ اس فن میں متعدد اہم کتابیں تصنیف کیں جنہیں اہل سنت کے علم کلام میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان میں سے اہم یہ ہیں: الاقتصاد فی الاعتقاد، الجام العوام عن علم الکلام، تہافت الفلاسفہ، المنقذ من الضلال، فیصلہ التفرقہ بین الاسلام والزندقہ اور قانون التاویل وغیرہ۔
- غزالی نے کلامی فکر کے ڈھانچے اور اس کے مشتملات کو متعدد سطحوں پر نئے اسلوب وانداز میں استوار کیا اور یہی عقلی اسلوب اور استدلالی منہج خاص طور پر سنی کلامی فکر کی شناخت بن گئی۔
- علم کلام کا بنیادی موضوع عقل ونقل کے درمیان ہم آہنگی ہے۔ اس مسئلے میں غزالی عقل ونقل دونوں کو اصل سمجھتے اور بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ اہم اصول یہ بیان کیا ہے کہ تکفیر کا ماخذ عقل نہیں ہے بلکہ شرع ہے۔ ضروریات عقلی کے انکار سے کسی کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔
- ایک متکلم کی حیثیت سے غزالی کے افکار وخدمات پوری اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

23.9 نمونہ امتحانی سوالات

23.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. غزالی کی وفات کب ہوئی؟

(a). 1111ء (b). 1011ء (c). 1211ء (d). 911ء

2. غزالی کی کتاب ''الاقتصاد فی الاعتقاد'' کس موضوع پر ہے؟

(a). علم عقائد (b). علم توحید (c). علم کلام (d). علم فقہ

3. فلسفیوں کے رد میں غزالی کی سب سے اہم کتاب کون سی ہے؟

(a). مقاصد الفلاسفہ (b). المنقذ من الضلال (c). المستصفی من الاصول (d). تہافت الفلاسفہ

4. غزالی کس کلامی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں؟

(a). حنبلی (b). اشعری (c). ماتریدی (d). معتزلہ

5. علم کلام میں غزالی کے کارنامے کا سب سے اہم پہلو کیا ہے؟

(a). اہم اصول مرتب کیے (b). فلاسفہ کے نظریات کا رد (c). علم کلام کی تاریخ لکھی (d). معتزلہ کی تردید

6. علم کلام کا مقصد غزالی کی نگاہ میں کیا ہے؟

(a). اسلام کی عقلی تشریح (b). قرآن وسنت کی تبلیغ (c). گمراہ فرقوں کی تردید (d) دینی فکر پر شبہات کا ازالہ

7. غزالی کی سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ وہ............ہیں؟

(a). متکلم ہیں (b). فلسفی (c). فقیہ اور فلسفی ہیں (d). متکلم فلسفی اور فقیہ

8. غزالی نے علم کلام کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز اس لیے بنایا کہ:

(a). متکلمین موجود نہیں تھے (b). علم کلام بہت کمزور تھا (c). اسلامی فکر پر شبہات کا جواب (d) باطل فرقوں کا رد

9. عقل و نقل کی ہم آہنگی کے مسئلے میں غزالی کس کو اہمیت دیتے تھے؟

(a) . صرف نقل کو (b). صرف عقل کو (c). عقل کو زیادہ نقل کو کم (d). عقل و نقل دونوں کو

10. غزالی کی فکر کے اثرات مرتب ہوئے:

(a). اسلامی فلسفے پر (b). علم کلام کی روایت پر (c). فقہ وحدیث کی روایت پر (d). اسلامی فکری روایت پر

23.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. غزالی کے ذاتی احوال قلم بند کیجیے۔
2. علم کلام میں غزالی کا حصہ کیا ہے؟ مختصر جائزہ لیجیے۔
3. علم کلام کی حقیقت اور اس کا مقصد غزالی کی نگاہ میں کیا ہے؟ لکھیے۔
4. اسلامی فکر پر غزالی کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔
5. غزالی کی کسی دو کتابوں پر تعارفی نوٹ لکھیے۔

23.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. علم کلام میں غزالی کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. علم کلام میں غزالی کی تصنیفات پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کیجیے۔
3. غزالی کے کلامی افکار و نظریات سے بحث کیجیے۔

23.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. الغزالی : شبلی نعمانی
2. افکار غزالی : مولانا محمد حنیف ندوی
3. مجموعہ رسائل امام غزالی (تین جلدیں) : امام غزالی
4. دعوت وعزیمت (جلد 1) : مولانا ابوالحسن علی
5. علم الکلام اور الکلام : شبلی نعمانی
6. دور الغزالی فی الفکر (عربی) : حسن فتح اللہ
7. Ebrahim Moosa : Ghazali and the Poetics of Imagination
8. Eric Ormsby : Ghazali: The Revival of Islam

اکائی 24: مشہور متکلمین (حصہ سوم)

اکائی کے اجزا:

24.0 تمہید
24.1 مقاصد
24.2 امام فخر الدین رازی
24.2.1 سوانحی حالات
24.2.2 علمی خدمات
24.2.3 دیگر خدمات
24.2.4 علم کلام
24.2.5 اثبات باری تعالی
24.2.6 اثبات توحید
24.2.7 رویت باری تعالیٰ
24.2.8 دیگر مسائل
24.2.9 فلسفہ اور علم کلام
24.3 امام ابن تیمیہ
24.3.1 احوال زندگی
24.3.2 ابن تیمیہ کی خدمات
24.3.3 معاصر کلامی روایت پر تنقید
24.3.4 وجود باری تعالیٰ
24.3.5 صفاتِ الٰہی
24.3.6 ارادہ الٰہی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

24.3.7 عقائد کی قرآنی تاویل
24.4 اکتسابی نتائج
24.5 نمونہ امتحانی سوالات
24.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
24.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
24.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
24.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

24.0 تمہید

امام رازی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ دونوں اپنے وقت کے عظیم علماء میں شامل ہیں۔ ان دونوں شخصیات کے اثرات پوری اسلامی دنیا پر پڑے۔ اپنے اپنے عہد میں ان دونوں شخصیات نے پورے اسلامی فکر کے دھارے کو متاثر کیا ہے بلکہ مجموعی اسلامی میراث میں ان کے غیر معمولی اثرات ہیں اور علم کلام پر بھی ان کے گہرے اثرات پڑے ہیں۔ دونوں ہی بزرگ کثیر التصانیف علماء میں سے تھے۔ ان کی کتابیں ان کے زمانے سے لے کر آج تک مرجع سمجھی جاتی ہیں اور متعدد کتابیں اپنے موضوع پر آج بھی اسی طرح فیصلہ کن ہیں جیسے وہ اپنے زمانے میں تھیں۔ ذیل کے صفحات میں ان دونوں عظیم ہستیوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

24.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ امام فخر الدین رازی اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے مختصر سوانحی کوائف سے آپ واقف ہو جائیں اور ان دونوں اماموں کی علمی خدمات اور ان کے علمی مقام و مرتبہ سے واقف ہو سکیں اور ساتھ ہی ان دونوں کے کلامی نظریات اور علم کلام میں ان کی خدمات سے واقف ہو سکیں، یعنی عقائد اسلامی کی تفہیم میں ان کی خدمات سے واقف ہو سکیں گے۔ امام رازی اور امام ابن تیمیہ دونوں کلامی میدان میں دو الگ الگ مکتب فکر کے امام ہیں۔ ایک کا تعلق اشعری مسلک سے ہے اور دوسرے کا تعلق کلام کی حنبلی روایت سے ہے۔ اگرچہ دونوں روایات میں بہت کچھ مشترک ہے تاہم بعض مقامات پر دونوں میں جزوی اختلافات بھی ہیں۔ اس اکائی میں ان دونوں اماموں کے افکار پر الگ الگ روشنی ڈالی گئی ہے۔ امید ہے اس کے ذریعے ان کی فکر کے کچھ اہم نکات آپ کے سامنے آجائیں گے ساتھ ہی آپ علم کلام کی اشعری روایت اور حنبلی روایت میں فرق سے بھی واقف ہو سکیں گے۔

24.2 امام فخر الدین رازی

امام فخر الدین رازی اپنے زمانے کے زبردست عالم، مناظر، متکلم، مفسر، فلسفی اور دینی و دنیاوی علوم کے جامع تھے۔ علوم اسلامی میں تو ان کی شخصیت ایک مثال ہے ہی ساتھ ہی فلسفیانہ علوم اور ریاضی وغیرہ میں بھی ان کی خدمات اہم ہیں۔ ان کی فلسفیانہ شخصیت ان کی دینی علوم میں مہارت کی وجہ سے پردہ خفا میں چلی گئی ورنہ فلسفہ میں شاید وہ اپنے زمانے کے ابن سینا تھے۔ انہوں نے دینی علوم اور فلسفیانہ علوم میں کم از کم سو کتابیں تصنیف کی تھیں۔

24.2.1 سوانحی حالات

امام فخر الدین رازی کا پورا نام محمد بن عمر بن حسین بن حسن بن علی ہے۔ ان کا لقب شیخ الاسلام اور فخر الدین ہے۔ ان کی دو کنیت ہیں، ایک ابو الفضل اور ایک ابو عبد اللہ۔

امام رازی رے کے ایک نہایت معزز خاندان کے فرد تھے ان کے والد ضیاء الدین عمر رے کی جامع مسجد کے امام تھے۔ اس زمانے میں شہر کی جامع مسجد کے امام کی حیثیت شہر کے امیر یعنی گورنر کی ہوتی تھی۔ اس طرح ان کو رے میں نہایت معزز مقام ملا۔

امام رازی نے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد اپنے والد ماجد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ لیکن ابھی ان کی تعلیم کا مناسب آغاز بھی نہیں ہو پایا تھا کہ قضائے الٰہی سے ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ امام رازی اس وقت بچے ہی تھے۔ اس اچانک حادثے نے ان کی زندگی کو بہت متاثر کیا تھا لیکن انہوں نے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ حصول تعلیم کا سلسلہ جاری بھی رکھا۔ انہوں نے رے میں کمال سمنانی اور مجد جیلی جیسے علما و فضلا سے استفادہ کیا اور دوسرے شہروں میں بعض علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے علم حاصل کیا۔

رے میں تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد امام رازی نے ماوراء النہر کے کچھ دوسرے علاقوں کا سفر کیا۔ اس سفر کی غرض وغایت دو تھی ایک تو مزید تحصیل علم تھی دوسرے فکر معاش کی سبیل تلاش کرنا بھی تھا۔ امام رازی نے اس سفر میں مختلف علما و فضلا سے ملاقات کی، مختلف شہروں میں گئے اور مختلف فرقوں خاص طور سے معتزلہ سے مناظرے کیے۔ ان مناظروں سے امام رازی کو مادی فائدہ تو زیادہ نہیں ہوا لیکن اس زمانے کے لحاظ سے مناظرہ بازی میں بڑی مہارت پیدا ہو گئی۔ ان کی یہ مہارت ان کی بقیہ زندگی میں بہت کام آئی وہ ایک کامیاب مناظر کے طور پر مشہور ہوئے اور انہوں نے اپنے مناظروں کے ذریعے فرقہ کرامیہ کا قلعہ قمع کر دیا۔ اس سفر میں امام رازی ہندوستان بھی تشریف لائے تھے لیکن ان کے سفر ہندستان کی مزید تفصیل نہیں ملتی۔

امام رازی ماوراء النہر کے اس سفر میں ایک طویل مدت گزارنے کے بعد واپس اپنے شہر رے میں تشریف لائے۔ اس زمانے میں رے کے اندر ایک نہایت دولت مند طبیب رہتے تھے اتفاق سے جب امام رازی واپس آئے ان دنوں میں وہ طبیب مرض الموت میں مبتلا تھے۔ چوں کہ امام رازی کے والد شہر کے امام تھے اس لیے لوگ ان کے خاندان پر بھروسہ کرتے تھے اور ان کے تقوی و طہارت اور ایمانداری کا بھی لوگوں کو یقین تھا۔ اس طبیب کے دو بیٹیاں تھیں اور امام رازی کے دو بیٹے تھے۔ اس طبیب نے امام رازی سے درخواست کی

کہ وہ اپنے بیٹوں کی شادی ان کی بیٹیوں سے کردیں تاکہ ان کو ایک قابل اعتماد سرپرست مل جائے۔ امام رازی نے اس کو قبول کرلیا۔ کچھ دن کے بعد مذکورہ طبیب کی وفات ہوگئی۔ ان کی وفات کے بعد جو دولت امام رازی کو ملی وہ کسی ریاست سے کم نہیں تھی۔ اس میں پچاس توصرف وہ غلام تھے جو سنہری کمربند باندھے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اس وقت اللہ تعالی نے غیب سے ایسی مدد فرمائی کہ امام رازی جو والد کی وفات کے بعد پریشانیاں جھیلیں تھی سب کافور ہوگئیں۔ ساتھ ہی وہ صرف لکھنے پڑھنے اور علمی کاموں کے لیے یکسو ہوگئے معاش کی فکر ختم ہوگئی۔

امام رازی کو اس دولت کے ملنے کے بعد معاشی طور پر یکسوئی مل گئی اور انہوں نے اپنے آپ کو مطالعہ، درس وتدریس، مناظرہ اور تصنیف وتالیف کے لیے فارغ کرلیا۔ رفتہ رفتہ ان کے علم وفضل کی شہرت رے شہر کی سرحدوں کو پار کرکے مختلف شہروں بلکہ شاہی ایوانوں تک پہنچی۔ غزنہ، خوارزم اور خراسان کے امرا ان کی قدردانی کرنے لگے۔ ان کو اپنے دربار میں بلاتے اور ان کی خدمت میں تحفے تحائف بھی ارسال کرتے۔ ان امرا وسلاطین میں سب سے بڑھ کر غور کے حاکم سلطان شہاب الدین غوری اور بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری نے ان کی سب سے زیادہ قدر افزائی کی اور ان کو مستقل اپنے ہی علاقے میں بلالیا۔

امام رازی غور کے علاقے میں ہرات کے اندر رہنے لگے۔ اس دور میں غور کے علاقے میں فرقہ کرامیہ کا زور تھا۔ ہرات میں کرامیہ فرقے کے بڑے امام قاضی قدوہ تھے۔ امام رازی اشعری تھے اس لیے امام رازی اور قاضی قدوہ کے درمیان مناظرے شروع ہوگئے اور امام رازی کا زور بیان اور طرز استدلال اتنا مقبول ہوا کہ لوگ ان کی اتباع کرنے لگے اور رفتہ رفتہ غور میں کرامیہ کا زور ختم ہوگیا اور وہاں اشعری مسلک غالب آگیا۔

امام رازی نے بقیہ عمر غور کے علاقے میں ہرات کے اندر گزاری۔ ہرات میں ہی وہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ اسی شہر میں 21/ محرم 606ھ مطابق 15/ پریل 1210ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

24.2.2 علمی خدمات

امام رازی اپنے وقت کے جید عالم اور عظیم المرتب مفسر قرآن تھے۔ انہوں نے پوری عمر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ مختلف علوم میں انہوں نے گراں قدر کتابیں تصنیف کیں اس وقت ان کی تصانیف کا اندازہ 80 کے قریب ہے۔ ان کی سب کتابوں کا نام ذکر کرنا مشکل ہے۔ تاہم ان کی اہم ترین کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(1) تفسیر مفاتیح الغیب، جو تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تفسیر پوری اسلامی تاریخ کی مشہور ترین تصانیف میں سے ہیں۔

(2) الاربعین فی اصول الدین

(3) لوامع البیات فی شرح اسماء اللہ تعالیٰ والصفات

(4) کتاب المحصول

(5) المباحث المشرقیہ

(6) شرح عیون الحکمۃ

24.2.3 دیگر خدمات

تصنیف و تالیف کے علاوہ امام رازی کی خدمات دو میدان میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک درس و تدریس کے میدان میں اور دوسرے مناظرہ اور اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں۔ علمی کاموں کے علاوہ ان دونوں میدانوں میں بھی ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔ ہرات میں انہوں نے ایک بڑا اور منفرد نوعیت کا مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسے میں کئی سو طلبہ ان سے علم حاصل کرتے تھے۔ امام رازی کے مدرسہ کی منفرد خوبی یہ تھی کہ یہ مدرسہ مختلف درجات میں علوم کی تکمیل کراتا تھا یعنی ابتدائی درجات کے طلبہ کو ان سے اوپر کے درجات کے طلبہ پڑھاتے تھے اور اوپر کے درجات کے طلبہ کو ان سے اوپر کے درجات کے طلبہ پڑھاتے تھے اور منتہی درجات کے طلبہ کو امام رازی خود پڑھاتے تھے۔ ساتھ ہی طلبہ کے تمام درجات میں تعلیم کی نگرانی خود فرماتے تھے۔ اس طرح ایک طالب بیک وقت استاد بھی ہوتا تھا اور طالب علم بھی ہوتا تھا اور دوران طالب علمی ہی اس کو مہارت حاصل ہو جاتی تھی۔

مناظرہ تو امام رازی کا پسندیدہ فن تھا۔ خاص طور پر کرامیہ فرقہ سے ان کے بہت مناظرے ہوئے۔ بلکہ ان کے مناظروں کے زیر اثر کرامیہ فرقہ ختم ہو گیا۔ مناظرہ بھی اصلاح معاشرہ اور اصلاح عقائد کا ایک ذریعہ تھا اور اس طرح ان کے ذریعہ عقائد کی اصلاح بھی ہوئی اور غور کے علاقے کے لوگوں کی اکثریت نے کرامی عقائد کو چھوڑ کر اشعری مکتب فکر کی پیروی شروع کر دی۔

امام رازی کے زیادہ مناظرے کرامیہ سے ہوئے تھے ان میں وہ مناظرہ سب سے زیادہ مشہور ہے جو قاضی مجد الدین عبد المجید بن عمر المعروف بہ قاضی قدوہ سے ہوا تھا۔ یہ مناظرہ فیروکوہ میں ۵۹۵ میں ہوا اس مناظرے میں اگرچہ فتح و ہار کا فیصلہ تو نہیں ہوا لیکن فریقین میں سخت اختلاف پیدا ہوا اور شہر میں فساد کی نوبت آ گئی اس کے بعد امام رازی کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ لیکن امام رازی کی خدمات جاری رہیں اور فن مناظرہ میں مہارت اور وسیع علمیت نے ان کو موقع دیا کہ وہ اس مشکل ڈگر پر باعزت گزر گئے۔

24.2.4 علم کلام

امام رازی اپنے زمانے کے بیشتر علوم میں ماہر تھے۔ فلسفہ اور منطق پر تو ان کو ایسی دستگاہ حاصل تھی کہ انہوں نے ابن سینا کی بعض کتابوں کی شرح لکھی ہے۔ تفسیر کے میدان میں وہ ہمیشہ کے لیے درجہ امامت پر فائز ہیں اور علم کلام میں بھی ان کی غیر معمولی خدمات ہیں۔ امام رازی نے علم کلام میں کتابیں بھی لکھیں اور اپنے مواعظ اور مناظروں کے ذریعہ بھی کلامی روایت کو فروغ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بڑی تعداد میں اپنے تلامذہ کی اس طرح تربیت کی کہ وہ ان کی کلامی روایت کو آگے بڑھا سکیں۔

امام رازی جتنے بڑے عالم دین تھے اتنے ہی بڑے فلسفی بھی تھے۔ فلسفہ اور کالم پر ان کو کامل دستگاہ تھی اگرچہ فلسفہ اور کلام دونوں الگ الگ علم ہیں تاہم امام غزالی کے زیر اثر امام رازی کے عہد میں صورت حال یہ تھی کہ کلامی مباحث اور فلسفیانہ مباحث اس طرح خلط ملط تھے کہ جب بھی ایک موضوع پر گفتگو ہوتی تو دوسرا بھی اس میں شامل ہو جاتا اس لیے دونوں کو الگ کرنا مشکل تھا۔ امام رازی کا اسلوب نگارش بھی اس طرح کا ہے انہوں نے فلسفیانہ اور کلامی مباحث کو باہم آمیز کر دیا ہے اور دونوں کو عقائد کی وضاحت میں یکساں اہمیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

علم کلام کے حوالے سے جب بات کی جائے تو اس میدان میں ان کی خدمات کا سب سے جامع مرقع ان کی تفسیر قرآن ہے۔اس تفسیر کا اصل نام تو مفاتیح الغیب ہے لیکن یہ تفسیر کبیر کے نام سے معروف ہے۔اس تفسیر میں انہوں نے اپنے تمام کلامی نظریات کو مکمل دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم کلام میں ان کی سب سے اہم تصنیف تو تفسیر کبیر ہے۔ تاہم اس کے علاوہ اس موضوع پر ان کی اور بھی بہت سی کتابیں ہیں بلکہ ان کی زیادہ تر کتابیں علم کلام کے موضوع پر ہی ہیں تاہم لوامع البینات، کتاب القضاو القدر، عصمت الانبیاء، کتاب الملل والنحل، المباحث المشرقیہ، الرسالۃ الکاملیہ فی الحقائق الالہیہ، اساس التقدیس اور کتاب الخلق والبعث ان کی اہم کلامی کتابوں میں شامل ہیں۔

کلامی نظریات میں ان کا مسلک، جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا اشعری مسلک ہے، شروع میں انہوں نے معتزلہ سے مناظرے کیے بعد میں کرامیہ سے، دونوں جگہ انہوں نے اشعری مسلک کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اشعری مسلک معتزلہ کے مقابلے میں وجود میں آیا اس لیے اصولی طور پر اس مسلک میں معتزلہ کے بنیادی نظریات پر تنقید ہے۔ اشعری مسلک کے اصول عام طور پر معتزلہ کے مقابلے میں وضع ہوئے۔ اس لیے ان میں زیادہ زور معتزلہ کے نظریات کی تردید پر ہے۔ امام رازی کے عہد تک آتے آتے معتزلہ کا زوال ہو چکا تھا اس لیے اب اشعری مسلک میں بھی دیگر مسائل در آئے تھے۔ امام رازی کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے اہم نظریات حسب ذیل ہیں۔

24.2.5 اثبات باری تعالی

امام رازی نے اثبات باری تعالیٰ عزاسمہ کے لیے تمام قدیم فلاسفہ اور متکلمین کے عقلی دلائل کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات میں بے شمار موجودات ہیں۔ ان کا وجود یقینی طور پر ثابت ہے۔ تاہم یہ سب ممکن الوجود ہیں۔ یعنی ان کے اندر موجود ہونے یا معدوم ہونے کا امکان برابر ہے۔ تو وجود وعدم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح کسی دلیل کی بنا پر ہوگی۔ وہ دلیل ان کے اندر نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ان میں وجود وعدم کا امکان برابر ہے۔ ایسی صورت میں لازمی طور پر ایک اور وجود کو ماننا پڑے گا جو واجب الوجود ہو یعنی ایسا وجود ہو جس کا عدم وجود محال ہو۔ اسی واجب الوجود کی بنیاد پر ہی ممکن الوجود کا وجود ہوگا۔ واجب الوجود ہی اللہ تعالی ہے۔

امام رازی نے اس نکتے کو اس کے دیگر متعلقات کے ساتھ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے ممکن الوجود اور واجب الوجود کی پوری بحث کی ہے۔ اس مسئلہ میں بہت سے مقدمات اور دلائل ہیں سب کا بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ان بیان کردہ ایک نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تمام موجودات میں جو بوقلمونی اور رنگا رنگی ہے، یہ بھی دراصل واجب الوجود کی حکمت و مصلحت اور اس کا عمل ہے، یہ بوقلمونی صرف طبعیات کا اثر نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اگر یہ صرف طبعی اثر ہوتا تو مثلاً ایک پتے میں ایک ہی رنگ ہوتا یا ایک پھل ایک ہی طرح کا ہوتا جیسے گلاب کے پھول میں پنکھڑی کا ایک حصہ زرد ہوتا ہے اور ایک سرخ ہوتا ہے۔ اگر یہ رنگ صرف طبیعت کے اثر سے ہوتا تو ایک ہی ہوتا۔ ایک ہی چیز میں دو یا دو سے زیادہ رنگ کیسے ہوتے چوں کہ ایک طبعی قانون اس میں کارفرما ہے تو ایک قانون سے ایک ہی چیز پیدا ہوگی رنگ برنگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مخلوقات میں جو مختلف اوصاف ہیں وہ دراصل خالق کے پیدا کردہ ہیں۔ یعنی ان کا پیدا کرنے والا ایسا مختار اور صاحب اقتدار ہے کہ وہ جس کو جیسا چاہے ویسا بنا دے۔

24.2.6 اثبات توحید

تمام اسلامی فرقوں میں توحید الٰہی کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔اختلاف توحید کے اثبات اور توحید کے دلائل میں ہے۔امام رازی نے توحید الٰہی کو ثابت کرنے کے لیے کئی طریقے اختیار کیے ہیں۔ایک طریقہ تو وہی ہے جو قرآن مجید میں آیا ہے۔یعنی ایک آیت میں ہے "اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو فساد برپا ہو جاتا۔"(انبیاء: 21-22)اسی طرح کی اور بھی آیات ہیں، جیسے سورہ مومنون کی آیت نمبر 91۔اسی طرح سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر 42 میں بھی یہی بات آئی ہے۔اس طرح کی دلیل کو قدیم فلاسفہ و متکلمین دلیل خطابی کہتے ہیں۔امام رازی نے بھی یہ دلائل دیے ہیں تاہم انہوں نے ایک منفرد بات یہ کہی ہے کہ قرآن مجید کی مذکورہ دلیل جس کو فلاسفہ دلیل خطابی کہتے ہیں وہ خطابی نہیں برہانی دلیل ہے اور انہوں نے اس کی روشنی میں توحید باری تعالیٰ کا اثبات اس طرح کیا ہے کہ اگر دو خدا فرض کر لیے جائیں تو ان میں ہر ایک پوری طرح قادر مطلق ہو گا۔اب اگر ان میں ایک خدا زید کے اندر حرکت پیدا کرنا چاہے اور دوسرا زید کے اندر سکون پیدا کرنا چاہے اور دونوں اپنے ارادے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ اجتماع ضدین ہو گا یعنی ایک ہی شخص میں بیک وقت حرکت اور سکون کا اجتماع لازم آئے گا جو فلاسفہ کی نظر میں محال ہے۔اسی طرح اگر دونوں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوئے تو ان کا محتاج ہونا لازم آئے گا جو ممکن نہیں اس لیے خدا ہر احتیاج سے بلند ہے۔اس لیے یقینی بات ہے کہ دو خدا نہیں ہو سکتے۔امام رازی نے اس دلیل میں ایک مزید پہلو یہ نکالا ہے کہ ہر وجود کی اصل وجہ یا علت اللہ رب العزت ہے۔چونکہ کسی بھی چیز کی دو علت نہیں ہو سکتی اس لیے اگر دو خدا مانے جائیں تو دونوں ہی ہر وجود کی وجہ یا علت ہوں گے اور کسی ایک چیز کی دو علت نہیں ہو سکتی اس لیے لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ خدا ایک ہے۔

امام رازی نے توحید باری تعالیٰ کی اس قرآنی دلیل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس میں کئی ایسے پہلو نکالے ہیں جن تک ان سے پہلے فلاسفہ اور متکلمین کسی کی رسائی نہیں ہوئی تھی اس ان کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس دلیل کے علاوہ امام رازی نے توحید باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے مزید 14 دلائل دیے ہیں۔ان 14 میں سے آخری دلیل مظاہر فطرت کا بیان ہے۔امام رازی کے مطابق مظاہر فطرت بھی توحید الٰہی کی ایک مضبوط دلیل ہیں انہوں نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"جان لو کہ جب تم اس دلالت کی حقیقت سے واقف ہو گئے کہ اس علوی اور سفلی کائنات میں جو بھی مخلوقات اور نئی چیزیں ہیں وہ سب خدا کی وحدانیت کی دلیل ہیں بلکہ ہمارے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہر جوہر اور ہر عرض کا وجود توحید باری تعالیٰ کی دلیل تام ہے اور اس دلیل کو اللہ رب العزت نے خود بھی اپنی کتاب میں متعدد جگہ بیان کیا ہے"۔

امام رازی نے توحید کے اثبات میں زیادہ انحصار عقلی دلائل پر کیا ہے تاہم قرآن مجید کی آیات سے بھی انہوں نے بکثرت دلائل دیے ہیں اور قرآنی آیات فلسفہ کی روشنی میں بعض منفرد توجیہات بھی کی ہیں۔

24.2.7 رویت باری تعالیٰ

معتزلہ کا ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ رویت باری تعالیٰ ممکن نہیں ہے۔اس لیے کہ رویت کے لیے جسم ہونا، زمان و مکان میں ہونا

اور فاصلہ پر ہونا ضروری ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی احتیاج سے بلند ہے۔ امام رازی نے اپنی کتاب الاربعین میں اور تفسیر کبیر میں رویت باری تعالی سے متعلق معتزلہ اور اشاعرہ کے تمام دلائل کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس مسئلے کے تمام جزئیات پر بحث کی ہے اور ثابت کیاہے کہ قیامت کے دن دیدار الٰہی ہو گا۔ امام رازی کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1۔ دیدار الٰہی کے ناممکن ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ معتزلہ جو یہ کہتے ہیں کہ رویت کے لیے جسم وفاصلہ وغیرہ شرائط کا ہونا ضروری ہے، جو باری تعالیٰ کے یہاں ممکن نہیں، تو یہ صرف امکانی بات ہے۔ اس لیے کہ کبھی کبھی تمام شرائط کے باوجود رویت نہیں ہوتی تو ایسا بھی ممکن ہے کہ کچھ شرائط کی عدم موجودگی میں رویت ہو جائے۔

2۔ قرآن مجید میں واضح طور پر اللہ پاک کے دیدار کی بات موجود ہے "وجوہ یومئذ ناضرہ إلی ربہا ناظرہ۔" (القیامۃ: 63) (یعنی اس دن بہت سے چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے۔)

معتزلہ اس آیت میں لفظ ناظرہ کو انتظار کے معنی میں لیتے ہیں۔ امام رازی نے ناظرہ کے لغوی استعمالات سے ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ دونوں معنی میں قرآن میں استعمال ہوا ہے اس لیے اس کو صرف ایک معنی میں مخصوص نہیں کر سکتے اور انتظار ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ اہل جنت کو کوئی تکلیف ہو گی نہیں اس لیے اس کو دیدار کے معنی میں ہی لینا درست ہو گا۔

3۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب رویت باری تعالیٰ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "تم دیکھ نہیں سکتے۔ پہاڑ کو دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ رہا تو تم دیکھ سکتے ہو۔" اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رویت ممکن ہے۔ اس لیے کہ اگر رویت ممکن نہ ہوتی تو پہاڑ کے لیے بھی ممکن نہ ہوتی۔

4۔ سورہ دہر کی آیت نمبر 20 میں ہے: وإذا رأیت ثم رأیت نعیما وملکا کبیرا۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں 'ملکا' کی ایک قرأت لام کے زیر کے ساتھ بھی ہے۔ اگر ایسا پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ عظیم بادشاہ کا دیدار ہو گا۔ وہ اللہ رب العالمین کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ غرض اس طرح کے دلائل سے امام رازی نے ثابت کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کا دیدار ممکن ہے۔

24.2.8 دیگر مسائل

مذکورہ بالا مسائل کے علاوہ ذات وصفات کے مسئلہ میں بھی انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے اور دلائل کی روشنی میں معتزلہ کے مسلک پر تنقید کی ہے اور اشاعرہ کے مسلک کو ثابت کیا ہے۔ اس طرح ارادہ واختیار یعنی جبر وقدر کے بارے میں بھی امام رازی نے تفصیلی گفتگو کی۔ معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان یہ مسائل ہمیشہ سے اختلافی رہے اور ان مسائل میں ہی ان کے زیادہ تر مناظرے ہوئے۔ امام رازی نے اشاعرہ کے مسلک کو ثابت کیا ہے اور مزید دلائل کے ذریعے اس کو مبرہن کیا ہے کہ اشاعرہ کا مسلک عقل اور نقل کے تمام پیمانوں پر کھرا اترتا ہے اور یہی مسلک درست ہے۔

امام رازی نے تمام کلامی مباحث پر شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے تمام متداول علوم وفنون کو اور خاص طور پر فلسفہ کو اپنے دلائل میں استعمال کیا ہے۔ امام رازی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اشاعرہ کے مسلک کے اثبات کے لیے متعدد نقلی و عقلی دلائل کا اضافہ کیا ہے اور متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے کہ فلاں دلیل ان کا اپنا اضافہ ہے، ان سے پہلے کسی نے یہ طرز استدلال اختیار نہیں کیا تھا۔

24.2.9 فلسفہ اور علم کلام

جیسا کہ پہلے اشارۃً ذکر کیا گیا کہ امام رازی کے زمانے تک آتے آتے فلسفہ اور علم کلام کے مسائل باہم آمیز ہو گئے تھے، دراصل امام غزالی نے یہ طرح ڈالی تھی کہ فلسفہ کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ کلامی مباحث اس میں شامل ہو جائیں۔ امام رازی نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے علم کلام کو اس انداز پر مرتب کیا کہ فلسفہ علم کلام کی ایک شاخ بن گیا۔ وہ فلسفہ پر جو گفتگو کرتے ہیں وہ بظاہر یونانی فلسفہ پر نہیں بلکہ اس فلسفہ پر ہوتی ہے جو انہوں نے کلام کے زیر اثر خود اختیار کیا تھا۔

تاہم فلسفہ کی اپنی ایک طویل روایت ہے اور اس کو کلام جیسے موضوع میں منحصر کرپانا ممکن نہیں۔ فلسفہ میں طرز استدلال مذہبی طرز استدلال سے بہت سی جگہ مختلف ہو جاتا ہے۔ اس لیے امام رازی نے فلسفہ پر تنقید بھی کی ہے۔ فلسفہ پر ان کی تنقید بھی بہت تفصیلی ہے۔ ان کی نظر میں مقبول فلسفہ وہ ہے جو علم کلام کا خادم ہے اور جو علم کلام کے مغایر ہے یا امام رازی کی نظر میں اس میں کلامی روایت کی گنجائش نہیں ہے اس کے خلاف اس پر وہ سخت تنقید کرتے ہیں۔

24.3 امام ابن تیمیہ

شیخ الاسلام تقی الدین احمد ابن تیمیہ اسلام کے مجددین میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے ساتویں صدی ہجری میں کار تجدید انجام دیا۔ انہوں نے کئی محاذ پر کام کیا۔ ایک طرف عیسائیوں کے مناظروں کا جواب دیا، دوسری طرف تاتاری فتنہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کی اور تیسری طرف مسلمانوں کی اندرونی فرقہ بندی اور مسلکی خلفشار اور انتشار کے ماحول میں انہوں نے قرآن و حدیث کے ذریعہ حق بات کو ثابت کرنے اور لوگوں کو قرآن و حدیث سے وابستہ کرنے کا کام کیا۔ ان کی خدمات غیر معمولی ہیں۔ امت میں ایسے دانشور بہت کم گزرے ہیں جنہوں نے ابن تیمیہ کی طرح بیک وقت مختلف میدانوں میں امت کی رہنمائی کی تھی۔

24.3.1 احوال زندگی

امام ابن تیمیہ کا پورا نام تقی الدین احمد بن عبد العلیم بن مجد الدین عبد السلام ابن تیمیہ تھا۔ ان کی ولادت مشہور علمی مرکز حران میں ہوئی۔ ان کا خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ ان کے دادا اور والد درجہ اجتہاد کے فقیہ تھے۔ اس لیے فقہ اور علوم دینیہ میں مہارت ان کے لیے خاندانی میراث کی طرح تھی۔ ساتھ ہی ان کی فطری قابلیت نے ان کو اس میراث کا اہل بھی بنا دیا تھا۔

ابن تیمیہ کی ولادت اس وقت ہوئی جب عالم اسلام تاتاری حملے سے دوچار تھا۔ اس زمانے میں لوگ اپنی اپنی جان بچانے کے لیے

بڑی تعداد میں نقل مکانی کرتے تھے۔ ابن تیمیہ کی عمر ابھی سات سال کی تھی کہ عراق تاتاری حملہ کی زد میں آ گیا۔ اس لیے ان کو وہاں سے ہجرت کر کے دمشق جانا پڑا۔ دمشق میں ان کے خاندان کا شاندار استقبال ہوا۔ ان کے والد مدرسہ سکریہ میں شیخ الحدیث مقرر ہو گئے اور جامع اموی میں خطیب بھی مقرر ہو گئے جو ان کے لیے بڑا اعزاز تھا۔

ابن تیمیہ کی تعلیم کا آغاز دمشق میں ہوا۔ پہلے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد عربی زبان و ادب اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا۔ فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم انہوں نے اپنے والد سے حاصل کی اور اس کی تکمیل قاضی القضاۃ شمس الدین عبدالرحمن اور شیخ زین الدین النجی سے کی۔ فقہ کے علاوہ انہوں نے حدیث کا بھی وسیع مطالعہ کیا۔ صحاح ستہ کا درس لیا، مسند احمد کئی دفعہ پڑھی اور حدیث کی دوسری کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ خاص حدیث میں ان کو بڑی مہارت حاصل ہوئی۔ حدیث پر ابن تیمیہ کی وسعت نظر کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ جو حدیث ابن تیمیہ کو معلوم نہ ہو اس کے بارے میں شک ہو جاتا ہے۔

ابن تیمیہ کی عمر ابھی 22 سال کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اسی دوران میں خود ابن تیمیہ کی مہارت اور ان کے علم و فہم کا بھی تذکرہ اہل علم کے درمیان شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے والد کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کو اپنے والد کا جانشیں بنا دیا۔ یعنی مدرسہ سکریہ میں استاد مقرر کر دیا۔ مدرسہ سکریہ میں ان کا درس شروع ہوا وہ بڑے عالم تھے اللہ نے پڑھانے کا بھی ہنر عطا فرمایا تھا کچھ ہی دنوں میں ان کی شہرت پورے علاقے میں پھیل گئی اور کچھ ہی عرصہ میں وہ اپنے علاقے کے مشہور اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔

امام ابن تیمیہ نے دس سال تک دارالحدیث سکریہ میں تدریس کی۔ ساتھ ہی جامع اموی میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد حج کرنے گئے۔ حج سے واپس آ کر پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں ایک عیسائی نے شان رسالت میں گستاخی کی تو ابن تیمیہ نے 'الصارم المسلول' نامی کتاب لکھی۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کے سوالات کی بنیاد پر انہوں نے رسالہ الحمدیہ لکھا۔ یہ رسالہ عقائد پر ہے اور اس میں کچھ ایسے نظریات بھی پیش کیے گئے ہیں جو اشاعرہ کے روایتی مسلک کے خلاف محسوس ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی اشاعت کے بعد اشاعرہ ابن تیمیہ کے خلاف ہو گئے اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ اس کی وجہ ابن تیمیہ کے خلاف شورش ہو گئی، حتی کہ حکومت کو اس پورے معاملے میں مداخلت کرنی پڑی تب یہ مسئلہ کسی حد فرو ہوا۔

رسالہ احمدیہ کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے تھے ابھی ان کو فرو ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ تاتاری حکمراں قازان خان نے دمشق پر حملہ کر دیا۔ امام ابن تیمیہ نے اس مشکل وقت میں لوگوں کی بڑی مدد کی۔ شہر کے معززین کی ایک سفارت لے کر خود قازان خاں سے ملے اور ان کو آمادہ کیا کہ وہ جنگ نہ کریں اور واپس لوٹ جائیں۔ ابن تیمیہ کی فہمائش پر اس سال قازان خاں واپس چلا گیا لیکن دو سال بعد پھر حملہ آور ہوا بلکہ اس کے حملوں کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ دمشق کے بہت سے لوگ اس کے خوف سے نقل مکانی کر کے مصر چلے گئے لیکن امام ابن تیمیہ ان مشکلات میں اہل دمشق کے ساتھ کھڑے رہے، لوگوں کو حوصلہ دیتے رہے اور مصر کے سلطان کے ساتھ گفتگو کر کے ایک طاقتور فوج فراہم کی۔ بعد میں اس فوج کی مدد سے قازان خاں کو شکست ہوئی اور دمشق اس لگاتار خطرے سے باہر نکل آیا۔

سیاسی خطرات کا خاتمہ ہوا تو شیخ الاسلام ابن تیمیہ پوری طرح معاشرہ کی اصلاح میں لگ گئے۔ اس زمانے میں شام و مصر میں بدعات

کا بڑا زور تھا قبر پرستی میں لوگ مبتلا تھے اور طرح طرح کی بدعات نے پورے معاشرے کو جکڑ رکھا تھا۔ شیخ الاسلام نے ان پر تنقید کی اور لوگوں کو قرآن و حدیث سے وابستہ ہونے کی دعوت دی۔ مشرکانہ رسوم کو ختم کروایا۔ عام لوگوں کو حضرت شیخ الاسلام کی ان مساعی سے بڑا فائدہ ہوا اس لیے کہ انہوں نے ابن تیمیہ کی کوششوں کے نتیجے میں توہمات اور شرکیہ اعمال سے نکل کر توحید خالص اور اتباع سنت رسول کریم کو اپنا وظیفہ حیات بنالیا۔ لیکن شام و مصر کے بہت سے لوگ جن کے دنیاوی ذرائع انہی رسوم و روایات پر مبنی تھے، انہوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی مخالفت کی۔ حالات اتنے مشکل ہوگئے کہ حکومت کو اس میں مداخلت کرنی پڑی اور بعض شر پسندوں کے زیر اثر حکومت نے ابن تیمیہ کو قید کر دیا گیا۔ لیکن خود شیخ الاسلام کی شخصیت شام و مصر میں بڑی محترم تھی اس لیے کچھ عرصہ بعد ان کو رہا کر دیا لیکن اب یہ شورش لگاتار جاری رہی اور اس کی وجہ سے ابن تیمیہ کو کئی مرتبہ قید و بند سے دوچار ہونا پڑا۔ اس درمیان میں سیاسی حالات بھی بدلتے رہے اور ان کا اثر شیخ الاسلام پر بھی مرتب ہوتا رہا۔ آخر میں ان کو پھر قید کر دیا گیا اور ان پر اتنی سختی برتی گئی کہ کاغذ، قلم دوات اور کتاب وغیرہ سب ان کی دسترس سے دور کر دیے گئے۔ قید تنہائی میں کاغذ قلم کا ساتھ چھوٹا تو انہوں نے کوئلے سے قید خانے کی دیوار پر لکھا کہ ”مجھ کو حقیقی سزا اب ملی“ ہے۔

شیخ الاسلام کی حیات کے لیے یہ قید آزادی کے راستے کی آخری منزل ثابت ہوئی۔ قید کے دوران بیمار ہوئے اور چند دن بیمار رہنے کے بعد 20/ ذوالقعدہ 728ھ مطابق 25/ ستمبر 1328ء کو میں قید خانے کے اندر ہی ان کی وفات ہوگئی۔

تہجد کے وقت حضرت ابن تیمیہ کی وفات ہوئی اسی وقت فجر سے پہلے ہی سرکاری سطح پر ان کی وفات کا اعلان ہوگیا۔ آناً فاناً پورا شہر بند ہوگیا، دفاتر بند کر دیے گئے، تعلیم گاہوں میں تعطیل ہوگئی، قلعے کے دروازے عام لوگوں کے لیے کھول دیے گئے اور لوگ جوق در جوق حضرت شیخ الاسلام کے آخری دیدار کے لیے قلعے کے اندر آنے لگے۔ ظہر کے وقت جنازہ تیار ہوا۔ نماز جنازہ میں بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ چار جگہ نماز جنازہ ہوئی۔ تقریباً دو لاکھ مردوں اور دس ہزار عورتوں نے جنازے میں شرکت کی۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اپنے وقت کے جید عالم اور مصلح تھے۔ انہوں نے من جملہ دیگر کاموں کے تصنیف و تالیف میں بھی گراں قدر حصہ چھوڑا ہے۔ ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کی تصانیف کی تعداد پانچ سو سے زیادہ بتائی ہے۔ ان میں بعض کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ ان کی مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں۔

1۔ فتاویٰ ابن تیمیہ، تقریباً 38 جلدیں
2۔ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، دو جلد
3۔ منہاج السنۃ، 4 جلد
4۔ درء تعارض العقل والنقل، 9 جلد
5۔ الصارم المسلول
6۔ السیاسۃ الشرعیۃ
7۔ الرسالۃ التدمریۃ
8۔ العقیدۃ الواسطیۃ
9۔ کتاب العبودیۃ
10۔ الفرقان بین اولیاء الرحمن واولیاء الشیطان

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

11۔ کتاب الرد علی المنطق

24.3.2 ابن تیمیہ کی خدمات

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک ادارے سے کم نہیں تھے۔ انہوں نے زندگی کے تمام میدانوں میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے کارزار جہاد میں تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور کئی سال اس میں مصروف رہے اور تاتاریوں، خاص طور پر قازان خاں کو شکست دینے میں ان کا بڑا اہم کردار ہے۔ انہوں نے دمشق کی آبادی کو نقل مکانی کرنے سے روکا اور لوگوں کو دشمنوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا۔

میدان جنگ کے علاوہ علمی دنیا میں تو انہوں نے ایسی خدمات انجام دی ہیں کہ آج صدیوں بعد بھی ان کی تحریریں اسی طرح تابندہ ہیں جیسے ان کے زمانے میں تھیں۔ انہوں نے علوم دینیہ کے تمام پہلوؤں پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ کتابیں لکھی۔ اس کے ساتھ منطق، فلسفہ، کلام، تاریخ، ردعیسائیت اور مسلمانوں کے باطل فرقوں کے رد اور تنقید پر بھی بڑی معرکہ آرا کتابیں لکھیں۔ ان کی تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے تنقید کے ایسے پہلو نکالے جو ان سے پہلے علمی دنیا کا حصہ نہیں تھے۔ خاص طور پر منطق پر انہوں نے جو تنقید کی ہے وہ خود منطق کے میدان میں بڑا اضافہ ہے۔

علم کلام کے میدان میں بھی ان کی خدمات قابل قدر ہیں، بلکہ اس میدان میں بھی انہوں نے بڑی مجتہدانہ بصیرت سے کام کیے ہیں۔ علم کلام اور کلامی روایت کے اعتبار سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی علمی خدمات کا آدھے سے زیادہ حصہ کلامی روایت پر مبنی ہے۔ انہوں نے اسلام کی پوری کلامی روایت کا جائزہ لیا اور ایک حد تک کلامی روایت میں نئے دور کا آغاز کیا۔ ابن تیمیہ نے علم کلام میں جس منہاج فکر کو فروغ دیا وہ حنبلی منہاج کہلاتی ہے اور وہ اشاعرہ اور ماتریدیہ سے بھی کسی حد تک منفرد ہے اور ظاہر ہے کہ دیگر کلامی مسالک جیسے معتزلہ، شیعہ اور قدریہ وغیرہ کے تو سخت خلاف ہے، ان سب پہلوؤں پر انہوں نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے لکھا ہے۔

24.3.3 معاصر کلامی روایت پر تنقید

علم کلام میں ابن تیمیہ کی خدمات کو جاننے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ انہوں نے اپنے عہد کی کلامی روایت پر کیا تنقید کی ہے۔ ابن تیمیہ قدیم کلامی روایت کے ایک حصے کی تعریف کرتے ہیں۔ خاص طور پر متکلمین کی خدمات بلکہ معتزلہ کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے۔ تاہم کلامی روایت میں ان کو جو پہلو قابل تنقید لگے ان پر انہوں نے تنقید بھی کی ہے۔

علم کلام پر ابن تیمیہ کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن تیمیہ کے مطابق متکلمین نے عقائد تو قرآن و سنت سے اخذ کیے ہیں لیکن انہوں نے قرآن کے طرز استدلال کو اختیار نہیں کیا ہے۔ اس کی جگہ انہوں نے عقلی دلائل کو بنیاد بنایا اور فلسفہ کے مفروضات اور مزعومات پر اپنے دعوں کی بنیاد رکھی۔ کلامی رایت کی یہ ایسی کمزوری ہے جس کا احساس خود متکلمین کو بھی رہا ہے کہ ان کے دلائل اطمینان بخش نہیں

ہیں۔

کلامی روایت پر ابن تیمیہ کی تنقید کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ متکلمین نے جن مقدمات پر اپنے دلائل کی عمارت کھڑی کی ہے ان میں سے بعض ایسے مفروضات بھی ہیں جن کی تصدیق کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتی یا اس کی کوشش نہیں کی گئی اور بعض اوقات ان مفروضات کی بنیاد پر بعض اور عقلی مسلمات کا انکار بھی لازم آجاتا ہے۔

ابن تیمیہ نے کلام کے ساتھ فلسفہ اور منطق پر بھی تنقید کی۔ چونکہ کلام کے بعض دلائل فلسفہ اور منطق سے ہی ماخوذ ہیں اس لیے اس تنقید کا بھی کچھ پہلو کلامی روایت سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ البتہ یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں۔

کلامی روایت میں ابن تیمیہ کی خدمات:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جو کلامی روایت قائم کی اگرچہ اس کا زیادہ تر حصہ قدیم روایت سے ماخوذ ہے تاہم اس میں بعض اہم اضافے بھی ہیں۔

24.3.4 وجود باری تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کی وجود کو ثابت کرنے کے لیے قدیم متکلمین کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ عالم اجسام سے مرکب ہے اور اجسام جوہر اور عرض سے مل کر بنتے ہیں۔ چونکہ کوئی بھی جوہر عرض کے بغیر وجود پذیر نہیں ہوتا اور اعراض ممکنات ہیں جو ممکن پر منحصر ہو وہ خود بھی ممکن ہوتا ہے اس لیے تمام جواہر ممکن ہیں یعنی یہ کائنات ممکنات کی دنیا ہے اور ہر وہ چیز جو دائرہ امکان میں ہو اس کا وجود ایسے سبب کے بغیر نہیں ہو سکتا جو دائرہ امکان سے باہر ہو، یعنی واجب الوجود ہو۔ اس لیے اللہ کو ماننا ضروری ہے۔

فلاسفہ نے بھی ممکن اور واجب کی دلیل دی ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کی حرکیت اور علت و معلول کو بھی بغور دلیل پیش کیا ہے۔ لیکن ابن تیمیہ نے معقول دلائل کے ذریعہ اس استدلال کے اندر کی خامیوں کو ظاہر کیا ہے اور اس میں ابن تیمیہ منفرد نہیں ہیں۔ لوگ پہلے بھی ان خامیوں کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔

ابن تیمیہ نے وجود باری عزاسمہ کی دلیل کے قرآنی طرز استدلال کا سہارا لیا۔ انہوں نے دو دلیلیں اختیار کیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید میں سورہ مومنون آیت نمبر 13-14 میں تخلیق انسان کا مرحلہ وار ذکر ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ کسی خالق کا محتاج ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا عقیدہ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ چنانچہ دنیا میں کہیں کوئی ایسا معاشرہ نہیں پیدا ہوا جو خالق کے تصور کے بغیر ہو۔ یہ بھی وجود باری تعالیٰ کی ایک دلیل ہے۔

24.3.5 صفاتِ الٰہی

علم کلام کا سب سے اہم اور مشکل مسئلہ صفات الٰہیہ کا ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کا ذات کا غیر ہیں ایک

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ صفات الٰہی اس کی ذات کا عین ہیں اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نہ عین ہیں اور غیر ہیں۔

جو گروہ یہ کہتا ہے کہ صفات الٰہی اس کی ذات کا عین اس کا کہنا ہے کہ اگر صفات کو ذات کا غیر مانیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا مرکب ہونا لازم آتا ہے اور مرکب ہونا ایک عیب ہے جو ہستی باری تعالیٰ میں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے گویا کا وجود ہی نہیں ہے۔ ابن تیمیہ نے اس تصور پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات کا غیر نہیں ہیں بلکہ عین ذات ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کا مرکب ہونا لازم نہیں آتا۔ ابن تیمیہ کا خیال ہے کہ جو ذات صفات سے عاری ہو وہ تو صرف موہوم خلا ہی ہو سکتی ہے یا صرف ذہنی وجود ہو سکتی حقیقی وجود نہیں ہو سکتی اس لیے کہ صفات سے ہی ذات کا تعارف ہوتا ہے۔

24.3.6 ارادہ الٰہی

اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے متعلق بحث بھی ان اہم مسائل میں سے ہے جو علم کلام میں عام طور پر زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فلاسفہ یہ مانتے ہیں کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے ارادے کے بغیر وجود میں آئی ہے اس لیے کہ ارادہ کے لیے زمان و مکان تسلیم کرنا پڑے گا جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ممکن نہیں۔

اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ مخلوقات اگرچہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ پیدا کی ہیں لیکن ان کی تخلیق میں مقصدیت نہیں ہے اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف کسی مقصد کی نسبت کریں گے تو اس سے اس ذات میں کمی لازم آئے گی جو بارگاہ رب العزت میں محال ہے۔

ابن تیمیہ نے ان دونوں تصورات پر تنقید کی ہے۔ ان کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاً تو بالارادہ کسی کام کو کرنا نقص کو مستلزم نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بہت سی جگہ تخلیق کے اندر مقصدیت کا اظہار کیا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ارادہ الٰہی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تشریعی اور دوسرا تخلیقی۔ انبیاء کو بھیجنا کتابیں نازل کرنا، حلال و حرام مقرر کرنا اس کا تشریعی ارادہ ہے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ مولا اپنے تشریعی امور کی انجام دہی سے خوش ہوتا ہے اور ان کے کرنے والوں کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔

دوسرا ارادہ تخلیقی ہے۔ اس ارادہ کے ساتھ اس کی پسند و ناپسند وابستہ نہیں ہے۔ نافرمانوں کے اعمال اس ارادہ کے ضمن میں آتے ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تکوینی ارادہ وابستہ ہے۔ وہ بھی خدا کے حکم اور ارادہ سے ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

ابن تیمیہ کے بقول واضح قرآنی نصوص سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کو ارادہ سے پیدا کیا ہے۔ ارادہ تشریعی بھی اس میں شامل ہے اور ارادہ تکوینی یا تخلیقی بھی۔ ابن تیمیہ نے متعدد قرآنی آیات سے استشہاد کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو با مقصد اور بالارادہ پیدا کیا ہے۔

24.3.7 عقائد کی قرآنی تاویل

ابن تیمیہ نے تمام عقائد میں اس کی کوشش کی ہے کہ ان کو ظاہری معنی پر ہی محمول کیا جائے لیکن اگر کہیں ظاہر معنی مراد لینا ممکن نہ ہوں تو پھر اس طرح تاویل کی جائے کہ عقلی موشگافیوں کے ذریعہ یہ تصور ناقابل بیان نہ ہو جائے۔ مثال کے طور پر استوا علی العرش کے

بارے میں متکلمین مختلف تاویلات کرتے رہے، معتزلہ نے بھی ایک نیا معنی بیان کرنے کی کوشش کی جب کہ ابن تیمیہ نے بہت واضح طور پر کہا ہے کہ استوا سے مراد بیٹھنا ہی ہے۔ البتہ وہ استوا یعنی بیٹھنا کیسا ہے اس کی کیفیت معلوم نہیں اور اس کے بارے میں زیادہ گفتگو کرنا بدعت ہے۔ ابن تیمیہ کا مشہور مقولہ ہے (الاستواء معلوم والکیف مجھول والسوال عنہ بدعۃ)

24.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اس یونٹ میں ہم نے یہ جانا امام فخر الدین رازی اپنے دور جید عالم اور بڑے پائے کے متکلم تھے۔ انہوں نے تاریخ اسلامی کی ایک نہایت عظیم تفسیر لکھی جو تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر کم و بیش اسی (۸۰) کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابوں کے زیادہ تر موضوعات کلامی روایت کی تفسیر و توضیح پر مشتمل ہیں حتی کہ ان کی تفسیر قرآن میں بھی بڑا حصہ ان کے کلامی نظریات کا ہی ہے۔ انہوں نے کلام میں اشعری روایت کو اختیار کیا اور معتزلہ اور کرامیہ کا رد کیا۔ انہوں نے کلام اور فلسفہ کو باہم آمیز بھی کیا اور جو فلسفہ ان کی نظر میں مذہب مخالف تھا اس پر انھوں نے شدید تنقید بھی کی۔ انہوں نے تمام کلامی مسائل پر تفصیل سے لکھا ہے، وجود باری تعالی، اثبات توحید الہی، ذات وصفات اور کلام و فلسفہ کے باہمی ربط پر انھوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔
- شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ بھی اپنے وقت کے بڑے عالم، محدث، فقیہ اور متکلم تھے۔ انہوں نے پوری زندگی تصنیف و تالیف اور بحث و تحقیق میں بسر کی اس کے علاوہ درس و تدریس اور اصلاح امت میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ابن تیمیہ پوری زندگی جہد و عمل کا پیکر رہے، میدان کارزار میں انہوں نے جہاد کا فریضہ بھی انجام دیا اور امت کی اصلاح و تربیت بھی کرتے رہے۔ اس راستے میں انہوں نے بڑے مصائب جھیلے، قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کی حتی کہ ان کی وفات بھی قید خانے کے اندر ہی ہوئی۔ ان کو قید کرنے والے ظالموں نے ان کے ساتھ یہ تک کیا کہ ان سے کاغذ، قلم اور دوات تک چھین لیے، وہ کوئلے سے لکھتے رہے وہ بھی ان کو گوارہ نہ ہوا۔ بہر حال ایک فعال اور متحرک زندگی گزارنے کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔ انہوں نے کم و بیش پانچ سو کتابیں لکھیں، ان کی کتابوں میں بڑا تنوع بھی ہے اور بڑی اجتہادی بصیرت بھی ان کی کتابوں کے اندر ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں آج تک اپنے موضوع پر مستند مانی جاتی ہیں۔
- شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے علم کلام کے میدان میں بھی بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ ابن تیمیہ نے علم کلام کے تمام موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ وہ مسلک کے اعتبار سے حنبلی تھے اس لیے انہوں نے جس علم کلام کو فروغ دیا وہ حنبلی علم کلام کہلاتا ہے اس میں اشاعرہ سے کچھ اختلافات بھی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر کافی مشابہت بھی دونوں میں پائی جاتی البتہ معتزلہ کے دونوں خلاف ہیں۔

24.5 نمونہ امتحانی سوالات

24.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. امام رازی کس شہر میں پیدا ہوئے؟

(a). حران (b). رے (c). مدینہ (d). ہرات

2. امام رازی کی وفات کس شہر میں ہوئی؟

(a). رے (b). حران (c). طبرستان (d). ہرات

3. امام رازی کی سرپرستی کس بادشاہ نے کی؟

(a). شہاب الدین غوری (b). قطب الدین ایبک (c). بختیار خلجی (d). سب غلط

4. امام ابن تیمیہ کی وفات کس شہر میں ہوئی؟

(a). حران (b). رے (c). دمشق (d). سب غلط

5. ابن تیمیہ کے زمانے میں کس تاتاری بادشاہ نے دمشق پر حملہ کیا تھا؟

(a). قازان خاں (b). چنگیز خاں (c). ہلاکو (d). موسیٰ جلیل

24.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. امام فخر الدین رازی کے مختصر احوال بیان کیجیے۔
2. امام ابن تیمیہ کے مختصر احوال زندگی بیان کیجیے۔
3. امام رازی کی علمی خدمات پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
4. امام ابن تیمیہ کی علمی خدمات مختصراً بیان کیجیے۔
5. تاتاریوں کے مقابلہ خدمات انجام دیں۔

24.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. علم کلام کے ارتقا میں امام رازی کی خدمات پر ایک مضمون لکھیے۔
2. علم کلام میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی خدمات بیان کیجیے۔
3. ابن تیمیہ کی حالات زندگی اور معاصر کلامی روایت پر تنقید کا جائزہ لیجیے۔

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

24.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	امام رازی	:	مولانا عبدالسلام ندوی
.2	حکمائے اسلام	:	مولانا عبدالسلام ندوی
.3	حیات امام ابن تیمیہ	:	ابوزہرہ مصری
.4	تاریخ دعوت وعزیمت	:	مولانا ابوالحسن علی ندوی
.5	علم الکلام	:	شبلی نعمانی

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

بی۔اے، اسلامک اسٹڈیز

چوتھا پرچہ (فقہ، تصوف اور علم کلام)

جملہ نمبرات: 70 | وقت: 3 گھنٹے

ہدایات:

1. حصہ اول میں 1 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔ 10x1=10

i. بنیادی مآخذ میں چار چیزیں آتی ہیں' قرآن' حدیث' اجماع اور.......................۔

(a). قیاس (b). بیعت (c). استحسان (d). کوئی نہیں

ii. سقوط بغداد کے بعد فقہ اسلامی کی تاریخ کا پہلا دور کب سے کب تک ہے؟

(a). 656ھ سے تیرہویں صدی ہجری کے اواخر تک (b). 1286ھ سے 1358ھ تک

(c). آٹھویں صدی سے پہلی عالمی جنگ تک (d). پہلی عالمی جنگ سے دوسری عالمی جنگ تک

iii. فن اصول فقہ کے آغاز کو..............نے رائج کیا۔

(a). امام ابو حنیفہ (b). امام مالک (c). امام شافعی (d). امام حنبل

iv. فقہ جعفری کے بانی امام-----------ہیں۔

(a). امام باقر (b). امام جعفر صادق (c). امام موسیٰ کاظم (d). سب غلط

v. تعلیم الاسلام کے مصنف...........................ہیں۔

(a). مولوی کفایت اللہ (b). مفتی انوار اللہ (c). مفتی امداد اللہ (d). ان میں سے کوئی نہیں

vi. اکثر علما کے مطابق تصوف تزکیہ اور.....................کا دوسرا نام ہے۔

(a). احسان (b). سلوک (c). عبادات (d). جہاد

vii. تصوف کی بنیادی کتب کس دور میں تصنیف کی گئیں؟

(a). دور اول (b). دور ثانی (c). دور ثالث (d). دور آخر

viii. معتزلہ کے دور اقتدار میں .... کو بھی مظالم سہنا پڑے کیونکہ آپ نے قرآن مجید کو مخلوق ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

(a). حضرت حسن بصری (b). رابعہ بصریہ (c). ذوالنون مصری (d). حارث محاسبی

ix. ”کشف المحجوب“ .... صوفی بزرگ کی تصنیف ہے۔

(a). معین الدین چشتی (b). علی ہجویری (c). علی متقی (d). نظام الدین اولیاء

x. معتزلہ کے مکتب فکر کے حاملین کو کس نام سے یاد کیا جاتا ہے؟

(a). اہل العقل (b). منکری الصفات (c). اہل الکلام (d). اہل العدل والتوحید

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو لفظوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبر مختص ہیں۔ 6x1=6

2. فقہ کے معنی اور مفہوم کو بیان کیجیے۔
3. ہندوستان میں فقہ کے آغاز و ارتقا سے بحث کیجیے۔
4. جدید دور میں اسلامی فقہ کی خصوصیات پر مضمون لکھیے۔
5. سلسلہ نقشبندیہ کے بنیادی تعلیمات اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
6. کتاب اللمع اور عوارف المعارف کا مختصر تعارف تحریر کیجیے۔
7. خواجہ نظام الدین اولیاء کی شخصیت پر گفتگو کیجیے۔
8. معتزلہ کے تاریخی ارتقا پر بحث کیجیے۔
9. علم کلام کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالیے۔

(ج) حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً 500 لفظوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔

10. فقہ اسلامی کے بنیادی آخذ کا تعارف پیش کرتے ہوئے فقہ کی ضرورت و اہمیت پر مضمون قلم بند کیجیے۔
11. فقہ حنفی اور شافعی کی تشکیل کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصراً تحریر کیجیے۔
12. سلسلہ چشتیہ اور قادریہ کی تعلیم اور نصابی کتب کا تعارف تحریر کیجیے۔
13. علم کلام میں غزالی کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
14. تاریخ علم کلام کے ادوار پر ایک جامع مضمون قلم بند کیجیے۔